حیاتِ ابن مریم علیہ السلام

اردو ترجمہ

عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام

تالیف

امام العصر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ

ترجمانی

مولانا ابوطلحہ محمد صغیر پرتاپ گڑھی استاذ معہد الانور دیوبند

زیر نگرانی

حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب کشمیری مدظلہ
شیخ الحدیث دار العلوم وقف دیوبند

زمزم پبلشرز

بسم الله الرحمن الرحیم

﴿وَالسَّلَامُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا﴾ط (القرآن)

حیاتِ ابن مریم علیہ السلام

اردو ترجمہ

عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام

تالیف

امام العصر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ

ترجمانی

مولانا ابوطلحہ محمد صغیر پرتاپ گڑھی استاذ معہد الانور دیوبند

زیر نگرانی

حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب کشمیری مدظلہ
شیخ الحدیث دارالعلوم وقف دیوبند

ناشر
زمزم پبلشرز
نزد مقدس مسجد اردو بازار کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''معروضات ناشر''

تین سالہ محنتوں، جدو جہد، لگاتار مصروفیت کے بعد آج ''معہد الانور'' جدامجد حضرت علامہ کشمیریؒ کی بلند پایہ تالیف ''عقیدۃ الاسلام'' کی اردو ترجمانی نظر قارئین کرتے ہوئے بجناب وہاب ذوالمنن سجدہ شکر ادا کرنے کے بعد عرض گزار ہے کہ آزاد ترجمہ سے متعلق والد ماجد اپنے بسیط مقدمہ میں تفصیلاً لکھ چکے ہیں۔ جو حقائق میں آپ کو سنا تا مجھ سے بہتر اور موثر انداز اور احوال واقعی ان کے خامہ عنبر شامہ پر آگئے۔

اس ناکارہ کو تو خوشی و مسرت، فخر وابتہاج اس کا ہے کہ ''معہد'' کے مقاصد تاسیس سے ایک منزل کا سفر طے ہوا، اور اس شاہکار تصنیف کا ترجمہ، جو قادیانیت کے رستے ہوئے ناسور کا شافی علاج ہے۔ آپ کے سامنے ہے۔ دوسری سعادت یہ کہ یہ کمترین بھی تحفظ ختم نبوت کی مہم میں بہرحال شریک ہو گیا والحمد للہ۔

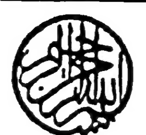
اس کے بعد والد صاحب نے حضرت علامہ کے منتخبات کا جو مجموعہ مرتب کیا ہے اور خود حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف ''اکفار الملحدین'' منظر عام پر لانے کی توفیق خدائے ذوالکرم سے اور آپ سے خیر و کامیابی کی دعا کا طالب ہے اچھا تو اب پڑھئے۔ مقدمہ اور پھر اصل کتاب۔ واللہ معکم اینما کنتم۔

والسلام تحیۃ الاسلام

سید احمد خضر شاہ مسعودی

معتمد معہد الانور دیوبند

۱۴۲۵/۵/۱۰ھ



عرض مترجم

لعین قادیان مرزا غلام احمد ان دجاجلہ میں سے ایک ہے، جن کی بابت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا ''لاتقوم الساعة حتی یبعث دجالون کذابون قریباً من ثلاثین کلهم یزعم انه رسول الله'' (مسلم: ۲/۳۹۷) اس بدبخت نے اولاً ولی ومجدد ہونے کا دعویٰ کیا، پھر مہدی موعود اور مسیح موعود بن بیٹھا، بعد ازاں غیر تشریعی نبی ورسول اور پھر مستقل صاحب شریعت نبی ورسول ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ اس لیے علمائے کرام اس کی سرکوبی کے لیے کمربستہ ہوگئے، اس کے ہر دعوے کے رد میں دلائل کے انبار لگا دیئے، مختلف کتب ورسائل لکھے مباہلہ ومناظرہ کیا۔ مگر اس کے بعض الحادی دعوے اور تحریفات ایسی تھیں کہ ان کا جواب آسان نہ تھا، علماء کو دقتیں پیش آئیں تو اللہ رب العزت نے اس دجالی فتنے کو سبوتاژ کرنے کے لیے علوم وہبی عطا فرما کر امام العصر خاتم المحدثین والفقہاء حضرت علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ کو پیدا فرمایا، جنھوں نے دلائل قاطعہ اور براہین ساطعہ کی روشنی میں اس فتنہ کا قلع قمع کیا، اس کے دجل وفریب کو آشکارا کیا اور بہاول پور (پاکستان) کی عدالت میں اس کے کفر والحاد پر سینکڑوں دلائل پیش کرتے ہوئے جج کو مجبور کر دیا کہ وہ اس کے کفر کا فیصلہ کرے۔ دوسری جانب ''اکفار الملحدین، التصریح بما تواتر فی نزول المسیح، عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیه السلام'' اور ''خاتم النبیین'' جیسی معرکۃ الآراء کتب تصنیف فرما کر اس امت کے علماء کو دلائل وبراہین سے ایسا مسلح کر دیا کہ رہتی دنیا تک اس کے کسی بھی دعوے کے جواب کے لیے علماء کو کوئی پریشانی اور دقت نہیں پیش آسکتی۔

مگر حضرت علامہ کا حال یہ تھا کہ وہ قدیم علماء کی طرح تقریر وتحریر ہر دو میں ایجاز پسند اور اختصار نگار تھے۔ جو بسا اوقات تعقید نگاری کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اشاروں کنایوں اور انتہائی مجمل انداز میں بات مکمل کر دیتے، جس کی وجہ سے مفہوم کو کلی طور پر سمجھنا انتہائی دشوار ہوتا ایک موقعہ پر خود ارشاد فرماتے ہیں:

''اب قادیانی فتنے کی شدت نے ہمیں اس کی (تصنیف وتالیف کی) طرف متوجہ کیا تو میں نے اس کے متعلقہ مسائل کا کچھ مواد جمع کیا۔ اگر میں خود اس کو تصنیف کی صورت سے مدون کروں تو میرا طرز ایک خالص علمی اصلاحی رنگ کا ہے، اور زمانہ قحط الرجال کا۔ اس قسم کی تحریر کو نہ صرف یہ کہ پسند نہیں کیا جاتا، بلکہ اس کا فائدہ بھی بہت محدود رہ جاتا ہے۔ میں نے مسئلہ ''قراءۃ فاتحہ خلف

الامـــام'' پرایک جامع رسالہ ''فصل الخطاب'' بزبان عربی تحریر کیا، اہل علم اور طلبہ میں عموماً مفت تقسیم کیا، لیکن اکثر لوگوں کو یہی شکایت کرتے سنا کہ پوری طرح سمجھ میں نہیں آتا''۔ (حیات انور: ۲۵۳۰)

اس لیے ضرورت تھی کہ حضرت علامہ کی تصانیف کو جو کہ عربی یا فارسی میں ہیں تسہیل کے ساتھ اردو میں منتقل کیا جائے تاکہ استفادہ کسی قدر آسان ہو۔ الحمدللہ معہد الانور کے شعبۂ نشرواشاعت نے اس جانب توجہ کی اور کئی کتابوں پر مختلف انداز سے کام شروع کرایا۔ اسی سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے بندے کو ''عقیدۃ الاسلام'' کے ترجمے وتسہیل کی ذمہ داری سونپی گئی۔ مگر کہاں علوم انوری کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اور کہاں یہ ہیچ مداں۔ آپ کی عبارتوں میں انتہائی اغلاق، اختصار، اقتباسات بہت زیادہ مزید یہ کہ عنوانات بہت کم، جس کی وجہ سے موضوع کو سنبھالنا انتہائی مشکل۔ حضرت شاہ صاحب دامت برکاتہم اور دیگر اساتذہ کرام کی ہمت افزائی وراہ نمائی میں اللہ اللہ کر کے کام کا آغاز کیا۔ اغلاق واختصار کے حل کے لیے اپنی جانب سے بین القوسین یا حاشیہ میں عبارتوں کا اضافہ اور مضمون کو واضح کرنے کے لیے ذیلی عنوانات قائم کیے۔ بعض اعتراض وجواب کی جانب آپ نے یہ کہتے ہوئے فقط اشارہ فرمادیا کہ طلبہ (وقاری) خود ان اعتراضات کا جواب دے لیں گے، حالاں کہ وہ انتہائی اہم مباحث ہیں کہ جن کی جانب مجھ جیسے کم فہموں کا ذہن بھی منتقل ہونے سے رہا۔ ان مواقع پر دوسری کتابوں سے طویل طویل اقتباسات حاشیہ میں نقل کیے، تاکہ قاری کو کسی قدر آسانی ہو۔

میں نے حضرت علامہ کی عبارت کا صحیح مطلب کہاں تک سمجھا ہے اور قاری کو کہاں تک مطمئن کرسکا ہوں یہ فیصلہ آپ کے ذمے۔ میری طرف سے یہ یاد رہے کہ حضرت علامہ کی عبارتوں کی درست تشریح وترجمانی کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ اگر وہ درست اور صحیح ہے تو یہ سب میرے اساتذہ کے فیوض وبرکات ہیں اور اگر غلط ہے تو بندے کا قصور علم سمجھیں۔

اس لیے اصحابِ نظر سے گزارش ہے کہ اگر انہیں کسی جگہ کوئی غلطی نظر آئے تو ازراہِ مہربانی اس سے مطلع فرمائیں۔ ان شاء اللہ آئندہ ایڈیشن میں حتی الامکان اصلاح کی کوشش کی جائے گی۔

اس موقع پر ناسپاسی ہوگی اگر اپنے ان کرم فرماؤں کا تذکرہ نہ کروں جنہوں نے قدم قدم پر میری راہ نمائی فرمائی اور اس عظیم کام میں ہمت دلائی خصوصاً مخدومی ومکرمی محدث جلیل فقیہ نبیل حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ صاحب دامت برکاتہم شیخ الحدیث دارالعلوم وقف دیوبند وسرپرست معہد الانور اور محدث کبیر امام الرجال حضرت الاستاذ مولانا زین العابدین صاحب دامت برکاتہم صدر شعبۂ تخصص فی الحدیث مظاہر علوم سہارنپور کا کہ ان دونوں بزرگوں نے پورے مسودے پر نظر ثانی فرمائی، حرفاً حرفاً سنا، دیکھا اور اصلاح فرمائی نیز محترمی حضرت مولانا

سید احمد خضر شاہ صاحب مہتمم معہد الانور اور حضرت الاستاذ مولانا عبدالرشید صاحب بستوی ناظم تعلیمات معہد الانور کے بے پایاں کرم واحسان کا بھی ممنون ہوں کہ ان حضرات نے بندے کو قدم قدم پر سنبھالا دیا، ہر طرح سے تعاون فرمایا اور ان ہی حضرات کے تعاون سے کتاب اس لائق ہوئی کہ آپ کے ہاتھوں میں پہنچے۔

آج جب کہ کتاب زیورِ طبع سے آراستہ ہورہی ہے، مجھے بار بار والدی ماجدی حضرت مولانا محمد یار صاحبؒ کی یاد ستارہی ہے جن کے دم سے میری بزم کی رونق تھی اور جن کی سحر گاہی دعاؤں سے کچھ لکھنے پڑھنے کی شد بد ہوئی، ان کی حیات ہی میں ترجمہ مکمل ہوگیا تھا، بہت تمنا تھی کہ کتاب جلد از جلد منظر عام پر آجائے۔ کتاب دیکھ کر ان کو کیا کچھ خوشی ہوتی قلم اس کو کہاں بیان کرسکتا ہے؟ بس: ماکل مایتمنی المرء یدرکه۔

افسوس! کتابت کے مرحلے نے طول کھینچا ادھر حضرت والد صاحبؒ کی طبیعت اچانک خراب ہوئی اور ۷/اپریل ۲۰۰۴ء کو دارِ فانی چھوڑ کر دارِ بقا کو کوچ کر گئے۔ انا للّٰه وانا الیه راجعون۔ اب میرے کسی بھی کام سے کسے خوشی، کسے مسرت اور میرے سر پر کس کا دست شفقت۔ وانا بفراقك یا ابی لمحزونون۔

دورانِ مطالعہ چند باتیں پیش نظر رہیں: لفظی ترجمہ کے بجائے آزاد ترجمانی کی گئی ہے۔ قوس دو طرح کے استعمال کیے گئے ہیں ایک معکوفین کی شکل کا [ ] اس کے درمیان کی عبارتیں حضرت مصنف کی ہیں بعض مواقع پر اصل کتاب عربی میں بھی یہ عبارتیں بین القوسین تھیں جب کہ بعض مواقع پر ربط کو باقی رکھنے کے لیے کردی گئیں ہیں۔ دوسرا ہلالین کی شکل کا ( ) اس کے درمیان کی تمام عبارتیں اور حوالے میری جانب سے ہیں۔ عربی کتاب پر حضرت مصنفؒ کی جانب سے بہ عنوان ''تحیۃ الاسلام'' جو حاشیہ ہے، اسے چھوڑ دیا گیا ہے، اس لیے تمام کے تمام حواشی بندے کی جانب سے ہیں۔ نیز بعض مقامات پر مآخذ ومراجع کی جانب مراجعت کے وقت الفاظ کا معمولی فرق ملا تو ان کو بغیر کسی نوٹ کے اصل کے مطابق کردیا گیا ہے۔ ہاں اگر کہیں ایسا فرق ہے کہ جہاں معنی ومفہوم ہی بدل جارہا ہے تو وہاں حاشیے میں نوٹ لگا دیا گیا ہے۔ قرآنی آیات کا ترجمہ ''شیخ الہند'' اور ''بیان القرآن''، از: حضرت تھانویؒ، سے نقل کیا گیا ہے۔ اصل کتاب میں موجود عناوین کو مرکزی عنوان بنا کر ذیلی عنوانات کا اضافہ کیا گیا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ رب العزت اس حقیر خدمت کو تحفظ ردائے ختم نبوت کے سلسلے میں قبول فرمائے اور اس کے پاسبانوں میں شامل کرے۔

ربنا تقبل منا انك انت السمیع العلیم وتب علینا انك انت التواب الرحیم

ابو طٰہٰ محمد صغیر پرتاپ گڑھی

خادم الطلبہ معہد الانور دیوبند ۱/۵/۱۴۲۵ھ-۲۰/۶/۲۰۰۴ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"...نوائے سروش ہے"

مولانا سید انظر شاہ صاحب مسعودی کشمیری

الفاظ ہوں کہ اشعار جملے ہوں کہ فقرے، زمانے کی الٹ پھیر سے یہ بھی محفوظ نہیں، سوسائٹی بدلتی ہے، معاشرہ تغیر پذیر ہوتا ہے، وہی الفاظ واشعار، جو قبول عام رکھتے اس نئے نویلے دور میں متروکات کی فہرست میں ڈال دیئے جاتے ہیں، دنیا ندرت پسند بھی ہے اور تروتازگی کی دلدادہ، جب ایک صدی اپنا دفتر لپیٹتی ہے، اور آنے والی صدی کے اوراق کھلتے ہیں تو ہر چیز بدل جاتی ہے، رہائشی مکانات، رہن سہن کے طریقے، زبان اور اس کی نزاکتیں، لباس و پوشاک، تا آں کہ ماکولات و مشروبات بھی کچھ اپنی جگہ چھوڑتے ہیں کچھ ان کی جگہ لیتے ہیں پرانے وقت میں "ستو" چنے کا یا جو کا بتاشوں سے اسے میٹھا کیا جاتا لیکن اب تو مختلف مشروبات اور کولڈ ڈرنک کے نام پر صحت کو کھوکھلا کرنے والے خدا جانے کتنے مارکیٹ میں مہیا ہیں، فرق وہی ہے کہ پرانی ہر چیز کھانے کی ہو کہ پینے کی صحت اور توانائیوں کو باقی رکھنے والی تھی اور اب صحت کا انہدام تو ممکن ہے لیکن حصول یا بقا سے صحت کی توقع نہیں۔ یہ روز مرہ کے مشاہدے ہیں ان کا انکار ممکن نہیں، اس لیے!

حضرت علامہ کشمیریؒ فرماتے کہ کثرت استعمال سے بعض الفاظ میں غلظت آجاتی ہے جن کا استعمال نظیف الطبع کے لیے گوارا نہیں، اہل علم کو چاہیے کہ وہ الفاظ وتعبیرات کو بدلتے رہیں۔ مثلاً وہ حیض کے بجائے طمث استعمال کرتے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی چیز کی تعبیر کے لیے متعفن تعبیر پسندیدہ نہیں، اس کی ادائیگی سے حیاء کے پر جلتے ہیں تو وہاں اشاروں و کنایوں کا سہارا لیا جاتا ہے، مضاجعت، مجامعت، مباشرت التقاء ختانین، تمکین علی النفس، ہمبستری وشب باشی، وغیرہ وغیرہ صاف بتاتے ہیں کہ تعبیر میں بے لگام چلنے کی اجازت نہیں اس تمہید کے بعد عرض ہے کہ پیش پا و فرسودہ ہو چکا یہ شعر ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے ٭ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مگر اسے کیا کیجیے اتنا جاندار ایسا قوی، کوئی اور شعر نہیں ملتا جو صورت حال کی واقعی عکاسی کر رہا ہو حافظ

شیرازی کا شعر، لعل بدخشاں سے متعلق، مضمون وہی ہے لیکن ادائیگی انوکھی و نرالی، خدا جانے خود راقم الحروف کے شکستہ قلم، برادرِ بزرگوار، تلامذہ کی قطار اندر قطار، دانشوروں کے جم غفیر نے علامہ کشمیریؒ پر کتنا لکھا اور کیا کچھ لکھا، مقالات بھی، مضامین بھی، تصانیف بھی تالیفات بھی، سیرت اور سوانح بھی، علوم بھی اور کمالات بھی، پی. ایچ. ڈی. کے لیے تحقیقی مقالے بھی، گراں قیمت اور معلومات کے خزانے، سب کچھ پڑھنے پڑھانے، دیکھنے اور مطالعے کے بعد مصرعہ وہی زبان پر بے اختیار آجاتا ہے کہ ع

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

زیر نظر مجموعہ علامہ کشمیریؒ مرحوم کی معرکۃ الاراء تالیف ''عقیدۃ الاسلام'' کی ترجمانی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کو سمجھنے کے لیے کچھ مختصر ایسی گفتگو ہو، جس سے مرحوم کے حدود اربعہ اور ان کی ہشت پہلو شخصیت نمایاں ہوسکے، اس لیے عام سوانح کو چھوڑ کر صرف بنیادی و اساسی خصوصیات زیر قلم آتی ہیں۔

''حافظہ'' یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تمام علوم خصوصاً حدیث کے لیے حافظہ موہبت الٰہی ہے محدثین کے تذکرے پڑھئے، بخاری الامامؒ کی گوناں گوں صفات میں نمایاں ان کا بے مثال حافظہ، ترمذی کو لیجئے۔ ان کی خصوصیات میں بھی اعلیٰ و اجلی وصف ان کی بے نظیر یادداشت، اسے یوں سمجھئے کہ یہ خدا تعالیٰ کا ایسا عطیہ ہے۔ جو اس فن کا سب سے بڑا ہتھیار ہے، کیسے ممکن تھا کہ لاکھوں احادیث کے ذخیرہ کو محفوظ رکھنا، اگر حافظہ اضمحلال کی زد میں ہو، علامہ کشمیریؒ کو خدا تعالیٰ نے محیر العقول حافظہ عطا فرمایا تھا، جو اس بات کی علامت تھی کہ چودھویں صدی میں علم حدیث کی بے پایاں خدمات جو مرحوم سے مقصود تھیں جس کے لیے حافظہ بے عدیل مطلوب تھا اس سے کیسے محروم رکھا جاتا، وہ چالیس پینتالیس سال پہلے زیر مطالعہ کتاب کا حوالہ عبارتوں کے ساتھ اس طرح دیتے کہ گویا کتاب ان کے سامنے آج بھی کھلی ہے، حوالہ دکھانے کے لیے کتاب کو اس انداز سے کھولتے یا وہ ہی صفحہ سامنے آتا یا ایک دو صفحہ ادھر ادھر، یہ حیرت زا منظر روزانہ ان کے سبق میں نظر آتا اور خصوصی مجالس میں بھی۔ لاریب کہ وہ حافظ حدیث تھے، جس کا اعتراف ان کے اساتذہ بھی کرتے، گنگوہ میں ایک بار اپنے استاذ حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی المعروف بشیخ الہندؒ کے ساتھ امتحان لینے کے لیے تشریف لے گئے، حضرت شیخ الہندؒ تقسیم کتب برائے ممتحنین فرما رہے تھے، نخبۃ الفکر کی تقسیم کا مرحلہ آیا تو حضرت نے فرمایا کہ ''حافظ کی کتاب حافظ (انور شاہ) کو دو'' معلوم ہوا کہ یہ کہنہ عمر شیخ الحدیث جو دار العلوم دیوبند کا صدر الاساتذہ، اور لگ بھگ چالیس سال بخاری شریف پڑھا چکا تھا قلباً معترف تھا کہ ''انور شاہ حافظ حدیث ہے''۔ دوران درس اگر کبھی کسی لفظ کی لغوی تحقیق زیر گفتگو آتی تو عرب جاہلیت کے اشعار بکثرت سناتے مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے لکھا ہے

کہ حضرت شاہ صاحبؒ پر جب انشاد یا شعر خوانی کا جذبہ طاری ہوتا تو وہ ہی وقت ہوتا کہ ہم اپنی انگلیوں کو تقریر درس بخاری مسلسل لکھنے سے آرام پہنچاتے، یہ بھی لکھا ہے کہ ہزاروں فارسی وعربی کے اشعار یاد تھے، ابو طالب کا وہ مشہور قصیدہ جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طفولیت میں آپ کے وسیلے سے دعائے بارانِ رحمت کی گئی اور فوراً قبول ہوئی، طلبہ کی فرمائش پر یہ طول وطویل ۸۴ر اشعار پر مشتمل قصیدہ کشمیری مرحوم نے برجستہ سبق میں سنا دیا حافظہ کے ایسے بہت سے واقعات ہیں جو علامہ مرحوم کا نمایاں وامتیازی وصف تھا!

''فنون متعلقہ پر تحقیقی نظر'' حدیث ایک دشتِ بے کرانہ ہے یا بحر مواج بلکہ ناپیدا کنار، اس فن کے لیے چوراسی (۸۴) علوم درکار ہیں، خود فرماتے کہ میں نہ صرف ان ۸۴ر علوم سے واقف بلکہ ان پر تنقیدی نظر رکھتا ہوں، خاکسار، تیس سال سے بخاری شریف کا درس دے رہا ہے اور خدا جانے کس کس گھاٹ کا پانی پیا، اس لیے اعلان کرتا ہوں کہ دورِ حاضر ان علوم کی شناوری تو درکنار گمانِ غالب ہے کہ نام بھی نہیں بتا سکتا۔

''نورِ تقویٰ'' جلال سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ سب سے بلند وبالا اولوہیت ہے اس کے بعد رسالت متصلاً نبوت، قریب ترین صدیقیت اُترتے اترتے فرمایا کہ آخر میں ورع ہے، ورع کے بعد کوئی مقام نہیں۔

محدثین کے تذکرے پڑھئے ان کی حیاتِ طیبہ کے اوراق پلٹئے، زہد وتقویٰ استغناء وتوکل عبادت وریاضت، خشوع وخضوع، یہ ان کی حیات کے جلی عنوانات ہیں۔ الحمد للہ کشمیریؒ ان سب اوصاف میں نمایاں مقام کے مالک ہیں۔

''وسعت نظر اور تبحر'' ابن تیمیہ روشن طبع وقاد طبیعت ذہانت کا مرقع ذکاوت کارواں دواں سمندر مگر فلسفہ میں غیر حاذق عربیت میں خام، ابن حجر حدیث میں ایسا پہاڑ کہ اگر کسی پر گر جائیں تو وہ ڈھے جائے، لیکن فقہ میں کچے، یہ حال بیشتر علماء کا ہے۔ لیکن علامہ کشمیریؒ جملہ علوم پر حاوی، فنون کی حقیقت اور گہرائی پر تام نظر، حاذقانہ فیصلوں کی طاقت، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کی مکمل صلاحیت، ہندوستان کے ایک فرقے کے معمار، باستثنائے حضرت گنگوہیؒ فقہ میں ممتاز مگر حدیث سے نابلد، اور اسی کوتاہی کی بناء پر عقیدے کی چیستاں میں پھنس کر رہ گئے علامہ شبیر احمد عثمانیؒ معاصر تھے، ڈابھیل کے زمانۂ قیام میں علامہ مرحوم سے بڑی قربت واختصاص حاصل کیا جس کا اعتراف ''فتح الملہم'' میں بھی ہے اور ''فوائد عثمانی'' یعنی حواشی قرآن مجید مطبوعہ بجنور میں بھی، ڈابھیل کے جلسہ تعزیت میں موصوف نے فرمایا ''کہ ہماری نظر زیادہ سے زیادہ اجساد واجسامِ علوم پر ہے! جب کہ حضرتِ شاہ صاحبؒ ارواح علوم پر مطلع تھے''۔ علامہ سید

سلیمان ندوی‌ؒ نے اپنے تعزیتی اداریہ میں لکھا کہ ہر مسئلہ شاہ صاحب‌ؒ کے یہاں طے شدہ تھا قیل وقال میں الجھائے بغیر سوال کا جواب ایسا عنایت فرماتے کہ حقیقت وروح سامنے آجاتی، اس تبحر، تعمق و وسعتِ نظر کے باوجود دوسروں کے کمالات تسلیم کرنے میں فراخ حوصلہ تھا، ابن تیمیہ کو سراہتے، مگران کی خامیوں پر بھی نظر تھی، ابن حجر کو تسلیم کرتے لیکن بعض گوشوں میں ان کی ناواقفیت کے اظہار سے نہ چوکتے، ابن ہمام‌ؒ کی اصول فقہ میں مہارت کو تسلیم کرتے لیکن ان کے تفقہ کے چنداں قائل نہ تھے، حافظ تقی الدین ابن دقیق العید کی گہرائی وگیرائی کے بڑے مداح تھے، امام شافعیؒ کو ہمیشہ رئیس الاذکیاء یا سید الاذکیاء کے لقب سے یاد کرتے شیخ محی الدین ابن عربی صاحب فتوحات مکیہ کو اپنے فن میں امامت کا درجہ دیتے شوکانیؒ صاحب نیل الاوطار کو خاطر میں نہ لاتے، الحلال بین والحرام بین (الحدیث) مشہور حدیث پر فرمایا کہ ''شوکانی نے اس حدیث پر رسالہ لکھا پیاز کی طرح چھلکے اتارے ہیں مغز کا نام ونشان نہیں اس سے تو اچھا میں لکھ سکتا ہوں گو میں بھی اس حدیث کو تھام نہیں سکتا'' (یعنی اس کا حق ادا نہیں کرسکتا) یہ بھی فرمایا کہ کتاب البیوع میں بخاری اس حدیث کو پھر لائیں گے وہاں میں بتاؤں گا کہ یہ جلیل امام بھی حدیث کے اطراف وجوانب کا احاطہ نہیں کرسکا۔

جرح وتعدیل کے فن کو چنداں حیثیت نہ دیتے فرماتے کہ ہر شخص نے اپنی پسندیدہ شخصیت کو اچھالا اور ناپسندیدہ کو گرایا ہے! بخاری الامام کے بعض کمالات کو دل سے تسلیم کرتے اور ساتھ ہی ان کی زیادتیوں پر نظر تھی، جس کا برملا اظہار ہوتا۔ مثلاً نعیم بن حماد، بخاری کے پسندیدہ رواۃ میں ہیں، تین جگہ احادیث کی سند میں آئے، بلکہ یہ بھی شہرت ہے ''تعلیقات بخاری'' کے بھی راوی تھے ''خلق افعال عباد'' کے مسئلہ میں بخاری نے ان سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔ کشمیری علیہ الرحمہ نے فرمایا، حالاں کہ یہ نعیم سنت کی تائید اور بدعت کی تردید میں حدیثیں گھڑا کرتا، اور ابوحنیفہ‌ؒ کے مثالب میں اس کی داستانیں ایجاد بندہ تھیں فرماتے کہ ''بخاری کے اعتماد پر امت میں ان گھڑی گھڑائی حکایات کو پھیلنے سے کون روک سکتا ہے، اس لیے جرح وتعدیل کے متعلق اکثر فرماتے کہ اس میں اندھیر ہی اندھیر ہے۔ فرمایا کہ ابن حجرؒ نے ''حدیث بیرٔ بضاعہ میں'' واقدی'' کو گرانے کے لیے زور قلم صرف کردیا، لیکن ایک روایت جو امام شافعیؒ کے لیے مفید اور اس میں واقدی ہیں ابن حجرؒ نے بڑی ہوشیاری سے ان کا نام حذف کردیا، چوں کہ سند عام شارحین کی نظر میں نہیں ہے۔ اس لیے کوئی ابن حجرؒ پر گرفت نہ کرسکا۔ میری نظر میں اس حدیث کی اسناد ہیں، تو ابن حجرؒ کی اس ہوشیاری پر میں نے متنبہ کیا، اور کہا کہ ''سبحان اللہ یہ تو ابن حجرؒ نے خوب کیا اگر کوئی حنفی ایسا کرگذرتا تو ابن حجرؒ اسے عمر بھر نہ بخشتے''۔

اعتدال

اس تبحر کے نتیجہ میں وہ تنگ دلی ختم ہوگئی جو ناقص علم والوں کا خاص شعار ہے چناں چہ وہ صدرِ شیرازی کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ایک بار یہ بھی فرمایا کہ ''باوجود اختلاف مسلک کے کہ وہ

شیعہ اور میں سنی ہوں اعلان کرتا ہوں کہ حقائق کو صدرِ شیرازی شاہ ولی اللہ سے زیادہ سمجھے'' ابن قیم کے علوم ومعارف کے قائل نہ تھے۔ ابن قیم نے جنت کا جغرافیہ لکھا ہے، اس پر فرمایا کہ ''عراق کے گاؤں کا جغرافیہ تو لکھ نہیں سکتے اور چلے ہیں جنت کا جغرافیہ لکھنے'' فخر رازی کی بعض قرآنی خدمات کی مدح کرتے لیکن یہ بھی فرماتے کہ ''اعتراض میں نقد النقدی چلتے ہیں، جب کہ جواب میں ادھار پر ٹال دیتے ہیں'' غزالیؒ کے محدث ہونے کا انکار فرماتے، صاحب روح المعانی کی تحقیقات، اور علوم ومعارف میں ان کی غواصی وشناوری کے دل سے قائل ہیں، ان کی انشاء اور ادب پر قدرت کاملہ کو بھرپور تسلیم کرتے، فرماتے کہ ''حریری ادیب نہیں ہے، صرف نامہ نگار ہے ایک روز سبق میں فرمایا کہ ''بادشاہ وقت نے حریری کو یاد کیا اور کسی خاص عنوان پر لکھنے کے لیے حکم دیا تو حریری ایک لفظ بھی نہ لکھ سکا بلکہ اپنی ریش مسلسل کریدتا رہا'' بدیع ہمدانی کی انشا کو مقامات پر ترجیح دیتے۔ فرماتے کہ صاحبِ روح المعانی نے بھی مقامات کے طرز پر ایک کتاب لکھی اور نام رکھا ''مقامات خیالی'' میں نے اس کا مخطوطہ دیکھا ہے، اگر وہ چھپ جاتی تو عربی انشاء کا ایک نادر مرقع سامنے آتا۔

شیخ عبدالحق محدث کی ان کے یہاں چنداں اہمیت نہیں تھی، حافظ فضل اللہ تورپشتی، اور طیبیؒ شارح مشکوٰۃ کو محقق فرماتے۔ متاخرین میں حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ اور حضرت گنگوہیؒ کے تفقہ کا دل سے اعتراف فرماتے، جلال سیوطیؒ کے تبحر کو قبول کرتے لیکن تعمق کا انکار فرماتے، فرماتے کہ فن تو ابن حجر عسقلانی کے پاس ہے! غرضیکہ فقہ حنفی میں تصلب کے باوجود حدیث کے غلبہ کی بناء پر جس کے اثرات انکے دل ودماغ روح وگوشت اور پوست پر نمایاں ہیں، اعتدال ان کی پوری زندگی پر حاوی ہے فکر پر بھی علم پر بھی، قلب پر بھی دماغ پر بھی، بلکہ روح اسی ذائقہ سے سرشار ہے، چناں چہ داؤد ظاہری رئیس اہل حدیث کے متعلق فرمایا کہ ''میں ان صاحب کو یوں ہی سمجھتا تھا، لیکن جب ان کی تصانیف کا براہِ راست مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ علم وتحقیق سے محروم نہیں''! ابن حزم اندلسیؒ کے لیے نہ ردّ ہے نہ قبول، بلکہ فرماتے کہ میں حیران تھا کہ ان کے قلم پر اس قدر تشدد کیوں آیا، معلوم ہوا کہ ایک بار ٹائیفائڈ میں مبتلا ہوئے جو بگڑ گیا جس کے برے اثرات ہمیشہ کے لیے رہ گئے، حدت جگر کے دائمی مریض رہے اور اپنے قلم سے اسی گرمی وحدت کا اظہار کرتے رہے، الحاصل! اسلام کے طول وطویل عرصہ کے جملہ علوم ومعارف اور دانش وران کے سامنے ہیں، تنقید انتہائی جچی تلی، تبصرہ بے حد متوازن، لیکن نیکی اور زُہد سے بہت متاثر، بڑے بڑے پر علمی تنقید کرتے ہوئے اچانک فرماتے ہیں کہ ''نیکی میں تو ہم سے بہت آگے ہوں گے اس لیے میں کف لسان کرتا ہوں''۔

فقہ حنفی کی پُر وقار خدمت

فقہ حنفی پر اُنھوں نے دلائل کا انبار لگا دیا، خود فرماتے ہیں کہ میں نے طحاویؒ سے زیادہ مسالہ جمع کر دیا، ڈابھیل میں ایک روز درس میں فرمایا

کہ میں فقہ حنفی کا مجدد ہوں، امام اعظم کے تفقہ کو غالب تر سمجھتے ہیں لیکن اپنے معروف اعتدال کے ساتھ تطبیق بین المذاہب ان کا خاصہ ہے امام اعظمؒ یا متقدمین احناف میں سے اس قول کو ترجیح دیتے جس میں دوسرے مذاہب سے قرب ہو، اہم اور معرکہ کے مسائل میں اختلاف کو سمیٹ کر اعتدال پر ختم کرتے اور فرماتے کہ اب جھگڑا کیا رہا؟ ''طحاوی'' کی بڑی قدر و قیمت تھی اور دل سے چاہتے کہ مدارس میں اس کا درس مکمل اور منضبط ہو، اپنے اس شغف میں اتنے بڑھے کہ اچانک ایک روز سہارنپور پہنچ گئے، مولانا زکریا صاحبؒ تشریف لائے تو فرمایا کہ میں دیوبند میں اپنی کوشش میں ناکام ہوگیا آپ مظاہر العلوم کے جزو کل پر محیط ہیں حاضری صرف اس لیے ہوئی کہ آپ سے طحاوی کے مکمل و منضبط درس کی درخواست کروں، موالیک نے اس کتاب سے جس قدر فائدہ اٹھایا حنفیہ نہیں اٹھا سکے'' شیخ الحدیث سہارنپوریؒ نے یہ پورا واقعہ ''آپ بیتی'' میں لکھا ہے۔

ان کی املائی درسی تقریریں ان کی حیات میں علمی دنیا میں عام ہوگئیں تھیں شیوخ حدیث استفادہ کرتے، لیکن تف اس معاصرت پر، ان کا نام لیے بغیر، حال آں کہ مصنف ہدایہ نے لکھا کہ جس کی جو چیز دیکھی جائے اسی کی طرف منسوب کر کے بیان کرنے سے برکت ہوتی ہے! اس صورتِ حال پر کبھی رنجیدہ ہوکر فرماتے کہ ''الشعیر یوکل ویُذم'' کہ جو کھایا بھی جاتا ہے اور اس کی برائی بھی کی جاتی ہے۔ ایک صاحب نے موطأ امام مالک کی شرح میں اوقاتِ صلاۃ میں پوری تحقیق علامہ کی لی لیکن نام ظاہر نہیں ہونے دیا، پاکستان سے شائع ہونے والی علامہ عثمانیؒ کی تقریر بخاری میں مولانا عبدالرحمٰن القاسمی نے علامہ کی املائی تقریروں سے سجا کر ایک گلدستہ تیار کرلیا، اور یہاں تک لکھ مارا کہ حضرت شاہ صاحب علامہ عثمانی سے علمی مذاکرے فرماتے، یہ الفاظ، یہ گل کاریاں انھیں تو متاثر کرسکتی ہیں جو حقیقت حال پر مطلع نہیں لیکن جن کے سامنے واقعات اور حقائق ہیں ان کی نظر میں تو ایسی تصانیف بے وقعت ہوتی ہیں، مفتی مہدی حسن صاحب شاہ جہاں پوری سابق مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند، راندیر سے ہمیشہ ڈابھیل پہنچتے اور علامہ کے درس میں شرکت فرماتے، ان کا ارشاد ہے کہ ''ایک روز حضرت علامہ کشمیریؒ نے بوقت حاضری مجھ سے فرمایا کہ آپ کو خوشخبری سناتا ہوں کہ اب مولانا شبیر احمد صاحب کو علم حدیث سے کچھ مناسبت ہوگئی'' مناسب ہے کہ خود علامہ عثمانیؒ کے ان تاثرات کو بھی پیش کیا جائے جو وہ علامہ کشمیریؒ کے متعلق رکھتے اور بیان فرماتے:

چنانچہ علامہ کے فضل و کمال اور علم دانش کو متعدد مواقع پر مختلف تعبیرات کے ذریعہ علامہ عثمانیؒ نے تسلیم کیا ہے، ایک موقعہ پر ڈابھیل میں جامعہ اسلامیہ کے سالانہ جلسہ انعامیہ و دستار بندی میں علماء و طلباء اور عوام کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''پس سفرِ آخرت میں منزل پر پہنچنے کے لیے ہمیں ضرورت ہے کہ عزت و عافیت سے سفر

کر سکیں، بے عزت سفر جیسے بغیر ٹکٹ لوگ کرتے ہیں، اور اسٹیشنوں پر اتار دیے جاتے ہیں، اسی طرح غلط گاڑیوں میں سفر کرنے سے منزل پر نہیں پہنچ سکتے اس لیے بعض اوقات بڑے سے بڑے آدمی کو بھی قلیوں سے دریافت کرنا پڑتا ہے کہ کس نمبر سے گاڑی چھوٹے گی۔ جب کہ انکوائری آفس بھی ہیں جن میں آفیسر ہوتے ہیں جن کو تمام معلومات ہوتی ہیں۔ علماء کو بھی قلیوں کی طرح سمجھو کہ ہم رات دن چوں کہ تعلیم میں مصروف ہیں، اس لیے آپ کو معلومات بہم پہنچا سکتے ہیں، ہم جیسوں کو قلی سمجھو! اور حضرت شاہ صاحب ”جیسوں کو آفیسر“۔

اس ذرۂ بے مقدار کو تیس سال سے زائد بخاری شریف کا درس دیتے ہوئے گذر گئے، دورانِ مطالعہ ”فضل الباری“ کے ان صفحات کو نشان زد کیا جنہیں بے تکلف مولانا عبدالرحمٰن کے قلم نے بجائے علامہ کشمیریؒ کے علامہ عثمانیؒ کی طرف منسوب کر دیا۔ حال آں کہ وہ سب گراں قدر تحقیقات علامہ کشمیریؒ کی ہیں، **فیا حسرتا ویا لهفا**، حنفیت سے اسی گہرے تعلق کی بناء پر اہل علم کو احناف کی کتابوں کے حواشی و شروح کے طبع کرنے کے لیے فرماتے، ملا علی قاریؒ کو تسلیم نہ کرتے ان کی طول وطویل شرح مشکوٰۃ ان کے خیال میں اہمیت کی حامل نہ تھی، لیکن شرح نقایہ کی خوبی کے قائل تھے، اس لیے الاستاذ مولانا اعزاز علی صاحب کو اس کے حواشی پر متوجہ کیا اور اپنے خاص شاگرد مولوی سید احمد مالک کتب خانہ اعزازیہ دیوبند جو حیدرآباد دکن کے ایک کالج میں پروفیسر تھے ترکِ ملازمت کے ساتھ شرح نقایہ کی طباعت کا حکم دیا۔ قدیم روایات بظاہر اپنے روشن مستقبل کو نظر انداز کرتے لیکن استاذ کے حکم کی تعمیل میں قصور کو برداشت نہ کرتیں مولوی سید احمد صاحب استعفیٰ دے کر دیوبند آبیٹھے کتب خانہ کا آغاز کیا سب سے پہلے ان کی مطبوعات میں یہی شرح نقایہ ہے، یہ استاذ کے حکم کی پُر خلوص تعمیل ہی نتیجہ تھا کہ خوب ترقی کی، شرح وقایہ کے بالمقابل شرح نقایہ کو ترجیح دیتے اور ”ملتقی الابحر“ کو ”کنز“ پر ”اصول الشاشی“ کے مقابلے میں ”تاسیس النظر“ کو پسند فرماتے ”شرح ابن عقیل“ کو بے حد پسند فرماتے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں ان کے مجوزہ نصاب میں یہی متبادل کتب داخل کی گئی تھیں، بدائع صنائع کے متعلق تو فرماتے کہ اس کا مطالعہ کرنے والا فقیہ ہو جائے گا، سکاکی وغیرہ کو خاطر میں نہ لاتے، ہاں زمخشری کو بلاغت کا امام گردانتے اور عبدالقاہر جرجانی کو بھی، قاہرہ میں بعض علوم کی تدوین جدید ہوئی مثلاً نحو، ادب، اس کو بے حد سراہتے، علم صرف کے متعلق فرماتے کہ ہنوز اس کے مسائل مدوّن نہیں ہوئے۔

کثرت مطالعہ

خدا تعالیٰ نے حافظہ کی بیش بہا دولت کے ساتھ مطالعہ کا بڑا شغف عنایت فرمایا تھا وفات سے کچھ پہلے تک کتاب کا مطالعہ فرما رہے تھے، اس کے نتیجہ میں غیر معمولی تبحر

پیدا ہو گیا، اور خداداد ذکاوت و ذہانت کے سہارے تعمق بھی، فکر علم میں ہمیشہ مستغرق رہتے، چناں چہ ایسے مواقع سے بھی مفید مطلب چیزوں کو اٹھا لیتے جہاں کسی کی رسائی ممکن نہیں مسئلہ کفر و ایمان پر جب کہ بعض علماء ''مرزا'' کے کفر میں متردد تھے، تو مرحوم نے ''اکفار الملحدین'' نامی کتاب تصنیف فرمائی، اور دو سو کتب کے حوالے دیئے ''صبح الاعشی فی فن الانشاء'' جو ادب لطیف کا مرقع ہے کیا کوئی تصور کر سکتا ہے کہ اس ٹھیٹ ادبی کتاب میں مسئلہ تکفیر سے متعلق کوئی اہم بات ہوگی؟ لیکن علامہ کا تبحر اسے بھی گرفت میں لے آیا، چوں کہ جملہ علوم مستحضر تھے، اور پورا مطالعہ دماغ میں موجود، اس لیے ''اکفار الملحدین'' جیسی معرکہ کی کتاب کل ۲، ۳، ہفتوں میں لکھ دی، اصل ان کے علوم ''آثار السنن'' کے حواشی میں محفوظ ہیں، مولانا شوق نیموی کی اس کتاب کے مطالعہ کے دوران ابوحنیفہ الامام کے دلائل کو انھوں نے جمع کیا، لا ریب کے اس میں سینکڑوں مطبوعات و مخطوطات کا حوالہ ہے، علامہ مرحوم کے براہِ راست شاگردوں و تلامذہ کی صف تو لپٹ گئی، کاش کہ کوئی اہل علم اس نادر و نایاب خزانہ پر اپنی محنت و کاوشیں صرف کرے، تو چند مجلدات میں فقہ حنفی کے لیے یہ ختام مسک ثابت ہوگا۔

جچی تلی رائے

تبحر اور علوم و فنون میں غواصی کا نتیجہ ہے کہ وہ ہر مسئلہ کی جڑ اور روح پر مطلع ہیں، معرکہ کے مسائل میں مرحوم نے بہت سے حقائق علمیہ کا انکشاف فرمایا اور بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ، مذہبی رواداری اور اس سلسلے میں اسلام کی فراخ حوصلگی پر دوسروں کے متعلق تو کیا کہوں خود اپنا یہ حال ہے کہ بارہا اس موضوع پر خاص و عام مجالس میں لا اکراہ فی الدین ، لکم دینکم ولی دین، اپنی رائے پر بطور حجت ہمیشہ پیش کرتا رہا، یہ بھی دیکھا کہ بہت سے معروف دانش ور، تحریکات کے داعی، انشائے لطیف پر قادر، جب اس موضوع پر پہنچے تو وہ ہی باتیں ان کے قلم سے تراوش ہوئیں جو عام حلقوں میں پھیلی ہوئیں تھیں، ''اکفار الملحدین'' جو مسئلہ کفر و ایمان پر خاصہ کی چیز ہے، اس غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے، کہ بعض سطحیت پسند علماء کو ''لعین مرزا'' کے کفر میں تردد ہے، ضمناً و ذیلاً لا اکراہ فی الدین پر بھی انھوں نے گفتگو کی، اس کا صرف ایک اقتباس پیش ہے! جو آنکھوں پر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھانے کے لیے کافی و وافی ہوگا۔

''واضح ہو کہ یہ تو بہ کرانا وہ جبر و اکراہ نہیں ہے جو عقلاً و شرعاً مذموم ہے بلکہ یہ تو اس حق کے قبول کرنے پر آمادہ کرنا ہے جس کا حق ہونا اظہر من الشمس ہو، معلوم ہوا کہ یہ سراسر ہدایت، ارشاد عدل و صواب، اور خیر محض ہے، اسے یوں سمجھئے کہ ایک بیمار کو زبردستی دوا پلانا، پرہیز کرانا، از اوّل تا آخر خیر خواہی ہے، اسی طرح حق کے قبول کرنے پر کسی کو مجبور کرنا، حق پرستی اور خیر خواہی ٹھہرے گی، یاد رکھنا چاہیے کہ جبر و اکراہ وہ مذموم ہوتا ہے جو برائی اور بدی پر ہو، جیسے کوئی کسی کو کفر و شرک یا بدکاری پر مجبور کرے''۔

پھر حسب عادت ابن عربی کی ''احکام القرآن'' سے وضاحت پیش کی، سورہ ممتحنہ کی تفسیر میں اسی تحقیق کا اعادہ کیا، الحاصل، اس حق کے قبول کرنے پر مجبور کرنا جس کا حق ہونا بدیہی ہوا کراہ نہیں ہے! آلوسیؒ نے بھی ''روح المعانی'' میں اسی رخ کو اختیار کیا، راقم الحروف کہتا ہے کہ ''اس وضاحت سے جو کچھ معلوم ہوا وہ تو ہے لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں کسی فرد کو زبردستی مومن بنانے کا واقعہ نہیں ملتا۔ ہاں یہ تو موجود ہے کہ جن صحابی کے ایمان پر ان کی والدہ نے بھوک ہڑتال کردی تھی تو صاف فرمادیا گیا تھا فلا تطعهما یعنی اگر والدین کا اصرار ارتداد پر ہو تو یہ وہ سرحد ہے جہاں ان کی اطاعت کا معاملہ ختم کردیا گیا، اور چوں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کا عمومی واکثری مقصد اعلائے کلمۃ الحق ہی رہا ہے۔ (دوسرے مقاصد کے ساتھ) اس لیے غالبًا یہ صحیح ہو کہ اسلام فرد و کفر کی بھرپور قوت کے مقابلے میں فرق کرتا ہے، اور یہ بھی ملحوظ رہے، احمد بن حنبلؒ الامام کے یہاں حقیقت ایمان واسلام سچی توبہ ہے! اور بخاری الامام دین اسلام وایمان وغیرہ سب کو متحد مانتے ہیں، اگرچہ اس مسئلہ میں ان سے اختلاف ہے! بہرحال اتنا تو واضح ہوگیا کہ علامہ مرحوم نے لا اکراہ فی الدین جیسی آیات کو غلط استعمال کرنے کے دروازے بند کردیئے۔

ایک دوسرا اقتباس ان کی تحقیق وتطبیق کے سلسلہ میں پیش ہے وہ ہی مشہور اختلافی مسئلہ کہ ایمان زائد وکم ہوتا ہے یا نہیں؟ اس سے متعلق مباحث واختلافات کو کشمیریؒ مرحوم نے چند سطروں میں کس اچھوتے انداز میں [illegible] دیا، فرمایا کہ ''جو ایمان کو قول اور عمل سے مرکب کہتے ہیں اور طاعت سے اس میں زیادتی اور معاصی سے اس میں کمی کے قائل ہیں، ان کا صرف اتنا مقصد ہے کہ مومن کامل، اور گنہگار مسلمان میں فرق کریں، اور یہ فرق اسی طرح ممکن ہے کہ عمل کو بھی ایمان میں معتبر مانا جائے، اور جن کا خیال ہے کہ ایمان کم زیادہ نہیں ہوتا۔ [illegible]ن کے پیش نظر یہ ہے کہ ایمان فعل قلب ہے اور بسیط، جس میں تجزیہ کا امکان نہیں، بلکہ مجموعہ دین جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا اس پر ایمان ضروری ہے! تو وہ کمی اور زیادتی کے بھی قائل نہیں، فرق صُرف نقطۂ نظر کا نکلا، اس سے زیادہ اختلاف کی حقیقت نہیں، جھگڑے ان متاخرین کے کھڑے کیے ہوئے ہیں جو اختلاف کے دلدادہ تھے، اور آویزشوں کے بغیر اُنھیں سکون نہیں ملتا، انھوں نے ہر دو فریق کے اقوال کی تعبیر اس انداز میں کی کہ ایک طرف اعتقاد ہی میں کمی وبیشی پیدا کردی دوسری طرف عمل کو ایمان سے خارج کردیا، بلکہ ظلم یہ ہوا کہ مرجئہ کے عقائد سے جاملایا۔

حسن خاتمہ

کہاں تک سنایئے ان اقتباسات کو یہاں تو ہر چیز زرِ خالص، اور طے شدہ مسئلہ ہے! آخر کوئی بات تو ہوگی کہ عالم اسلام کی ممتاز شخصیت، شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے لکھا ہے کہ ان کے محقق استاذ شیخ کوثریؒ علامہ کشمیریؒ کی تصانیف کا نہ صرف مطالعہ کا مشورہ بلکہ وصیت فرماتے، کشمیر

کے اس جلیل فرزند اور عالم اسلام کے عظیم محدث کی تصانیف وتالیفات کا مطالعہ ضرور کیا جائے مرحوم کی ابتدائی تصنیفی وتالیفی کوششیں ایسے فرقے کے اٹھائے ہوئے ہنگاموں کو ختم کرنے کے لیے تھیں، جو فقہی مذاہب کے پیچھے لٹھ لے کر اندھا دھند دوڑ رہے تھے۔ اور چپ وراست پر ان کی نظر نہ تھی، حالاں کہ ان کے ایک بڑے عالم نے لکھا اور سمجھایا کہ ہم نے اس طرز کی سمیت آزادئ فکر، اور انتہاء الحاد پر دیکھی، مگر جو شور وغوغا برپا کر دیا گیا تھا، اس میں اس صدائے حق کو سننے والا کون تھا، بلکہ آج تک اسی ڈگر پر چلے جا رہے ہیں امت کو اس وقت سب سے بڑی ضرورت اتحاد کی ہے، لیکن ان احمقوں نے اختلاف وتشتت کو ضروریات دین میں سمجھ لیا، آج بھی ان کے قلم زہر پاشی میں مصروف، ان کی زبانیں فتنہ خیزیوں میں مشغول، انکا انداز مبارزت، بہر حال، علامہ اپنی ان تصانیف میں بھی معروف اعتدال اور پسندیدہ روش تطبیق ہی پر چلتے رہے، خاتمۂ عمر پر تمام تر توجہات اس فتنۂ عمیاء کی سرکوبی کے لیے مرکوز ہو گئیں، جو مطلع انوارِ نبوت، اور ختم نبوت کے افق کو اپنی دسیسہ کاریوں سے تاریک تر بنانے کے لیے ہو رہی تھیں۔

بتائیے تو سہی کہ اس کھلے کافرانہ انداز کا کوئی جواب معقول پسند دنیا کی طرف سے ہے؟ کہ ایک ہفوات بکنے والا بک رہا تھا، کہ عیسیٰ قربِ قیامت میں دو فرشتوں کے کاندھوں پر اتریں گے، جبکہ میں حکیم نور الدین اور محمد حسین امروہوی کے دوش پر اترا ہوں، اعاذنا اللّٰہ من طغیان العقل وسکراتہ۔ حالاں کہ ملائکہ قدسی صفات عباد الرحمٰن اور یہ دونوں بدنصیب عبدۃ الشیطان والاوثان۔ یہ محمد حسین وہ ہی ہے کہ قلیل مشاہرہ کی شکایت پر ملعون مرزا سے جدا ہو کر چل دیا اور جب مشاہرہ حسب المراد ملنے لگا تو پھر باطل دامن نبوت کو چمٹ گیا۔ فرشتے درکنار، یہ محروم القسمت صدیقؓ وعمرؓ عثمانؓ وعلیؓ بلکہ جماعت صحابہ میں سے کسی ایک کے کردار کا بھی، جو ایثار واخلاص، چشم نبوت کے اشاروں پر جانیں دینے کے لیے تیار، ادھورا نمونہ بھی پیش نہیں کر سکے۔ لیکن مرزا ملعون کی تائید میں دنیا کی سب سے بڑی حکمرانی جلی وخفی انداز میں رواں دواں تھی اور اسلام کے حصن حصین پر اس ملعون فرقہ کی یورش ویلغار بے باکانہ انداز میں ہو رہی تھیں۔ تو حضرتِ علامہ نے تحفظ ختم نبوت کا محاذ تیار کیا، اپنے تلامذہ کو پورے پنجاب بلکہ ہندوستان کے ان ان گوشوں تک پہنچایا جہاں اس باطل نبوت کا غلیظ پانی متعفن نالیوں سے پہنچ رہا تھا۔ اس فتنہ کی شدت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ علامہ مرحوم کے شب وروز اسی فکر میں غلطاں وپریشاں تھے۔ جس کی تفصیل خود علامہ کی زبانی سنیے:

> ''فرمایا کہ ہنگامِ قیام دیوبند، متواتر ۶ / سال تک مجھ پر اس فتنۂ قادیانیت کے باعث ایک جنون کے درجہ کی حالت تھی، ہر وقت حتی کہ نماز کو آتے جاتے، اٹھتے بیٹھتے، یہ ہی خیال مستولی ہو گیا تھا کہ ہمارا دین مختلط ہو جائے گا۔

اوراس عرصہ میں ردّ قادیانیت خصوصاً ''حیات عیسیٰ علیہ السلام'' کے اثبات کے لیے کہ اس میں علماء ہی مناظروں میں اپنے آپ کو کمزور سمجھتے تھے اور پہلو بچاتے تھے، بہت سرگرداں رہا اور تمام ذرائع استعمال کے لیے، مثلاً، ابن کثیر جو آٹھویں صدی کے محدث ہیں اور ان کی تفسیر نہایت عمدہ ہے موجودہ تفاسیر میں اس میں لکھا ہے کہ ''لو کان موسیٰ وعیسیٰ حَیَّینِ لَمَا وَسِعَهُما الّا اتباعی'' اور اس کی تخریج بھی درج کتاب نہیں، اس سے قادیانی استدلال کرتے ہیں اور علماء نے تاویلاتِ واہیہ کے سوا کچھ جواب نہ دیا تھا۔

میں نے اس کے ہی جواب کی کوشش کی، اوّل تو تمام کتبِ احادیث مطبوعہ اور قلمی جو ہاتھ آئیں دیکھیں، تو سب میں حضرتِ عیسیٰ کا ذکر نہ تھا، میں نے حکم کیا کہ قلم کی غلطی ہے، اور اس طرح مجمل حکم کیا، کیوں کہ ابن کثیر ایسے بڑے محدث کی غلطی کہنا آسان نہ تھا، پھر میں نے ہر طبقہ کے محدثین کو دیکھنا شروع کیا کہ کس طرح روایت کیا ہے چنانچہ آٹھویں صدی کے محدثین کو دیکھا کسی کے یہاں حضرت عیسیٰ کا ذکر نہیں ہے، پھر ساتویں صدی پر چڑھا وہاں بھی نہ تھا، پھر چھٹی صدی پر چڑھا وہاں بھی نہ تھا، پھر پانچویں صدی کے محدثین کا تتبع نہ کیا۔ مگر نہ پایا، پھر چوتھی صدی پر آیا، کشمیر کے ایک محدث کی کتاب ''مبانی الاخبار'' جو قلمی تھی دیکھی، جس کی سند بہت قریب تھی اور اس میں دیکھا کہ حدیث تو درج ہے، پر لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے ''لو کان موسیٰ وعیسیٰ حَیَّینِ لَمَا وَسِعَهُما الّا اتباعی'' ''لو کانَ موسیٰ حیًّا لَمَا وَسِعَهُ اِلَّا اتباعی'' مروی ہے، یہاں پہنچ کر میں نے جزماً حکم کیا کہ ابن کثیر کا سہو ہے کہ قول ابن عباس کو قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمادیا۔

غرض اس قسم کی تشویشات میں مبتلاء رہا ہوں، پھر ایک روز کمرہ سے مسجد کو جارہا تھا تو دفعتہً خیال ہوا کہ ہمارا دین محفوظ رہے گا اور بغیر کسی دلیل و برہان کے دل میں اتر گیا''۔ اسی دوران حیات عیسیٰ علیہ السلام پر آپ کی یہ شاہکار تصنیف ''عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام'' ۴۰۰ رصفحات سے زیادہ عربی میں شائع ہوئی نام تو اس کا حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام ہے! لیکن ذوالقرنین، سدسکندری، یاجوج وماجوج، خروج دجال، ظہور مہدی، نزول عیسیٰ، قرآن مجید کی بہت سی آیات کی تفسیر، مفید مطلب احادیث کا ذخیرہ مختلف علوم وفنون پر محققانہ کلام، سیر حاصل مباحث، اسرار و حکم، تحقیقات کے نوادر، کاوشوں کے جواہر پارے، سب کچھ اس میں موجود اسی لیے حضرت علامہ فرماتے ''کہ حضرت عیسیٰ اس تصنیف کے نتیجہ میں میری شفاعت فرمائیں گے انشاء اللہ''! اس آرزو پر بطور بشارت ایک رویائے صادقہ ان کے نامور تلمیذ یوسف ثانی علامہ بنوریؒ کا پیش ہے: ''ایک سبز قالین نگاہوں کو خیرہ کرنے والا زیبِ زمین، اس پر دو گاؤ تکیہ، ایک سے حضرت

عیسیٰ علیہ وعلی نبینا الصلاۃ والسلام ٹیک لگائے، اور دوسرے پر علامہ کشمیریؒ، ایک دوسرے کے چہرہ کو بغور دیکھ رہے ہیں، اور بنوریؒ ان دونوں آفتاب وماہتاب چہروں کی زیارت میں محو ہے"۔ عرصہ سے تمنا تھی کہ اس اہم علمی افادہ کے لیے استفادہ کی راہیں ہموار کی جائیں چنانچہ معہد الانور ان ہی مقاصد کی توفیر کے لیے وجود میں آیا، ابتدائے قیام میں ایک نوجوان مستعد، ذکی ذہین، ظاہر صلاح سے آراستہ، باطن فلاح کا طالب مولانا ابوطٰہ محمد صغیر صاحب قاسمی کا تقرر عقیدۃ الاسلام کی اردو ترجمانی کے لیے ہوا تین سالہ کاوش وعرق ریزی کے بعد یہ اردو ترجمانی نذرِ قارئین ہے! چند وضاحتوں کے ساتھ موصوف مترجم ہر مرحلے پر اپنے استاذ گرامی قدر مولانا زین العابدین صاحب اعظمی استاذ شعبہ تخصص فی الحدیث مظاہر علوم سہارنپور کا دامن علم وتربیت مضبوطی سے تھامے رہے، مولانا موصوف جید عالم، صاحبِ استعداد، فاضل وکامل ہیں، ان کی نگرانی کے بعد خاکسار نے کسی اور نگرانی کا اہتمام نہیں کیا، (۲) یہ ترجمہ نہیں بلکہ ترجمانی ہے، اور ترجمانی بھی آزاد، مزید برآں علامہ کشمیریؒ کے اتھاہ علوم کو سمجھ کر ان کا واقعی حق ادا کرنا سنگلاخ ہے، پھر بھی موصوف مترجم نے بڑی حد تک نبھانے کی کوشش کی ہے! تاہم یہ نقش اوّل ہے اور مشہور ہے کہ "نقاش نقش ثانی بہتر کشد زاوّل" (۳) حضرت علامہؒ نے عقیدۃ الاسلام پر خود حواشی بھی قلمبند کیے، چوں کہ عقیدۃ الاسلام کے ترجمہ میں وقت کافی گذر گیا اور شائقین کا اصرار بڑھتا جارہا اس لیے سر دست صرف متن کی ترجمانی مناسب سمجھی گئی، دوسرے ایڈیشن میں تعلیقات وحواشی کا اضافہ بھی کیا جائے گا انشاء اللہ! (۴) کتابت وطباعت میں حضرت علامہ کی اس گراں قدر تالیف کا اہتمام پیش نظر رہا، لیکن اس کے باوجود بشری کاموں میں تکمیل کا کوئی بھی دعویٰ نہیں کرسکتا، معہد الانور اپنی چھ سالہ زندگی میں حضرت علامہ مرحوم سے متعلق چند در چند تالیفات فخر ومباہات اور سعادتوں کے حصول کی نیت سے پیش کررہا ہے۔ ایک بے قرار روح، ایک بے چین دل ودماغ، ایک مجسمہ علم، ایک منارۂ نور وہدایت کا خاتمہ۔ لعین قادیانی کی باطل نبوت کے بے بنیاد قلعے کو منہدم کرنے اور فداہ ابی وامی رسول اکرم ﷺ کی نبوتِ کبریٰ اور آپ کی ختم نبوت کی حفاظت میں آخری سانس لینے پر یہی کہا جاسکتا ہے ؏۔

خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

''معہد الانور'' کا خوشگوار فریضہ یہ بھی ہے کہ ان سب کے لیے فوز وفلاح کامرانی وصلاح کے لیے ہمیشہ بہ دعاء رہے۔ جن کی ہمہ جہت توجہات نے چند ناتوانوں کو ساحل مراد تک پہنچنے کی توانائی بخشی۔ وگرنہ ؎

کہاں میں اور کہاں نکہتِ گل ✿ نسیم صبح تیری مہربانی

وانا الاحقر الاواہ **محمد انظر شاہ** المسعودی الکشمیری

خادم التدریس بدار العلوم وقف دیوبند، ۱۴۲۵/۵/۷ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کلماتِ توثیق

حضرت اقدس مولانا زین العابدین صاحب اعظمی مدظلہ

رئیس شعبۂ تخصص فی الحدیث مظاہر علوم سہارنپور (یوپی)

الحمد لله رب العالمين والصلاة على رسوله النبي الامين وعلى آله وصحبه اجمعين. اما بعد

استاذ الاساتذہ حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جن گونا گوں خصوصیات سے نوازا تھا، امت میں بہت کم لوگوں کو ان خصوصیات کا جامع بنایا ہے، اگر چہ آپ کی شہرت ایک محدث عصر کی حیثیت سے ہوئی، لیکن علم تفسیر قرآن اور تاویل الفرقان بالماثور میں بھی وہ عظیم خصوصیت کے حامل تھے، باطل فرقوں میں قادیانی تحریفات اور تاویلات پر مکمل عبور حاصل تھا، جس سے خوشہ چینی کر کے قادیانی ملحد سو جھوٹ ملا کر اپنے باطل نظریات کو امت میں پھیلاتا تھا اور ان میں سے کسی ایک کے منقول من السلف ہونے سے اس کے چیلے چانٹے اکابر کے سر ان جھوٹی تاویلات کو تھوپ دیتے تھے، اس گمراہی کو دور کرنے کے لیے آپ نے "عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام" ایک عظیم اور ضخیم کتاب تصنیف فرمائی، جو بہت ہی مشکل کتاب ہے اس کا حل کرنا علماء کرام کو بھی بہت مشکل اور دشوار گذار ہے، معمولی عربی دانوں کے تو بس کی بات ہی نہیں، اس وجہ سے اس کا نفع محدود ہو گیا تھا، اب حضرت مرحوم کے صاحب زادہ محترم مولانا سید انظر شاہ صاحب مدظلہ نے اردو خوانوں کی سہولت، اور افادۂ کتاب کو عام کرنے کے لیے "اردو" زبان میں اس کو شائع کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ خوش قسمتی سے ان کو ایسے افراد بھی مل گئے جنھوں نے اس محنت طلب کام کو لگن سے کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ چناں چہ عزیزم مولوی محمد صغیر سلمہ نے چند سال کی محنت شاقہ کے بعد "عقیدۃ الاسلام" کی ترجمانی اردو زبان میں کر ڈالی، ناظرین باتمکین اس کا فیصلہ کریں گے کہ مترجم نے ترجمانی کا حق کہاں تک ادا کیا۔

مترجم سلمہ نے ترجمہ کر کے مجھے بھی سنایا میں نے کہیں کہیں ترمیم کا مشورہ دیا، اور کتنی جگہیں ایسی بھی ہیں کہ اصل کتاب دیکھ کر میں پوری طرح سمجھ نہیں پایا تھا، لیکن ترجمہ سن کر خود میں نے وہ مقامات حل کر لیے، اللہ تعالیٰ مترجم سلمہ کو اس کا اجر عنایت فرمائے اور حضرت شاہ صاحبؒ کے فیوض و برکات سے بغایت نفع اٹھانے کی توفیق بخشے، اور امت کو قادیانیت کے زیغ وضلال سے بچنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ والسلام

زین العابدین الاعظمی، ۲۳؍رجب ۱۴۲۵ھ

فہرست عنوانات

عنوان	صفحہ

عنوان	صفحہ

قادیانیوں کولا جواب کریں

آیات سورہ مائدہ اور موضوع زیر بحث

تحریفات قادیانی

فصل

اہم علمی فائدہ: ذوالقرنین، سدّ اور یاجوج ماجوج کی تحقیق

آخری بحث

چند مفید باتیں

نزل أهل الإسلام فی حیاة عیسیٰ علیه السلام



عقیدة الاسلام فی حیاة عیسیٰ علیه السلام

بقلم

محدث کبیر حضرت مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوریؒ

اردو ترجمانی

مولانا ابوطاہر محمد صغیر پرتاپ گڑھی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله الذی جعل علماء هذه الأمة كنجوم السماء، فبهم يهتدى فى دياجر الكفر وظلمات الإلحاد غاية الاهتداء، وبهم زينة هذه البسيطة الغبراء، وبهم يرجم شياطين الإنس فى كل ليلة ليلاء والصلاة والسلام على سيد الرسل محمد خاتم الأنبياء، الممثل للأمة بالمطر والمبشر بنزول سيدنا عيسى روح الله الأطهر فيصلح به الأمة العوجاء، وعلى آله الأصفياء، وصحبه السعداء، ما استنار القمر وتجلت ذكاء.

اما بعد!

تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے جس نے امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے علماء کو آسمان کے ستاروں کی طرح منور بنایا، جن سے کفر کے گھٹا ٹوپ اندھیروں اور الحاد و بے دینی کی تاریکیوں میں مکمل ہدایت ملتی ہے، جو اس سرزمین کی زینت ہیں اور جن سے شیطان صفت انسانوں کا قلع وقمع ہوتا رہا۔

حضور سرور کائنات خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے غیر محدود درود وسلام، جنھوں نے اپنی امت کو بارش سے تشبیہ دی اور حضرت عیسیٰ روح اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آسمان سے نزول کی خوش خبری، جن کے ذریعہ اللہ رب العزت کج راہ امت کی اصلاح فرمائے گا اسی طرح آپ کے پاکیزہ اہل وعیال اور سعادت مند ساتھیوں کے حضور بھی درود وسلام کا نذرانہ پیش ہوتا رہے جب تک چاند سورج میں روشنی ہے۔ (آمین)

امام العصر محقق بے نظیر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے، مشکل ترین علوم ومسائل اور دقیق ترین پیش آمدہ حالات کے حل میں، روشن اور نمایاں کارنامے رہے ہیں، آپ اس دیار میں تمام علوم میں ہر نوع کی مشکلات کے حل کے لئے مرجع علماء تھے، آپ نے حدیث شریف کی تدریس اور اس سے متعلق امور: متن وسند اور جرح وتعدیل کی تحقیق میں منفرد اور بے مثال طریقہ ایجاد کیا۔

آپ کو امت کے مختلف مسالک کے استحضار میں اس درجہ ملکہ حاصل تھا گویا آپ خدا کی ایک نشانی تھے، فقہائے امت کے مابین مختلف فیہ مسائل میں اپنے اسلوب کے وہ خود موجد تھے، اور اہل بدعت بالخصوص اس زمانہ کے سب سے بڑے فتنہ ''فتنۂ قادیانیت'' کی تردید کے سلسلے میں آپ کے بے پناہ احسانات ہیں،

آپ نے علماء کو اس فتنے کی طرف متوجہ کیا، انہیں اس شجرۂ خبیثہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی اہم ذمہ داری نبھانے کی ترغیب دی، اور اپنے بے بہا علمی ذخیروں اور حیرت انگیز قوت حافظہ کے ذریعہ، زبان اور قلم دونوں سے ان کا ہر ممکن تعاون کیا؛ چنانچہ آپ کے اجل تلامذہ کے لئے عربی اور اردو میں فتنۂ قادیانیت کی بیخ کنی کے لئے کتابیں اور رسائل تالیف کرنا آسان ہوگیا، آپ نے یہ تمام تر تعاون صرف خدا کی خوشنودی اور اس کی رضا جوئی کے لیے کیا، کسی کی تعریف کے منتظر رہے نہ داد و تحسین کے متمنی۔ آپ کا بے نظیر علم طالبین کا منتظر رہتا اور آپ کے علمی خزانے ہر آنے جانے والے کی نگاہوں کے سامنے رہتے، قادیانیت کے گمراہ کن فتنے سے آپ کا حساس دل پگھلتا اور اہل علم کی جانب سے حدودِ دین کی حفاظت کے سلسلے میں تساہل برتنے پر، آپ کی پاکیزہ روح کو دکھ پہنچتا، بسا اوقات قادیانیت کی فتنہ سامانیوں سے متعلق یہ خیالات اس قدر آپ پر چھا جاتے کہ ساری رات آنکھوں میں کاٹ دیتے، آپ کی دلی خواہش یہ تھی کہ حق بلند اور باطل سرنگوں رہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ پہلے اس جلیل القدر امام کی سیرت اور زندگی پر تھوڑی سی روشنی ڈالی جائے، تا کہ قارئین کو معلوم ہو کہ خدائے علیم وعلام نے موصوف کو جو علم وافر عطا فرمایا تھا، اس سے مقصود جہاں علم و کمال کی اشاعت تھی، وہیں باطل نبوت کی ہمہ گیر سرکوبی بھی مشیت الٰہی کا جزء تھی۔ اس کے بعد "عقیدہ الاسلام" کی چند خصوصیات کا تذکرہ کروں گا۔

نام ونسب

محقق دوراں امام عصر محدث کبیر حضرت مولانا محمد انور شاہ بن معظم شاہ بن شاہ عبد الکبیر رحمہم اللہ تعالیٰ۔ آپ کا سلسلۂ نسب شیخ مسعود نروری کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے جا ملتا ہے، آپ کے آباء واجداد بغداد سے ملتان آئے، پھر ملتان سے لاہور کا رخ کیا اور وہاں سے کشمیر، جو آپ کی اولاد کا مستقر اور وطن بن گیا، اسی موقع پر کسی نے کہا ہے:

فالقی عصاہ واستقر بہ النوی ۔۔۔ کما قر عینا بالإیاب المسافر

"وہیں لاٹھی ڈال دی اور دوری نے اس کو وہیں ٹھہرا دیا، جس طرح کہ واپس ہونے سے مسافر کی آنکھ ٹھنڈی ہوتی ہے"۔

ولادت، تعلیم وتربیت

آپ کی ولادت ستائیس شوال ۱۲۹۲ھ کو کشمیر میں ہوئی، آپ کے والد محترم بڑے عالم دین، متقی

اور سلسلہ سہروردیہ کے شیخ تھے۔ سہروردی سلسلہ آپ کے خاندان میں منتقل ہوتا رہا۔

آپ کی والدہ محترمہ بھی نیک اور عبادت گذار تھیں گویا کہ پاکباز والدین کی شفقت کے زیر سایہ آپ نے نیک تربیت پائی، صغر سنی میں آپؒ کے والد محترم جب تہجد کے لئے بیدار ہوتے، تو آپ کو بھی جگادیا کرتے اور نماز پڑھتے وقت اپنے پاس بٹھالیتے، اس طرح ابتداء ہی سے برکات کا نزول ہوتا رہا اور بچپن سے نیک دعائیں آپ کے ساتھ رہیں۔ الغرض بہترین نگہداشت کے ساتھ علم وصلاح کے خانوادہ میں آپ کی پرورش ہوئی اور صلاحیتیں پروان چڑھیں۔

ابتدائی تعلیم والد محترم سے، پھر اپنے ضلع کے علماء اور اس کے بعد کشمیر کے مشائخ سے حاصل کی۔ بعد میں حدود کشمیر میں ضلع ''ہزارہ'' اور وہاں سے ہندوستان کے سب سے بڑے علمی مرکز ''دارالعلوم دیوبند'' کا رخ کیا۔ دارالعلوم دیوبند اس وقت بلند پایہ علماء کا مرکز، قرطبہ اور رازہر ہند تھا۔ چند سال دارالعلوم میں تعلیم حاصل کر کے ۱۳۱۳ھ میں فراغت حاصل کی، طالب علمی کے زمانہ ہی سے دارالعلوم میں آپ کے علم، وسعت نظر اور زہد وتقویٰ کا چرچا تھا۔

آپ کے والد محترم نے بیان کیا کہ علامہ کشمیری، ''قدوری'' کے درس میں ایسے سوالات کرتے کہ مجھے ''ہدایہ'' کے مطالعے کی ضرورت پڑتی۔ اس کے بعد میں نے ان کا سبق ایک دوسرے عالم کے سپرد کر دیا، لیکن وہ بھی آپ کے کثرت سوال کی شکایت کرتے۔ جب کہ درس کے علاوہ دیگر اوقات میں بالکل خاموش، سنجیدہ اور یکسو رہتے، دوسرے بچوں کی طرح کھیل کود میں دلچسپی نہ تھی۔ آپ کے والد محترم کو یہ بھی فرماتے ہوئے سنا کہ: ایک مرتبہ وہ آپ کو لے کر اپنے علاقے کے ایک مستجاب الدعوات بزرگ کے پاس آئے، انہوں نے آپ کو دیکھ کر فرمایا کہ: ''یہ بچہ اپنے زمانے کا بڑا عالم ہوگا''۔ آپ کے والد صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ: ہمارے زمانے کے بعض بڑے علماء نے جب درسی کتابوں پر آپ کے نوٹ دیکھے تو محسوس کیا کہ یہ کم سن اپنے وقت کا غزالی اور رازی ہونے والا ہے۔

حضرت علامہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ میں نے اپنے علاقے میں رائج فارسی کی کتابیں پانچ سال پڑھیں اور پھر پانچ سال عربی علوم کی تحصیل میں صرف ہوئے اس طرح کل مدت تعلیم دس برس ہوئی۔ مولانا مشیت اللہ صاحب بجنوریؒ جو آپ کے دوستوں اور تلامذہ میں سے ہیں، ان سے معلوم ہوا کہ حضرت علامہؒ صرف شب جمعہ کو پہلو پر لیٹتے، اس کے علاوہ تمام اوقات مطالعہ فرماتے اور جب نیند کا غلبہ ہوتا تو کچھ دیر کے لیے بیٹھے بیٹھے سو جاتے۔

یہ بھی فرماتے ہوئے سنا کہ: جس سال میں نے حضرت الاستاذ مولانا محمود حسن دیو بندی (متوفی:۱۳۳۹ھ) سے ''صحیح بخاری'' پڑھنے کا ارادہ کیا، اس سے پہلے والے رمضان ہی میں پوری ''عمدۃ القاری'' کا مطالعہ کرلیا تھا، پھر ''فتح الباری'' کا ''صحیح بخاری'' کے ساتھ سبقا سبقا مطالعہ کرتا، بسا اوقات ایک رات میں ایک جلد کا مطالعہ کرلیا کرتا، ایک مرتبہ طویل بیماری کے سبب سترہ روز تک اسباق میں حاضر نہ ہوسکا، صحت یابی کے بعد جب حاضر ہوا تو حضرت الاستاذ کا درس ابھی تک وہاں نہ پہنچا تھا، جہاں تک ''صحیح بخاری'' اور اس کی شرح ''فتح الباری'' کا مطالعہ کر چکا تھا۔ سبحان اللہ العظیم۔

یہ بھی فرماتے کہ: میں نے دیو بند میں حضرت شیخ الہندؒ سے ''ہدایہ آخرین''، ''صحیح البخاری''، ''ابوداؤد'' اور ''ترمذی'' پڑھی۔ اور حضرت مولانا محمد اسحاق کشمیری مہاجر مدنی (متوفی مدینہ منورہ:۱۳۲۲ھ) سے ''مسلم''، ''نسائی'' اور ''ابن ماجہ'' پڑھی۔

میں نے حضرت الاستاذ کی علمی زندگی پر ''نفحۃ العنبر فی حیاۃ الشیخ انور'' میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اسی طرح ''فیض الباری علی صحیح البخاری'' اور ''مشکلات القرآن'' کے مقدمے میں بھی آپ کی چند خصوصیات اور حالات زندگی کا تذکرہ کیا ہے؛ اس لئے یہاں انہی چند کلمات پر اکتفا کرتا ہوں۔

خدمات اور مصروفیات

آپ گم نام اور گوشہ نشین رہ کر یکسوئی کے ساتھ کتابوں کے مطالعہ میں مشغول رہنا پسند کرتے؛ لیکن بعض واقعات نے آپ کی طبعی خاموشی کو ختم کیا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ آپ کے صدیق محترم مولانا امین الدین دہلوی نے دہلی میں مدرسہ قائم کرنے کے سلسلے میں آپ سے مدد کی درخواست کی تو آپ نے بسر وچشم قبول کیا، مدرسہ ''امینیہ'' کے نام سے مدرسے کے قیام میں ان کی مدد کی۔ اور اس مدرسے کے اولین صدر مدرس ہوئے، بلکہ آپ نے سب سے پہلے ایثار و اخلاص کے ساتھ اپنی جیب سے اس مدرسے کو دس روپے بطور تعاون مرحمت فرمائے۔ چند سال تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد وطن مالوف کشمیر چلے گئے اور لوگوں کو وعظ ونصیحت، مسلمانان کشمیر میں پائی جانے والی بدعات وخرافات کو ختم کرنے اور تصحیح عقائد میں مشغول ہوگئے۔ اس زمانہ میں آپ گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ جا کر لوگوں کو کشمیری زبان میں وعظ ونصیحت کرتے۔ قابل ذکر ہے کہ آپ فصیح کشمیری بولتے اور لکھتے۔ آپ کا بیان کچھ اس پر سوز انداز میں ہوتا کہ سامعین مصروف آہ وبکا

ہو جاتے اور صراط مستقیم پر گامزن رہنے کا جذبہ پیدا ہو جاتا۔ پھر آپ نے ضروری سمجھا کہ موثر تبلیغ و تعلیم کے لئے مدرسہ کی ضرورت ہے؛ اس لئے بارہ مولا میں ''مدرسہ فیض عام'' کی بنیاد ڈالی، جہاں سے آپ نے کشمیر کے ماحول میں نمایاں اصلاح کی۔

۱۳۲۳ھ میں حج و زیارت کے ارادے سے حجاز مقدس کا سفر کیا اور چند ماہ قیام کر کے شیخ الاسلام عارف حکمت اللہ کی ذاتی لائبریری اور ''مکتبہ محمودیہ'' وغیرہ میں بہت سی نادر کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اسی سفر میں وہاں کے کبار علماء و مشائخ سے ملاقات ہوئی، جن پر آپ کا فضل و کمال واضح ہوا، ان میں ''رسالہ حمیدیہ'' کے مصنف اور سلطنت عثمانیہ کے مایۂ ناز عالم شیخ حسین بن محمد طرابلسی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ پھر کشمیر واپس ہو کر چند سال تدریس و افتاء کی خدمت انجام دیتے رہے، تین سال تک یگانۂ روزگار علماء کو فقہ و افتاء کا درس دیا، نت نئے مسائل اور ارباب فقہ و افتاء کے مابین اختلافی مسائل کی بابت بھی فتوے دیے؛ لیکن آپ کو فقہ کی کسی بھی کتاب کی مراجعت کی ضرورت نہیں پڑی (گویا کل کتابیں ازبر تھیں) یہ بات میں نے خود حضرت شیخ سے سنی۔

اس کے بعد ہجرت کے ارادہ سے حرمین کا قصد کیا، اس سفر میں اپنے شیخ حضرت شیخ الہندؒ سے ملاقات کے لیے دیوبند تشریف لائے۔ حضرت شیخ الہندؒ کو محسوس ہوا کہ ہندوستان اور خود علوم اسلامیہ کا مرکز عظیم ''دارالعلوم دیوبند'' آپ کے علوم و معارف سے استفادہ کا زیادہ مستحق ہے، چنانچہ آپ حضرت شیخ الہندؒ کے اصرار پر دیوبند میں قیام پر تیار ہو گئے۔ دیوبند میں پہلے استاذ حدیث ہوئے، پھر اپنے شیخ کے نائب اور جب ۱۳۳۱ھ میں حضرت شیخ الہندؒ حجاز مقدس کو روانہ ہونے لگے تو آپ کو صدر المدرسین بنا دیا گیا۔

دیوبند میں رہ کر حدیث کی امہات کتب اور صحاح ستہ کا درس کچھ اس انقلابی اور مجتہدانہ انداز میں شروع کیا کہ آپ مسند الہند جیسے القاب سے یاد کئے جانے لگے، پورے برصغیر میں آپ کی علمی صلاحیت کا ڈنکا بجنے لگا، جوق در جوق تشنگان علوم نبوی کے قافلے آپ کی خدمت میں آنے لگے اور بہت جلد آپ علماء و طلباء کے لئے مرجع بن گئے۔ آپ کا علمی وجود تدریسی طریقوں کی اصلاح اور پیچیدہ مسائل کے حل کرنے کا سبب بن گیا۔ آپ کے علوم کا بحر ذخار کچھ اس انداز سے بہتا کہ چہار جانب کی بنجر زمینوں کو سبزہ زار کر دیتا اور تشنگان علوم کو سیراب۔ الحاصل اپنے علمی سرمایہ سے خوب خوب فیض پہنچایا، بلکہ علمی ذخیروں اور نفیس مباحث پر حاوی اپنے حافظے کو طالبین کے لئے کھول دیا، لیکن افسوس کہ ۱۳۴۶ھ میں کچھ ایسے ناگفتہ بہ حالات پیش آئے کہ آپ صدارت تدریس کے منصب سے الگ ہو گئے۔

دیوبند سے علاحدگی کے بعد ہر طرف سے مخلصین وقدردانوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے یہاں تشریف لانے کے لئے اصرار کیا، جہاں گرانقدر مشاہرے تھے اور ہر قسم کے اعزاز۔ لیکن آپ سورت شہر سے قریب ''ڈابھیل'' نامی بستی تشریف لے گئے؛ جہاں آپ کے مبارک وجود سے مرکزی درسگاہ ''جامعہ اسلامیہ'' اور نشر واشاعت کا معیاری ادارہ: ''المجلس العلمی'' قائم ہوا، اور بہت سی علمی اور قیمتی کتابیں طبع ہوئیں۔

اب آپ کی مبارک زندگی تدریس وتالیف اور وعظ ونصیحت میں گذرنے لگی اور آپ کے نور سے وہ علاقے علم وعمل اور حدیث وسنت کی روشنی سے منور ہوگئے، اللہ تعالیٰ نے وہاں کے لوگوں کی آپ کے ذریعہ اصلاح کی، یہ آپ کی حیات طیبہ کا آخری دور رہا اور آپ پر رقت کا غلبہ۔ چنانچہ دوران وعظ ونصیحت خود بھی روتے اور دوسروں کو بھی رلاتے۔ آخری زندگی میں حقائق الٰہیہ کے متعدد مسائل پر خصوصی توجہ رہی مثلاً: روح کی حقیقت، تجلی کی حقیقت، برزخی زندگی کے احوال اور دیگر نادر علوم ومعارف، جو مجالس مواعظ اور اسباق میں بیان ہوتے، یہاں تک کہ دیوبند میں وقت مقرر آپہنچا اور ۳/صفر ۱۳۵۲ھ بہ مقام دیوبند دار الفناء سے دار البقاء روانہ ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ اپنی خصوصی رحمت کا فیضان فرمائے اور فردوس اعلیٰ میں مع الصالحین خصوصی مقام نصیب فرمائے۔ (آمین)

چند نمایاں خصوصیات اور علماء کے تأثرات

آپ نے ذاتی شرافت اور خاندانی عظمت کے ساتھ ساتھ نیک اور صالح والدین کے زیر سایہ بہترین تربیت پائی، ہندوستان کے سب سے معتدل علاقہ ''کشمیر'' کی صاف ستھری اور پاکیزہ فضا میں پلے بڑھے، من جانب اللہ تیز اور طباع طبیعت پائی، بزرگان دین کی دعاؤں کی برکات سے دولت بداماں ہوئے۔ آپ کو جانفشانی کی دائمی توفیق، مسلسل محنت، عمدہ صحت، روشن عقل اور غضب کے حافظے کے ساتھ بلند پایہ نیک سیرت اور یگانۂ روزگار اساتذہ سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا۔ بسبب توفیق الٰہی اپنے تمام معاصرین میں علم، دین، تقویٰ، پرہیزگاری، حدیث، فقہ، ادب، تاریخ، کلام اور فلسفہ میں یکتائے روزگار ہوئے، مشکلات کے سمندر میں غواصی کرکے گوہر نایاب نکال لیتے اور مسائل کہ تہہ تک پہنچ جاتے، مطالعے میں بیحد انہماک تھا، فکر بھی علم ودانش کی پگڈنڈیوں پر رواں رہتا، خاموشی، خاص عادت تھی۔ اگر کوئی علمی مسئلہ پوچھتا تو رخ انور پھول کی طرح کھل جاتا اور محسوس ہوتا کہ ایک علم وآگہی کا سیل رواں یا بحر ذخار تلاطم پذیر ہے۔ تقویٰ کی نورانیت کے ساتھ نہایت خوب رو اور خوش شکل تھے۔ القصہ مختصر کہ خدا تعالیٰ نے سیرت وکردار اور اعلیٰ اخلاق کے ساتھ

جمال صورت کا ایک شاہکار بنایا تھا جس کی وجہ سے آپ کی عظمت دل و آنکھ میں بیٹھ جاتی۔ اس وقت جہانِ علم میں کم از کم میرا یقین ہے کہ آپ سے زیادہ کمال و جمال اور شرافت و عظمت کی خوبیوں کا جامع کوئی نہیں تھا۔

حکیم الامت حضرت تھانوی علیہ الرحمہ آپ کے بارے میں فرماتے کہ:

''امت مسلمہ میں آپ کا وجود اس بات کی نشانی ہے کہ اسلام دین برحق ہے''۔

میں نے یہ بات حضرت الاستاذ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ سے سنی، بعد ازاں حضرت تھانویؒ کے خلیفۂ اکبر مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری سے بھی، لیکن سب سے پہلے یہ بات سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم سے احقر نے سنی تھی۔

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم سادس مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ نے فرمایا کہ:

''آپ زمین پر چلتے پھرتے کتب خانہ ہیں''۔

نیز یہ کہ:

''آپ ثقہ، نیک، متقی، حافظ، حجہ، مفسر، محدث، علوم عقلیہ ونقلیہ کے بحر ناپید کنار اور مشکل ترین مسائل میں تحقیق کے امام ہیں''۔

علامہ سید سلیمان صاحب ندویؒ فرماتے کہ:

''آپ کی مثال اس سمندر جیسی ہے جس کی اوپر کی سطح پرسکون ہو اور گہرائیاں گراں قدر موتیوں سے لبریز''۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ آپ کے متعلق فرماتے کہ:

''آپ اپنی مثال آپ تھے، آپ کا کوئی ہم سر نہ تھا، بقیۃ السلف، حجۃ الخلف، بحر مواج اور سراج وہاج تھے، موجودہ زمانے میں نہ دوسروں کی آنکھوں نے ان کی نظیر دیکھی اور نہ خود انہوں نے''۔

یہ بھی کہ:

''ماہرین فن، اور ناقدین انہیں'' آیۃ من ایات اللہ '' کہتے ہیں، اور یہ کہ: ''وہ پورے عالم پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک حجت ہیں''۔

مولانا رحیم اللہ صاحب بجنوریؒ تلمیذ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی جب حضرت شاہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو فرمایا کہ:

''آپ ہمہ جہت کامل العلم محقق اور مدقق ہیں، بلکہ موجودہ صدی کے لئے مایۂ افتخار''۔

مناظر اسلام مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری کے الفاظ میں:

''آپ شیخ الاسلام والمسلمین ہیں، اور دین ودانش کے مختلف سمندوں کے سنگم''۔

مفتی اعظم ہند مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلویؒ نے ارشاد فرمایا کہ:

''علامہ صاحب فضل وکمال، اصحاب فضل وکمال میں سب سے فائق، محقق بے بدل، رواں دواں سمندر، وقت کے مرجع اور نمونہ، استاذوں کے استاذ، محققین کے سردار، یگانہ محدث، باکمال مفسر، قابل تقلید فقیہ اور علوم عقلیہ ونقلیہ کے ماہر تھے''۔

نامور محقق شیخ الاسلام علامہ زاہد حسن کوثریؒ ''تانیب الخطیب'' ص:۸۴، میں آپ کی تحقیق نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''العلامة الحبر البحر محمد انور شاه الكشميری''

''یعنی ایسا عالم جو تمام ہی علوم کا ایک بحر ناپید کنار ہے''۔

مشہور عالم اور متکلم اسلام شیخ الاسلام مصطفیٰ صبری ترکی مقیم قاہرہ اپنی کتاب ''موقف العلم و العقل و الدین'' ج:۳، ص:۳۲۷، میں آپ کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''میں نے ہندوستان کے ایک بڑے عالم محمد انور شاہ کشمیری کی کتاب ''مرقاۃ الطارم علی حدوث العالم'' میں ان کی رائے اس مسئلے میں یہ دیکھی (پھر تفصیل سے عبارت نقل کی) اس کے بعد فرمایا: ''مجھے خوشی ہے کہ ہم دونوں اس مسئلے میں ہم رائے ہیں''۔

احقر نے مذکورہ کتاب ''مرقاۃ الطارم'' مرحوم کو مصر میں انکی رہائش گاہ پر ۱۳۵۷ھ میں پیش کی تھی، مطالعے کے بعد فرمایا تھا:

''میں نہیں سمجھتا تھا کہ ہندوستان میں کوئی ایسا محقق ہوگا، میرے نزدیک یہ کتاب صدر الدین شیرازی کی ''الاسفار الاربعہ'' سے کہیں بہتر ہے''۔

۱۳۵۷ھ میں شیخ الاسلام علامہ زاہد کوثریؒ سے قاہرہ کے محلہ ''عباسیہ'' میں ان کی رہائش گاہ پر ایک ذاتی ملاقات میں سنا کہ:

''محقق ابن ہمام کے بعد علامہ مرحوم جیسا کوئی نہیں ہوا، جو احادیث میں پنہاں انوکھے مباحث اجاگر کرتا ہو''۔

پھر خود ہی فرمایا ''حالانکہ دونوں کے مابین طویل زمانہ ہے''۔

آپ کے استاذ حضرت شیخ الہندؒ نے اجازت حدیث دیتے ہوئے سند پر آپ کی بابت لکھا:

''انہیں من جانب اللہ روشن سوجھ بوجھ، اصابت رائے، پاکیزہ طبیعت اور پسندیدہ اخلاق عطا ہوئے ہیں''۔

مولانا سجاد حسین صاحب بہاریؒ نے آپ کا تذکرہ بایں الفاظ کیا ہے:

''وقت کے علامہ، اعلیٰ فہم کے مالک، زمانے کے فقیہ، وقت کے محدث، روایت حدیث کی بابت ثقہ، درایت حدیث میں حجت، علمائے وقت کے شیخ......الخ''۔

جب علامہؒ جوانی میں خداداد شہرت سے پہلے شیخ حسین بن احمد طرابلسیؒ سے مدینہ منورہ میں ملے تو شیخ نے آپ کو ''الشیخ الفاضل'' کا خطاب دیا۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے علماء وارباب فضل وکمال کی قیمتی آراء اور تأثرات آپ کی بابت موجود ہیں۔ گذشتہ سطور میں جو کچھ سپرد قلم کیا گیا وہ ''مشتے نمونہ از خروارے'' کی حیثیت رکھتا ہے۔

الغرض آپ کے معاصرین، مشائخ یا مشائخ کے ہم رتبہ علماء کی جانب سے آپ کے فضل وکمال کا اعتراف دلیل ہے کہ آپ ایسے بلند مقام پر ہیں، جہاں تک اس زمانے کے ارباب فضل وکمال کی رسائی نہیں، اور یہ کہ آپ ان یگانۂ روزگار، جامع کمالات علماء میں سے ہیں، جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ کی منفرد شخصیت میں گوناگوں خوبیاں ودیعت کردی تھیں: حسن صورت، حسن سیرت، خوش اخلاقی، پرہیزگاری، زہد وتقویٰ، مصائب وآلام پر صبر، پاکیزہ ماحول میں پاکیزہ تربیت، پھر جملہ علوم میں جامعیت، بصیرت کے ساتھ روایت ودرایت، شب وروز مطالعہ میں انہماک، غیر معمولی حافظہ، ہر مسئلہ کی تحقیق کا والہانہ جذبہ، متعدد علوم میں اختصاص کے حامل، نیک سیرت اور اصحاب بصیرت اساتذہ کی خدمت میں تلمذ: یہ امور کسی ایسی ہی شخصیت میں یکجا ہوسکتے ہیں، جس کے متعلق مشیت ازلی نے امت کا امام اور پیشوا ہونا مقدر کردیا ہو اور جو شاعر کے اس شعر کا مصداق ہو: ؎

لکل زمان واحد یقتدیٰ بہ   وھذا زمان انت لاشک واحدہ

''ہر زمانے میں کوئی ایک ایسا ہوتا ہے جس کی اقتدا کی جائے اور یقیناً اس زمانے کے وہ واحد تم ہو''۔



عقیدۃ الاسلام

اور دیگر تصانیف

اپنی یادداشت میں خاص باتوں اور اپنے متفرق خیالات کو نوٹ کرنے کے علاوہ باقاعدہ تصنیف و تالیف، حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذاق اور طبیعت سے ہم آہنگ نہیں تھی، ہاں اگر کسی خاص موضوع پر کچھ لکھنے کی ضرورت پڑی، خواہ کسی علمی و دینی مسئلے کی تحقیق ہو یا اہل علم کے اختلافات اور ایسے مسئلے سے نقاب کشائی جس میں حق وصواب کی راہ تاریک ہوگئی ہو، تو اس سے بھی بے توجہی نہیں کی، چنانچہ آپ کی جملہ تصانیف اسی قبیل سے ہیں۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں، تاہم احقر نے ''نفحۃ العنبر'' (عربی) اور برادر گرامی صاحب زادہ مولانا ازہر شاہ قیصر صاحب نے ''حیات انور'' (اردو) میں اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔

جب برصغیر میں فتنۂ قادیانیت نے سر اٹھایا [یہ فرقہ پنجاب کے ضلع گورداس پور میں ''قادیان'' نامی ایک گاؤں کی طرف منسوب ہے] اور اس کے بانی مرزا غلام احمد قادیانی نے مختلف مراحل میں متعدد دعاوی کئے: پہلے اس نے مجدد، پھر مثیل مسیح، مہدی آخر الزماں، ترقی کرتے ہوئے آسمان سے نزول فرمانے والے مسیح موعود ہونے کا اعلان، آخر میں یہ کہ میں خود نبی و رسول ہوں، بلکہ میرے اوپر وحی آتی ہے، اسی کے ساتھ جہاد اور حج کو منسوخ کیا اور یہ بھی دعویٰ کیا کہ حکومت برطانیہ رحمت الٰہی ہے، آیاتِ قرآنیہ کا ازراہِ تحریف خود کو مصداق بتایا، قرآن کریم کی تشریح وتفسیر فرقۂ باطنیہ وزنادقہ کے طرز پر کی اور اکثر امور میں بابیہ و بہائیہ فرقوں کے نقش قدم پر چلا۔ اور اس کی پوری کوشش کہ عوام اس کی حقیقت سے واقف نہ ہوں اسی وجہ سے ایسے مسائل اٹھائے جن کا اس کے موضوع سے دور کا بھی تعلق نہ تھا مثلاً: عیسیٰ علیہ السلام وفات پاچکے، وہ آسمان سے نہیں اتریں گے۔ اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کے لئے احادیث میں تاویل، آیات قرآنیہ میں تحریف اور ان کی مراد ومنشاء کو مسخ کرنے لگا۔ اس کے اس انداز نے دین میں بڑی مصیبتوں اور آفات کا سامان کردیا اور خود کفر والحاد کی وادی میں داخل ہوگیا، جیسا کہ احقر نے ''نفحۃ العنبر'' میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے بلکہ حضرت علامہ نے اسی کتاب ''عقیدۃ الاسلام'' کے پیش لفظ میں اس کا تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ چنانچہ اس کے حوارین بھی تیار ہوگئے، یہ

فتنہ برطانوی حکومت کے زیر سایہ پروان چڑھا اور برطانیہ نے اس کے کفریہ دعاوی سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے عقائد فاسد کرنے میں بڑا کام لیا۔ بلکہ اپنے ذرائع سے اس ہفوات کو عام کیا۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ فتنہ برطانوی سیاست کی پیداوار اور اسکا پروردہ ہے، جسے اپنے زیر سایہ بتدریج آگے بڑھایا۔

چوں کہ اس ملک میں اسلامی حکومت نہ تھی، جو اس فتنے کی سرکوبی کرتی؛ اس لئے یہ ذمہ داری علمائے اسلام پر آگئی کہ وہ اس کی ہر خباثت کا رد کرنے، اسلام اور مسلمانوں کے عقائد کا تحفظ، ملت بیضاء کی حفاظت اور اپنے فرض منصبی کی ادائیگی کے لئے سرگرم ہوں، الحمد للہ علماء نے ایسی کاوش کیکہ اس کے ہر دعوے کے خلاف کتب ورسائل کے انبار لگ گئے۔ اس فتنے نے شاہ صاحب کو بھی جھنجھوڑ دیا چناں چہ آپ اس کے استیصال کے لئے کمربستہ ہوگئے، تحریر وتقریر اور تلقین وتنبیہ ہر طرح سے اس کا رد کیا۔ تالیفات میں نادر ونایاب تحقیقات پیش کیں، آیات قرآنیہ کی تفسیر کے ضمن میں عربی علوم کے دقیق مباحث زیر قلم آئے اور موضوع سے متعلق احادیث وروایات کو ایسے مآخذ ومصادر سے؛ جن پر عموماً اہل علم کی نظر نہیں جایا کرتی، سمیٹ کر ایک جگہ جمع کر دیا جو تردید باطل کے لئے بہترین مسالہ ہے۔

"التصریح بما تواتر فی نزول المسیح". کے نام سے متعلقہ احادیث پر ایک رسالہ تالیف فرمایا، جو موضوع پر بے مثال ہے۔ اسی طرح ضروریات دین کے انکار پر تکفیر کے متعلق بھی ("اکفار الملحدین" کے نام سے) مستقل تصنیف کی۔ جس میں آپ نے چھوٹی بڑی اور مطبوع وغیر مطبوع ایک سو کتابوں سے اکابر امت کی تصریحات جمع کر دیں۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے یہ تصنیف فرما کر امت پر عظیم احسان کیا۔ اس میں آپ نے مدارنجات اور ایمان وکفر کے معیار، ایسے پیچیدہ مباحث پر سیر حاصل بحث کی، جو اہل علم کے لیے مدتوں پریشانی کا باعث رہے۔

ان مباحث کو قرآنی آیات، احادیث وآثار اور اب تک کے فائق فقہاء، متکلمین، محدثین اور مفسرین کی تصریحات سے مدلل کیا۔ پھر اس تصنیف کو اپنے ہم عصر محققین واکابر علمائے اسلام کے سامنے پیش کیا، ہر ایک نے اس پر تقریظ لکھی اس کاوش کو سراہا اور نگارشات سے مکمل اتفاق کیا۔ یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ مدارنجات اور مسئلۂ تکفیر کی بابت علماء کا اتفاق سامنے آجائے مرکزی نقطۂ بحث یہ ہے کہ ضروریات دین کا انکار، یا تاویل ہر دو کفر ہیں۔ بہر حال یہ کتاب اپنے موضوع پر جامع اور اہم تصنیف ہے، اس میں ان الجھے ہوئے مسائل کا حل ہے جو مدتوں علماء کے لیے ناقابل حل رہے۔

آیت کریمہ: "وَمَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ"

کی تفسیر کے لئے آپ نے (''خاتم النبیین'' نامی) فارسی میں ایک رسالہ تصنیف فرمایا، جو آپ کی بیش قیمت آراء اور وہبی خصوصیات کا مرقع ہے۔

حیات عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق زیر نظر ''عقیدة الاسلام فی حیاة عیسی علیه السلام'' مبسوط کتاب لکھی، پھر اس پر بہ عنوان ''تحیة الاسلام'' گراں قدر حاشیے کا اضافہ کیا، گویا کہ قادیانیت سے متعلق حضرت کی یہ کل پانچ کتابیں ہیں۔ میرے اس مقدمے کا مقصد آپ کی اسی آخری تصنیف کی خصوصیات پر ایک نظر ڈالنا ہے۔

حضرت نے ''عقیدة الاسلام'' کا ایک دوسرا نام ''حیاة المسیح بمتن القرآن والحدیث الصحیح'' بھی رکھا ہے اور اس کی بابت خود مجھ سے فرمایا کہ:

''میری اس کتاب کا موضوع حیات عیسیٰ علیہ السلام کو صرف قرآنی آیات سے مدلل کرنا ہے احادیث وآثار کا ذکر آیات کی تفسیر میں ضمناً آگیا ہے''۔

یہ خیال صحیح نہ ہوگا کہ صاحب کتاب نے متعلقہ تمام آیات وروایات جمع کردی ہیں، احادیث کا استیعاب حضرت الاستاذ نے ''التصریح'' میں کیا ہے، البتہ حضرت کا یہ طریقہ تھا کہ وہ موضوع سے متعلق بیش قیمت تصریحات اور تحقیقات بھی پیش فرماتے۔

حضرت الاستاذ علوم عربیہ میں امام تھے، بے تکلف آپ کو سیبویہ اور خلیل کہا جاسکتا ہے، بلکہ یہ تعبیر مناسب ترین اور آپ کی علمی حیثیت کے اظہار کے لیے زیادہ موزوں ہے، جس سے بہت سے اہل علم وارباب فضل نا آشنا ہیں، اپنی تصانیف میں بلاغت ومعانی، صرف ونحو کے ایسے دقیق مسائل بیان کیے ہیں کہ ان علوم میں آپ کی دسترس، نادر ذوق اور منفرد تحقیقات کو دیکھ کر، عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ جب بھی حضرت الاستاذ کی کسی تصنیف کا مطالعہ کرتا ہوں تو حیرت واستعجاب میں اضافہ ہی ہوتا ہے کہ زیر بحث موضوع سے متعلق تمام مباحث ایسے مقامات سے کیوں کر حاصل کئے، جن کی ان مواقع پر ہونے کا وہم وخیال بھی نہیں ہوتا۔ اگر میں آپ کے بارے میں وہ شعر پڑھوں جو امام غزالی پڑھا کرتے تھے تو صحیح ہوگا:

ونادتنی الاشواق مهلا فهذه	منازل من تهوی رویدک فانزل
غزلت لهم غزلا رقیقا فلم اجد	لغزلی نساجا فکسرت مغزلی

''وفور شوق نے مجھے پکارا کہ ٹھہر، یہ تمہارے محبوب کا دیار ہے، آگے نہ بڑھ، یہیں فروکش ہو، میں نے ان کے لئے باریک سوت کاتا، لیکن اس کا کوئی بننے والا ہی نہ پاکر میں نے اپنا تکلا ہی توڑ دیا''۔

اور بجا طور پر آپ کی یہ نسبت کہا جا سکتا ہے: ؎

ولو ان ثوبا حیک من نسج تسعة وعشرین حرفا من علاه قصیر

''اگر انتیس حروف کے دھاگے سے (یعنی کائنات کے سارے دھاگوں سے) کوئی کپڑا بن دیا جائے تو اس کے جسم پر چھوٹا ہی معلوم ہوگا''۔

کوئی بھی صاحب بصیرت ناقد کسی موضوع پر آپ کی کوئی تصنیف دیکھے تو یہ کہنے پر مجبور ہوگا: ؎

فالقی عصاه واستقربه النوی کما قر عینا بالایاب المسافر

''وہیں لاٹھی ڈال دی اور دوری نے اس کو وہیں ٹھہرا دیا، جس طرح کہ واپس ہونے سے مسافر کی آنکھ ٹھنڈی ہوتی ہے''۔

یا پھر یہ شعر اس کی زبان پر ہوگا: ؎

هل غادر الشعراء من متردم ام قد عرفت الدار بعد توهم

''کیا شعراء نے کوئی کھنڈر چھوڑ دیا ہے، یا میں نے ہی بڑے غور و فکر کے بعد دیار محبوب کا سراغ لگا لیا''۔

علامہ کوثری رحمہ اللہ نے اپنے مقالات، ص:۳۵۴ میں لکھا ہے کہ ''عقیدة الاسلام فی حیاة عیسی علیہ السلام'' میں علامہ کشمیری نے اس موضوع سے متعلق اہل حق کے عقیدے پر قرآنی دلائل شرح وسط کے ساتھ ذکر کئے ہیں، اس موضوع پر کسی نادر تالیف کے لئے علامہ مرحوم کی یہ تالیف معرکہ کی چیز ثابت ہوگی۔

میں نے کتاب ہذا اور اس کی بیش قیمت تعلیقات کے مآخذ و مصادر کو شمار کیا تو جن تصانیف سے حضرت الاستاذ نے براہ راست اخذ و اقتباس کیا، یا ان کا حوالہ دیا ان کی تعداد تین سو تک پہنچ گئی۔ آپ کو ہر بحث کا خواہ وہ ذیلاً ہو حوالہ ضرور ملے گا، محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی حیات مستعار انہیں مقاصد کے لئے وقف کر دی تھی؛ جہاں اناجیل اربعہ، بائبل اور اس کی شروحات سے استفادے اور فاسد نظریے کی تردید کا موقع آتا ہے تو وہیں ہر کتاب کا حوالہ اور اس کے متعلقہ استنباطات ضرور مل جاتے ہیں۔

حیرت انگیز یہ ہے کہ اگر کسی کتاب میں موضوع سے متعلق امور منتشر ہوں، خواہ وہ کتاب کئی جلدوں میں ہو حضرت الاستاذ ان سب کو ایسا یکجا کر دیتے ہیں کہ کسی کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑتے مثلاً: علامہ وجدی اور علامہ بستانی کی ''دائرة المعارف'' کو لیجئے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ دونوں کتابیں ایک کھلے صفحے کی شکل میں آپ کے سامنے ہیں، آپ نے ان کا بھرپور مطالعہ کر لیا ہے اور جب کوئی کام کی بات ملتی ہے تو اسے نقل کرتے ہیں یا اس کا حوالہ دیتے ہیں، اسی طرح ''فتح الباری''، ''فتوحات مکیہ'' بلکہ دیگر ضخیم

کتب سے بھی بیش قیمت اور نادر اقتباسات پیش کیے، جن کا بظاہر موضوع سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا۔

الحاصل زیر بحث موضوع سے اگر کسی بات کا قریبی یا دور کا تعلق ہوتا ہے، حضرت الاستاذ اسے ضرور بیان کرتے ہیں، قاری اس بے مثال تبحر علمی، حیرت انگیز دسترس، انتہائی ذکاوت و فطانت اور بحث و تحقیق میں اس بے نظیر جانفشانی سے انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ ان سب پر وہ بے مثال حافظہ مستزاد ہے، جس میں ہر چیز ہمیشہ کے لئے محفوظ ہے۔ واقعی قابل تعریف وہ ہے جو اپنی خاص رحمت و فضل سے جسے چاہتا ہے نوازتا ہے: ''واللہ ذو الفضل العظیم''۔

اعتراف و تسلیم میں ایسے کشادہ کہ اگر کسی معاصر کی کوئی بات باوزن محسوس ہوئی تو اس کی افادیت اور نفیس تحقیق کی دل بھر کر تعریف کرتے ہیں [خوف طوالت کی بناء پر مزید خصوصیات نظر انداز کی جارہی ہیں] اب کتاب اہل نظر و بصیرت کے سامنے ہے، اگر انہوں نے غور و فکر کیا تو خود ان حقیقتوں کا اندازہ کرلیں گے۔

علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اپنے تفسیری فوائد میں ارشاد باری: ''اِنِّـی مُتَوَفِّیکَ وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ'' کے تحت لکھتے ہیں:

> ''میں اہل علم کو متوجہ کرتا ہوں کہ مخدوم علامہ فقید النظیر حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری اطال اللہ بقاءہ نے رسالہ ''عقیدۃ الاسلام'' میں جو علمی لعل و جواہر ودیعت کیے ہیں، ان سے بہرہ ور ہونے کی ہمت کریں، میری نظر میں ایسی جامع کتاب اس موضوع پر نہیں لکھی گئی''۔

اور ''فتح الملھم'' ج:۱، ص:۳۲۰ ر میں رقم طراز ہیں:

> ''علامہ نے اپنی کتاب ''عقیدۃ الاسلام'' میں لفظ ''توفی'' اور حیات عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق دیگر مباحث کی ایسی تحقیق کی ہے، جس سے زائد ممکن نہیں، ''فلیراجع''۔

یہی وجہ ہے کہ علامہ محقق شیخ محمد زاہد کوثریؒ ''عقیدۃ الاسلام'' نیز ''التصریح بما تواتر فی نزول المسیح'' کے بڑے مداح تھے۔ ''التصریح'' ان کی ضائع ہوگئی تو قاہرہ سے گرامی نامہ ارسال کیا اور دوبارہ مجھ سے طلب کی، وہ اپنے مقالات، ص:۲۵۵ ر میں لکھتے ہیں:

> ''علامہ کشمیری کی ایک کتاب ''التصریح'' ہے، جس میں مرحوم نے نزول عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق ستر حدیثیں ذکر کی ہیں''۔

اور ص:۳۵۹ ر پر لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ فقیہ اسلام، محدث باکمال علامہ محمد انور شاہ کشمیری کو جنت کے بالا خانوں میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے اور حریم اسلام کا دفاع کرنے پر پوری جزا دے کہ انہوں نے اپنے ٹھوس دلائل سے قادیانیت کا قلع قمع کر دیا، ان کے رد میں مختلف زبانوں میں مفید کتابیں لکھ کر ان کے دونوں گروہوں یعنی قادیانی و لاہوری کے فتنوں کا سد باب کیا اور ''اکفار الملحدین'' میں ان جیسوں کی تکفیر کا مسئلہ تحقیق کے ساتھ ہمیشہ کے لئے واضح کر دیا''۔

حضرت الاستاذ نے موقع و مناسبت سے کچھ اہم و نادر مباحث و مسائل بھی بیان کیے مثلاً: یاجوج و ماجوج کی تعیین، ذوالقرنین اور سد ذوالقرنین کی تحقیق وغیرہ، یہ اس تصنیف کا امتیازی مضمون ہے، کنایہ کی تحقیق بھی کہ یہ حقیقت ہے یا مجاز: جس کا شمار علم بلاغت کے اہم مسائل میں ہے، چنانچہ اس بحث کے ذیل میں اس فن کی امہات کتب اور اساطین علم کی بیش قیمت تصریحات ملیں گی۔ بلکہ اناجیل و بائبل سے سید المرسلین خاتم الانبیاء کی آمد اور سیادت کی بشارت کی تحقیق بھی پیش کی گئی ہے۔

عالم اور حدوث عالم سے متعلق گفتگو اور یہ کہ کائنات کی بابت علت و معلول کی بات صحیح نہیں ہے، بلکہ اس میں سبب و مسبب اور شرط و مشروط کا تعلق ہے، اسے مدلل کیا گیا کہ کائنات اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے۔ کائنات اور اس کے صانع کے درمیان وہی رابطہ ہے جو کسی فاعل کا اپنے فعل سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس وقت بھی تھا جب کچھ بھی نہیں تھا۔ معراج سے متعلق آپ کا ایک قصیدہ بھی ہے، جس میں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دیدار الٰہی ثابت کیا گیا۔ شب معراج میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اعمال کا پیش ہونا بھی بتایا گیا، یہ پیشی اجمالی تھی تفصیلی نہیں، جس طرح ملائکہ کے سامنے کچھ اشیاء پیش کر کے ان کے نام دریافت کئے گئے تھے۔ اہم مباحث میں آیت ختم نبوت کی تفسیری بحث بھی ہے، جس میں آپ نے خصائص نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر اپنی فارسی تصنیف ''خاتم النبیین'' کے تفصیلی مضامین کا سلیس خلاصہ پیش کیا ہے۔

''عقیدۃ الاسلام'' کا اصل موضوع قرب قیامت نزول عیسیٰ علیہ السلام کو ثابت کرنا ہے، جو امت کا اجماعی عقیدہ ہے۔ قادیانی مرزا غلام احمد کے دعاوی میں اس اجماعی عقیدے کا انکار ہے۔ اس نے صراحت کی ہے کہ: مسیح علیہ السلام آسمان سے نازل نہیں ہوں گے؛ بلکہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ مصلوب ہو کر وفات پا چکے ہیں۔ یہ بھی کہتا ہے کہ: ان کا بن باپ پیدا ہونا ثابت نہیں، وہ تو یوسف نامی شخص کے فرزند تھے، اس کے علاوہ اور بھی من گھڑت باتیں کہیں۔ ظلم یہ ہے کہ اس ملعون نے عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق غلیظ سب و شتم اور وہ اہانت آمیز ہفوات کیں جن سے صاحب ایمان کانپ اٹھتا ہے، اس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق اس کے کفر و الحاد کے متعدد اسباب جمع ہو گئے، اگر دوسرے اسباب کفر سے ہم صرف نظر کریں، چونکہ انبیاء علیہم

السلام کی قصداً توہین کھلا کفر ہے، مثلاً: دعوائے نبوت و رسالت، صاحب شریعت ہونا، نصوص کی تحریف، ضروریات دین کا انکار، عقیدۂ ختم نبوت کا نہ ماننا۔ تمام انبیاء و رسل، نیز سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی افضلیت کا اعلان، معجزات کا دعویٰ، تمام انبیاء کے معجزات پر اپنے معجزات کی برتری کا اظہار اور بہت سی آیات قرآنیہ کی خود پر تطبیق وغیرہ۔ ان امور کے نتیجہ میں اس کا کفر واضح ہے۔ لیکن اس عیار نے اپنے کفریات والحاد کی پردہ پوشی کے لئے دوسرے مسائل چھیڑ دیے، اور صدیوں سے منقول امت محمدیہ کے عقائد میں کفر آمیز تاویلات کرنے لگا، تاکہ سادہ لوح عوام کو اپنی ملمع سازی کے سبب، اسلامی عقائد سے دور کردے اور علماء کو علمی مسائل میں الجھا کر خود کو ان کی تیر افگنی سے محفوظ کرلے، یہی مکار ملحدین کا ہمیشہ طریقۂ کار رہا ہے۔

یہ سب کچھ دیکھ کر صداقت و سچائی کے حامل علماء، دین و عقیدے کی حفاظت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، ان علماء میں ''عقیدۃ الاسلام'' کے مصنف حضرت الاستاذ علامہ کشمیری کی ذات گرامی سب سے نمایاں ہے، آپ نے عقیدۂ نزول مسیح و حیات مسیح علیہ السلام سے متعلق مستقل تصنیف فرمائی، جس میں نزول عیسیٰ علیہ السلام کی بابت قرآنی دلائل، احادیث متواترہ، عہد صحابہ سے لے کر آج تک کے علمائے امت کا اجماع، تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف کے ائمہ کی تصریحات سے ناقابل تردید ثبوت پیش کیے، عقیدۂ نزول عیسیٰ علیہ السلام کا ضروریات دین سے ہونا، اللہ تعالیٰ کی خوارق عادت امور پر قدرت کاملہ اور قرب قیامت نزول عیسیٰ علیہ السلام کے واقع ہونے پر بھی مدلل گفتگو کی۔ چنانچہ ''تحیۃ الاسلام'' میں فرماتے ہیں:

''واضح رہے کہ دنیا میں بھی آخرت کے کچھ نمونے ہیں''۔

مزید فرمایا:

''کہ قرب قیامت تو بہت سے خلاف عادت واقعات ہوں گے چوں کہ بفحوائے حدیث ''انا حجیجہ'' نبوت دجل و تلبیس کے سد باب کے لئے ہوتی ہے، اسی لئے عیسیٰ علیہ السلام دجال سے مقابلے کے لئے نزول فرمائیں گے اور اس طرح دنیا میں آخرت کے کچھ نمونے وقوع پذیر ہوسکتے ہیں، پھر ان معجزات کو بعید از عقل سمجھنے کا کیا تک، اور ان کی علامات کا انکار کیوں کر ممکن، جب دنیا میں دجل و فریب، جادوگری، شعبدہ بازی اور اس جیسے پُر فریب امور ہوتے رہیں گے تو ان کے توڑ کے لئے حسی معجزات کا وجود بھی ضروری ہے، یہی سنت اللہ ہے۔ جب دجال دجل و تلبیس کے لیے اپنا نام مسیح رکھے گا تو ضروری ہوگا کہ سچے مسیح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھی نزول ہو۔ پھر یہ بھی ہے کہ عیسیٰ روح اللہ ہیں اور قدرت الٰہی کا ایک نمونہ، تو ان کی درازی عمر سنت اللہ کے مطابق ہے''۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی سنت یہ رہی ہے کہ وہ ہر زمانے میں اتمام حجت کی خاطر کوئی نہ کوئی نبی بھیجتا ہے، جن کے ہاتھوں خوارق و معجزات کا ظہور ہوتا ہے؛ تاکہ دنیا کو یہ پیغام پہنچ سکے کہ یہ دنیاوی اسباب و وسائل کتنی ہی حیرت انگیز ترقی کیوں نہ کر جائیں، مگر ایک ایسی قادر اور باختیار ہستی بھی ہے جس کی قدرت ہر قدرت سے اعلی اور جس کی قوت ہر قوت سے بالا ہے۔ جب مادیات کا عروج ہوگا اور فکر و نظر کو لرزہ براندام کرنے والی قدرت کی انوکھی چیزوں کا اس کائنات میں ظہور ہوگا، تحیر خیز اشیاء کے موجدین ان فطری اسباب و وسائل اور حیرت انگیز ترقی کو خدائی طاقت اور معجزات کے انکار کا ذریعہ بنائیں گے، مادی ترقی کا یہ عروج قوانین ربانی کے شدید مخالف دجال کو جنم دے گا اور اپنی مصنوعی قدرت کے عجائبات پیش کر کے دنیا کو دین اور توحید سے گمراہ کرے گا [جیسا کہ احادیث میں اس کی تفصیل ہے] ایسے نازک وقت میں عیسی علیہ السلام کا نزول ہوگا اور آپ سے ایسے معجزات رونما ہوں گے جس سے عقلیں حیرت زدہ اور سائنس داں انگشت بدنداں ہوں گے، یوں پھر دنیا میں اللہ تعالیٰ کی حجت تام کریں گے، جس طرح اپنی ابتدائی زندگی میں بمشیت ایزدی، احیائے موتی، جذام اور برص کے مریضوں کو شفا دے کر؛ تام کی تھی۔ یہ وہ شفائی معجزات تھے جن سے اس وقت کے حاذق اطباء مبہوت تھے۔ ایسے ہی نزول کے وقت بھی بہ اذن الٰہی اتمام حجت کریں گے، تاکہ محیر العقول عجائبات یا سائنس دانوں کی مادی حیرت انگیز ترقیات مثلاً: فضاء میں اڑنا، مہلک اور خطرناک ہتھیاروں کی تیاری، حیرت ناک بری و بحری طاقت اور اس کے ذریعہ بحر و بر میں فساد برپا کرنے کی صلاحیت؛ پر ایمان لا کر اپنا دین و ایمان ضائع کرنے والوں کی گردنیں خم ہوں، اس وقت سائنس دانوں کی ترقیات کے مقابلے کے لئے مسیح علیہ السلام کے ذریعے حسی معجزات ظاہر ہوں گے تاکہ منکرین بھی ایمان لے آئیں۔

معجزات میں یہ اشارہ ہوتا ہے کہ سائنس اور ماہرین طبعیات، مادی اسباب و وسائل کے دائرے میں رہ کر عجائبات کی ایجاد میں کتنی ترقی کر سکتے ہیں۔ حضرت علامہؒ نے اپنے قصیدہ حدوث عالم میں مندرجہ ذیل مصرع سے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

فذلک اعجاز وخرق للعادة　　　وان کان کل الکون إعجاز منتهی

وقد قیل: المعجزات تقدم　　　بما یرتقی فیه الخلیقة فی مدی

''وہ ایک اعجاز اور خلاف عادت امر کا ظہور ہے، اگر چہ پوری کائنات ایک اعجاز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ معجزات، انسانی ترقی کے عروج کی انتہا کی عکاسی کرتے ہیں''۔

چناں چہ آج الکٹرانک آلات، ٹیلی فون، ٹیلی گراف، ٹیلی ویژن اور بمبار طیاروں وغیرہ میں جو کچھ ترقیات ہمیں نظر آتی ہیں، ان سب کی نظیر آپ کو انبیاء علیہم السلام کے معجزات میں کسی مادی سبب اور قدرتی ذریعے، نیز سابقہ نظیر کے بغیر ضرور ملے گی۔

چونکہ دجال لعین، مسیح ضلالت ہے اور عیسیٰ علیہ السلام مسیح ہدایت، یہود نے عیسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کی، آپ کے قتل اور پھانسی کے درپے ہوئے، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو آسمان پر اٹھا لیا۔ یہود مسیح ضلالت (دجال) کی اتباع کریں گے جو کہ انھی کی نسل سے ہوگا؛ اس لئے بتقاضۂ حکمت مسیح ضلالت (دجال) کو قتل کرنے کے لئے مسیح ہدایت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہونا چاہئے، تاکہ آپ اپنی مخالفت پر کمربستہ یہود کو نیست ونابود کردیں، صلیب توڑ دیں۔ دجال لعین حضرت مسیح کا ہم نام، الوہیت کا مدعی، خباثت وضلالت میں مثیل ابلیس، فطری توانائیوں کو مسخر کرنے والا، احیائے موتیٰ، سحر اور شعبدہ بازی جیسے امور میں اپنے کو عیسیٰ علیہ السلام کا مثل ظاہر کرے گا؛ اس لئے ضروری ہے کہ اس کی ہلاکت کے لئے ایسی شخصیت کا نزول ہو، جو باکمال اور نبوت کے اہم منصب پر ہو؛ ایسا ہی شخص دجال کو قتل اور اس کے شعبدوں کا توڑ کرسکتا ہے۔

مزید یہ کہ آپ روح اللہ ہیں، اللہ تعالیٰ کے کلمہ ''کن'' سے پیدا ہوئے اور اس کے حکم سے مردوں کو زندہ کرتے، اس لئے یہ ہونا چاہیے کہ آسمان پر ایک طویل زندگی گذار کر دوبارہ دنیا میں نزول فرمائیں؛ تاکہ آپ سے عام دجالوں نیز دجال اکبر کے حیرت انگیز عجائبات، سے فائق خدائی معجزات کا ظہور ہو، اور اللہ تعالیٰ کی دلیل، سب پر غالب رہے۔

اس سلسلے میں حضرت نانوتویؒ کی تحقیق [جسے علامہ عثمانیؒ نے ''فتح الملهم''۱/۲۹۹-۳۰۰ میں ذکر کی ہے] ابن تیمیہ کی ''الجواب الصحيح''، ابن قیم کی ''هداية الحيارى'' اور حضرت الاستاذ نے کتاب ہذا کی فصل ''الحكمة فى نزول عيسى'' میں جو اقتباسات پیش کیے ہیں، انہیں ضرور دیکھ لیا جائے۔

الحاصل نزول عیسیٰ علیہ السلام کا یقین صحابہ سے لے کر آج تک اہل حق کا عقیدہ رہا ہے اور راجح تفسیر کے مطابق قرآن کریم میں اس کا ذکر ہے، ابن جریر طبری، ابوالحسین آبری، ابن عطیہ مغربی، ابن رشد الکبیر، علامہ قرطبی، ابوحیان، حافظ ابن کثیر، حافظ ابن حجر وغیرہ حفاظ حدیث کے بقول، اس سلسلہ کی احادیث متواتر ہیں، جیسا کہ علامہ کوثریؒ نے اپنی گرانمایہ تالیف ''نظرة عابرة فى مزاعم من ينكر نزول عيسى عليه السلام قبل الآخرة'' میں اس کی وضاحت کی ہے۔ اسی کتاب کے ص: ۷۰ پر لکھتے ہیں:

''اس مسئلے میں حضرات صحابہ کرام، تابعین، فقہا، محدثین اور مفسرین سب متفق ہیں، جن کی تائید کتاب

ہوتی ہے۔ نزول عیسیٰ کا منکر تنہا ایک طرف، جس کی تمامت قادیان
اللہ، سنت رسول اللہ، اور اجماع امت سے
کے خود ساختہ جعلی نبی اور اس سے پہلے ''طرہ'' کے فلفی نے کی''۔

ص:۲۹ پر مزید لکھتے ہیں:
کہ جمہور امت کے عقیدے پر قرآن وسنت اور اجماع سب متفق ہیں۔

حیات عیسیٰ اور نزول عیسیٰ پر قرآنی دلائل کے تحت ایک طویل بحث کے بعد ص:۳۶ پر رقم طراز ہیں۔

''واضح ہوگیا کہ صرف قرآنی نصوص کے ذریعہ عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ اٹھائے جانے اور قرب قیامت دوبارہ نزول کی بات یقینی ہو جاتی ہے، اس حقیقت پر احادیث تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں اور خیر القرون سے تا وقتِ تحریر اسے اپنانے اور کتب عقائد میں اس کا ذکر، امت کا عمل رہا ہے''۔

پھر ص:۳۷ پر ہے:
ہم یہ ثابت کر چکے کہ قرآن میں ایسی قطعی آیات موجود ہیں جو رفع عیسیٰ و نزول عیسیٰ پر دلالت کرتی ہیں حضرات ائمہ وعلمائے امت خصوصاً مفسرین نے ان آیات سے یہی سمجھا ہے۔

ص:۳۸ پر ہے:
''ثابت ہوا کہ رفع ونزول کا منکر، جماعت سے علاحدگی اختیار کرنے والا، خواہشات کا پیرو، اور کتاب و سنت کو پس پشت ڈالنے والا ہی ہوسکتا ہے اور اس کا انکار قرآن وحدیث سے مستنبط مسلک جمہور کا انکار ہوگا''۔

ص:۴۰ پر یہ بھی ہے:
''رفع ونزول عیسیٰ علیہ السلام کے مسئلہ میں خبر متواتر کا تحقق طے شدہ ہے۔ فخر الاسلام بزدوی نے حدیثِ متواتر کی بحث کے اختتام پر صراحت کی ہے کہ متواتر کا انکار اور خلاف ورزی کفر ہے، اس کے بعد متواتر کی مثال دیتے ہوئے لکھا کہ: جیسے قرآن، پنج وقتہ نمازیں، تعداد رکعات، مقدار زکوٰۃ اور اس جیسے دیگر امور، نیز یہ کہ نزول عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کتب حدیث میں مقدار زکوٰۃ کے تذکرے سے کم نہیں ہے''۔

ص ۴۷ پر آپ یہ بھی مطالعہ کریں گے:
''عقیدۂ نزول عیسیٰ علیہ السلام، کسی خاص مسلک کا عقیدہ نہیں: بلکہ ایک اجماعی مسئلہ ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں، چنانچہ ''الفقہ الاکبر'' بروایت حماد ''الفقہ الأوسط'' بروایت ابی مطیع، ''الوصیۃ'' بروایت امام ابو یوسف اور ''عقیدۃ الطحاوی'' دیکھئے: ان سے بخوبی معلوم ہوگا کہ امام اعظم ابوحنیفہ، ان کے تلامذہ

اوران کے مقلدین جو پوری امت کا نصف حصہ ہیں؛ امام مالک، ان کے تلامذہ، امام شافعی ان کے تلامذہ اور مقلدین؛ کا نزول مسیح پر ایمان ہے، کسی سے انکار ثابت نہیں۔ عقائد اہل سنت سے متعلق امام احمد بن حنبل نے اپنے تلامذہ کے نام کچھ خطوط ارسال کئے تھے، ان میں یہ مسئلہ بھی مذکور ہے، یہ خطوط مع سند ابن جوزی کی ''مناقب احمد'' اور ابن ابی یعلی کی ''طبقات الحنابلہ'' وغیرہ میں موجود ہیں۔ ظاہریہ اور معتزلہ بھی اس کے قائل ہیں جیسا کہ زمخشری کی نگارشات سے محسوس ہوتا ہے؛ یہی نہیں اس مسئلہ میں تو امامیہ بھی جمہور امت کے ساتھ ہیں جیسا کہ مہدی منتظر کے ظہور کی بابت ان کے دفاع سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس سے قطع نظر کھلی بات یہ ہے کہ ایسے مسئلے میں مسلکی تعصب کیوں کر ہوسکتا ہے؛ جس کے دلائل کتب صحاح، سنن اور مسانید میں موجود ہیں اور تمام فرقے اسے تسلیم کرتے ہیں''۔

ص:۴۹ر پر لکھتے ہیں:

''امام مہدی، مسیح دجال اور عیسی علیہ السلام سے متعلق احادیث، علمائے امت کے نزدیک ہر شک وشبہ سے بالاتر ہیں''۔

ص:۵۷ر پر ہے:

''قرون اول سے لے کر آج تک، رفع عیسیٰ ونزول عیسی مسیح علیہ السلام پر کتب عقائد کا اتفاق اس امر کی دلیل ہے کہ اس مسئلے میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں''۔

ابن حزم نے ''مراتب الاجماع'' میں لکھا ہے:

کہ اجماع احناف کے نزدیک اصول فقہ میں سے ایک اصل ہے، جس کی طرف (بوقت ضرورت) رجوع کیا جاتا ہے اور اس کے انکار کرنے والے کی تکفیر کی جاتی ہے۔ (کما ذکرہ الشیخ الکوثری)

علامہ کوثری ''الإشفاق'' اور ''النظرة'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''اجماع امت کی حجیت پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے اور انہوں نے اسے کتاب وسنت کے بعد تیسری بنیادی دلیل قرار دیا ہے، حتی کہ اہل ظاہر، فقہ سے بُعد کے باوجود، اجماع صحابہ کی حجیت کے قائل ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ بہت سے علماء نے علی الاطلاق لکھا ہے کہ اجماع کا منکر کافر ہے۔ علاوہ ازیں واضح دلائل سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ امت محمدیہ کسی غلطی پر اتفاق نہیں کرسکتی۔ یہ امت دوسری امتوں کے خلاف گواہ ہوگی، یہ بہترین امت ہے؛ جو دنیا کے لئے تشکیل دی گئی، ان کا کام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے، ان سے اتفاق کرنے والا مومن مخلص اور مخالفت کرنے والا ملحد وگمراہ اور علمائے امت کا معاند ہے''۔

یہ بھی لکھتے ہیں:

''جب علماء کرام اجماع کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد ان علماء کا اجماع ہوتا ہے، جو صاحب تقوی ہونے کے ساتھ منصب اجتہاد پر بھی فائز ہوں تا کہ ان کی شہادت لوگوں میں قابل قبول ہو، اجماع کی بابت غیر مجتہد کی بات قابل اعتبار نہیں خواہ وہ متقی و پرہیز گار ہی کیوں نہ ہو..... الخ''۔

پھر ''النظرۃ'' کے ص:۶۰/پر لکھتے ہیں:

''اجماع کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر مسئلے کی بابت ایک لاکھ صحابۂ کرام کے اسماء گرامی پر مشتمل کئی ضخیم جلدیں موجود ہوں؛ بلکہ کسی مسئلہ میں اجماع کے لئے مجتہدین صحابہ کی ایک جماعت جس کی تعداد بیس ۲۰/بتلائی گئی ہے، کا اجماع کافی ہے، بشرطیکہ ان میں سے کسی کا کوئی اختلاف نہ ہو، بلکہ بعض مواقع پر جس کی تفصیل ائمہ نے بیان کی ہے ایک دو حضرات صحابہ کے اختلاف سے بھی کچھ اثر نہیں پڑتا۔ یہی ضابطہ تابعین وتبع تابعین کے بارے میں بھی ہے......الخ''۔

اس مفید وضاحت کے بعد ص:۶۲-۶۳، پر یہ بھی ہے کہ:

''نزول عیسیٰ کی تصریح تیس صحابہ کرام نے کی ہے، اس سے متعلق آثار موقوفہ علامہ کشمیریؒ کی ''التصریح'' میں مذکور ہیں۔ پھر کسی ایک صحابی سے بھی اس کا انکار منقول نہیں، اگر تیس صحابہ کرام سے ثابت شدہ چیز اجماعی نہیں تو پھر دنیا میں کسی اجماع کا تحقق نہ ہوگا''۔

اخیر میں ''التلویح'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''کہ کبھی کوئی روایت فی نفسہ ظنی ہوتی، مگر اجماع کے بعد قطعی ہو جاتی ہے''۔

راقم الحروف کہتا ہے کہ عقیدۂ نزول مسیح دلائل قرآنیہ، آحادیث متواترہ اور ہر زمانے کے علمائے امت کے اجماع کی روشنی میں قطعاً واضح اور روشن ہے۔ مجھے احادیث میں کسی حکم یا کسی عقیدے کی بابت، نزول عیسیٰ علیہ السلام کی طرح حلفیہ تاکیدات نہیں ملیں، یہ تاکید در تاکید اس لئے تھی کہ یہ انکار یا کم از کم حیرت واستعجاب کا باعث تھا، چنانچہ ارشاد نبوی ہے:

"واللہ لینزلن ابن مریم حکما عادلا، فلیکسرن الصلیب، ولیقتلن الخنزیر، ولیضعن الجزیة، ولتترکن القلاص، فلایسعی علیھا ولتذھبن الشحناء والتباغض، والتحاسد، ولیدعون إلی المال فلا یقبلہ احد"

''خدا کی قسم عیسیٰ (علیہ السلام) ضرور حاکم عادل کی حیثیت سے نازل ہو کر صلیب کو توڑیں گے (یعنی صلیب

پرستی ختم کردیں گے) خنزیر کو قتل کریں گے (تاکہ نصاریٰ کی عملی تردید ہو جائے، جو خنزیر حلال سمجھ کر کھاتے ہیں) جزیہ بند کردیں گے (اس لئے کہ یہ کافروں سے لیا جاتا ہے اور اس وقت کوئی کافر نہ ہوگا) تم اونٹوں کو چھوڑ دو گے، ان پر بار برداری نہ کی جائے گی، (بلکہ دوسری سواریاں وجود میں آجائیں گی)، حسد، بغض اور کینہ ختم ہو جائے گا، مال و دولت کی ایسی فراوانی ہوگی کہ کوئی لینے والا نہ ہوگا''۔

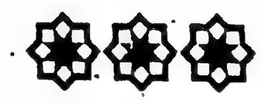
یہ الفاظ ''مسند احمد و مسلم'' میں وارد حضرت ابو ہریرہ کی روایت کے ہیں، جب کہ صحیح بخاری میں یہی روایت ان الفاظ سے ہے:

''والذی نفسی بیدہ لیوشکن ان ینزل فیکم ابن مریم......'' الخ

''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے وہ وقت ضرور آئے گا جب تم میں (اے امت محمدیہ!) ابن مریم نازل ہوں گے......الخ''۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی پر اکتفا نہ کیا؛ بلکہ احادیث میں آپ کا نام، کنیت، نسب، والدہ کا نام، نانا کا نام، آپ کی والدہ کے اوصاف، آپ علیہ السلام کا حلیہ، رنگ، قد و قامت، بالوں کا رنگ، اس کی کیفیت وغیرہ سو سے زائد اوصاف کا ذکر ہے۔ جنہیں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیو بندی وغیرہ نے جمع کیا ہے، تاکہ اس مسئلے میں کوئی شک و شبہ نہ رہے اور کسی قسم کے انکار، تحریف یا تاویل کی گنجائش نہ ہو، اسی طرح آیت کریمہ: ''وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا'' اپنے اندازِ تاکید میں احادیث سے ملتی جلتی ہے۔

واللہ یقول وھو یھدی السبیل



نزولِ عیسیٰ کے انکار کا سبب

حیرت واستعجاب ہے

یہ بات تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ عقیدۂ نزول مسیح علیہ السلام ایک اسلامی وایمانی تقاضہ ہے، جس پر قرآن کریم اور احادیث متواترہ شاہد ہیں، اہل سنت بلکہ معتزلہ اور امامیہ کا بھی اجماع ہے، اس لیے اس کا انکار جہالت اور گمراہی ہے، اور بے بنیاد توہمات۔ جو کچھ استبعاد پیدا کیا جارہا ہے وہ اس کی علامت ہے کہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی واضح قدرت اور معجزات کے مشاہدہ سے غفلت برتی گئی۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ نئی نئی ایجادات حیرت انگیز نہیں ہیں؛ جو ہمارے اور آپ کے سامنے ہیں مثلاً: بجلی کا کرنٹ، زہریلی گیس، مہلک کیمیاوی اجزاء سے تیار ساز وسامان، ایٹم بم، ہائیڈروجن بم، فضا میں چلنے والے میزائل، مصنوعی سیارے، خلائی اسٹیشن، چاند تک پہنچنے والا راکٹ، جس کے پہنچنے سے ایک دھماکہ ہوا، وہ راکٹ چاند پر پہنچ کر سائنسدانوں کے بقول واپس بھی آگیا، جدید قسم کے آلات سے لیس وہ راکٹ جس کے بند لیکن ہوادار کمرہ میں ''لایکہ'' نامی کتیا کو سوار کیا گیا، اس کتیا کے بلڈ پریشر، اس کی رگوں کے پھیلاؤ، حرکت قلب، حرارت جسمانی، تنفس اور پھیپھڑوں کے متاثر ہونے کی بابت، معلومات فراہم کرنے کے لئے آلات نصب کیے گئے اور اس نے یہ معلومات زمین تک پہنچائیں، اسی طرح انہوں نے ایک مصنوعی سیارے پر، خلاء کے دباؤ، حرارت، سورج کی تپش اور کائنات کی شعاعوں کی جانچ کے لیے کچھ دوسرے آلات نصب کر کے اسے فضا میں بھیجا، یہ مصنوعی سیارہ جس کا نام ''سبوتنیک'' رکھا گیا [جس کے معنی روسی زبان میں چاند کے ہیں] نصف ٹن وزنی ہونے کے باوجود، صرف سولہ منٹ میں زمین کا ایک چکر لگا لیتا ہے، اتنا وزنی ہوتے ہوئے اس قدر تیز رفتاری؛ یہ اور اس جیسی عجیب وغریب دوسری ایجادات، زمانہ قریب تک خواب وخیال سمجھی جاتی تھیں، لیکن آج حقیقت بن کر سامنے ہیں، ان میں سے کوئی چیز محال اور خلاف عقل نہیں رہی، علاوہ ازیں کیمیا اور فزیکل کے ماہرین نے جو دریافت کیں، حال ہی میں ٹیلی ویژن بھی اسی قبیل سے ہے، پھر ماہرین فلکیات اور محققین ہر سال جو نئی دریافت کر رہے ہیں، اسی سے تعلق رکھتی ہیں، چنانچہ ۱۹۵۷ء میں پہلی بار زہرہ

سیارے سے وائرلیس سگنل لیے گئے۔

ان ایجادات کو چھوڑیئے، فضا میں منڈلانے والے جہاز، سمندروں کی تہوں میں چکر لگانے والے ایٹمی آب دوز، جمے ہوئے سمندروں کے سینے کو چیرنے والے اسٹیمر، آواز سے تیز رفتار جٹ طیارے وغیرہ نئی ایجادات پر اگر ہم نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ وہی چیزیں وجود میں آگئیں جو نصف صدی پہلے افسانہ تھیں؟ کیا انسان یہ سوچ سکتا تھا کہ ایسے راکٹ ایجاد ہوں گے جو زمینی کشش کے باوجود فی گھنٹہ پچیس ہزار میل کا سفر کریں گے؟ نصف صدی قبل یہ عجیب وغریب آلات اور مشینری سے لیس مصنوعی سیارچوں کو کوئی شخص تسلیم نہیں کرسکتا تھا، جو فضائی حالات اور معلومات ریکارڈ کر کے ریڈیائی لہروں سے، مرتفع فضاء سے بہت دور، زمین تک پہنچاتے ہیں۔ کچھ پہلے ایسے عجیب وغریب راڈار کا تصور ممکن نہ تھا، جو ایسے ہوائی جہازوں کو بھی کیچ کرلیتے ہیں، جنہیں مشین سے دیکھنا ممکن نہیں۔

خیر ان کو بھی چھوڑیئے، چمکیلی اور شفاف معدنیات سے بنے ہوئے ان کپڑوں کو دیکھئے مثلاً: ریشم، کاٹن، نائلون وغیرہ، کیا یہ انوکھی چیزیں نہیں؟ چند سال پہلے یہ ساری چیزیں خواب وخیال تھیں اور از قبیل خرافات وواہیات۔ اگر ماضی میں کوئی ایسی بات کہتا تو اسے پاگل، دیوانہ قرار دیتے؛ لیکن آج یہی مصنوعات سامنے ہیں۔

جب فانی مخلوق حیرت انگیز ایجادات واختراعات کی موجد ہوسکتی ہے تو قادر مطلق کے کسی حیرت انگیز کام کو، محال کیوں سمجھا جاتا ہے؟ لہٰذا درازیٔ عمر، آسمان پر جانا، پھر وہاں سے واپس آنا اور اس جیسے خرق عادت امور، کیوں کر بعید از عقل اور محال ٹھہرائے جاتے ہیں؟ یہ عجیب وغریب ضرور ہیں، خلاف عادت بھی، حیرت انگیز اور محیر العقول بھی، لیکن محال نہیں، الغرض کوئی بھی چیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خبر دینے کے بعد محال نہیں۔

اسلامی مسلمات مثلاً: آسمان کا وجود، آسمان پر ملائکہ کا ہونا، پلک جھپکتے ان کا نزول وعروج، واقعہ اسراء ومعراج، یہ سب عجائبات کی دنیا میں قدرت الٰہی کے ادنی کرشمۂ قدرت ہیں، خود اس بے نظیر اور عظیم قدرت کو دیکھئے پھر ان ایجادات پر نظر ڈالیے، لاریب سائنسی ایجادات کی، خدا تعالیٰ کی ایجادات کے سامنے وہی حیثیت ہے، جو ان سائنس دانوں کے لئے بچوں کے کھلونے کی ہے، انہیں کھلونوں پر فخر ہے، انہیں کی تعریف میں اخبارات و رسائل رطب اللسان ہیں، انہیں کا مشرق ومغرب میں شور ہے، یہی ان کی خوشی ومسرت اور حیرت واستعجاب کا مقام ہے، مگر چاند، تاروں، اور بے شمار فضائی فوائد کے حامل روشن سورج کے سامنے ان کھلونوں کی کیا حقیقت؟ ذٰلک تقدیر العزیز العلیم۔

یہ بلند فضائی طبقات، یہ دور دراز کے ستارے اور کائنات میں پھیلی ہوئی قدرت کی نشانیاں، کیا

ارباب علم ودانش کے لئے باعث حیرت واستعجاب نہیں؟ پھران ایجادات کے پہلو بہ پہلو آپ کائنات اور مادہ، نیز روح اورنفس کے عجائبات کے پے چیدہ اسرار ورموز کو دیکھئے، تو آپ کومعلوم ہوگا کہ انسان ہمیشہ سے حقائق سے ناواقف رہا؛ تا آنکہ آج تک وہ اس زمین کی حقیقت سے نابلد ہے، جس پر چلتا اور جس کی آغوش میں پلتا ہے، خود عظیم سائنس دانوں نے کائنات وقدرت کے بہت سے رازہائے سربستہ سے اپنی ناواقفیت کا کھلا اعتراف کیا، اس قدر ترقی کے باوجود وہ ابھی طفولیت ہی میں ہیں۔ حضرت الاستاذؒ نے کائنات کی ناپائیداری کو مندرجہ ذیل اشعار سے واشگاف کیا ہے:۔

یقال: إلی الحین استھاموا وما دروا　　　علاقة بین الروح والفکر ماذا

''زمانے کی طرف دیکھ کر لوگ حیران وششدر ہیں اور آج تک روح وفکر کے تعلق کو نہ سمجھ سکے کہ کیسا ہے؟''

بیولوجیا اضحی کذلک مخبطا　　　لتخریجھم سر الحیاة وما انجلی

''زندگی کا راز معلوم کرنے کے لئے بائی لوجی کیذریعہ آدمی خبط میں مبتلا ہے اور وہ راز کھلا نہیں''۔

فذلک اعجاز و خرق لعادة　　　وان کان الکون کل اعجاز منتھی

''یہ ایک اعجاز ہے اور خلاف عادت امر کا ظہور ہے اگر چہ پوری کائنات ہی اعجاز ہے''۔

سوال یہ ہے کہ اگر حشر ونشر اور بعث بعد الموت کا عقیدہ قطعی اور تمام آسمانی مذاہب کا عقیدہ ہے اور کسی کے لئے اس کے عجیب وغریب اور بعید از عقل ہونے کے باعث انکار کی گنجائش نہیں، بلکہ اس پر ایمان لانا ضروری ہے، تو عقیدۂ نزول مسیح علیہ السلام پر ایمان لانا کیوں ضروری نہ ہوگا؟ حشر ونشر اور بعث بعد الموت پر ایمان لانا، اس عقیدے سے زیادہ مؤکد، اہم اور قدیم ہے۔

اللہ تعالیٰ کی یہ حکمت ہے کہ جب یہ متمدن دنیا حیرت انگیز اور محیر العقول ایجادات کی تعریف و توصیف میں زمین وآسمان کے قلابے ملانے لگے، سائنسی ترقی عروج پر ہو اور سائنس داں کبر ونخوت میں اس قدر آگے بڑھ جائیں کہ باری تعالیٰ کا انکار اور اس کی شان میں گستاخیاں ہونے لگیں، تو مسیح ضلالت، دجال اکبر یہودیوں میں ظاہر ہوگا، جو دائیں آنکھ کا کانا ہوگا، کوئی بھی سچا مومن اس کے کفر میں شبہ نہ کرے گا، کیوں کہ اس کی پیشانی پر ''کافر'' یا ''ک ف ر'' لکھا ہوگا، وہ خدائی کا دعویٰ کرے گا، طلسماتی چیزوں اور شعبدہ بازیوں کا ایک دفتر دکھائے گا، یہود ونصاریٰ اس پر ایمان لائیں گے اور یہ دنیا ہر قسم کی ضلالت، کفر، ظلم وستم اور جبر وجور سے بھر جائے گی، اس وقت بحیثیت امتی اور صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم عیسیٰ علیہ السلام نازل

ہوں گے اور شریعت محمدیہ پر عمل پیرا ہو کر دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے صلیب توڑ دیں گے، خنزیر کو قتل کر دیں گے، دجال کو ہلاک کر دیں گے، اسی طرح بغیر کسی مادی سبب کے آپ سے ایسے معجزات کا ظہور ہوگا، جن سے سائنسداں حیران رہ جائیں گے۔

جس وقت مسیح ضلالت، دجال اکبر دنیا کو قساوت و خباثت سے بھر دے گا، حیرت انگیز عجائبات پیش کریگا، خدائی کا دعوے دار ہوگا اور کسی کو اس سے مقابلے کی تاب نہ ہوگی، اسوقت مسیح ہدایت عیسی علیہ السلام کا نزول ہوگا، جنہیں دیکھتے ہی دجال برف کی مانند پگھلنے لگے گا، تا آں کہ آپ اسے ختم کر دیں گے، دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے، شریعت بیضاء کو نافذ کر کے کفر و خبث سے دنیا کو پاک کر دیں گے اور دین اصل شکل میں قائم ہو جائے گا۔ شاید قیامت سے قبل ظہور پذیر ہونے والی ان ہی نشانیوں کی طرف آیت کریمہ ''وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا'' میں اشارہ کیا گیا ہے۔

یہ خدائی معجزات اور قدرت کاملہ کی واضح نشانیاں اس لیے ہوں گی کہ اہل دنیا جان لیں کہ قیامت قریب ہے، کسی قسم کے شک وشبہے میں مبتلا نہ رہیں، ''وَاتَّبِعُوْنِ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ'' (اور میرا کہا مانو یہ ایک سیدھی راہ ہے) کے ذریعہ آیت کا خاتمہ، خاتمے کی اچھوتی مثال ہے۔ کیوں کہ اس میں قبول حق کی دعوت دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ وحی الٰہی پر ایمان لانے کا نام ہی صراط مستقیم ہے اور اسکا انکار ضلالت و گمراہی اور شکوک وشبہات کے لق ودق صحراء میں گمشدگی ہے۔

انہیں الفاظ پر ''نزل اهل الاسلام فی حیاة عیسی علیہ السلام'' نامی اپنے اس مقدمے کو ختم کرتا ہوں۔ حضرت العلامؒ کی تالیف آپ کے ہاتھوں میں ہے جو حق و باطل کا فیصلہ کر دے گی اور جس کے مطالعہ سے کسی قسم کا شک وشبہ باقی نہ رہے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

وصلى الله على صفوة البرية، خاتم النبيين، محمد وإخوانه الانبياء والمرسلين، والشهداء والصلحين أجمعين.

وانا الفقير اليه تعالىٰ

محمد یوسف بن سید محمد زکریا بن سید میر مزمل شاہ بنوری حسینی

خادم الطلبہ و مہتمم مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی نمبر ۵

بروز شنبہ آخری ذی الحجہ ۱۳۷۹ھ - مطابق: ۲۵/ جون ۱۹۶۰ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض مؤلف

صدع الصدیع وصیحة بالوادی — لمن اھتدی من حاضر او بادی

’’کھلے میدان میں برسرِ عام اعلان ان کے لیے ہے، جوراہ ہدایت پر ہیں خواہ شہری ہوں یا دیہاتی‘‘۔

بالکادیانی ذلک الآخر الذی — امسی زعیم الکفر والإلحاد

’’کہ ذلیل قادیانی جو کفر والحاد کا گروگھنٹال بن گیا ہے‘‘۔

وأبان عن کفر ینوء بعصبة — ویبوء بالأغلال والأصفاد

’’اس نے ایسا کفر ظاہر کیا ہے جس کا تحمل ایک جماعت سے بمشکل ہو سکے گا، انجام کار وہ بیڑیوں اورزنجیروں میں جکڑا جائے گا (جہنم رسید ہوگا)‘‘

بدبخت مرزا غلام احمد قادیانی [جس کا سلسلۂ نسب مغل تاتاریوں سے ملتا ہے، اور بہ قول اس کے یاجوج و ماجوج سے] کے شروع ہی سے وہی عزائم تھے، جن کا اس نے بعد میں مختلف دعاوی وافتراءات کی شکل میں اظہار کیا، لیکن اس نے گرگٹ کی طرح اپنے دعوؤں میں تدریج وتلون سے کام لیا، مقصد برآری اور اپنی بات کو مخفی رکھنے کے لیے زنادقہ اور باطنیہ کا طریقہ اختیار کیا اور اس سلسلے میں وہی کچھ کیا، جو اس سے پہلے بابی اور بہائی کر چکے ہیں۔ پہلے تو اس نے ایک طرف مجدد اور مثیل مسیح ہونے کا دعوی کیا، پھر مہدی موعود اور مسیح معہود کا دعوی کرنے لگا؛ جب کہ دوسری طرف خود ساختہ معانی کے تحت لغوی، ظلی اور بروزی نبی ہونے، بعدازاں غیر تشریعی نبی اور غیر صاحب شریعت رسول ہونے کا دعوی کیا، پھر وہ وقت آگیا کہ مستقل اور صاحب شریعت نبی ورسول ہونے کا دعوی کر بیٹھا، جیسا کہ اس نے خود اپنی کتاب ’’اربعین‘‘ میں تصریح کی ہے۔ اس نے بزعم خود اپنے اوپر نازل ہونے والی آیات کے ذریعہ چیلنج بھی کیا اور اپنی وحی کو قرآن کا درجہ دیا۔ جیسا کہ ’’نزول مسیح‘‘ ص:۹۹ راور دیگر کتب میں تحریر ہے۔

اسی طرح جملہ انبیاء کرام نیز حضرت سید الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی معجزات میں نقالی بھی شروع کردی، چناں چہ اپنی مسجد کو مسجد اقصیٰ، اپنے گاؤں کو ’مکة المسیح‘‘ اپنے شہر لاہور کو ’مدینہ‘‘ قرار دیا اور ’’منارۃ المسیح‘‘ کے نام سے اپنی مسجد کا ایک مینارہ تعمیر کرایا، منارہ کے علاوہ عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق تمام باتوں اور پیشین گوئیوں کی تاویل کی، کیونکہ منارہ اس رقم سے زیر تعمیر تھا، جو اس نے اپنے پیروکاروں سے وصول کیے تھے، بہشتی مقبرہ کے نام سے ایک قبرستان بنوایا، جس میں دفن ہونے والے کو جنت کی بشارت دی،

اپنی بیویوں کوامہات المومنین اوراپنے متبعین کواپنی امت قراردیا۔

اپنے لیے ایک بڑے معجزے کادعوی کیا، یہ معجزہ محمدی بیگم نامی خاتون کے ساتھ، اس کا آسمانی نکاح تھا، اسے وحی الٰہی قراردیا اوراس جھوٹے دعوے پرتقریباً بیس برس پوری بے حیائی سے ڈٹارہا، کیوں کہ اس دعوے کی شہرت کا آغاز ۱۸۸۸ء ہے، جب کہ وہ ۱۹۰۸ء میں اس نکاح آسمانی کے بغیر جہنم رسید ہوگیا۔اس طرح اس نے اپنی تہائی زندگی اس بے بنیاد دعوے پراصرار میں گزاردی، اس کا کہنا تھا کہ اللہ تعالیٰ نکاح کی راہ میں حائل ہررکاوٹ دورکردے گااورمحمدی بیگم اس کے نکاح میں ضرورآئیگی، کہتاتھا کہ یہ ایک قطعی فیصلہ اوروحی الٰہی ہے، جیسا کہ''انجام آتھم''میں اپنی شیطانی آیات:''کذبوابآیاتی وکانوا بھا یستھزٔون، فسیکفیکھم اللہ، ویردھاالیک، امرمن لدنا انا کنافاعلین، زوجناکھا''میں اس کاذکرکیاہے۔اسی طرح وہ اپنی ہفوات کے لیے قرآنی آیات میں ترمیم کرکے اسے حسب منشابیان کرتا، مردود نے اپنی کتاب''ازالۂ اوھام''میں اس نکاح کااعلان ان الفاظ میں کیا:''الحق من ربک فلاتکونن من الممترین''ان الفاظ کوقرآن کی طرح وحی الٰہی قراردیااورنکاح سے متعلق اپنی اس پیش گوئی کومسلمانوں، عیسائیوں اوریہودیوں کے لیے اپنے صدق وکذب کا معیارقراردیا۔اس پیش گوئی کودرست ثابت کرنے کی خاطرمحمدی بیگم کے والدکومال ودولت اورجائداد کی بہت کچھ لالچ دی، ہرقسم کے مکروفریب سے بہلانے پھسلانے کی کوشش کی؛ لیکن اللہ جل شانہ نے برسرعام اسے رسواکیااوریہ نکاح نہ ہوسکا، بلکہ مذکورہ خاتون کی شادی سلطان احمدنامی ایک دوسرے شخص سے ہوگئی، جس سے اس کے کئی بچے ہوئے (۱)۔

اس کے الہام میں یہ اعلان بھی تھاکہ اگریہ نکاح نہ ہواتووہ خبیث ترین انسان ہوگا، چناں چہ اللہ تعالیٰ نے اسے خبیث ترین انسان بناکردنیاکودکھابھی دیا، اس کا تمام ترمقصد مال ودولت کی ذخیرہ اندوزی اورہرطرح کی لذات وخواہشات کاحصول تھا، آخرکارجہنم رسید ہوا، لیکن جب تک زندہ رہامسلمانوں کے لیے ایک مصیبت بنارہااورہراس شخص کی تکفیرکی جس نے اس کے دعوائے نبوت کاانکارکیا۔یہ تفصیلات رسالہ''حکم'' ۱۰اکتوبر۱۸۹۹ء کے شمارے میں ص:۲۴ رپر،''حقیقۃ الوحی''میں ص:۱۷۹رپراور''ذکرحکیم'' نامی کتاب میں موجود ہیں۔ اس ملعون نے عیسی علیہ السلام کی شان میں ایسی گستاخیاں اورکھلی اہانت کی، جن سے جگرشق ہوتاہے، اپنی اس بکواس میں عیسائیوں کی بہتان تراشیوں کاسہارالیا۔ اوریوں اپنے کفرکوظاہرکرکے اپنی خواہشات کی تکمیل کی، العیاذ باللہ۔ وہ اپنی ان کفریات کوحقائق کا نام دیتا، موت سے ایک سال پہلے

(۱)اس پاک باز صادقہ صالحہ کا بہ حالت ایمان ۱۹رنومبر ۱۹۶۶ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔ جب کہ ان کے شوہر سلطان محمد صاحب کا ۱۹۴۹ء میں۔ (محمد صغیر)

رسالہ ''البدر'' میں لکھا کہ: ''میرا دعوی ہے کہ میں نبی و رسول ہوں'' اور اخبار ''عام'' کے اڈیٹر کے نام اپنے مکتوب میں لکھا کہ: ''بلاشبہ میں اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا نبی ہوں'' اسی طرح یہ دعوی اس نے ''حقیقة الوحی'' کے صفحہ ۱۴۹ پر بھی کیا ہے۔ ایڈیٹر ''اخبار عام'' کے نام اس مکتوب کے بھیجنے کے پانچ ہی دن بعد قہار و جبار ہستی نے اس کی زبردست پکڑ کی، چناں چہ وہ ہیضے کا شکار ہوا اور پھر نجاست پر اوندھے منہ گر کر جہنم کی راہ لی۔

خبیث کی موت عبرت ناک انداز میں ہوئی، لاہور کے قریب ''اچھرہ'' نامی محلہ کے ایک معزز شخص نے ایک دوسرے صاحبِ حیثیت شخص کی معرفت مجھے لکھا کہ ''بہ تقدیر ایزدی اس کو ہیضے نے آدبوچا اور جہنم رسید کر دیا۔ اور اس قول کا مصداق ٹھہرایا: ''این ہمار یدست کی درآخر تجرید خوری'' ۔ اور اللہ کی یہ بات اس کے حق میں ثابت ہوئی:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْقَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ ط وَلَوْتَرٰى اِذِالظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰئِكَةُ بَاسِطُوْا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْا اَنْفُسَكُمْ ط اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ آيَاتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ (الانعام ۹۳)

''اور اس سے زیادہ ظالم کون جو باندھے اللہ پر بہتان، یا کہے مجھ پر وحی اتری اور اس پر وحی نہیں اتری کچھ بھی اور جو کہے کہ میں بھی اتارتا ہوں مثل اسکے جو اللہ نے اتارا اور اگر تو دیکھے جس وقت کہ ظالم ہوں موت کی سختیوں میں اور فرشتے اپنے ہاتھ بڑھا رہے ہیں کہ نکالو اپنی جانیں، آج تم کو بدلہ میں ملے گا ذلت کا عذاب، اس سبب سے کہ تم کہتے تھے اللہ پر جھوٹی باتیں اور اس کی آیتوں سے تکبر کرتے تھے''۔

جب اس بدبخت نے اصل موضوع سے ہٹ کر حیات و وفات عیسیٰؑ سے متعلق عوام کو فریب دینے کا تہیہ کر لیا اور اس موضوع پر صفحات کے صفحات لکھ کر لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی، تو علماء کرام نے حیات مسیح کے ثبوت کے لیے ''درة الدرانی علی متن القادیانی''، ''سیف چشتیائی'' اور ''شھادة القرآن'' وغیرہ جیسی مفید کتابیں لکھیں جو کافی و وافی تھیں، لیکن میں نے سوچا کہ اپنی اس تالیف سے طلبہ کو اس بحث سے متعلق کچھ معلومات بہم پہنچاؤں، یہ بھی مقصد تھا کہ عرب ممالک جیسے عراق: شام اور مصر وغیرہ کے مسلمان اس فتنے سے باخبر ہوں، اسی لیے عربی میں لکھ رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ مسلمان دین کی نصرت، اس کے حدود کی حفاظت، فریضۂ اسلام کی ادائے گی اور ان بے دینوں کے مکر و فریب اور کفر صریح سے مسلمانوں کی حفاظت، کے لیے مستعد ہوں گے۔ واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم۔

مخلص

محمد انور شاہ کشمیری

بسم اللہ الرحمن الرحیم ○

الحمد لله الذی جعل الحق یعلو ولا یعلی، وجعل کلمته هی العلیا، وترک الباطل زبدا رابیا، یذهب جفاء أو هواء، وکلمته هی السفلیٰ وعاقبته هی السوئ، وقدر للحق رجالا لا یخافون فی الله لومة لائم، یقاتلون علیه ظاهرین إلی انقراض الدنیا، ولو کثر الباطل فإنه "ککلمة خبیثة اجتثت من فوق ما لها من قرار" ولا بقیا. والصلاة والسلام علی خاتم الانبیاء والمرسلین سیدالأولین والآخرین بلا مثنویة والاثنیا، لم یقبضه الله حتی اقام به الملة العوجاء، بأن قالوا: لا اله الا الله وفتح الله به آذا ناصمّا، وقلوبا غلفاً، وأعینا عمیا، وعلی آله واصحابه واتباعه من الأمة المرحومة الذین ثبتت لهم الحسنی، وزیادة ولهم مبشرات الرؤیا :اما بعد.

''ہر تعریف کی مستحق وہی ذات باری ہے، جس نے حق کو غالب، اپنی بات کو بلند، اور باطل کو جھاگ کی طرح کمزور و بے بنیاد کیا، بطلان کی تقدیر مغلوبیت ٹھہرائی اور اس کا انجام رسوا کن۔ قیام حق کے لئے ایسے افراد پیدا کئے جو اپنے فریضہ کی ادائیگی میں کسی ملامت سے نہیں گھبراتے، وہ حق کے لئے قیامت تک نبرد آزما رہیں گے اور غالب رہیں گے، انشاء اللہ۔ خواہ باطل کتنا ہی طاقتور ہو، باطل زمین سے نکلے ہوئے اس درخت کی طرح ہے، جس کیلئے کوئی بقا و قرار نہیں۔

اور درود و سلام اس ہستی (ﷺ) پر جو تمام انبیاء و رسل کے بعد آنے والے اور گزشتہ و آئندہ مخلوق خدا کے سردار ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس وقت وفات دی جب ملت بیضاء کو استحکام ہو گیا، دنیا کا بڑا حصہ کلمۂ توحید'' لا الہ الا اللہ'' کا قائل ہو گیا، بہرے کان شنوا ہو گئے، زنگ آلود دل چمک اٹھے، آنکھیں بینا ہو گئیں اور خدا کی رحمت ہو آپ کی اولاد، آپ کے اصحاب اور امت پر جن کے لیے بہتری اور خوشخبری ہے''۔

یہ چند مضامین اور فصلیں ہیں، جن کا نام ''عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام'' رکھا ہے۔ یہ معلومات سرسری طور پر طلبۂ عزیز کو لکھوائے تھے اور اب جب کہ ۱۲؍رمضان ۱۳۴۲ھ ہے، اسے تالیف کی شکل دی، اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو رشد و ہدایت کی توفیق دے، ضلالت و الحاد سے محفوظ رکھے (آمین)

'' وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ م بِالْعِبَادِ''

''اللہ تعالیٰ ڈراتا ہے تم کو اپنے سے اور اللہ مہربان ہے بندوں پر''۔

نزول عیسیٰ علیہ السلام کی بابت مشیت ایزدی

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ ○ وَقَالُوا آَأَلِهَتُنَا خَيْرٌ أَمْ هُوَ مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا ط بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ ○ إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنَاهُ مَثَلًا لِبَنِي إِسْرَائِيلَ ○ وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَلَائِكَةً فِي الْأَرْضِ يَخْلُفُونَ ○ وَإِنَّهُ لَعِلْمٌ لِلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُونِ ط هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ○" (الزخرف ۵۷۔۶۱)

"اور جب مثال لائے مریم کے بیٹے کی تبھی قوم تیری اس سے چلّانے لگتے ہیں، اور کہتے ہیں ہمارے معبود بہتر ہیں یا وہ، یہ مثال جو ڈالتے ہیں تجھ پر سو جھگڑنے کو؛ بلکہ یہ لوگ ہیں ہی جھگڑالو، وہ کیا ہے ایک بندہ ہے کہ ہم نے اس پر فضل کیا اور کھڑا کر دیا اس کو بنی اسرائیل کے واسطے، اور اگر ہم چاہیں نکالیں تم میں سے فرشتے، رہیں زمین میں تمہاری جگہ، اور وہ نشان ہے قیامت کا، سو اس میں شک مت کرو، اور میرا کہا مانو، یہ ایک سیدھی راہ ہے"۔

شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی "موضح القرآن" میں لکھتے ہیں:

"قرآن میں (جب) ان کا (عیسیٰ علیہ السلام کا) ذکر آوے تو (کفار) اعتراض کرتے ہیں کہ ان کو (عیسیٰ علیہ السلام کو) بھی خلق پوجتی ہے تو انہیں کیوں خوبی سے یاد کرتے ہو، اور ہمارے پوجوں (معبودوں) کو برا کہتے ہو" (اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی)

ارشاد باری "وَلَوْ نَشَاءُ...... الآیۃ" کا مطلب یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام میں ملکوتی آثار ہیں (اور اتنی بات سے کوئی معبود نہیں بن جاتا) اتنی بات تو ہمارے لیے بہت آسان ہے کچھ بھی مشکل نہیں، بلکہ اس سے بڑھ کر اگر ہم چاہیں تو تمہاری جگہ آسمان سے فرشتوں کو لا کر زمین پر آباد کر دیں، یعنی ملائکہ کو زمین پر اتارنا اور عیسیٰ (علیہ السلام) کو آسمان پر اٹھانا، اور پھر دوبارہ زمین پر اتارنا، ہمارے لیے سب برابر ہے، اور سب کچھ میری قدرت میں ہے۔ یہ بدبخت کذاب قادیانی کہتا ہے کہ فلسفہ قدیم وجدید کی رو سے کسی بھی جسم کا آسمان پر چڑھنا محال ہے، یہ خبیث نبوت کا دعویٰ بھی کرتا ہے، پھر فلسفی بھی بنتا ہے، طرفہ تماشا یہ کہ اس کو نہ تو فلسفہ کی ہوا لگی اور نہ ہی کسی اور علم کی، یہ یورپی ذہن رکھنے والے اپنے متبعین سے سنی سنائی باتیں، اس انداز سے

کرتا ہے کہ گویا بڑا فلسفی ہے، لیکن جب معاملہ مشکل دیکھتا ہے، اور بے بس نظر آتا ہے تو اپنے دعوائے الہام کا سہارا لیتا ہے، جیسے شترمرغ کہ جب اس سے کہا جائے اڑ تو وہ اونٹ اور گھوڑا بننے لگتا ہے، اور جب کہا جائے کہ بوجھ اٹھا تو گدھ بننے لگتا ہے۔ باری تعالیٰ عزاسمہ فرماتے ہیں: ''اگر ہم چاہتے تو تمہاری زمین کو فرشتوں کا مسکن بنا دیتے'' اور یہ بات ظاہر ہے کہ فرشتوں کا اپنی متعین جگہ چھوڑ کر زمین پر اترنا اور انسان کا آسمان پر جانا دونوں برابر ہیں، ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔

''وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ'' کی ضمیر کی بابت صحیح یہ ہے، جیسا کہ صاحب روح المعانی نے صراحت کی ہے کہ اس کا مرجع عیسیٰ علیہ السلام ہیں، نہ کہ قرآن، یہ بھی کہا گیا ہے کہ ادریس اور عیسیٰ علیہما السلام کا آسمان پر جانا، تاریخی لحاظ سے بھی حشر اجسام کا ایک بین ثبوت ہے، درمنثور، سورہ زخرف (ج:۶،ص:۲۰) میں ہے کہ ابن مردویہ نے ابن عباسؓ سے روایت کی کہ انہوں نے آیت کریمہ: ''اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ '' کے شان نزول کے سلسلے میں فرمایا کہ: ایک مرتبہ حضور علیہ السلام کے پاس کچھ مشرکین آئے اور کہنے لگے: اللہ تعالیٰ کے علاوہ جن کی عبادت کی جاتی ہے ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے، وہ کہاں ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: دوزخ میں۔ ان لوگوں نے پھر کہا: سورج اور چاند؟ فرمایا سورج اور چاند بھی۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ عیسیٰ بن مریم؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیت نازل فرمائی۔

عبد ابن حمید اور ابن جریر روایت کرتے ہیں کہ مشہور تابعی مجاہد ارشاد باری: ''لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِى الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ'' کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ: اس سے مراد یہ ہے کہ اگر ہم چاہیں تو تمہارے بدلے ملائکہ سے دنیا کو آباد کر دیں۔ فریابی، سعید بن منصور، مسدد، عبد بن حمید، ابن ابی حاتم اور طبرانی وغیرہ نے مختلف طرق سے ابن عباس کے اس قول کی تخریج کی ہے کہ انہوں نے ارشاد باری ''وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ'' (۱) کی

(۱) یہ سورہ زخرف کی آیت: ۶۱ کا ایک حصہ ہے، اس کے لفظ ''لَعِلْمٌ'' میں دو قراءتیں ہیں اور دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے ثابت ہیں، ایک قراءت میں اسے ''لَعَلَمٌ'' پڑھا گیا ہے (یعنی عین اور دوسرے لام پر فتحہ ہے) حدیث میں یہ قراءت مذکور ہے اور عَلَمٌ کے معنی علامت کے ہیں، لھذا اس قراءت کی رو سے اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ عیسیٰ کا نزول قیامت کی ایک علامت ہے۔

اور دوسری قراءت میں یہ لفظ ''لَعِلْمٌ'' (عین مکسور اور لام ساکن) ہے۔ جمہور قراء کی قراءت یہی ہے، اس قراءت کی رو سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ ''عیسیٰ'' قیامت کے یقین کا ذریعہ ہیں یعنی عیسیٰ کا بغیر باپ کے پیدا ہونا، اس بات کی دلیل ہے کہ جو ذات اس پر قادر ہے وہ قیامت واقع کرنے پر بھی قادر ہے، اس قراءت کے اعتبار سے یہ آیت نزول عیسیٰ کے بجائے ان کی پیدائش سے متعلق ہے (علامات قیامت اور نزول مسیح، ص:۱۰۲) (محمد صغیر)

تفسیر میں فرمایا کہ: یہ قیامت سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بارے میں ہے (یعنی حضرت عیسیٰ کا نزول قرب قیامت کی علامت ہے)۔

عبد بن حمید نے یہ بھی روایت کی ہے کہ ابوھریرہ نے ''وَاِنَّہٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ'' کی تفسیر میں فرمایا کہ: یہ قیامت سے پہلے عیسیٰ کے (نزول) کے بارے میں ہے، آپ نازل ہونے کے بعد چالیس سال دنیا میں رہیں گے، ان ایام میں حج وعمرہ بھی کریں گے، ان چالیس سالوں کی مدت صرف چار سال کے بقدر ہوگی۔

عبد بن حمید اور ابن جریر نے مجاہدؒ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے ''وَاِنَّہٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ'' کی تفسیر کرتے ہوئے کہا عیسیٰ کا (نزول) قرب قیامت کی علامت ہے اور یہی حسن بصری سے منقول ہے کہ اس سے مراد نزول عیسیٰ ہے۔ (انتہی)

میں کہتا ہوں کہ جن حضرات نے ''اِنَّہٗ'' کی ضمیر کا مرجع حضرت عیسیٰ کے بجائے قرآن کو قرار دیا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ علم ونشانی ہونا اسی کے مناسب ہے حالانکہ یہ کوئی اہم دلیل نہیں ہے، اس لیے کہ مجاہد نے لفظ ''علم'' کی تفسیر ''آیۃ'' (نشانی) سے کی ہے اور ابن کثیر لکھتے ہیں کہ: باری تعالیٰ کے قول ''وَاِنَّہٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ'' کے ذیل میں ابن اسحاق کی تفسیر گزر چکی ہے کہ اس سے مراد وہ معجزات ہیں جو عیسیٰ کو نزول کے وقت عطا کئے جائیں گے۔ مثلاً: مردوں کو زندہ کرنا، مادرزاد اندھوں اور کوڑھیوں کو ٹھیک کر دینا وغیرہ، اس سے بھی عجیب بات وہ ہے جسے قتادہ نے حسن بصریؒ اور سعید بن جبیرؒ سے روایت کیا کہ ''وَاِنَّہٗ'' کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ضمیر کا مرجع عیسیٰ ہیں، اس لئے کہ اس سے پہلے عیسیٰ ہی کا تذکرہ ہے نہ کہ، قرآن کا۔ اور اس سے مراد قیامت سے پہلے آپ کا نزول ہے جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وَاِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ قَبْلَ مَوْتِہٖ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَکُوْنُ عَلَیْھِمْ شَھِیْدًا''

(نساء: ۱۵۹)

''یعنی (اس زمانے کے) تمام اہل کتاب عیسیٰ کی تصدیق ان کی موت سے پہلے کر دیں گے (کہ بیشک آپ زندہ ہیں مرے نہ تھے اور آپ نہ خدا ہیں نہ خدا کے بیٹے؛ بلکہ اللہ کے بندے اور رسول ہیں) اور عیسیٰ قیامت کے دن ان اہل کتاب کے خلاف گواہی دیں گے (جنہوں نے ان کو خدا کا بیٹا کہا تھا یعنی نصاری، اور جنہوں نے ان کی تکذیب کی تھی یعنی یہود)''

اس معنی کی تائید ''وَاِنَّہٗ لَعَلَمٌ لِّلسَّاعَةِ'' (عین اور دوسرے لام پر فتحہ کے ساتھ) کی قراءت سے بھی ہوتی ہے، یعنی عیسیٰ قیامت کے وقوع کی دلیل اور نشانی ہیں۔ مجاہد ''وَاِنَّہٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ'' کی تفسیر

کرتے ہیں کہ: قیامت سے پہلے عیسیٰؑ کا نزول علامات قیامت میں سے ہے، یہی تفسیر ابو ہریرہؓ، ابن عباس، ابوالعالیہ، ابو مالک، عکرمہ، حسن، قتادہ، اور ضحاک وغیرہ سے بھی منقول ہے۔ نیز احادیث متواترہ سے یہ ثابت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: قیامت سے پہلے عیسیٰؑ انصاف پسند امام اور عدل گستر حاکم کی حیثیت سے نازل ہوں گے۔

حاصل کلام یہ کہ آیت کریمہ: ''وَاِنَّہٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ'' سے مراد علامات قیامت میں سے ہونا ہے۔ گویا قرآن کریم میں لفظ اشراط (علامات) کے بجائے لفظ ''علم'' ذکر کیا گیا ہے۔ ابھی آپ نے حافظ ابن کثیر کے حوالے سے حضرت عیسیٰؑ کے نزول سے متعلق تواتر احادیث کا دعویٰ سنا۔ اسکی وضاحت انہوں نے سورہ نساء کی تفسیر میں بھی کی ہے اور ان میں سے چند احادیث کو ذکر بھی کیا ہے۔ اسی طرح امام ترمذی نے جامع ترمذی میں ان پندرہ صحابہ کرام کے اسماء ذکر کیے ہیں، جو حضرت عیسیٰؑ کے دجال کو قتل کرنے کی حدیث روایت کرتے ہیں (۱)۔ حافظ ابن حجر نے ''فتح الباری'' میں حسین آبری [''آبر'' سجستان کے قریب ایک بستی ہے] سے نقل کیا ہے کہ نزول عیسیٰؑ کے سلسلے میں احادیث متواتر ہیں اور خود حافظ ابن حجر اپنی کتاب ''التلخیص الحبیر'' کی کتاب الطلاق میں فرماتے ہیں: ''رہا عیسیٰؑ کا آسمان پر اٹھایا جانا، تو تمام محدثین و مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ آپ اسی جسم انسانی کے ساتھ زندہ اٹھائے گئے ہیں، ہاں اس میں اختلاف ہے کہ رفع سے پہلے موت طاری ہوئی تھی یا نیند کی سی کیفیت۔

''فتح الباری: باب ذکر ادریس'' میں ہے کہ: صحیح یہ ہے کہ (جس طرح ادریس علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھایا گیا) اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کو بھی زندہ اٹھایا گیا ہے۔ ''التوضیح فی تواتر ماجاء فی المنتظر والدجال والمسیح'' کے نام سے شوکانیؒ کا ایک مستقل رسالہ ہے، جس میں انہوں نے صحیح، حسن، اور صالح درجہ کی تقریباً انتیس احادیث جن میں اکثر مرفوع ہیں اور بے شمار آثار؛ ذکر کیے ہیں۔

سیوطیؒ نے اپنے رسالہ: ''الاعلام بحکم عیسیٰ علیہ السلام'' میں اس بات کو ذکر کرنے

---

(۱) قال الترمذی حدثنا قتیبة قال: حدثنا اللیث عن ابن شهاب انه سمع عبید الله بن عبدا لله بن ثعلبة الانصاری یُحدث عن عبدالرحمن بن یزید الانصاری من بنی عمرو بن عوف قال: سمعت عمی مجمع بن جاریة الانصاری یقول: سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: یقتل ابن مریم الدجال بباب لُدٍّ. وفی الباب عن عمران بن حصین ونافع بن عتبة وابی برزة وحذیفة بن اسید وابی هریرة وکیسان وعثمان بن ابی العاص وجابر وابی امامة وابن مسعود وعبدالله بن عمرو وسمرة بن جندب والنواس بن سمعان وعمرو بن عوف وحذیفة بن الیمان. هذا حدیث صحیح. (ترمذی، ابواب الفتن، باب ماجاء فی قتل عیسی بن مریم الدجال: ۴۹/۲) (محمد صغیر)

کے بعد کہ جب قرب قیامت حضرت عیسیٰؑ نازل ہوں گے تو شریعت محمدیہ کے مطابق فیصلہ کریں گے، ایک عجیب حدیث ذکر کی ہے:

"اخرجه ابن حبان في صحيحه عن ابى هريرة قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: ينزل عيسىٰ ابن مريم فيؤمهم، فاذارفع رأسه من الركوع قال: سمع الله لمن حمده، قتل الله الدجال، واظهر المؤمنين".

"کہ ابن حبان اپنی صحیح میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: عیسیٰؑ بن مریم نازل ہوں گے، پس (سب سے پہلی نماز فجر کے علاوہ(۱) باقی نمازوں میں) مسلمانوں کی امامت فرمائیں گے، اور نماز پڑھاتے ہوئے رکوع سے سر اٹھا کر "سمع الله لمن حمده" کے بعد (بطور دعا)(۲) فرمائیں گے، "قتل الله الدجال واظهر المؤمنين"۔ (اللہ دجال کو قتل کرے اور مؤمنین کو غالب)"۔

شب معراج میں انبیاء علیہم السلام کی قیامت کے سلسلے میں جو گفتگو ہوئی تھی، جیسا کہ درمنثور میں ہے کہ: سعید بن منصور، احمد، ابن ابی شیبہ، ابن ماجہ، ابن جریر، ابن المنذر، حاکم (صححہ)، ابن مردویہ، اور بیہقی نے "البعث والنشور" میں تخریج کی ہے، وہ یہ ہے:

عن ابن مسعود رضى الله عنه. عن النبى صلى الله عليه وسلم قال: لقيت ليلة أسرى بى ابراهيم، وموسىٰ، وعيسىٰ. عليهم السلام. فتذاكروا أمر الساعة، فردوا أمرهم الى ابراهيم، فقال: لاعلم لى بها، فردوا أمرهم الى موسىٰ، فقال: لا علم، لى بها، فردوا امرهم إلى عيسى. فقال: أماوقتهاء فلايعلم أحد الا الله. تعالىٰ. وفيماعهدالى ربى: ان

(۱) احادیث سے ثابت ہے کہ نزول عیسیٰ کے بعد سب سے پہلی نماز کی امامت امام مہدی کریں گے (ابوطہ صغیر)

(۲) حضرت مولانا مفتی رفیع صاحب عثمانی دامت برکاتہم "علامات قیامت اور نزول مسیح" کے حاشیے میں اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں کہ: احقر کی سمجھ میں یہ آتا ہے کہ یہ ارشاد بطور دعا کے ہوگا قرینہ یہ ہے کہ حدیث میں "سمع الله لمن حمده" کے بعد بغیر عطف کے "قتل الله الدجال واظهر المومنين" آیا ہے اور ظاہر ہے "سمع الله لمن حمده" جملہ دعائیہ ہے۔ لہٰذا مناسب ہے کہ بعد کا جملہ بھی دعائیہ ہو اور بظاہر یہ دعا قنوت نازلہ کے طور پر ہوگی، جو حادثات و مصائب کے وقت مسلمانوں کی حفاظت اور دشمنوں پر فتح کے لئے نماز فجر کی آخری رکعت میں رکوع کے بعد سجدہ سے پہلے قومہ میں کی جاتی ہے۔ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے اسے جملہ خبریہ قرار دیا ہے، پھر اس پر جو اعتراض ہوتا ہے کہ دوسری احادیث میں صراحت ہے کہ عیسیٰ دجال کو اپنے حربہ سے باب لد پر قتل کریں گے اور زیر بحث جملہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اثنائے نماز میں قتل کریں گے، دونوں حدیثوں میں تعارض ہوا تو اس کا جواب انہوں نے اپنے شیخ سے یہ نقل کیا کہ: ہوسکتا ہے کہ یہ صلوٰۃ الخوف ہو، جو باب لد کے مقام پر ادا کی جارہی ہو یعنی کہ اثنائے نماز میں عیسیٰ کو دجال نظر آجائے گا چنانچہ آپ حربہ سے نماز کے اندر ہی اس کا کام تمام کر دیں گے (علامات قیامت اور نزول مسیح ص ۱۰۸ حاشیہ ۱) ابوطہ صغیر

الدجال خارج ومعی قضیبان، فاذا رأنی، ذاب کما یذوب الرصاص، فیهلکه الله اذا رأنی حتی ان الحجر والشجر یقول: یامسلم! ان تحتی کافرا، فتعال فاقتله، فیهلکهم الله، ثم یرجع الناس الی بلادهم وأوطانهم، فعند ذلک یخرج یاجوج وماجوج، وهم من کل حدب ینسلون، فیطأون بلادهم، لایأتون علیٰ شیء الاأهلکوه، ولایمرون علی ماء الاشربوه، ثم یرجع الناس الیّ، فیشکونهم، فادعوا الله تعالیٰ علیهم، فیهلکهم ویمیتهم، حتی تجیف الأرض من نتن ریحهم، فینزل الله المطر، فیجترف أجسادهم، حتی یقذفهم فی البحر، ففیما عهد الی ربی –ان کان کذلک– ان الساعة کالحامل المتم لایدری أهلها متی تفجاهم بولادتها لیلااو أنهاراً.

''عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میں نے شب معراج میں ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ (علیہ السلام) سے ملاقات کی، تو وہ قیامت کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ پس انہوں نے اس معاملہ میں ابراہیم (علیہم السلام) سے رجوع کیا (کہ وہ وقت قیامت کے بارے میں کچھ بتائیں) ابراہیم نے فرمایا کہ: ''مجھے اس کا کوئی علم نہیں'' پھر موسیٰ کی طرف رجوع کیا تو ان کا بھی جواب تھا: ''مجھے اس کا کوئی علم نہیں''۔ پھر عیسیٰ کی طرف رجوع کیا تو انہوں نے یہی کہا کہ جہاں تک وقت قیامت کا معاملہ ہے تو اس کا علم سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں بات تو اتنی ہی ہے، البتہ جو عہد پروردگار عز وجل نے مجھ سے کیا ہے اس میں یہ ہے کہ دجال نکلے گا اور میرے پاس دو باریک نرم سی تلواریں ہوں گی، وہ مجھے دیکھتے ہی رانگ کی طرح پگھلنے لگے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو اس طرح ہلاک کرے گا؛ یہاں تک کہ پتھر اور درخت بھی کہیں گے کہ: اے مسلم! میرے پیچھے ایک کافر (چھپا ہوا) ہے، آ کر اسے قتل کر؛ چناں چہ اللہ تعالیٰ ان سب (کافروں) کو ہلاک کردیگا پھر لوگ اپنے اپنے شہروں اور وطنوں کو واپس ہوجائیں گے، تو اس وقت یاجوج ماجوج نکلیں گے جو (کثرت اور تیز رفتاری کے باعث) ہر بلندی سے پھسلتے ہوئے معلوم ہوں گے، وہ شہروں کو روند ڈالیں گے، جن چیزوں پر ان کا گزر ہوگا اس کا خاتمہ کردیں گے، جس پانی (نہر، چشمہ، کنواں اور دریا وغیرہ) سے گزریں گے، اسے پی کر ختم کردیں گے، پھر لوگ میرے پاس آ کر ان کی شکایت کریں گے میں اللہ تعالیٰ سے ان کے بارے میں بددعا کروں گا، پس اللہ تعالیٰ ان کو ہلاک کردے گا اور مار ڈالے گا حتی کی زمین ان کی بدبو سے متعفن ہوجائیگی، تو اللہ عز وجل بارش برسائے گا، جو ان کی لاشیں بہا کر سمندر میں ڈال دے گی، جن امور کی اطلاع میرے رب نے مجھے دی ہے ان میں یہ بھی ہے کہ: جب ایسا ہو چکے تو قیامت کا حال پورے دنوں کی اس

گابھن (حاملہ) کی طرح ہوگا جس کے مالک کو علم نہیں کہ وہ دن یارات میں کب بچہ دے گی؟

اس حدیث کو ابن حجرؒ نے ''فتح الباری'' میں دجال کے ذکر سے پہلے بیان کیا ہے اور حاکم کی تصحیح پر سکوت اختیار کیا ہے، الحاصل جب آپ کے نزول کے بارے میں احادیث وآثار متواتر ہیں، اور آیۃ کریمہ ''وَاِنَّہٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَۃِ'' کے سیاق سے بھی یہی معنی متبادر ہیں تو (اس آیت کی مذکورہ تفسیر کے علاوہ) دوسری کوئی تفسیر درست نہ ہوگی۔

یہ بھی ذہن نشین رہے کہ جس طرح عیسیٰؑ کے نزول کے بارے میں احادیث متواتر ہیں، اسی طرح پوری امت کا اجماع بھی ہے۔ معتزلہ سے جو اختلاف منسوب ہے اس کی کوئی اصل نہیں ہے، بلکہ یہ اختلاف ملاحدہ وفلاسفہ نے کیا ہے کمافی ''عقیدۃ السفارینی''۔ ''مجمع البحار'' میں امام مالک کا جو قول ہے اور اس کی تاویل کی گئی، اس کی تحقیق یہ ہے کہ وہاں عبارت نقل کرنے میں اختصار سے کام لیا گیا ہے، اُبی وغیرہ نے شرح ''مسلم'' میں ''العتبیہ'' کے حوالے سے امام مالک کا جو قول نقل کیا ہے اس کی عبارت تواتر واجماع کے بالکل موافق ہے۔ ایسے ہی جن لوگوں نے ابن حزم کی جانب اختلاف منسوب کیا ہے اس کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے؛ اس لئے کہ انہوں نے اپنی کتاب ''الملل'' میں عیسیٰؑ کے نزول کے سلسلے میں احادیث کے متواتر ہونے کی خود صراحت کی ہے، اس بدبخت (مرزا غلام احمد قادیانی) نے اپنے مکتوب العربی، ص:۱۳۲، اور ''سر الخلافہ'' میں جو دعوی کیا ہے کہ: امام مالک اور ابن حزم کا مسلک یہ ہے کہ عیسیٰؑ وفات پاچکے ہیں، یہ اس کی جہالت اور حماقت کی دلیل ہے۔ اس کمینے کو جب بھی ایسی کوئی بات نظر آتی ہے جس کی نقل میں کچھ کوتاہی ہوگئی ہو تو اسے لے اڑتا ہے، مگر جب بات واضح ہوجاتی ہے اور صحیح نقل پیش کردی جاتی ہے تو اپنی تشہیر کردہ بات چھپانے لگتا ہے نیز یہ بھی کہتا ہے کہ: عیسیٰؑ کے نزول کے سلسلے میں جو احادیث آئی ہیں، ان میں کہیں بھی لفظ ''السماء'' کی تصریح نہیں ہے، حالانکہ بیہقی کی ''کتاب الاسماء والصفات''، ص:۳۰۱، میں سند صحیح کے ساتھ اور کنز الاعمال، ص:۲۶۸، وص: ۲۵۹، میں لفظ ''السماء'' موجود ہے۔

اُبی کی عبارت یہ ہے:

''وفی العتبیۃ قال مالک: بینا الناس قیام یستمعون لإقامۃ الصلوۃ فتغشاھم غمامۃ، فاذا عیسیٰ قد نزل''۔

''امام مالک کا قول عتبیہ میں ہے کہ لوگ اقامت سننے کے لیے کھڑے ہوں گے کہ اچانک بادل لوگوں کو ڈھانپ لے گا، دیکھیں گے کہ عیسیٰؑ نازل ہوچکے ہیں''۔

آیت قرآنی: ''وَاِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ قَبْلَ مَوْتِہٖ''، پر تفصیلی گفتگو آگے آرہی ہے۔

فصل

نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کی حکمتیں

حافظ ابن حجرؒ ''فتح الباری'' میں لکھتے ہیں کہ حضرات علماء ومحدثین کے بقول دوسرے تمام انبیاء کرام کو چھوڑ کر صرف عیسیٰ علیہ السلام کو نازل کرنے کا مقصد یہود کے اس خیال خام کی تردید ہے کہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کردیا ہے (العیاذ باللہ) چناں چہ اللہ رب العزت آپ کو نازل فرما کران کے کذب کو ظاہر کریں گے۔

آپ کے نزول کی دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ آپ کی موت کا وقت قریب ہوگا، زمین میں دفن کرنے کی غرض سے آپ کو نازل کیا جائے گا، کیوں کہ قانون قدرت ہے کہ ہر خاکی کو خاک ہی میں جانا ہے۔

تیسری وجہ یہ بیان کی گئی کہ عیسیٰ علیہ السلام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کے اوصاف کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ: مجھے محمد (ﷺ) کا امتی بنادیا جائے، اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو قبولیت سے نوازا؛ اسی لئے آخر زمانے میں آپ مجدد اسلام بنا کر نازل کئے جائیں گے۔ اتفاق سے اسی زمانے میں دجال کا خروج بھی ہوگا، تو آپ اسے قتل بھی کریں گے۔

مذکورہ تینوں وجہوں میں سے پہلی وجہ زیادہ صحیح ہے۔

''حاشیہ المغربی علی سنن ابی داوٗد'' میں ہے کہ: یہود نے جب یہ دعویٰ کیا کہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر چڑھادیا ہے، تو اللہ رب العزت نے ان پر ایسی ذلت طاری کی کہ پھر نہ تو کبھی ان کا جھنڈا بلند ہوسکا، نہ کہیں حکومت قائم ہوسکی اور نہ ہی شان وشوکت باقی رہ گئی قرب قیامت تک ان کی یہی حالت رہے گی (۱)، یہاں تک کہ جب دجال کا خروج ہوگا تو یہود اس کی اتباع کرتے ہوئے اس کی فوج میں شامل ہوجائیں گے، منصوبہ یہ ہوگا کہ: اس کے تحت مسلمانوں سے انتقام لیں۔ جب یہ نوبت آجائے گی تو اللہ

(۱) موجودہ اسرائیلی حکومت سے اس قول پر جو اعتراض ہوتا ہے، اس کا مفصل جواب صفحہ ۶۸ کے حاشیہ پر آیت کریمہ ''وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّکَ'' کے تحت ملاحظہ کریں (محمد صغیر)

تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کونازل فرمائیں گے جن کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ہم نے انہیں ختم کردیا ہے۔ آپ کا یہ نزول یہود اور کفار ومنافقین کی سرکوبی کے لیے ہوگا، حضرت عیسیٰؑ کوان کے خودساختہ رب کے مقابلے میں غلبہ عطا ہوگا، آپ اسے قتل کریں گے اوران سب کوایسی ذلت آمیز شکشت ہوگی کہ ہلاکت کے علاوہ کوئی راہ فرار نظر نہ آئے گی۔

مسیح ہدایت اور مسیح ضلالت

میں کہتاہوں کہ: اس طرح دو مسیح ہوئے: ایک مسیح ہدایت (یعنی عیسیٰ علیہ السلام) دوسرا مسیح ضلالت (یعنی دجال اکبر)۔ جب مسیح ہدایت تشریف لائے تو یہود نے انہیں مسیح ضلالت سمجھا (العیاذ باللہ) اور مسیح ہدایت کا انتظار کرتے رہے، پھر جب مسیح ضلالت (دجال) آئے گا تو اسے مسیح ہدایت سمجھ کراس کی اتباع کریں گے۔ اسی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ان الیھود اکثر اتباعہ" (اس کے پیروکاروں میں سب سے زیادہ یہود ہوں گے) چونکہ دجال مسیح ہونے کا دعوی کرے گا اور مسیح ہی اس کا نام ہوجائے گا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی ہلاکت مسیح ہدایت حضرت عیسیٰؑ کے ہاتھوں مقدر کردی، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے ہاتھوں سے ابی بن خلف کو قتل کیا تھا۔ وہ بدبخت حضور اکرم سے کہتا تھا کہ: میں نے ایک گھوڑا پال رکھا ہے، جس پر سوار ہوکر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کروں گا۔ جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بل انااقتلک علیہ انشاء اللہ" (سیرت ابن ھشام: ۳/۴۷)

"میں ہی تجھے قتل کروں گا انشاء اللہ"۔

چناں چہ اُحد کی لڑائی میں وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں مارا گیا۔

حضرت عیسیٰؑ آسمان سے سرزمین شام پر اتریں گے، جہاں سے آپ آسمان پر اٹھائے گئے تھے، پھر اس کو فتح کریں گے، جس طرح کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ فتح کیا اور جن یہودیوں نے آپ کو نکالا تھا، ان کا خاتمہ فرمادیں گے؛ اس لیے کہ جتنی قومیں گزری ہیں، ان سب نے اپنے نبی کے بعد آنے والے نبی کی بھی اتباع کی جیسا کہ ان سے: "وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ" (آل عمران: ۸۱) میں عہد لیا گیا تھا، لیکن یہودیوں نے اپنے بعد والے نبی حضرت عیسیٰؑ کی پیروی نہیں کی اور باری تعالیٰ نے جو عہد لیا تھا اس کو توڑ دیا۔ (اس بدعہدی اور بے ایمانی کی وجہ سے) اللہ تعالیٰ نے ان پر ذلت مسلط کردی

اور حضرت عیسیٰؑ کے ہاتھوں تباہ و برباد کر دیا۔ رہے رومی تو ان کی طرف باری تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں اشارہ فرمایا:

"الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْ اَدْنَی الْاَرْضِ وَھُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِھِمْ سَیَغْلِبُوْنَ" (الروم: ۱۔۳)

"مغلوب ہو گئے رومی ملے ہوئے ملک میں اور وہ اس مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب ہوں گے"۔

یعنی رومیوں کی صدیوں تک یہی حالت رہے گی، جب کوئی قرن ختم ہوگا تو دوسرا قرن شروع ہو جائے گا اور یہی سلسلہ چلتا رہے گا کہ کبھی یہ غالب ہوں گے اور کبھی وہ، جیسا کہ "الخصائص" میں حدیث کے الفاظ ہیں "یَغلبون ویُغلبون" ان کا قطعی خاتمہ مقدر نہیں (قربِ قیامت) حضرت عیسیٰؑ ان کی اصلاح وہدایت کے لیے تشریف لائیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو آسمان پر اٹھا کر بنی اسرائیل کے ہاتھوں حضرات انبیاء کرامؑ کو شہید کرنے کا سلسلہ ختم کر دیا اور یہ دکھا دیا کہ وہ اس پر قادر ہے۔ پھر اس نے عیسیٰؑ کا نزول مقدر فرما کر یہ بات بتا بھی دی۔ حضرت عیسیٰؑ کے دین میں اب تک جو لوگ بھی داخل ہوئے وہ یہودی نہ تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ بات مقدر کر دی کہ اہل کتاب میں سے کوئی شخص ایسا نہ رہ جائے جو نزول کے وقت آپ پر ایمان نہ لائے۔

قوموں کی ہلاکت اور سنت اللہ

سنت اللہ یہ ہے کہ جب کسی قوم میں کوئی نبی مبعوث ہوتا ہے تو اس قوم نے اگر ایمان قبول کر لیا تو ٹھیک ہے ورنہ ان کو ہلاک و برباد کر دیا جاتا ہے (یا نبی کو ہجرت کا حکم دے کر مہلت عنایت فرما دی جاتی ہے) مگر یہ معاملہ صرف ان کے ساتھ ہوتا ہے جن کی طرف نبی کی بعثت ہوئی؛ چناں چہ اہل عرب کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کا یہی مسلک ہے کہ یا تو وہ اسلام قبول کریں یا پھر تلوار ان کا فیصلہ کرے گی، اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں۔ اللہ رب العزت نے حضرت نوح، ہود، صالح، لوط اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی قوموں کے واقعات میں اپنے اسی قانون کی طرف اشارہ کیا ہے (کہ جب ان کی قوموں نے ایمان قبول کرنے سے انکار کر دیا تو ان سب کو ہلاک و برباد کر دیا گیا) اور ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں دوسرے اصول (یعنی انکار کی صورت میں نبی کو ہجرت کا حکم دے کر مہلت دیدی جاتی ہے) کو بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

"فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ وَقَالَ اِنِّیْ مُھَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ اِنَّهٗ ھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ" (العنکبوت: ۲۶)

"پھر مان لیا اس کو۔ یعنی ایمان لایا ابراہیم علیہ السلام کی نبوت پر لوط علیہ السلام نے اور وہ (ابراہیم

بولا) میں وطن چھوڑتا ہوں، اپنے رب کی طرف، بیشک وہ ہی زبردست حکمت والا ہے"۔

چناں چہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے ہجرت شروع ہوئی آپ کو عراق سے شام کی طرف ہجرت کا حکم ہوا (اور قوم کو مہلت دے دی گئی) نمرود حام کی اولاد سے تھا اور ابراہیم علیہ السلام سام کی اولاد سے۔ اگر حضرت ابراہیمؑ کو ہجرت کا حکم نہ ہوا ہوتا تو اسی وقت پوری قوم ہلاک کردی گئی ہوتی۔ غالباً اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہجرت کا حکم ہوا اور شاید آیت کریمہ:

" وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ " (الانفال : ٣٣)

"اور اللہ ہرگز نہ عذاب کرتا ان پر جب تک تو رہتا ان میں"۔

میں بھی اس طرف اشارہ ہے۔

(بنی اسرائیل کو اتنی زیادہ مہلت اس لئے دی گئی کہ) یہ انبیاء کرام کی اولاد سے تھے، حضرت موسیٰ اور ان کے بعد آنے والے انبیاء کرامؑ پر ایمان بھی رکھتے تھے اگر چہ بعض انبیاء کی نافرمانی بھی کی۔ لیکن انبیاء ورسل اور غیر انبیاء ورسل کی اولاد میں فرق کرتے ہوئے پوری قوم کو ہلاک نہیں کیا گیا۔ پھر جب حضرت عیسیٰؑ رسول بنا کر ان کے پاس بھیجے گئے [آپ اپنے پیش رو انبیائے بنی اسرائیل کی طرح نہ تھے، چناں چہ آپ سے پہلے کے انبیاء نے توریت کے کسی بھی حکم کو منسوخ نہ کیا تھا؛ جب کہ آپ نے بعض احکامات کو منسوخ کردیا] تو یہ لوگ آپ کے منکر ہو گئے، لہذا اللہ تعالی نے (اپنے دوسرے اصول پر عمل کرتے ہوئے) آپ کو آسمان پر اٹھا کر ہجرت کا شرف بخشا اور پھر قرب قیامت نزول مقدر کردیا، تا کہ سنت اللہ کے مطابق جو لوگ ایمان لائیں نجات پائیں اور جو لوگ منکر رہیں وہ ہلاک و برباد کردئے جائیں۔ آیت کریمہ:

"وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ"، (النساء : ١٥٩) ...

"اور جتنے فرقے ہیں اہل کتاب کے سو عیسی پر یقین لاویں گے اس کی موت سے پہلے"۔

سے یہی مراد ہے کہ اہل کتاب کے لئے ابھی ایمان کا ایک جز باقی ہے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ پر آپؑ کی وفات سے پہلے ایمان لائیں (لہذا آپ کے نزول کے بعد اہل کتاب کے لیے آپ پر ایمان لانا لازم ہوگا)

برخلاف امت محمدیہ کے کہ ان کے اجزائے ایمان مکمل ہیں، کوئی جز باقی نہیں، ہاں صرف اتنا ہے کہ امت محمدیہ کے لیے اس بات پر ایمان لانا ضروری ہے کہ: حضرت عیسیٰؑ بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور قرب قیامت امت محمدیہ کے درمیان انصاف پسند اور عدل گستر امام کی حیثیت سے تشریف لائیں گے (بنی اسرائیل کو اہل کتاب ہونے کی وجہ سے جو اتنی زیادہ مہلت دی گئی) یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ امام

شافعیؒ کے نزدیک اہل کتاب پر صرف جزیہ عائد ہوتا ہے۔

سورہ شعراء اور دیگر سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء علیہم السلام کی قوموں کے جو واقعات بیان فرمائیں ہیں، انہیں ملاحظہ کیا جائے۔ ان سب کا خلاصہ یہی ہے کہ: جب ان قوموں نے اپنے نبیوں کی تکذیب کی تو اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو کشتی پر سوار کر کے بچالیا اور قوم کو غرق کر دیا، اور کبھی کسی نبی کو بچا کر بقیہ پوری قوم کو تہہ و بالا کر دیا، بعض کے ساتھ یہ کیا کہ ان کے لیے آگ کو بقعہ نور بنادیا، پھر ہجرت کا حکم دے دیا، بعض کے لیے سمندر میں راستہ بنادیا اور ان کے دشمنوں کو غرق کر دیا۔ (اسی قانون قدرت کے مطابق تکذیب کے بعد) حضرت عیسیٰؑ کو آسمان پر زندہ اٹھالیا؛ اس لیے کہ اگر آپ ان کے درمیان موجود رہتے تو جن لوگوں نے تکذیب کی تھی، سب کو ختم کر دیا جاتا (خلاصہ یہ کہ مہلت دے کر) ان کے بقاء کو مقدر کر دیا اور اہل کتاب کے حکم کے مطابق ان پر جزیہ عائد کر دیا، جو کہ امام شافعیؒ کا مسلک ہے۔

آیت کریمہ:

"اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ" (آل عمران: ۱۱۲)

"(اور چھاپ دی گئی ان پر ذلت جہاں کہیں بھی پائے جائیں گے) مگر ہاں ایک تو ایسے ذریعہ کے سبب جو اللہ کی طرف سے ہے اور ایک ایسے ذریعہ کے سبب جو آدمیوں کی طرف سے ہے"۔

میں "وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ" سے مراد یہی جزیہ ہے امت محمدیہ میں جس کی نظیر:

"وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ" (الانفال: ۳۳)

"اور اللہ ہرگز نہ عذاب کرتا ان پر جب تک تو رہتا ان میں"۔

اور "حَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ" کی نظیر:

"وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ" (الانفال: ۳۳)

"اور اللہ ہرگز نہ عذاب کرے گا ان پر جب تک وہ معافی مانگتے رہیں گے"۔

ہے جب بنی اسرائیل کو مکمل تباہ نہیں کیا گیا (بلکہ مہلت دے دی) تو قرب قیامت حضرت عیسیٰؑ کے نزول کو طے کر دیا گیا، تاکہ اب ایمان لائیں مامون و مغفور ہو جائیں اور جو نافرمانی و سرکشی پر ڈٹے رہیں، انہیں تباہ و برباد کر دیا جائے۔ آپ کے نزول کے وقت سقوط جزیہ اہل کتاب کے طریقے کے اعتبار سے ملحوظ خاطر ہوا، ورنہ حکم کے اعتبار سے عام ہے۔ ارشاد ربانی:

"وَاِذْتَاَذَّنَ رَبُّکَ لَیَبْعَثَنَّ عَلَیْھِمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ مَنْ یَّسُوْمُھُمْ سُوْءَ الْعَذَابِ" (۱)

(الاعراف: ۱۶۷)

''اوراس وقت کویاد کرو جب خبر دی تھی تیرے رب نے کہ ضرور بھیجتا رہے گا یہود پر قیامت کے دن تک ایسے شخص کو کہ دیا کرے ان کو برا عذاب''۔

کے تحت صاحب ''روح المعانی'' لکھتے ہیں (یہ سلسلہ چلتا رہا، کہ کوئی نہ کوئی ان یہود پر مسلط ہوتا رہا) یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو معاملہ ان کے ساتھ کرنا تھا کیا، (اولاً معاہدہ کیا) پھر بدعہدی کے جرم میں ملک بدر کر دیا، پھر ان پر جزیہ قائم کیا، جو قیامت تک ان پر نافذ رہے گا، یہود کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بعد نزول ایمان لانا ضروری ہوگا صرف اتنا ایمان کافی نہ ہوگا؛ کہ آپ زندہ ہیں۔ ہاں امت محمدیہ کے لیے صرف اس بات پر ایمان لے آنا کافی ہے کہ آپ ایک قوم کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے تھے؛ پھر کسی حاجت وضرورت کے باعث دوسری قوم میں چلے گئے، جیسا کہ یعقوب علیہ السلام (مصر میں یوسف علیہ السلام کی حکومت قائم ہونے کے بعد فلسطین سے) مصر چلے آئے تھے۔

---

(۱) علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی اپنے تفسیری فوائد میں اس آیت کے تحت تحریر فرماتے ہیں: یعنی خدا کی طرف سے پختہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ یہود اگر احکام تورات پر عمل کرنا چھوڑ دیں گے تو حق تعالیٰ قرب قیامت تک وقتاً فوقتاً ان پر ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو ان کو برے عذاب میں مبتلا رکھیں۔ برا عذاب یہاں محکومانہ زندگی کو فرمایا؛ چناں چہ یہود کبھی یونانی اور کلدانی بادشاہوں کے زیر حکومت رہے، کبھی بخت نصر وغیرہ کے شدائد کا تختہ مشق بنے۔ آخر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک تک مجوسیوں کے باجگزار رہے، پھر مسلمان حکمرانوں کو ان پر مسلط فرمادیا۔ غرض اس وقت سے آج تک ان کو من حیث القوم عزت وآزادی کی زندگی نصیب نہیں ہوئی؛ بلکہ جہاں کہیں رہے اکثر ملوک وحکام کی طرف سے ذلت اور خطرناک تکلیفیں اٹھاتے رہے، ان کا مال اور دولت وغیرہ کوئی چیز اس غلامی ومحکومیت کی لعنت سے نجات نہ دے سکی اور نہ قیامت تک دے سکے گی۔ آخر میں جب یہ لوگ دجال کے مددگار ہو کر نکلیں گے تو مسیح علیہ السلام کے مسلمان رفقاء کے ہاتھوں سے تہہ تیغ کیے جائیں گے۔ کما ورد فی الحدیث۔ (انتہی)

موجودہ یہودی ریاست ''اسرائیل'' سے اس آیت پر شبہ نہ ہو۔ سورہ آل عمران کی آیت ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِنَ النَّاسِ (آل عمران: ۱۱۲۔ چھاپ دی گئی ان پر ذلت جہاں کہیں بھی پائے جاویں، مگر ہاں ایک تو ایسے ذریعہ کے سبب جو اللہ کی طرف سے ہے اور ایک ایسے ذریعہ کے سبب جو آدمیوں کی طرف سے ہے) میں "حَبْلٍ مِنَ النَّاسِ" کے ذریعہ جو استثناء ہے اس کا جہاں ایک مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو جزیہ دے کر معاہدہ صلح کر کے مامون ومحفوظ ہو سکتے ہیں وہیں یہ بھی ہے کہ دیگر غیر مسلم طاقتوں سے بھی صلح کر کے محفوظ ہو سکتے ہیں۔ چناں چہ جاننے والے جانتے ہیں کہ درحقیقت آج بھی اسرائیل کی نہ اپنی کوئی قوت ہے اور نہ حکومت۔ بلکہ وہ امریکہ وبرطانیہ کی اسلام دشمن شازش کے نتیجے میں انہیں کی ایک چھاؤنی ہے۔ ان حکومتوں کی امداد سے زندہ ہے، ان کے تابع فرمان ہے، اس حقیقی غلامی کو مجازی حکومت کا نام دینے سے اس قوم کو کوئی اقتدار حاصل نہیں ہو جاتا۔

دوسرے یہ کہ مسلم گوریلا مجاہدین سے ہر وقت خوف زدہ رہتی ہے، کسی بھی وقت چین وسکون انہیں حاصل نہیں ہے (محمد صغیر)

سفارینی نے اپنی کتاب ''العقیدۃ'' میں سوال قبر کی بحث میں لکھا ہے کہ: حکیم ترمذی نے پہلی امتوں سے سوال قبر نہ ہونے پر اس طرح استدلال کیا ہے کہ: پہلی امتوں میں جب رسول آتے اور قوم ایمان لانے سے انکار کرتی تو تبلیغ سے رک جاتے اور قوم سے الگ ہو جاتے؛ جس کی وجہ سے قوم پر فوراً عذاب آجاتا اور اہل ایمان واہل کفر ممتاز ہو جاتے۔ پھر سوال کی ضرورت کیا رہی؟ جب اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمت العالمین بنا کر بھیجا تو عذاب عام کو بند کر دیا اور تلوار عنایت فرمائی؛ چنانچہ کچھ نے اولاً تلوار کے خوف سے اسلام قبول کیا، پھر آہستہ آہستہ ایمان ان کے دلوں میں راسخ ہوا اور سچے مسلمان ہو گئے، یہیں سے نفاق کی ابتداء ہوئی، منافقین دلوں میں کفر چھپا رکھتے اور قتل کے خوف سے خود کو مسلمان ظاہر کرتے، اور یوں مسلمانوں کے درمیان چھپے رہتے، ان کی وفات ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے قبر میں عذاب دینے والے فرشتوں کو ان پر مسلط کر دیا، تاکہ ان کے سوال کے جواب میں اپنے دل کی بات ظاہر کریں اور اللہ تعالیٰ بدکردار لوگوں کو نیک لوگوں سے جدا کر دے۔

آغاز جہاد

حافظ ابن تیمیہ ''الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح'' میں لکھتے ہیں کہ: مشہور یہ ہے کہ تورات کے نزول کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے جھٹلانے والی قوموں کو کسی عام آسمانی عذاب سے ہلاک نہیں کیا، جیسا کہ قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود اور قوم لوط وغیرہ کو ہلاک کیا، بلکہ اہل ایمان کو کافروں سے جہاد کرنے کا حکم دیا، چناں چہ موسیٰ علیہ السلام کی معرفت بنی اسرائیل کو جابر ظالم لوگوں سے قتال کا حکم دیا گیا، یوشع، داؤد، سلیمان اور دیگر انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کا بھی کفار سے جہاد مشہور و معروف ہے، تفصیل کے لیے دیکھیے ''الجواب الصحیح''، ج:۴، ص:۲۷۵۔ ج:۱، ص:۲۹۹۔

مستدرک حاکم میں عبدالرحمن بن سابط سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا:

''انہ لم تھلک أمة الا الحق نبیھا بمکة فیعبد فیھا حتی یموت، وأن قبر ھود بین الحجر وزمزم'' (مستدرک حاکم: ۶۱۵/۲)

''جب بھی کوئی امت ہلاک ہوئی تو ان میں مبعوث نبی مکہ مکرمہ آگئے اور وفات تک وہیں عبادت میں مشغول رہے چناں چہ ہود علیہ السلام کی قبر حطیم اور زمزم کے وسط میں ہے''۔

یہ درمنثور میں بھی مرفوعاً موجود ہے اور جامع البیان میں سورہ یٰسین کی تفسیر کے تحت ہے کہ: ''بہت سے علمائے

سلف نے اللہ تعالیٰ کے قول:

”وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ مِنْ م بَعْدِ مَآ اَھْلَکْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلیٰ “(قصص:۴۳)

”اور دی ہم نے موسیٰ کو کتاب بعد اس کے کہ ہم غارت کر چکے پہلی جماعتوں کو“۔

کی تفسیر میں فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نے تورات نازل فرمانے کے بعد عذاب عام کے ذریعے کسی بھی قوم کو ہلاک نہیں کیا، بلکہ مسلمانوں کو مشرکین سے جنگ کرنے کا حکم دیا“۔

روح المعانی[ج:۷/ص:۴۵۹] میں علامہ سید محمود آلوسیؒ[جو کہ دو واسطوں سے میرے شیخ ہیں] آیت کریمہ:

”اِنَّ الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْ آیَاتِ اللّٰہِ بِغَیْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰھُمْ“(المؤمن:۵۶)

”جو لوگ جھگڑتے ہیں اللہ تعالیٰ کی باتوں میں بغیر کسی سند کے جو پہنچی ہو ان کو“۔

کے شان نزول کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

”اخرج عبد بن حمید و ابن ابی حاتم بسند صحیح عنه–ای ابی العالیة– قال: ان الیھود أتوا النبی صلی الله علیه وسلم فقالوا :ان الدجال یکون منا فی آخر الزمان، ویکون من أمره مایکون : فعظموا أمره، وقالوا: یصنع کذاو کذا فانزل الله.“

”کہ عبد بن حمید اور ابن ابی حاتم نے سند صحیح کے ساتھ ابو العالیہ سے روایت کی ہے کہ: یہود نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے“ کہ: آخری زمانے میں دجال ہم میں سے ہوگا، اور اس کا معاملہ یوں یوں ہوگا، انہوں نے اس سے متعلقہ امور کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا اور کہا کہ: وہ یہ یہ کرے گا، تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی“۔

نیز لکھتے ہیں:

”ففی بعض الروایات: انھم قالوا للنبی ﷺ لست صاحبنا–یعنون النبی المبشر به انبیائھم –بل ھو المسیح ابن داؤد یبلغ سلطانه البر و البحر ویسیر معه الأنھار“.

”بعض روایتوں میں ہے کہ یہودیوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ:”آپ ہمارے صاحب نہیں ہیں[ان کی مراد وہ نبی تھے جن کی ان کے انبیاء نے بشارت دی تھی] بلکہ وہ مسیح بن داؤد ہیں، جن کی حکومت بحر و بر پر چھا جائے گی اور ان کے ساتھ نہریں چلیں گی“۔

اس کے علاوہ اور بھی دوسرے آثار در منثور میں ہیں۔ ان روایات میں لفظ”دجال“ کی تعبیر شاید راویوں کی جانب سے ہوگئی ہے، یہود کی نہیں ہے، اس لیے کہ یہود اس کی اتباع کریں گے تو بعید ہے کہ اس کا نام ’دجال‘ رکھیں۔

مسیح کی تحقیق

(مسیح سیدنا عیسیٰ کا بھی لقب ہے اور دجال مردود کا بھی؛ لیکن دونوں میں فرق ہے) وہ مسیح جو حضرت عیسیٰ کا لقب ہے؛ صحیح قول کے مطابق عبرانی لفظ ہے، جیسا کہ روح المعانی میں ہے، عبرانی میں اس کی اصل ''ماشیح'' ہے، جس کے معنی ''مبارک'' کے ہیں، اور یہی معنی عربی سے ملے جلے ہیں، عربی میں ''مسیح'' کے چند معانی میں سے ایک ''مبارک'' بھی ہیں، جیسا کہ ''قاموس'' میں ہے(۱)۔

اور ''عیسیٰ''، ''ایشوع'' کا معرب ہے، یہ لفظ ان کے یہاں مخلص کے معنی میں ہے۔ اسی لیے مصروشام وغیرہ سے آکر عرب میں بسنے والے نصرانیوں کی عبارت میں، کثرت سے مسیح کی تعبیر لفظ ''السید المخلص'' سے کی گئی ہے۔ گویا کہ مخلص انجیل میں وارد لفظ ''فارقلیط'' سے ماخوذ ہے، جب کہ علمائے اسلام اس لفظ ''فارقلیط'' کو نبی اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا لقب قرار دیتے ہیں اور اس کی تعبیر احمد سے کرتے ہیں۔ حافظ ابن تیمیہ نے ''الجواب الصحیح'' [ج:۴/ص:۷] میں یہی لکھا ہے۔ اس سلسلے میں فریقین میں طویل نزاع ہوا اور بہت سی کتابیں اس موضوع پر لکھی گئیں۔

رہا وہ لفظ ''مسیح'' جو دجال کا لقب ہے، اس کی اصل بالاتفاق عربی ہے، ''روح المعانی'' میں بھی یہی ہے، بعض کی تحقیق ہے کہ: یہ ''ممسوح العین'' کے معنی میں ہے اور بعض کی کچھ اور تحقیقات اس بارہ میں ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ دونوں مسیحوں کے درمیان تضاد ہے، یہودیوں نے مسیح ہدایت کے بدلے مسیح ضلالت کو اختیار کیا ہے، اللہ تعالیٰ ہی ہدایت دینے والا ہے اسکے علاوہ کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔



---

(۱) قاموس کے الفاظ یہ ہیں: ''والمسیح عیسی صلی اللہ علیہ وسلم لبرکتہ''۔ (مادہ مسح) محمد صغیر

فصل

عالم دنیا کی تمثیل اور خالق و مخلوق کی نسبت

یہاں بطورِ تمہید فلسفۂ تصوف سے متعلق ایک بحث ضروری ہے:

وہ یہ کہ عالمِ دنیا صوفیاء کے خیال میں لذا ابتداء تا انتہاء شخصِ کبیر ہے، جس کو انسانِ کبیر کا بھی نام دیا جاتا ہے اور انسان کو عالمِ صغیر کہا جاتا ہے، جس طرح انسان کا بدن بہت سے اعضاء و جوارح اور ارواح سے مرکب ہے اور اس کی مختلف قوتیں اور بہت سی تاثیرات ہیں، پھر کچھ اعضاء ذریعہ اور واسطہ ہیں اور کچھ اصل، ان میں کچھ حاکم ہیں اور کچھ محکوم، مثلاً: دل اور دماغ، اعضائے رئیسہ میں سے ہیں، ان کا حکم ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضاء پر چلتا ہے۔

اسی طرح ارواح کی بھی تین قسمیں ہیں: طبعی، حیوانی اور نفسانی۔ نفسانی قوتیں بھی بہت سی ہیں: بعض محرکہ ہیں اور بعض مدرکہ (اسی طرح بعض جاذبہ ہیں اور کچھ دافعہ) ان سب کے باوصف، وہ انسان زید ہے، اور ایک ہے مختلف الانواع احکام و صفات کے باوجود متعدد نہیں۔

اسی طرح یہ عالمِ دنیا ابتداء و انتہاء اور بلندی و پستی کے ہوتے ہوئے بھی شخصِ واحد ہے، اس کی ایک انتہاء ہے اور ایک کمال، یہ نہیں کہ ہر ہر قرن، الگ الگ عالم ہے۔

یہ شخصِ کبیر میرے نزدیک عدمِ محض کے پیچھے آنے والا ہے (یعنی پہلے معدوم تھا پھر وجود میں آیا) جس کو بعض معقولی ''سبقتِ دہریہ'' سے تعبیر کرتے ہیں اور یہی تعبیر صحیح ہے۔ یہ وجودِ ظاہری ان مخفی پنہائیوں سے پیدا ہوا، جہاں نہ کوئی زمانہ تھا، اور نہ زمانی چیز، کیونکہ زمانہ اور زمانیات تو اس وجود کے بعد ہیں، جب اللہ تعالیٰ کے اسمِ باطن کے حکم سے اسمِ ظاہر کی جانب یہ حالت پہنچی۔ اوّل سے آخر تک عالمِ شہود کے امتداد کا نام عرضِ عالم ہے اور اس کا ایک دوسرے سے مربوط ہونا، نیز مبادیات کا تسلسل کے ساتھ زینہ بہ زینہ بارگاہِ باری

تعالیٰ تک رسائی کا نام طول عالم ہے، ان مبادیات کی بابت ہمیں بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے، شاید یہ اللہ تعالیٰ کے مختلف شئون ہوں۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

" كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ " (الرحمن: ۲۹)

''ہر آن وہ نئی شان میں ہے''۔

ہم بس اتنا کہہ سکتے ہیں کہ یہ عالم شہود نو پید ہے، عدم کے بعد وجود میں آیا ہے۔ جیسے کہ مبادیات چڑھتے چڑھتے مجرد تک اور مقداری ابعاد چڑھتے چڑھتے بعد مجرد تک پہنچتے ہیں، اسی طرح یہ عالم، زمان اور زمانیات سے چڑھتے چڑھتے اس مقام تک پہنچ جاتا ہے، جہاں پر نہ کوئی زمانہ ہے اور نہ کوئی زمانی چیز۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

"إن ربكم ليس عنده ليل و لانهار نور العرش من نور وجهه"

''تمہارے رب کے پاس نہ رات ہے، نہ دن، عرش کا نور اسی کی ذات کے نور کے طفیل ہے''۔

حافظ ابن قیم کی ''قصیدہ نونیہ'' میں ہے

قال ابن مسعود كلاما قدحكا ❁ ه الدارمى عنه بلا نكران

ماعنده ليل يكون ولانها ❁ رقلت تحت الفلک يوجد ذان

''عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا جس کو دارمی محدث نے بلانکیر نقل کیا، کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں نہ رات ہے، نہ دن، میں کہتا ہوں کہ رات و دن تو آسمان کے نیچے ہیں اور اس کی ذات تو بہت اعلیٰ ہے''۔

نور السمٰوات العلى من نوره ❁ والارض كيف النجم والقمران

من نوروجه الرب جل جلاله ❁ وكذاحكاه الحافظ الطبرانى

''جب کہ آسمانوں اور زمین کا نور اسی کے نور سے ہے، تو ستاروں اور چاند و سورج کی کیا حیثیت یہ سب اللہ جل جلالہ کی ذات کے نور سے منور ہیں، حافظ سلیمان بن احمد الطبرانی نے یوں ہی نقل کیا ہے''۔

ہوسکتا ہے کہ حدیث شریف:

"ان اللّٰه لا ينام ، ولا ينبغى له ان ينام، يخفض القسط، ويرفعه، يرفع اليه عمل الليل قبل عمل النهار ، وعمل النهار قبل عمل الليل، حجابه النور "، (مسلم شریف: ۱/ص: ۹۹)

''بیشک اللہ تعالیٰ نہ سوتے ہیں اور نہ سونا ان کے لائق ہے، وہی میزانِ عدل کو جھکاتے اور اٹھاتے ہیں۔ رات کا عمل، دن کے عمل سے پہلے اور دن کا عمل، رات کے عمل سے پہلے، اس کی بارگاہِ ایزدی میں پیش کردیا

جاتا ہے، اس کا حجاب نور ہے''۔

کا بھی یہی مفہوم ہو۔ پس بارگاہِ عالی لیل ونہار سے وراء الوراء ہے، روح المعانی میں اس حدیث کو آیتِ کریمہ:

''وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا''، (الزمر : ۹)

''اور چمکے زمین اپنے رب کے نور سے''۔

کی تفسیر میں لائے ہیں۔

اس مقام میں اشیاء کے اندر نہ تو تعاقبِ زمانی ہے اور نہ حیز و مکان میں ایک دوسرے سے کشمکش ہوتی ہے، ہاں جب یہ اشیاء زمان و مکان کے عالم میں اترتی ہیں، اس وقت ان میں ترتیب اور کشاکش ہوتی ہے، اس کی مثال کلامِ نفسی ہے، کہ وہ ایک بسیط حالت ہے، اس کی شان یہ ہے کہ کسی بات کا فائدہ دے، اس میں بعضیت و جزئیت کا سوال نہیں، ہاں جب یہی کلامِ نفسی، کلامِ لفظی ہو جائے، تب اس میں اجزاء ہوں گے اور بعض اجزاء بعض کے پیچھے آئیں گے۔ یا جیسے ارادے کا فعل پر انطباق۔ ارادہ امرِ دفعی ہے، اس میں تقدیم و تاخیر نہیں، ایک بارگی آتا ہے اور فعل جو کہ اعضاء کے ذریعے صادر ہوتا ہے، تدریجی ہے، اس میں تقدیم و تاخیر ہوتی ہے، اس کے باوجود ارادہ بسیط اس تدریجی فعل کو شامل ہوتا ہے، اسے یوں سمجھئے کہ: کسی عمارت کا ایک ذہنی نقشہ ہے کہ اس کے اجزاء میں کوئی کشمکش نہیں اور نہ ہی اس کے لئے حیز و مکان ہے، لیکن یہی عمارت جب موجود ہوتی ہے تو اس کے اجزاء بھی ہیں اور حیز و مکان بھی۔ ایسے ہی علت کا، معلول سے تقدمِ ذہنی ہے، کہ ذہن میں رہتے ہوئے تقدمِ ذاتی مانا جاتا ہے، لیکن یہی تقدمِ ذاتی جب عالمِ زمان میں منتقل ہو تو تقدمِ زمانی ہوتا ہے۔

علامہ سبکیؒ اور ان کے بعد شیخ ابن ہمام نے ''التحریر'' میں جو فرمایا ہے کہ: علت و معلول کے درمیان زمانی معیت نہیں، بلکہ تعقیب و ترتیب ہے اس سے دونوں کی مراد یہی ہے۔ اسی طرح متکلمین نے جو علتِ مختارہ کو علتِ تامہ ہونے کے باوجود معلول سے مقدم کیا ہے، اس سے بھی مراد یہی تقدمِ ذاتی ہے۔

ہرگز یہ نہ سمجھئے کہ صانع کی نسبت، عالم کی جانب یہی علت و معلول والی ہے۔ جیسا کہ فلاسفہ جو کہ ایجابِ ذاتی کے قائل ہیں، کہتے ہیں، بلکہ فاعل کی جو نسبت فعل کے ساتھ ہوتی ہے، وہی صانع کی عالم کے لئے ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، اسلام اور تمام آسمانی مذاہب کا یہی عقیدہ ہے۔

علت اور فاعل میں فرق یہ ہے کہ علت کی طبیعت میں معلول کا صدور ہے، اس لئے دونوں کا ایک مرتبہ ہوا۔ اسی وجہ سے دوانیؒ نے اپنے رسالہ ''الزوراء'' میں لکھا کہ: معلول تو علت کی بہت سی حیثیتوں میں سے ایک حیثیت، بہت سی شانوں میں ایک شان اور بہت سی وجوہ میں ایک سے وجہ ہے، اس لئے علت کی

ذات سے وہ جدا نہیں، رہا فعل تو وہ فاعل کی تکمیل کے بعد وجود میں آتا ہے، اس لئے فاعل کے ساتھ فعل نہیں ہوسکتا، بلکہ اس کے بعد ہوگا۔

اگر ہم ازل سے تھوڑا نیچے اتر کر دیکھیں تو اس سے پہلے وہ غیر متناہی تھا، وجود کے بعد کو حدوث زمانی کہا جاتا ہے، باری تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی شخص کا قدیم ہونا میرے نزدیک قطعاً محال ہے، اس لئے کہ قدیم ہونا، وجود کے اوصاف کمالیہ میں خصوصی وصف ہے، جو وجود مطلق کے لائق ہے اور وجود مطلق صرف باری تعالیٰ کی ذات ہے۔

ممکن کا معدوم ہونا امر ذاتی ہے، اس لئے اگر وجود کو اس ذاتی عدم سے ضرب دیا جائے تو حاصل ضرب حدوث زمانی ہوگا اور یہ وجود ذاتی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، پس ممکن کو وجود میں ضرب دینا اس کی ذات کی وجہ سے محال ہوگا، اس کی صرف ایک صورت ہے کہ اس کے وجود کو حادث مانا جائے اور حدوث کے لئے زمانی ہونا لازم ہے، جیسے کسی کسر کو عدد صحیح میں ضرب دیں تو کسر ہی نکل سکتا ہے، حاصل ضرب عدد صحیح نہیں ہوسکتا اور جس طرح کسی کا بحیثیت شخص قدیم ہونا محال ہے اسی طرح نوعاً قدیم ہونا بھی میرے نزدیک محال ہی ہے اور کثرت تو وحدت ہی سے ظاہر ہوتی ہے پس نوع کے افراد کثیرہ ایک ہی ذات واحد سے صادر ہوئے ہیں، جو کہ پہلے سے تھا اور اس کے ساتھ کچھ بھی نہیں تھا۔ **کان اللہ ولم یکن معہ شئی۔**

میں نے عربی میں قصیدہ ذیل کہا ہے:

ومن الصفات حیاتہ وبقائہ ❁ ومن الخصائص کیف یشترکان

احد فلم یک غیرہ فی غابر ❁ صمد بقی بالملک والسلطان

''اللہ تعالیٰ کی صفتوں میں سے اس کی حیات وبقا بھی ہے، جو اسی کے ساتھ خاص ہے دوسرے میں کہاں مشترک ہوسکتی ہے۔ وہ یکتا ہے اس کے سوا کوئی بھی نہیں تھا، وہ بے نیاز ہے، کل ملکیت اور لازوال پادشاہت کے ساتھ باقی ہے''۔

لا بد ان فی الکون تظہر وحدۃ ❁ من غیر ما ثان وکل فان

صفۃ لہ خلق کذالک وحدۃ ❁ کصفاتہ العظمی فلا یقفان

''ضروری ہے کہ عالم کون میں ایسی وحدت ظاہر ہو، جس کا کوئی ثانی نہ ہو اور اس کے سوا ہر چیز فانی ہو۔ ایسے ہی خلق بھی اس کی صفت ہے اور وحدت بھی، جیسے کہ اس کی تمام عظیم صفتیں ہیں پس یہ دونوں رک نہیں سکتیں''۔

فعل وفرع من جلالة ذاته ❁ لولاه ما ذاشاب من نقصان

والكون لولا كان مظهر فعله ❁ وصفاته لم يبد من كتمان

''اس کی صفت فعل اور اس کی فروعات، اس کی ذات کی جلالت کی وجہ سے ہے، اگر وہ نہ ہوتا تو کوئی گھٹتے گھٹتے کیسے بوڑھا ہوتا اور عالم کون اگر اس کی فعل وصفات کا مظہر نہ ہوتا، تو عدم سے وجود میں نہ آتا''۔

بدأ الزمان بعالم الاجسام ما ❁ فيما عداه تصرف الازمان

فالممكنات لاصلها معدومة ❁ وله الغنى فی کل شأن شان

''زمانہ تو عالم اجسام سے شروع ہوا، تاوقتیکہ عالم اجسام نہیں تھا، تو زمانے کا الٹ پھیر بھی نہ تھا، کیوں کہ تمام ممکنات اصلا و ذاتا معدوم ہیں اور غناء کی صفت تو اسی کی شان ہے' ہر شان میں اس کی ایک شان ہے''۔

دع علة معلولها مٌن شانها ❁ زوجان هذی اول، ذاثان

لا بائنا منها وكان تنزلا ❁ فالله مبدع سائر الاكوان

من أمره مهما ارادفقال: كن ❁ سبحانه من مبدی دیان

''علت اور اس کے معلول کو چھوڑو، یہ دونوں تو جوڑ ہیں، علت پہلا ہے، معلول دوسرا، علت معلول سے الگ نہیں، یہ تو علت کا اترنا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ تو تمام اکوان کو بے مثال پیدا کرنے والا ہے، اس کا معاملہ یہ ہے کہ جب کسی چیز کا ارادہ کرے تو صرف ''کن'' کہہ دے۔ وہ پیدا کرنے والا کس قدر پاک ذات ہے کہ سب کو بدلہ دینے والا ہے''۔

میرے ایک فارسی قصیدے کا بھی یہی مضمون ہے:

مجموعہ کون بود در کتم عدم ❁ ازحرف کن آورد بایں دیرقدم

فعلیست کہ بی مادہ ید قدرت او کرد ❁ کز ضرب وجودی بعدم نیست قدم

''عالم عدم کے پردے میں تھا ''کن'' کی وجہ سے موجود ہوا، یہ خدائے قدوس کا ایک فعل ہے، جو اس کے دست قدرت سے بغیر مادے کے ظاہر ہوا؛ اس لئے کہ اگر وجود کو عدم میں ضرب دیں تو حاصل ضرب قدم نہیں ہوسکتا، بلکہ حادث ہی نکلے گا''۔

مزید:

ترتیب کہ ذاتی ست دراسماء الٰہی ❁ ترتیب زمانی. چو پذیرفت کماہی

آں چیز کہ در آخر منزل زتنزل ❁ افتادہ قدیمش بچہ تدبیر بخواہی

''اسماء الٰہی میں ترتیب ذاتی ہے، پس ذاتی ترتیب زمانی ترتیب کیسے پا سکتی ہے؟ جو چیز اتر کر آخری منزل میں آئی ہو، اس کو کس حکمت سے تم قدیم بنا سکتے ہو''۔

اور یہ بھی:

جہاں چو نقش و نگاریست ازید قدرت ❁ چہ ہر چہ خویش نداند نمود بی بو دست
سمات نقص زتسخیر ہر یکے پیدا ❁ بقید سخت درین قید خانہ مسدوداست
نہ خود بخویش کہ برآمدہ زدست دگر ❁ چناں کہ نقش کہ حیراں ودیدہ بکشودہ است

''یعنی عالم جو بہمہ خوبی، قدرت کی کرشمہ سازی کا بہترین نقش ہے، جب یہ خود اپنے لئے نہیں ہے تو پھر وہ ایک نمائش اور دکھاوٹ ہے۔ اس لئے کہ کارخانۂ عالم کی تمام اشیاء دست قدرت میں مسخر اور اس قید خانہ کی قید سخت میں گرفتار اور عاجز ہیں۔ اس کا وجود اور اس کی ہستی اپنے ہاتھوں نہیں، بلکہ اس کا وجود ایک دوسرے ہاتھ سے کتم عدم سے نکل کر منصۂ شہود پر اس طرح جلوہ نما ہوا، جیسا کہ تصویر آنکھیں پھاڑے ہوئے بشکل حیران اپنے مصور و نقاش کا پتہ دیتی ہے''۔

یہ بھی سامنے رہے:

آن کس کہ بابداع زماں رفت نہ فہمید ❁ کز عمر حق ایں حصہ بہ مخلوق بہ بخشید
چوں واحد حق است بہر مرتبہ باید ❁ نے مرتبۂ ذہن کہ یک گفت بعدید

''یعنی اس نے کچھ بھی نہ سمجھا، جس نے زمانے کو قدیم سمجھ لیا، اس نے اپنے عقیدہ میں خدائے قدوس کی صنعت قدم کا حصہ زمانے کے حوالے کر دیا، جب خدا کو واحد مانتے ہو تو اس کی وحدت صحیح جب ہوگی کہ ہر مرتبے میں اس کو واحد مانا جائے، ورنہ ذہنی مرتبہ میں اس کو واحد کہنا اور پھر زمانے کو اس کی صفات میں شریک کرنا گنتی میں ایک کہنا ہے، نہ کہ حقیقت میں اور شمار میں تو ہر چیز اسی چیز کے مقابلے میں اول کہی جا سکتی ہے''۔

ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب ''العقل والنقل'' میں لکھا کہ: ''اس دنیا کے حوالے سے علت و معلول کی مثال نہیں ہے؛ اس لئے کہ جن چیزوں کو بھی علت سمجھا جاتا ہے وہ صرف شرط ہیں''۔

آمدم برسر مطلب

جب یہ معلوم ہو گیا کہ پورا عالم ایک شخص واحد ہے، اس کی ابتداء اور انتہا ہے، اس کا مربوط نظام ہے، تو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس کی جزئیات میں بھی ترتیب و تعقیب نہ ہوتی، اگر وہ تحت زمانہ نہ ہوتا، اگر چہ

بعض کا بعض سے ربط، ترتیب اور سبب بنانے میں ہوتا، لیکن جبکہ زمانے کے تحت ہے تو تقدم و تاخر زمانی کی نسبت ظاہر ہو کر عالم کے لئے ابتداء اور انتہاء ثابت ہوگی۔ مگر یہ ایسی نہیں جیسے کہ ادوار وا کوار والے کہتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت کی ابتداء حضرت آدمؑ سے کی، اس کے بعد آدم ثانی حضرت نوحؑ کی ذریت میں نبوت جاری رکھی، پھر حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں منحصر کر دیا۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

"وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ" (العنکبوت : ۲۷)

"اور رکھ دی اس کی اولاد میں پیغمبری اور کتاب (یعنی ابراہیمؑ کے بعد بجز ان کی اولاد کے کسی کو کتاب آسمانی اور پیغمبری نہ دی جائے گی، چنانچہ جس قدر انبیاء کرام ان کے بعد تشریف لائے ان ہی کی اولاد تھی)"

پھر اولاد ابراہیم کی دو شاخیں ہو گئیں ایک بنی اسرائیل، کہ ان میں رسولوں اور نبیوں کو مسلسل بھیجا گیا لیکن اس شاخ کی نبوت حضرت عیسیٰؑ پر ختم ہو گئی اور ان کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا۔ دوسری بنی اسمٰعیل اس میں حضرت ابراہیمؑ کی دعا کے مطابق خاتم الانبیاء سید الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور تمام بنی آدم کی سرداری آپ کے لئے طے کر دی، آپ کے ہاتھ میں حمد کا جھنڈا ہوگا، اس دن جتنے نبی ہوں گے خواہ آدم یا ان کے علاوہ، سب کے سب آپ کے مبارک جھنڈے تلے ہوں گے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء سے یہ عہد لیا کہ: اگر انہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ملے تو وہ آپ کی نصرت کریں؛ چنانچہ تمام انبیاء نے (معراج کے موقعہ پر) مسجد اقصیٰ میں آپ سے ملاقات کی اور بڑی پیشی (حساب و کتاب) کے دن بھی کریں گے، فرض کیجئے اگر تمام انبیاء کرام دنیاوی زندگی میں جمع ہو گئے ہوتے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان کا وہی درجہ ہوتا جو امام کبیر کے سامنے اس کے ماتحت علاقوں کے حکمرانوں کا ہوتا ہے، لیکن جب یہ حضرات یکے بعد دیگرے تشریف لائے، تو زمانے میں ان کے مرتبے ظاہر ہوئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے کامل مرتبہ پر فائز ہوئے مثل مشہور ہے: "اَوَّلُ الْفِكْرِ آخِرُ الْعَمَلِ" کہ پہلی سوچ عملاً آخر میں وجود میں آتی ہے۔

یہ تاخر، عالم زمان میں صرف تاخر زمانی ہے، ورنہ ذاتی اعتبار سے آپ سب سے مقدم ہیں۔ چناں چہ ابن ابی عاصم اور ضیاء نے "المختارہ" میں ابی بن کعب سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ: رسول اللہ نے فرمایا:

"بدی بی الخلق و کنت آخر هم فی البعث"

"مخلوق کی ابتداء مجھ سے ہوئی لیکن میری بعثت ان سب کے بعد ہے"۔

اور ایک جماعت نے حسن بصریؒ سے انھوں نے ابو ہریرہؓ سے اس حدیث کو روایت کیا ہے کہ:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کنت اول النبین فی الخلق وآخرھم فی البعث" (کذا فی "روح المعانی": ۱۱/۷)

"میں تخلیق میں اول ہوں اور بعث میں آخر"۔

کسی شاعر نے خوب کہا:

ألا بابی من کان ملکا وسیدا ۞ وآدم بین الماء والطین واقف

"سنو! میرا باپ اس ذات پر قربان جو کہ بادشاہ اور آقا تھے، درانحالیکہ آدمؑ پانی اور کیچڑ میں تھے"۔

فذاک الرسول الأبطحی محمد ۞ لہ فی العلا مجد تلید وطارف

"وہ بطحائی پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جن کو بلندیوں میں نئی پرانی سیادت حاصل ہے"۔

أتی بزمان السعد فی آخر المدی ۞ وکان لہ فی کل عصر مواقف

"آخری دور میں سعادت کا زمانہ لائے اور تمام ہی زمانے میں آپ کے تذکرے رہے"۔

أتی لانکسار الدھر یجبر صدعہ ۞ فأثنت علیہ ألسن وعوارف

"زمانے کی تخریب کے وقت اس کے شگاف کو بند کرنے کے لیے تشریف لائے، اس لیے کل زبانیں اور جانے پہچانے آپ کی تعریف میں رطب اللسان ہوگئے"۔

اذا رام امراً لا یکون خلافہ ۞ ولیس لذاک الامر فی الکون صارف

"جب کسی کام کا ارادہ کر لیتے تو اس کے خلاف نہ ہوتا اور کائنات میں اس کام کو کوئی روکنے والا نہ ہوتا تھا"۔

روح المعانی کی وہ حدیث جس کو انھوں نے حضرت ابی بن کعبؓ سے نقل کیا ہے، درمنثور میں حضرت قتادہ سے مرسلا ہے، غالباً قتادہ نے ارسال کیا ہے، صاحب روح المعانی نے اس کو اس حدیث سے لیا ہے، جو کنز العمال ج:۱۱، ص:۴۵۲ میں موصولاً ہے۔

ایک حدیث میں "وانا العاقب" آیا ہے اور درمنثور میں ارشاد باری: "وَلَوْ تَرٰی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ" کے تحت، وہب ابن منبہ سے منقول ہے کہ: عاقب وہ عشر وصول کرنے والا ہوتا ہے جس کے پاس ماتحت عشر جمع کرتے ہیں۔

نزول عیسیٰ کی ایک اور حکمت: تکمیل میثاق

روح المعانی میں قتادہ سے مروی ہے کہ:

"اخذ الله تعالیٰ میثاقهم بتصدیق بعضهم بعضاً والاعلان بأن محمداً رسول الله واعلان رسول الله صلی الله علیه وسلم أن لانبی بعده".

"اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام سے یہ عہد لیا کہ وہ ایک دوسرے کی تصدیق کریں اور یہ اعلان کردیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس اعلان کا عہد لیا کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا (یعنی نبوت کسی کو نہیں دیجائے گی)"

درمنثور: میں ہے کہ: احمد، ابن جریر، ابن ابی حاتم، حاکم، ابن مردویہ اور بیہقی نے "دلائل النبوۃ" میں عرباض بن ساریہؓ سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"انی عند الله فی ام الکتاب لخاتم النبیین، وان آدم لمنجدل فی طینته، وسانبؤكم باول ذلک دعوة ابی ابراهیم، وبشارة عیسی (علیهما السلام) بی، ورؤیا امی التی رأت، وكذلک امهات النبیین یرین" (۱/۲۲۵، سورہ بقرہ: ۱۲۹)

"میں اللہ تعالیٰ کے یہاں ام الکتاب میں خاتم النبیین اس وقت لکھا ہوا تھا، جب کہ آدمؑ پیدا نہیں ہوئے تھے اور عنقریب میں تم کو اپنے بارے میں اولاً ابراہیمؑ کی دعا اور عیسیٰؑ کی بشارت کے متعلق بتلاؤنگا اور اس خواب کو بھی جو میری والدہ اور اسی طرح تمام انبیاء علیہم السلام کی ماؤں نے دیکھا تھا" (۱)

ارشاد باری ہے:

" وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتٰبٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ، قَالَ ءَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ إِصْرِيْ، قَالُوْا أَقْرَرْنَا، قَالَ فَاشْهَدُوْا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ". (آل عمران: ۸۱)

"اور جب لیا اللہ نے عہد نبیوں سے کہ جو کچھ میں نے تم کو دیا، کتاب اور علم، پھر آوے تمہارے پاس کوئی رسول کہ سچا بتاوے تمہارے پاس والی کتاب کو، تو اس رسول پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کروگے۔ فرمایا کہ تم نے اقرار کیا اور اس شرط پر میرا عہد قبول کیا؟ بولے: ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا: تو اب گواہ رہو اور میں بھی گواہ ہوں"۔

واضح رہے کہ میثاق کبھی اخذ کی طرف مضاف ہوتا ہے، کبھی ماخوذ منہ کی طرف اور کبھی ان دونوں

(۱) حضرت ابراہیمؑ کی دعا یہ تھی: "رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُوْلًا" (بقرہ: ۱۵۶) اور حضرت عیسیٰؑ کی بشارت یہ: "وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَأْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗ أَحْمَدُ" (الصف: ۶) جب کہ آپ کی والدہ کے خواب کی تصریح مستدرک حاکم: ۲/۶۵۶، ۴۱۷۵، میں ہے، روایت ملاحظہ ہو:
"انی عند الله فی اول الکتاب لخاتم النبیین وان آدم لمنجدل فی طینته وسانبئكم بتاویل ذلک دعوة ابی ابراهیم وبشارة عیسیٰ قومه ورؤیا امی التی رأت انه خرج منها نور اضاءت له قصور الشام" (محمد صغیر)

کے علاوہ کسی اور کی طرف۔ پہلے کی مثال یہ آیت کریمہ ہے:

" وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖ اِذْقُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا" (المائدہ: ۷)

''اور یاد کرو احسان اللہ تعالیٰ کا اپنے اوپر اور عہد اس کا جو تم سے ٹھہرایا تھا، جب تم نے کہا تھا کہ ہم نے سنا اور مانا''۔

دوسری قسم کی مثال بے شمار ہیں۔ جیسے آیت کریمہ:

"وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَا آتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا " (البقرۃ: ۹۳)

''یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے لیا اقرار تمہارا اور بلند کیا تمہارے اوپر کوہ طور کو، پکڑو جو ہم نے تم کو دیا، زور سے اور سنو''۔

اور جیسے:

" وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ" (آل عمران: ۱۸۷)

''اور یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے عہد لیا کتاب والوں سے کہ اس کو بیان کرو گے لوگوں سے اور نہ چھپاؤ گے''۔

اور جیسے:

" لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ وَاَرْسَلْنَا اِلَيْهِمْ رُسُلًا" (المائدہ: ۷۰)

''ہم نے لیا تھا پختہ قول بنی اسرائیل سے اور بھیجے ان کی طرف رسول''۔

تیسرے کی مثال باری تعالیٰ کا قول:

"اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَافِيْهِ "(الاعراف: ۱۶۹)

''کیا ان سے کتاب میں عہد نہیں لیا گیا تھا کہ نہ بولیں اللہ تعالیٰ پر سوائے سچ کے اور انھوں نے پڑھا ہے، جو کچھ اس میں لکھا ہے''۔

اس لئے آیت کریمہ کی تفسیر میں اختلاف ہو گیا کہ ''مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ'' سے کیا مراد ہے؟ بعض کہتے ہیں کہ: اس سے مراد وہ میثاق ہے جو انبیاء علیہم السلام سے لیا گیا۔ بعض کا خیال ہے کہ: اس سے مراد وہ میثاق ہے جو انبیاء کرام کی امتوں سے ان کے نبیوں کے بارے میں لیا گیا۔ پھر یہ کہ رسول سے مطلقاً تمام رُسل مراد ہیں، یا صرف ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم؟ راجح یہ ہے کہ تمام انبیاء سے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو عہد لیا گیا تھا، وہی یہاں مراد ہے اور سورۃ احزاب کی آیت:

"وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرَاهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ

وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِیْثَاقًا غَلِیْظًا“ (الاحزاب:۷)

”اور یاد کرو اس وقت کو جب کہ ہم نے تمام پیغمبروں سے ان کا اقرار لیا اور آپ سے بھی اور نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم سے بھی اور ہم نے ان سب سے خوب پختہ عہد لیا“۔

میں کلمہ ”من“ کی تصریح سے بھی اسی کی تاکید ہوتی ہے، باوجودیکہ کہ سورہ یوسف میں:

”حَتّٰی تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِیْ بِهٖ“ (یوسف: ٦٦)

”یہاں تک کہ دو مجھ کو عہد خدا کا کہ البتہ پہنچا دو گے اس کو میرے پاس“۔

آیا ہے۔ضروری ہے کہ سورہ اعراف کی آیت کو بھی دیکھ لیا جائے، نیز سورہ آل عمران کے سلسلے میں ابن کثیر نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی مطالعہ میں رہے اور اس سے زیادہ درست وہ ہے جو انہوں نے سورہ صف کی تفسیر میں کہی۔ نیز یہ حقیقت، سورت کی آیات اور باہمی ارتباط میں صحیح غور و فکر کرنے سے بھی واضح ہوتی ہے۔

سیرت ابن ہشام میں ابن اسحاق کے حوالہ سے ان آیات کے ارتباط کا کچھ تذکرہ ہے اور اس سے زیادہ افادات ”الموضح“ میں؛ اس لئے ضروری ہے کہ انہیں دیکھ لیا جائے۔علماء نے لکھا ہے کہ: سورہ بقرہ میں امت مغضوبہ کا رد ہے اور آل عمران میں امت ضلال کو راہِ مستقیم کی ہدایت، جیسا کہ سورہ فاتحہ میں بھی یہی ترتیب ہے۔ اسی کو ابن اسحاق نے نبی کریم ﷺ کے آغاز بعثت میں اپنایا ہے اور سورہ بقرہ پھر آل عمران کی آیات کی تفسیر میں بھی اس کو دہرایا ہے۔ لہٰذا جب آپ آیات کے باہمی ارتباط کو دقت نظر سے دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ باری تعالیٰ کے ارشاد: ”وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ“ میں لفظ ”النبیین“ پر لام استغراق کا ہے اور جو ان کے پاس آئے گا وہ یقیناً ان کے بعد ہی ہوگا جیسے کہا جاتا ہے ”جئتہم“ (میں ان کے پاس آیا) اور ارشاد باری: ”ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ“ میں لفظ ”رسول“ سے مراد معین رسول ہے، نہ کہ کوئی بھی رسول اور وہ خاتم الانبیاء والرسل صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، کلمہ تراخی ”ثم“ کی وجہ سے۔ یہ ایسا ہی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان:

”وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ“ (البقرة: ۸۹)

”اور جب پہنچی ان کے پاس کتاب، اللہ کی طرف سے، جو سچا بتاتی ہے اس کتاب کو جو ان کے پاس ہے اور پہلے سے فتح مانگتے تھے کافروں پر۔ پھر جب پہنچا ان کو جس کو پہچان رکھا تھا تو اس سے منکر ہو گئے۔ سو لعنت

ہے اللہ کی منکروں پر(۱)"

"وَلَمَّا جَاءَ هُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ كِتَابَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ "(البقرة : ۱۰۱)

''اور جب پہنچا ان کے پاس رسول اللہ کی طرف سے تصدیق کرنے والا، اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے، تو پھینک دیا ایک جماعت نے اہل کتاب سے، کتاب اللہ کو اپنی پیٹھ پیچھے، گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں"۔

یہ آیت دیگر آیات کی بہ نسبت زیادہ مرتب ہے اور اگر "ثُمَّ جَاءَ كُمْ رَسُوْلٌ" میں "رسول" سے مراد کوئی بھی رسول لیا جائے تو آیت میں تعقید ہوگی، بلکہ اس وقت مناسب ہوتا کہ عبارت یوں ہوتی ''واذ اخذ اللّٰہ میثاق النبیین ان یصدق بعضھم بعضا''۔ الحاصل الفاظ قرآنی اور اس کا سیاق وسباق دلیل ہیں کہ رسول سے مراد ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ جیسا کہ اس سورت سے پہلے ارشاد باری ہے:

" اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرَاهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ" (آل عمران : ۶۸)

''لوگوں میں زیادہ مناسبت ابراہیم سے ان کو تھی جو ساتھ اس کے تھے اور اس نبی کو اور جو ایمان لائے اس نبی پر"۔

پھر اہل کتاب کی ایک جماعت سے نقل کرتے ہوئے فرمایا:

" اَنْ يُّؤْتٰى اَحَدٌ مِّثْلَ مَا اُوْتِيْتُمْ" (آل عمران : ۷۳)

''اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ اور کسی کو بھی کیوں مل گیا، جیسا کچھ تم کو ملا تھا"۔

اس سے مسلمانوں کو مراد لیتے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا:

" كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَاءَ هُمُ الْبَيِّنَاتُ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ"(آل عمران: ۸۶)

''کیوں کر راہ دے گا اللہ ایسے لوگوں کو کہ کافر ہو گئے ایمان لا کر اور گواہی دیکر کہ بیشک رسول سچا ہے اور آئیں ان کے پاس نشانیاں روشن اور اللہ راہ نہیں دیتا ظالم لوگوں کو"۔

پھر فرمایا:

---

(۱) ان کے پاس جو کتاب آئی وہ قرآن ہے اور جو کتاب ان کے پاس پہلے سے تھی وہ توریت ہے، قرآن کے اترنے سے پہلے جب یہود کافروں سے مغلوب ہوتے تو خدا سے دعا مانگتے کہ: ''ہم کو نبی آخر الزماں اور جو کتاب ان پر نازل ہوگی ان کے طفیل سے کافروں پر غلبہ عطا فرما'' جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے اور سب نشانیاں بھی دیکھ چکے تو منکر ہو گئے اور ملعون ہوئے (تفسیر عثمانی) ابو طہ صغیر

" وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ آيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ " (آل عمران: ۱۰۱)

''اور تم کس طرح کافر ہوتے ہو حالانکہ پڑھی جاتی ہیں تم پر آیتیں اللہ کی اور اس کا رسول تم میں موجود ہے''۔

پس نظم قرآنی مربوط ہے۔''البحر المحیط'' میں اسی کو اختیار کیا ہے جو ہم نے ذکر کیا، یعنی مراد ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، خاص طور پر جب کہ آپ کے ''مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ '' ہونے کا معنی آپ کا اپنی اور دیگر انبیاء کرام کی تصدیق کا شاہد اور گواہ ہونا ہے، کیونکہ دیگر انبیاء علیہم السلام سے منقول روایتیں کمیاب اور مشتبہ ہوگئیں اس لیے اگر آپ گواہ نہ ہوں تو ان حضرات کی نبوت پر کوئی دلیل باقی نہ رہے گی۔

'' هداية الحيارى ''میں تصریح ہے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور نہ ہوتا تو دوسرے تمام انبیاء علیہم السلام کی نبوت باطل ہو جاتی؛ کیونکہ آپ ﷺ کی نبوت کا ظہور دوسرے انبیاء کی نبوت کی تصدیق اور ان کی نبوت کی صداقت کی گواہی ہے۔ باری تعالیٰ عز اسمہ نے اپنے قول:

'' بَلْ جَاءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ'' (صافات : ۳۷)

''وہ لے کر آیا ہے سچا دین اور سچا مانتا ہے سب رسولوں کو''۔

سے اسی معنی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اس لئے کہ تمام رسولوں نے آپ کی بشارت دی اور آپ کی تشریف آوری کی خبر دی، پس آپ کا تشریف لانا ہی ان کی خبر کی تصدیق ہے۔ کیونکہ آپ، ان کی دی گئی خبروں کی عملی تفسیر ہیں۔ اس لئے آپ ﷺ کی بعثت بھی ان کی تصدیق ہوئی، نیز آپ نے اپنے ارشاد سے بھی ان کی تصدیق فرمائی۔

اس سیاق کا حاصل اہل کتاب کے خلاف اس میثاق سے استدلال کرنا ہے، جو ان سے لیا گیا، اور جس کا ان کی کتابوں میں تذکرہ کیا گیا اور اس شخص کی ہلاکت و بربادی کی خبر دی گئی جو اس کو فراموش اور نظر انداز کر دے۔ جیسا کہ درمنثور میں ارشاد باری ''يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ'' کی تفسیر کے تحت مذکور ہے کہ: ابن اسحاق، ابن جریر اور بیہقی نے دلائل میں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ:

نجران کے نصاریٰ اور احبار یہود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بحث و مباحثہ کرنے لگے۔ احبار یہود کہتے کہ: ابراہیمؑ یہودی تھے اور نصاریٰ کا دعویٰ تھا کہ: نصرانی تھے، اس پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا:

'' يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ، وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ

وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُوْ مِنِيْنَo" (آل عمران : ۶۵، ۶۸)

''اے اہل کتاب کیوں حجت کرتے ہوابراہیم کے بارے میں (کہ وہ طریق یہودیت پر تھے یا نصرانیت پر؟) حالاں کہ نہیں نازل کی گئی توراۃ اورانجیل، مگران کے (زمانہ کے بہت) بعد (پس یہ دونوں طریق ان دونوں کتابوں کے نزول کے بعد سے ظاہر ہوئے پہلے سے ان کا وجود ہی نہ تھا۔ پھر ابراہیم ان طریقوں پر کس طرح ہو سکتے ہیں) کیا (ایسی خلاف عقل بات منہ سے نکالتے ہواور) پھر سمجھتے نہیں ہو۔ ہاں تم ایسے ہو کہ ایسی بات میں حجت کر ہی چکے تھے، جس سے تم کو کسی قدر واقفیت تھی، سوایسی بات میں کیوں حجت کرتے ہو، جس سے تم کو اصلاً واقفیت نہیں اور اللہ تعالیٰ (ابراہیم کے طریق کو خوب) جانتے ہیں، تم نہیں جانتے (تو اللہ سے ان کے طریق کو سنو کہ) ابراہیم نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی لیکن طریق مستقیم والے صاحب اسلام تھے اور مشرکین میں سے نہ تھے (اس لئے یہود اور نصاریٰ کو تو مذہبی طریق کے اعتبار سے ان کے ساتھ کوئی مناسبت نہ ہوئی، ہاں) بلاشبہ سب آدمیوں میں زیادہ خصوصیت رکھنے والے ابراہیم کے ساتھ البتہ وہ لوگ تھے جنہوں نے (ان کے وقت میں) ان کی اتباع کی تھی اور یہ نبی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں اور یہ ایمان والے (جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہیں) اور اللہ تعالیٰ حامی ہیں ایمان والوں کے''۔

ابو رافع قرظی نے کہا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، کیا تم چاہتے ہو کہ ہم تمہاری اسی طرح پرستش کریں جیسا کہ نصاریٰ نے عیسیٰ ابن مریم، کی؟ وفد میں شامل اہل نجران میں سے ایک دوسرے (۱) شخص نے بھی یہی پوچھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی پناہ کہ ہم غیر اللہ کی بندگی کریں، یا دوسروں کو اس کی دعوت دیں، حق تعالیٰ نے ہم کو اس کام کے لئے نہیں بھیجا اور نہ اس کا حکم دیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

''مَاكَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ o وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَo'' (آل عمران ۷۹۔۸۰)

''کسی بشر سے یہ بات نہیں ہوسکتی کہ اللہ تعالیٰ (تو) اس کو کتاب اور (دین کی) فہم اور نبوت عطا فرما دیں (جن میں ہر ایک کا مقتضاء ہے کفر وشرک سے ممانعت اور) پھر وہ لوگوں سے (یوں) کہنے لگے میرے بندے (یعنی عبادت کرنے والے) بن جاؤ، خدا تعالیٰ (کی توحید) کو چھوڑ کر۔ لیکن (وہ نبی یہ تو) کہے گا کہ: تم لوگ اللہ والے بن جاؤ (یعنی صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو) بوجہ اس کے کہ تم کتاب الٰہی (اوروں کو بھی)

(۱) اس کو ''الربیّس'' اور ''الریس'' کہا جاتا تھا، دیکھئے: ابن ہشام: ۱۶۱/۲، درمنثور: ۸۲/۲۔ (محمد صغیر)

سکھاتے ہو اور بوجہ اس کے کہ (خود بھی اس کو) پڑھتے ہو (اور اس کتاب میں تعلیم ہے توحید کی) اور (نہ وہ بشر) یہ بتائے گا کہ تم فرشتوں کو اور نبیوں کو رب قرار دے لو۔ کیا وہ تم کو کفر کی بات بتلاوے گا، بعد اس کے کہ تم (اس عقیدہ خاص میں خواہ فی الواقع یا بزعم خود) مسلمان ہو"۔

اس کے بعد اس عہد کو ذکر کیا جو ان سے اور ان کے آباء واجداد سے لیا گیا تھا کہ وہ آپ کی آمد پر آپ کی تصدیق کریں گے، چناں چہ ارشاد ہے:

"وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ط قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ، قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا، قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ" (آل عمران : ۸۱)

"اور جب لیا اللہ نے عہد نبیوں سے کہ جو کچھ میں نے تم کو دیا کتاب اور علم، پھر آوے تمہارے پاس کوئی رسول کہ سچا بتاوے تمہارے پاس والی کتاب کو، تو اس رسول پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے، فرمایا: کہ کیا تم نے اقرار کیا اور اس شرط پر میرا عہد قبول کیا؟ بولے: ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا: تو اب گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں"۔

حضرت علی وابن عباس رضی اللہ عنہم نے اس کی یہی تفسیر کی ہے (کہ یہ عہد تمام انبیاء سے صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں لیا گیا تھا کہ اگر وہ خود ان کا زمانہ پائیں تو ان پر ایمان لائیں، ان کی تائید ونصرت کریں اور اپنی اپنی امتوں کو بھی یہی ہدایت کریں) اس اثر کی روشنی میں یہی تفسیر راجح کہی جائے گی، یہ دونوں حضرات جلیل القدر ہیں، بہ نسبت ان لوگوں کے جنھوں نے اس کی دوسری تفسیر کی ہے۔ پس عیسی علیہ السلام کی آمد، شاید کے سلسلے میں اس عہد کی تکمیل ہے نہ کہ جیسا اس بد بخت (قادیانی) نے کہا: کہ یہ تو آپ کی نبوت کے سلب کو مستلزم ہے (العیاذ باللہ) یہ اس کی مذموم بے دینی بلکہ حماقت ہے۔

صحیح یہ ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام کا تشریف لانا اس بات کی دلیل ہے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی دوسرا نبی نہیں آئے گا۔ انبیاء کی جو تعداد علم الٰہی میں طے شدہ تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کا اختتام ہو گیا اور اب تکرار کی حد میں داخل ہو گئی ہے، چنانچہ جب کسی نبی کی بعثت کی ضرورت پڑی تو اس نبی کو حکم بنا کر نازل کیا گیا، جس کا زمانہ گزر چکا تھا، تا کہ یہ انبیاء کی تعداد کے ختم ہونے پر دلیل ہو۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ حکم طرفین سے ہوتا ہے، اس لئے اگر حکم اسی امت سے ہوتا تو معاملہ مشتبہ ہو جاتا، جیسا اس بد بخت (ملعون قادیانی) کے متبعین پر مشتبہ ہو گیا۔

ارشاد باری ''كَمَآ آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ'' کا مطلب یہ ہے کہ: اس نعمت سے ہم نے تم پر احسان کیا ہے، اس لیے عہد و پیمان کے سلسلے میں کتاب میں جو کچھ ذکر ہے اس کو تسلیم کرو، یہی اس نعمت کی شکر گزاری ہے۔ الفاظ قرآنی میں ایک نوع کا ابہام رکھا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی صراحت نہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ میثاق اس دن لیا گیا؛ جب کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا گیا، جیسا کہ تفسیر ''درمنثور'' میں سورہ احزاب کے تحت موجود ہے۔ تو یہ واقعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے بہت پہلے کا تھا، اس لئے حکمت کا یہ تقاضہ نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کرنے والوں اور اس سے محروم رہ جانے والوں کی نشاندہی کرتے ہوئے سلسلہ نبوت کی ترتیب کو بتلایا جائے۔ خلاصہ یہ کہ اللہ تعالی نے کچھ اُمور پر مطلع کرنا مناسب نہ جانا، بلکہ اس میں ابہام و اجمال کو بہتر جانا۔ ارشاد باری: '' وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ '' کے سلسلے میں روح المعانی میں ہے کہ: مراد یہ ہے کہ (اے! انبیاء کرام) تم نے اپنی امتوں سے بھی ان امور کا عہد لیا تھا (جن کا تم سے لیا گیا تھا)

پھر آیت بالا کے کچھ ہی بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انبیاء سابقین پر ایمان لانے کو ذکر کیا گیا اور یہ ہوا بھی۔ چنانچہ ارشاد ہے:

''قُلْ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ وَإِسْمٰعِيْلَ وَإِسْحٰقَ'' (آل عمران: ۸۴)

''تو کہہ: ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو کچھ اترا ہم پر اور جو کچھ اترا ابراہیم پر اور اسماعیل اور اسحاق پر... الخ)''

گویا کہ ایمان جانبین سے ہے۔ (یعنی وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر ایمان لائے اور آپ ان حضرات کی بعثت و رسالت پر۔

معلوم ہو کہ اطاعت و فرماں برداری کی حقیقت یہ ہے کہ انسان مطاع اصلی کے حکم کی اتباع کرے، نہ کہ اس مطاع کی۔ آیت کریمہ:

'' قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ''(ال عمران: ۳۱)

''تو کہہ: اگر محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری راہ پر چلو، تا کہ محبت کرے تم سے اللہ اور بخشے گناہ تمہارے''۔

اور حدیث نبوی:

'' من اطاع امیری فقد اطاعنی ومن عصی أمیری فقد عصانی '' (البخاری: ۱۰۵۷/۲)

''جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی''۔

میں اسی کو بیان کیا گیا ہے اور ارشاد باری:

"وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا" (المائدہ: ۱۲)

"اور لے چکا ہے اللہ عہد بنی اسرائیل سے اور مقرر کیے ہم نے ان میں بارہ سردار"۔

میں ایک دوسرے عہد کا ذکر ہے جو حضرت موسیٰ کی زندگی کے آخری ایام میں لیا گیا، مناسب نہیں کہ ان دونوں کو ایک قرار دیا جائے، بلکہ ہر صاحب حق کو اس کا حق دینا چاہیے۔

نیز کتب عہد عتیق کا مطالعہ کرنے والے بعض علماء نے پہلی آیت کو توریت کے سفر تثنیہ کے اٹھارہویں فقرے پر اور دوسری آیت کو اس کے اٹھائیسویں اور انتیسویں فقروں پر محمول کیا ہے اور وہ موسیٰ کے قربِ وفات کے وقت ہے۔ ایسے ہی علامہ سعید ابن حسن الاسکندرانی نے "مسالک النظر فی نبوۃ سید البشر" میں دونوں عہدوں کے حوالے سے اس کی تصریح کی ہے [علامہ موصوف کا شمار یہود کے بڑے علماء اور محققین میں تھا، ۷۶۹ء میں اسلام قبول کیا] اس رسالے کا قلمی نسخہ میرے پاس ہے۔

عہد متوسط میں اعمال رسل کی تیسری فصل میں اس بات کی صراحت ہے کہ بنی اسرائیل کے بھائی بنی اسماعیل میں نبی بھیجے جانے کا عہد تمام انبیاء علیہم السلام سے لیا گیا تھا۔

اس طرح کا میثاق لینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسی علیہ السلام کے ہاتھوں دنیا میں اس کی تکمیل فرمائی؛ چناں چہ عیسیٰ علیہ السلام نزول کے بعد سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق نکاح وغیرہ کریں گے، غلبہ روحانیت کی وجہ سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ چیزیں رہ گئی تھیں۔ الحاصل آپ علیہ السلام نازل ہونے کے بعد نکاح کریں گے، آپ کے اولاد ہوگی اور چالیس سال تک زندہ رہ کر وفات پائیں گے۔ اہل اسلام آپ کی نماز جنازہ پڑھ کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن کردیں گے۔ حج وعمرہ بھی آپ سے رہ گیا تھا بعد نزول وہ بھی کریں گے۔ جس طرح حضرت موسیٰ نے دنیا سے جانے کے بعد اس کی تکمیل کی چنانچہ "صحیح مسلم میں" ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ:

"سرنا مع رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم بين مكة والمدينة فمررنا بوادٍ، فقال: اى وادٍ هذا؟ فقالوا: وادى الازرق، فقال: كانى انظر الى موسى – فذكر من لونه وشعره شيئا لم يحفظه داؤد – واضعاً اصبعيه فى اذنيه له جوار الى الله بالتلبية مارًا بهذا الوادى، قال: ثم سرنا حتى اتينا على ثنية، فقال: اىّ ثنية هذه؟ قالوا هرشى اولِفت، فقال: كانى انظر الى يونس على ناقة حمراء، عليه جبة صوف، خطام ناقته ليف خلبة مارًا بهذا الوادى ملبيا". (صحيح مسلم: ۱/ ۹۵)

''ہم لوگ رسول اللہ علیہ ﷺ کے ساتھ مکہ ومدینہ کے درمیان چل رہے تھے، جب ایک وادی سے ہمارا گزر ہوا تو آپ علیہ ﷺ نے دریافت فرمایا: یہ کون سی وادی ہے؟ صحابہ نے جواب دیا: ''وادی ازرق'' پھر آپ نے فرمایا: ایسا محسوس ہورہا ہے کہ میں موسیٰ کو دیکھ رہا ہوں [آپ نے ان کے رنگ اور بال وغیرہ کا بھی ذکر کیا، مگر حدیث کے راوی داؤد کو یہ چیزیں یاد نہیں رہیں] کہ وہ اپنی انگلیوں کو کانوں میں ڈال کر تلبیہ کہتے ہوئے اس وادی سے گزر رہے ہیں۔ ابن عباس فرماتے ہیں: پھر ہم لوگ آگے بڑھے، یہاں تک کہ ایک دوسری وادی سے ہمارا گزر ہونے لگا تو رسول اللہ علیہ ﷺ نے سوال کیا کہ: یہ کونسی وادی ہے؟ عرض کیا گیا: ''ھرشی''(۱) یا، ''لفت''(۲) اس پر آپ نے فرمایا: یوں محسوس ہوتا ہے کہ یونسؑ اونی جبہ زیب تن کیے ہوئے، کھجور کی چھال کی لگام والی ایک سرخ اونٹنی پر سوار ہیں اور تلبیہ کہتے ہوئے اس وادی سے گزر رہے ہیں''۔

آپ کا اس موقع پر انہیں دونبیوں کا ذکر کرنا، اس وجہ سے ہے کہ شاید یہ اپنی دنیوی زندگی میں حج نہیں کر سکے تھے، برخلاف عیسیٰ علیہ السلام کے کہ آپ نزول کے بعد حج کریں گے، اس لیے آپ کا تذکرہ نہیں کیا، چناں چہ ''مسند احمد'' اور ''صحیح مسلم'' میں ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''والذین نفسی بیدہ لیھلن عیسیٰ بن مریم بفج الروحاء حاجاً، او معتمراً، اولیثنینھما جمیعا'' (مسلم: ۱/۴۰۸)

''قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے عیسیٰ بن مریم فج الروحاء(۳) (کے مقام پر) حج یا عمرے کا یا دونوں کا تلبیہ ضرور پڑھیں گے''۔

مذکورہ باتوں کا اثبات ایسا ہی ہے، جیسا کہ انبیاء کرام کی حیات برزخی کا اثبات اس حدیث سے کیا گیا ہے، جسے امام بیہقی نے اسی مسئلہ سے متعلق اپنے ایک مستقل رسالہ میں انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعا روایت کی ہے اور سند کی تصحیح کی ہے۔ حدیث یہ ہے:

''الانبیاء احیاء فی قبورھم ،یصلون'' (صححه البیهقی)

''انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں''۔

ایسے ہی مسلم نے اپنی ''صحیح'' میں موسیٰ علیہ السلام کی نماز کے بارہ میں ذکر کیا کہ رسول اللہ علیہ ﷺ نے فرمایا:

''مررت علی موسیٰ لیلة اسری بی عندالکثیب الاحمر،وھوقائم یصلی فی قبرہ'' (مسلم: ۲/۲۶۸)

''معراج کی رات ایک سرخ ٹیلے کے قریب میرا گزر موسیٰ کے پاس سے اس حال میں ہوا کہ وہ اپنی

(۱) ھاء کے زبر اور راء کے سکون کے ساتھ۔ مکہ کے راستے میں جحفہ کے قریب ایک وادی ہے (معجم البلدان: ۵/۳۹۷) (محمد صغیر)

(۲) لام کے زیر کے ساتھ، ہرشی کے قریب یہ ایک دوسری وادی ہے (معجم البلدان: ۵/۲۰) (محمد صغیر)

(۳) مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام کا نام ہے۔ (معجم البلدان: ۴/۲۳۶) (محمد صغیر)

قبر میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے“۔
ایسے ہی حضرت عیسیٰ کی نماز کا بھی ذکر کیا، مگر آپ کی قبر کا تذکرہ نہیں کیا، اس لیے کہ آپ باحیات ہیں۔ اس جگہ ان روایات کا بھی مطالعہ مفید ہوگا جو ”درمنثور“ میں انبیاء کے حج کے سلسلے میں مذکور ہیں۔

ابن ابی شیبہ، احمد، ابوداؤد، ابن جریر، اور ابن حبان نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی اکرم علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

”الانبياء اخوات لعلات، امهاتهم شتى و دينهم واحد، وانى اولى الناس بعيسى ابن مريم، لانه لم يكن بينى وبينه نبى وانه خليفتى على امتى، وانه نازل، فاذا رأيتموه فاعرفوه، رجل مربوع الى الحمرة والبياض، عليه ثوبان ممصران كأن راسه يقطر، وإن لم يصبه بلل، فيدق الصليب ويقتل الخنزير، ويضع الجزية، ويدعو الناس الى الاسلام، ويهلك الله فى زمانه الملل كلها الا الاسلام، ويهلك الله فى زمانه المسيح الدجال، ثم تقع الأمنة على الارض، حتى ترتع الاسود مع الابل، والنمار مع البقر، والذئاب مع الغنم، وتلعب الصبيان بالحيّات لا تضرهم، فيمكث اربعين سنة، ثم يتوفى، ويصلى عليه المسلمون، ويدفنونه“. (درمنثور: ۲/۲۴۸)

”تمام انبیاء باپ شریک بھائیوں کی طرح ہیں، کہ ان سب کا دین ایک اور مائیں (شریعتیں) (۱) جدا جدا ہیں اور میں عیسیٰ ابن مریم کے سب سے زیادہ قریب ہوں، کیوں کہ میرے اور ان کے درمیان کوئی نبی نہیں، میری امت کے لئے وہ میرے نائب ہیں، وہ (آسمان سے) اتریں گے، جب تم دیکھو تو پہچان لینا۔ (ان کی شناخت یہ ہے) وہ درمیانہ قد وقامت کے ہونگے، رنگ سرخ وسفید ہوگا، زرد رنگ کے دو کپڑوں میں ہوں گے، سر کے بال بھیگے نہ ہونے کے باوجود (چمک اور صفائی کی وجہ سے) ایسے ہوں گے کہ گویا ان سے پانی ٹپک رہا ہے، وہ صلیب کو توڑ ڈالیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، جزیہ موقوف کردیں گے، اسلام کی دعوت دیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کے زمانے میں اسلام کے سوا تمام ادیان ومذاہب کا خاتمہ کردیگا اور اللہ تعالیٰ انہی کے وقت میں کذاب مسیح دجال کو ہلاک کرے گا، زمین میں امن وامان کا دور دورہ ہوگا، حتی کہ شیر، اونٹ کے ساتھ، چیتے، گائے کے ساتھ اور بھیڑیے، بکری کے ساتھ، ایک جگہ چرا کریں گے، بچے سانپوں سے کھیلیں گے مگر کوئی کسی کو نقصان نہ پہنچائے گا۔ الغرض عیسیٰ زمین میں چالیس سال رہ کر وفات پائیں گے اور مسلمان ان کی نماز جنازہ پڑھ کر دفن کریں گے“۔

(۱) دین کو باپ سے اور شریعت کو ماں سے تشبیہ دی گئی ہے، کیوں کہ اصل دین یعنی سب انبیاء علیہم السلام کے عقائد ایک تھے، البتہ شریعتیں (یعنی فقہی مسائل) مختلف امتوں میں مختلف رہیں۔ (محمد صغیر)

حاکم نے ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لیھبطن ابن مریم حکما عدلا ،واماما مقسطا ، ولیسلکن فجا حاجا او معتمرا، او بنیتھما ، ولیاتین قبری حتی یسلم علی ، ولا ردن علیه (صحیح الحاکم: ۲/ ۶۵۱، ۶۶۲)

"یقیناً ابن مریم حاکم عادل، اور امام منصف کی حیثیت سے نزول فرمائیں گے اور حج یا عمرے یا دونوں کی نیت سے جاتے ہوئے مقام فج سے گزریں گے اور میری (آنحضرت ﷺ کی) قبر پر بھی ضرور آئیں گے، حتی کہ مجھے سلام کریں گے اور میں ان کو جواب دوں گا۔ (حاکم نے اس حدیث کو ذکر کر کے صحیح قرار دیا ہے)"

اس موضوع سے متعلق دوسری بہت سی احادیث تفسیر "در منثور" "تفسیر ابن کثیر" اور "کنز العمال" وغیرہ میں موجود ہیں۔

وفات عیسیٰ علیہ السلام اور روضۂ اقدس میں تدفین

صاحب "مشکوٰۃ المصابیح" نے "کتاب الوفاء" کے حوالے سے عبداللہ ابن عمرؓ سے مرفوعاً نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ینزل عیسی ابن مریم الی الارض ،فیتزوج ، ویولد له ویمکث خمسا واربعین سنة ثم یموت فیدفن معی فی قبری فاقوم انا وعیسی ابن مریم فی قبر واحد بین ابی بکر و عمر (مشکوٰۃ المصابیح ،باب نزول عیسی علیه السلام: ۴۸۰)

"عیسیٰ ابن مریم زمین پر اتریں گے، نکاح کریں گے، اولاد ہوگی اور پینتالیس سال دنیا میں رہیں گے، پھر موت واقع ہو جائے گی اور میری قبر (یعنی میرے مقبرہ میں میرے پاس) دفن کئے جائیں گے۔ پس قیامت کے دن میں اور عیسیٰ ابن مریم ایک ہی قبر (یعنی مقبرہ) سے ابوبکر و عمر کے درمیان اٹھوں گا"۔

ترمذی نے محمد بن یوسف بن عبداللہ بن سلام سے روایت کی ہے کہ عبداللہؓ بن سلام نے ارشاد فرمایا:

"مکتوب فی التوراۃ صفة محمد، وعیسی بن مریم یدفن معه" (۱)

"تورات میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف موجود ہیں اور یہ بھی کہ عیسیٰ بن مریم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دفن کئے جائیں گے"۔

یعقوب علیہ السلام کو ان کی وصیت کے مطابق بعد وفات، مصر سے شام منتقل کیا گیا، ایسے ہی موسیٰ علیہ السلام

(۱) وقال الترمذی : ھذا حدیث حسن غریب . وقال ابو مودود : قد بقی فی البیت موضع قبر (امام ترمذی نے اس حدیث کو "حسن غریب" کہا ہے۔ اور ابو مودود جو اس حدیث کے رواۃ میں سے ہیں فرماتے ہیں کہ ابھی بھی روضہ اقدس میں ایک قبر کی جگہ خالی ہے) ترمذی: ۲/ ۲۰۲، فی مناقب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ابو طہ صغیر)

نے یوسف علیہ السلام کو منتقل کیا، نیز موسیٰ علیہ السلام نے وفات کے وقت اللہ سے دعاء کی کہ: مجھے ارض مقدس (بیت المقدس) کے قریب کردیا جائے، جیسا کہ "صحیح مسلم" (ا) میں موجود ہے۔ پس یہ ناممکن ہے کہ اللہ رب العزت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے، یا خود عیسیٰ علیہ السلام اپنی قبر کے لئے، ارض مقدس یا اس سے افضل جگہ (مدینہ منورہ) کے علاوہ کوئی دوسری جگہ پسند کریں۔ "صحیح مسلم" میں یہ بھی ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"انه لم يقبض نبي قط، حتى يرى مقعده في الجنة، ثم يُخير" (مسلم: ۲/۲۸۶)

"کسی نبی کی روح اس وقت تک قبض نہیں کی جاتی، جب تک کہ جنت میں اس کا مقام نہ دکھلا دیا جائے۔ پھر اسے اختیار دیا جاتا ہے (کہ زندہ رہے یا جنت میں اپنے مقام کو اختیار کرلے)"۔

اس بد بخت مدعی نبوت نے اپنی حماقت سے یہ دعویٰ کر ڈالا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کشمیر میں ہوئی۔ حالاں کہ کشمیر اس زمانے میں دار الکفر تھا، جو وعدۂ خداوندی:

"وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا" (آل عمران: ۵۵)

"اور پاک کردوں گا تجھ کو کافروں سے"۔

کے خلاف ہے، سچ ہے کہ جب شرم وحیا نہ رہے تو انسان جو چاہے کرے اور کہے، جیسا کہ حدیث کے الفاظ ہیں۔ "اذا لم تستحي فاصنع ماشئت" (بخاری: ۱/۴۹۵)

نزول عیسیٰ کی مزید ایک حکمت: آں حضرت کی سیادت عامہ کا اظہار

عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق بطور خاص ان امور کا تذکرہ حدیث میں اس لئے ہے کہ یہ امور ان کی دنیاوی زندگی میں وقوع پذیر نہیں ہوئے، پس ان کو بیان کرنے کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ یہ امور ابھی باقی ہیں، آپ کے نزول کے بعد شریعت محمدیہ کے مطابق ان کی تکمیل ہوگی، تاکہ آپ ﷺ کی سیادت وقیادت تمام لوگوں پر آشکارا ہوجائے۔ بایں طور کہ بنی اسرائیل و بنی اسماعیل دونوں قبیلے اس وقت ایک ہوجائیں گے اور صرف ایک دین خداوندی (اسلام) باقی رہے گا۔ عیسیٰ علیہ السلام انبیائے بنی اسرائیل کے لئے خاتم ہیں، لیکن ہمارے نبی ﷺ کی خاتمیت، خاتمیت عامہ وتامہ ہے، ہر قسم کی نبوت آپ ﷺ پر ختم ہے، حمد کا جھنڈا روز محشر آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

(ا) حدیث میں آپ کی دعاء کے الفاظ یہ ہیں "فسال الله ان يدنيه من الارض المقدسة رمية بحجر" (مسلم شریف، الفضائل، باب من فضائل موسى عليه السلام: ۲/۲۶۷) (محمد صغیر)



تتمہ

قارئین کے لیے مناسب ہوگا کہ ان تمام احادیث متواترہ کو بھی مطالعہ میں رکھیں، جو آپ ﷺ کی سیادت وقیادت سے متعلق ہیں۔ اسی طرح ان احادیث کا بھی مطالعہ ضروری ہے جو معراج کے موقعہ پر مسجد اقصی میں آپ ﷺ کی تمام انبیاء کی امامت کے سلسلے میں ہیں میں نے اسی مضمون کو یوں منظوم کیا ہے:

قصیدہ معراجیہ

تبارک من اسری واعلی بعبده ☆ الی المسجد الاقصی الی الافق الاعلی

''بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو، راتوں رات مسجد اقصی تک اور افق اعلیٰ تک سیر کرائی''۔

الی سبع أطباق الی سدرة کذا ☆ الی رفرف ابهی الی نزلة اخری

''ساتوں آسمان اور سدرۃ المنتہی تک۔ خوبصورت رفرف اور نزلۃ اخری تک ایسے ہی سیر کرائی''۔

وسوی له من حفلة ملکیة ☆ لیشهدمن آیات نعمته الکبری

''حق تعالیٰ نے آپ کے اعزاز میں شاہانہ محفل سجائی، تاکہ آپ باری تعالیٰ کی بڑی بڑی نعمتوں اور نشانیوں کو بچشم خود مشاہدہ فرمائیں''۔

براق یساوی خطوه مد طرفه ☆ أتیح له واختیر فی ذلک المسری

''ایسا براق جس کا قدم برابر تھا جہاں پر اس کی نظر جاتی، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مقدر کیا گیا اور اس سیر کے لیے اسے منتخب کیا گیا''۔

وابدی له طیّ الزمان فعاقه رویداعن الاحوال حتاه ماأجری

''آپ کے لیے طی الزمان کو ظاہر کیا، چناں چہ تھوڑی دیر کے لیے اس کی حرکت کو روک دیا، یہاں تک کہ وہ چلا نہیں''۔

هناموطن فوق الزمان ثباته علی حالة لیست به غیر تتری

''وہاں ایک ایسا مقام ہے جس کا ثبات زمانے سے بالا ہے، لیکن ایسی حالت پر ہے جس میں تسلسل نہیں''۔

وكانت لجبريل الامين سفارة ☆ الى قاب قوسين استوى ثم مااقصى

''جبرئیل علیہ السلام ہم رکاب تھے، قاب قوسین پر ٹھہر گئے اور آگے نہیں بڑھے''۔

اذا خلف السبع الطباق وراءه ☆ وصادف مااولىٰ لرتبته المولىٰ

''جب ساتوں آسمانوں کو آپ نے اپنے پیچھے چھوڑ دیا اور تو وہ پالیا جو آپ کے رتبہ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کیا''۔

نعم طائر القدس المنيع بشاؤه ☆ خوافيه تطوى موطن السراواخفى

''آپ کی مضبوط پاکیزہ، قدسی طائر اپنے دوڑ میں آفاق عالم کو طے کر رہی تھی پوشیدہ در پوشیدہ مقامات میں''۔

وكان عيانا يقظة لايشوبه ☆ منام ولاقد كان من عالم الرؤيا

''یہ عروج بیداری کی حالت میں تھا، جس میں نہ نیند تھی اور نہ ہی خواب کا عالم''۔

قدالتمس الصديق ثم فلم يجد ☆ وصحح عن شداد البيهقى كذا

''آپ ﷺ کے مقام پر صدیق اکبرؓ نے تلاش کیا، مگر آپ کو نہ پایا بطریق شداد (بن اوس) اس کی تصحیح کی بیہقی نے اسی طرح''۔

رأى ربه لمادنا بفؤاده ☆ ومنه سرى للعين مازاغ لايطغى

''جب آپ ﷺ قریب ہوئے تو اپنے رب کو دیکھا، اپنے قلب سے اور قلب سے رؤیت سرایت کر گئی آنکھ تک، جو ذرا بھی بھٹکی اور نہ بہکی''۔

رأى نوره أنى يراه مؤمل ☆ وأوحى اليه عند ذاك بما أوحى

''آپ ﷺ نے باری تعالیٰ کے نور کو دیکھا اور امید کرنے والا کہاں دیکھ سکتا ہے اس کو اور باری تعالیٰ نے اسی وقت آپ ﷺ پر وحی کی جو چاہی''۔

بحثنا فآل البحث اثبات رؤية ☆ لحضرته صلى عليه كمايرضى

''ہم نے بحث کی اور بحث کا نتیجہ یہ ہوا کہ باری تعالیٰ کی رؤیت ثابت کی جائے آپ ﷺ کے لیے، آپ پر اللہ تعالیٰ درود بھیجے، جتنا اور جیسا چاہے''۔

وسلم تسليما كثيرا مباركا ☆ كمابالتحيات العلى ربه حىّ

''اور سلام بھیجے اللہ تعالیٰ بہت بہت سلام، جس کے ساتھ برکتیں بھی ہوں، جیسا کہ ''التحيات لله والصلوة والطيبات'' فرما کر آپ ﷺ نے اپنے رب کو سلام کیا''۔

کما اختاره الحبر ابن عم نبینا ☆ واحمد من بین الائمة قد قوی

''ہمارے نبی ﷺ کے چچازاد بھائی حبر الامۃ ابن عباسؓ نے دیدار الٰہی کا قول اختیار کیا ہے اور احمد بن حنبل الامام نے اسی کو راجح کہا ہے''۔

فقال: اذا ما المروزیّ استبانہ ☆ راہ رأی المولی فسبحان من اسریٰ

''انہوں نے فرمایا: جب کہ مروزی نے آپ سے دریافت کیا کہ: کیا حضور نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے؟ ہاں آپ نے اپنے مولیٰ کو دیکھا ہے۔ پس پاک ہے وہ ذات جو لے گیا اپنے بندے کو راتوں رات''۔

رواہ ابو ذر بان قد رأیتہ ☆ وانی أراہ لیس للنفی بل ثنیا

''ابو ذر غفاریؓ نے اس کو روایت کیا ہے کہ: آپ نے ذات باری تعالیٰ کو دیکھا ہے اور ''انی أراہ'' یہ نفی کے لئے نہیں بلکہ کسر نفسی کے لئے ہے''۔

نعم رؤیۃ الرب الجلیل حقیقۃ ☆ یقال لھا: الرؤیا بالسنۃ الدنیا

''ہاں رب جلیل کی رؤیت ایک ایسی حقیقت ہے، جس کو ہماری تعبیر میں رؤیا کہا جاتا ہے''۔

والا فمرأی جبرئیل عوادۃ ☆ ولیس بدیعا شکلہ کان أو أوفی

''ورنہ تو جبرئیل کا دیکھنا کئی بار تھا، یہ کوئی نئی بات نہیں تھی خواہ کسی شکل میں دیکھا ہو''۔

وذلک فی التنزیل من نظم نجمہ ☆ اذا مارعی الراعی ومغزاہ قد وفی

''رؤیت کا مسئلہ قرآن کریم میں سورہ نجم میں ہے، جب کہ رعایت کرنے والا غور کرے اور اصل مقصود کو پورا ادا کرے''۔

وکان ببعض ذکر جبریل فانسری ☆ الی کلہ والطول فی البحث قد عنّیٰ

''بعض طرق میں جبرئیل کا ذکر ہے، یہ کل کی طرف سرایت کر گیا اور بحث کے طول نے تھکا دیا''۔

وکان الی ألاقصی سری ثم بعدہ ☆ عروجا بجسم أن من حضرۃ اخری

''مسجد اقصیٰ تک تو اسراء تھی پھر اس کے بعد جسم کے ساتھ عروج تھا، ہاں دوسرے دربار تک''۔

عروجاً الی ان ظللتہ ضبابۃ ☆ ویغشی من الانوار ایاہ ما یغشی

''عروج یہاں تک تھا کہ آپ ﷺ کو ایک بدلی نے ڈھانپ لیا اور انوار الٰہیہ آپ پر چھا گئے''۔

ویسمع للأقلام ثم صریفھا ☆ ویشھد عینا ما لہ الرب قد سوّی

''آپ وہاں قلموں کے چلنے کی آواز سن رہے تھے اور اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کر رہے تھے جو اللہ

تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تیار کیا ہے"۔

ومن عض فیہ من ھنات تفلسف ☆ علی جرف ھار یقارف ان یردی

"جو آدمی فلسفے کی گمراہ کن باتوں پر یقین کرے، وہ ایسی گھائی پر ہے جو گرا ہی چاہتی ہے، قریب ہے کہ وہ ہلاک ہو جائے"۔

کمن کان من اولاد ماجوج فادعی ☆ نبوتہ بالغی والبغی والعدوی

"جیسا کہ وہ آدمی جو کہ یاجوج ماجوج کی اولاد سے ہے، (یعنی مرزا قادیانی) پس اس نے دعوی کر دیا اپنی نبوت کا، اپنی گمراہی، بغاوت اور تعدی سے"۔

ومن یتبع فی الدین أھواء نفسہ ☆ علی کفرہ فلیعبد اللات والعزی

"جو آدمی دین میں اپنی خواہشات کا اتباع کرتا ہے، وہ اپنے کفر میں لات اور عزی کا پجاری ہے"۔

اولاد ماجوج میں مدعی فلسفہ سے مراد یہی مردود (غلام احمد قادیانی) ہے، کیونکہ یہ تاتاریوں کی نسل سے ہے، اسے فلسفے وغیرہ سے کوئی واقفیت نہیں۔ اس نے تو مغربی افکار کے بدلے اپنے دین وایمان کا مفت سودا کر لیا ہے۔

منقبت شفیع المذنبین (فارسی)

روز محشر شفاعت کبریٰ کے لئے آپ کے آگے بڑھنے اور دوسری چیزوں میں آپ کی اولیت کی حدیثوں کو میں نے فارسی میں یوں منظوم کیا ہے:

ای آں کہ ہمہ رحمت مہداۃ قدیری ☆ باران صفت وبحر سمت ابرمطیری

"اے پیمبر آپ سراپا رحمت ہیں، راہ یاب ہیں، خدا کا عطیہ ہیں، جیسے بارش، سمندر اور برستا بادل"۔

معراج توکرسی شدہ وسبع سموات ☆ فرش قدمت عرش بریں سدرہ سریری

"آپ کی معراج ساتوں آسمان سے بلند مقام کرسی تک ہوئی، آپ کے زیر قدم عرش اور سدرہ آپ کی تخت گاہ تھی"۔

برفرق جہان پایہ پائے توشدہ ثبت ☆ ہم صدر کبیری وہمہ بدر منیری

"تمام جہان کی پیشانی پر آپ کا نقش قدم ثبت رہا، آپ صدر کبیر بھی ہیں اور بدر منیر بھی"۔

ختم رسل ونجم سبل صبح ہدایت ☆ حقا کہ نذیری تو والحق کہ بشیری

''آپ رسولوں کے خاتم، راہ دکھاتے تارے، ہدایت کی لو۔ یقیناً آپ بشیر ہیں اور واقعۃً آپ نذیر ہیں''۔

آدم بصف محشر وذریت آدم ☆ درظل لوایت کہ امامی وامیری

''محشر کے دن آدم اور آدم کی ساری ذریت آپ ﷺ کے جھنڈے تلے ہوگی، آپ ان کے امام اور امیر ہوں گے''۔

یکتا کہ بود مرکز ہردائرہ یکتا ☆ تا مرکز عالم توئی بے مثل و نظیری

''کون یکتا ہوسکتا ہے؟ ہردائرہ کا مرکز تو تنہا آپؐ ہیں۔ عالم کے مرکز تک آپؐ ہی بے مثل و بے نظیر ہیں''۔

ادراک بختم ست وکمال ست بخاتم ☆ عبرت بخواتیم کہ در دور اخیری

''پختگی مہر سے ہوتی ہے اور کمال خاتم نبوت سے۔ اعتبار تو خاتمے کا ہے، کیونکہ آپ ہی آخری دور میں آئے ہیں''۔

امی لقب وماہ عرب مرکز ایمان ☆ ہر علم وعمل را تو مداری ومدیری

''آپ کا لقب امی ہے، آپ عرب کے ماہتاب اور ایمان کے مرکز ہیں۔ ہر علم وعمل کے دارومدار اور اس کے منتظم کار آپ ہی ہیں''۔

عالم ہمہ یک شخص کبیرست کی جمال ☆ تفصیل نمودند دریں دیر بسدیری

''پورا عالم ایک شخص کبیر ہے۔ اس جہاں فانی میں تفصیل کو مجمل کردیا ہے''۔

ترتیب کہ رتبی است چو واکردہ نمودند ☆ درعرصہ واسراء توخطیبی وسفیری

''مرتبے کی ترتیب کو جب کھول دیا تو میدان محشر میں اور شب معراج میں آپؐ ہی خطیب ہیں اور آپؐ ہی سفارت کار''۔

حق ہست وحقی ہست چو ممتاز زباطل ☆ آن دین نبی ہست اگر پاک ضمیری

''حق جو باطل سے ممتاز ہوتا ہے تو حق یہ ہے کہ وہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہے۔ اگر تمہارا ضمیر پاک ہے تو سمجھ سکتے ہو''۔

آیات رسل بودہ ہمہ بہتر وبرتر ☆ آیات تو قرآن ہمہ دانی ہمہ گیری

''رسولوں کے معجزے سب بہتر اور برتر تھے اور آپ کا معجزہ تو قرآن کریم ہے، جو سب کا احاطہ کرنے والا اور سب کو جاننے والا ہے''۔

آن عقدۂ تقدیر کہ از کسب نہ شد حل ☆ حرف تو کشودہ کہ خبیری وبصیری

''تقدیر کا نا قابل حل مسئلہ جو علم و کسب سے حل نہیں ہو سکتا تھا، آپ کے کلام نے اس کو کھول دیا؛ کیونکہ آپ خوب جاننے والے اور خوب سوجھ بوجھ والے ہیں''۔

کان را کہ جزا خواندہ آن عین عمل ہست ☆ بگزر زحفاف دگر آنچہ پذیری

''عمل ہی جزا کی صورت میں نمایاں ہوگا، بے مغز بحثوں کو چھوڑ کر حقیقت کو معلوم کرو''۔

ای ختم رسل امت تو خیر امم بود ☆ چوں ثمرہ کہ آید ہمہ در فصل نفیری

''اے ختم رسل آپ کی امت خیر امم ہے۔ اس پھل کی طرح جو اخیر فصل میں آتا ہے''۔

کس نیست ازیں امت تو آں کہ چو انور ☆ باروی سیہ آمدہ وموئ زریری

''اس امت میں انور جیسا کوئی نہیں، جو سیاہ چہرے اور سفید بالوں کے ساتھ حاضر ہے (اور آپ ﷺ کی شفاعت اور خدا تعالیٰ کی رحمت کا امیدوار ہے)''

محمد ﷺ کی رسالت پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایمان

''شرح مواہب'' جز اول کے شروع میں ہے کہ ابوالشیخ نے ''طبقات الاصفہانیین'' میں اور حاکم نے ''مستدرک'' میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ:

''اوحی اللہ الی عیسی :آمن بمحمد و مر امتک: أن یومنوا به''

''اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ: خود بھی محمد (ﷺ) پر ایمان لائیے اور اپنی امت کو بھی محمد (ﷺ) پر ایمان لانے کا حکم فرمائیے''۔

حاکم نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے، نیز سبکی نے ''شفاء السقام'' میں اور بلقینی نے اپنے فتاوی میں حاکم کی تائید کی ہے۔ چوں کہ یہ بات محض رائے اور قیاس سے نہیں کہی جا سکتی، اس لیے یہ روایت حکماً مرفوع ہوگی۔ ذہبیؒ کہتے ہیں کہ: اس روایت کی سند میں ''عمرو بن اوس'' ہیں، جن کے بارے میں علم نہیں کہ یہ کون نہیں؟ نیز ذہبی نے اس حدیث کو ''المقصد الرابع للبیھقی، فصل دوم قسم چهارم'' کی طرف بھی منسوب کیا ہے اور بیہقی کی یہ شرط معلوم و مشہور ہے کہ وہ اپنی تصانیف میں موضوع احادیث ذکر نہیں کرتے۔ حاصل یہ کہ سند کے اعتبار سے یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے، لیکن معنی و مفہوم کے تواتر کے باعث متن حدیث یقیناً صحیح ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ: ارشاد باری:

''وَمِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْا اِنَّا نَصَارٰیٰ اَخَذْنَا مِیْثَاقَهُمْ'' (المائدہ: ۱۴)

''اور وہ جو کہتے ہیں اپنے کو نصاریٰ ان سے بھی لیا تھا ہم نے عہد ان کا''

میں جس عہد کا ذکر ہے وہ یہی عہد ہے، جس کا ذکر حدیث بالا میں آیا ہے۔

حدیث ''لو ان موسیٰ کان حیاً...'' اور ایک غلطی کا ازالہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لو انّ موسی کان حیّا، ما وسعه الا اتباعی"

''اگر موسیٰ (علیہ السلام) زندہ ہوتے تو وہ بھی میری پیروی پر مجبور ہوتے''۔

انہی الفاظ کے ساتھ یہ حدیث ''فتح الباری'' میں باب قولہ ﷺ ''لا تسألوا اھل الکتاب عن شیئ'' کے تحت اور مسند احمد (۳/۳۸۸) میں جابر رضی اللہ عنہ سے انہی الفاظ کے ساتھ ہے نیز ان تمام کتب میں، جن میں یہ روایت ہے صرف موسیٰ علیہ السلام ہی کا نام ہے حضرت عیسیٰ کا نام نہیں ہے چنانچہ ''کنز العمال'' میں متعدد کتب کے حوالے سے ''حاشیہ ابی داؤد للمغربی'' میں ''کتاب الملاحم'' کے اندر ''شرح الشفاء للقاری'' میں مختلف جگہوں پر، ''شرح المواھب'' اور ''درمنثور'' میں ''آیت میثاق'' کے تحت، ''مسند دارمی'' اور ''مشکوۃ المصابیح'' وغیرہ میں یہ روایت فقط حضرت موسیٰ کے ذکر کے ساتھ ہے؛ لہٰذا جن کتابوں میں موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام کا بھی تذکرہ اس حدیث کے ذیل میں ہے، جیسا کہ ''تفسیر ابن کثیر'' کے ایک نسخہ میں ارشاد باری ''وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ'' کے تحت ہے وہ یقینی اور قطعی طور پر نقل نویسوں اور کاتبوں کی غلطی و سہو کا نتیجہ ہے، کتب حدیث میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

کتب حدیث کے علاوہ دوسری کتابوں میں بعض جگہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام کا بھی تذکرہ ہے۔ مگر جیسا کہ ہم نے ابھی کہا کہ یہ نقل نویس کی غلطی اور سبقت لسانی ہے؛ اس لیے ایک صاحب ایمان قاری کو اس سے بچنا ضروری ہے، خواہ اس ملحد قادیان کے پیروکار اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے اسکی کتنی ہی تشہیر کر دیں؛ چناں چہ ''کتاب الابریز'' ص:۹۵ ر میں ''فتح الباری'' کے حوالے سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام کے ساتھ اس حدیث کو ذکر کیا ہے، جب کہ ''فتح الباری'' میں عیسیٰؑ کا قطعاً ذکر نہیں ہے، اسی طرح علامہ شعرانی کی ''الیواقیت'' میں فتوحات کے دسویں باب کا بھی حوالہ دیا گیا ہے، لیکن مذکورہ باب میں ایسی کوئی روایت نہیں ہے۔ اسی طرح وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے کتاب مذکور کے باب: ۶۹ ر "ذکر من یغسل ویغسل من الجنازة" کے تحت اور باب: ۴۲ ر کے ذیل میں اسے موصول گردانا ہے، کیوں کہ امام شعرانی نے خود ہی اپنی کتاب ''الجواھر واللدرر'' ص: ۲۱۲ ر میں اس کے برخلاف نقل کیا ہے۔ علاوہ ازیں متعدد ثقہ علماء نے مجھ سے یہ بات بیان کی کہ ''دہلی'' میں ''الیواقیت'' کا ایک قلمی نسخہ ہے، جس میں عیسیٰ کا لفظ نہیں ہے۔ فاحفظ و تدبر۔

چند علمی نکات

نزول عیسیٰ اور امامت مہدی

حضور اکرم ﷺ پیر کے دن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز فجر پڑھ کر رفیق اعلیٰ سے جا ملے تھے، جیسا کہ امام بیہقی نے ''معرفة السنن و الآثار'' میں اختیار کیا ہے، ایسے ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نماز فجر میں اتریں گے اور امام مہدی کے پیچھے اسی طرح اپنی پہلی نماز پڑھیں گے (جس طرح کہ حضور ﷺ نے ایک امتی کی اقتداء میں آخری نماز پڑھی تھی) اکثر احادیث سے یہی بات معلوم ہوتی ہے جیسا کہ امام احمد و امام مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے، ابن ماجہ، ابن خزیمہ، حاکم اور ضیاء نے ابو امامہؓ سے، نیز امام احمد نے حضرت عثمان بن ابی العاص سے بھی [کما فی ''تفسیر ابن کثیر'' و ''درمنثور''] روایت کیا ہے۔ اصول حدیث میں یہ ضابطہ ہے کہ جب کسی روایت کے مصادر و مخارج متعدد ہو جائیں، تو اس سے رواۃ حدیث کے ضبط و اتقان پر دلالت ہوتی ہے جہاں تک ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کا سوال ہے جو سیوطی کے رسالہ ''الاعلام بحکم عیسیٰ'' کے حوالے سے گذر چکی کہ ''ان عیسی علیه السلام یؤمهم'' (حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کی امامت کریں گے) وہ اس پہلی نماز فجر کے بعد ہے۔

ایسے ہی آپ رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث جسے امام مسلم نے ''کتاب الفتن و اشراط الساعة'' (۳۹۱/۲) میں روایت کیا ہے، جس کے آخری الفاظ یہ ہیں:

''فاذا جاء والشام خرج، فبينما هم يعدون للقتال يسوون الصفوف، اذا اقيمت الصلٰوة، فينزل عيسىٰ ابن مريم -صلى الله عليه وسلم- فامهم، فاذا راه عدوالله ذاب كما يذوب الملح فى الماء، فلو تركه لا نذاب حتى يهلك، ولكن يقتله الله بيده، فيريهم دمه فى حربته''۔

''جب لشکر اسلام شام پہنچے گا، تو دجال نکل آئے گا، ابھی مسلمان جنگ کی تیاری اور صفیں درست کرنے ہی میں مشغول ہوں گے کہ نماز (فجر) کی اقامت ہو جائے گا اور فوراً ہی بعد (حضرت) عیسیٰ ابن مریم نازل ہوں گے اور ان کی امامت فرمائیں گے۔ اللہ کا دشمن (دجال) عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھتے ہی اس طرح گھلنے لگے گا، جیسے نمک پانی میں گھلتا ہے۔ چناں چہ اگر وہ اسے چھوڑ بھی دیں، تب بھی وہ گھل گھل کر ہلاک ہو جائے، لیکن اللہ تعالیٰ اسے آپ علیہ السلام کے ہاتھوں قتل کرائیں گے اور آپ علیہ السلام لوگوں کو اس کا خون دکھلائیں گے، جو آپ کے برچھے میں لگا ہوگا۔''

قابل ذکر ہے کہ ''صحیح مسلم'' کے بعض نسخوں میں لفظ ''فأمهم'' رہ گیا ہے۔ اس حدیث کا بھی یہی مطلب ہے کہ امام مہدی کے پیچھے پہلی نماز پڑھنے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام امامت کریں گے، تاکہ روایت میں تناقض نہ رہے۔

مسند احمد: ج:۲، ص: ۲۹۰، میں امام زہری عن حنظلہ عن ابی ہریرۃ کے طریق سے مروی حدیث

"ينزل عيسى بن مريم ،فيقتل الخنزير و يمحو الصليب وتجمع له الصلاة ... الحديث"

''عیسیٰ بن مریم نازل ہو کر خنزیر کو قتل کریں گے، صلیب کو مٹائیں گے، نمازوں کی امامت کریں گے... الخ''

کا بھی یہی مفہوم ہے۔ نیز ''عمدۃ القاری'' میں نعیم بن حماد کی ''کتاب الفتن'' کے حوالے سے حضرت کعب کی روایت اس سلسلے میں بالکل واضح ہے۔ الفاظ روایت یہ ہیں:

"يحاصر الدجال المومنين ببيت المقدس،فيصيبهم جوع شديد ،حتى يأكلوا أوتار قسيهم،فبينما هم كذالك ، اذ سمعوا صوتا في الغلس ،فاذا عيسى - عليه السلام - وتقام الصلاة ، فيرجع امام المسلمين ،فيقول - عليه اسلام- تقدم ، فلك اقيمت الصلاة ، فيصلي بهم ذلك الرجل تلك الصلاة، ثم يكون عيسى الامام بعد "

''دجال بیت المقدس میں مومنین کا محاصرہ کرے گا، جس سے وہ سخت بھوک کا شکار ہوں گے، حتیٰ کہ بھوک کی وجہ سے وہ اپنی کمانوں کی تانت کھانے لگیں گے، اسی حال میں ہوں گے کہ اچانک صبح کی تاریکی میں ایک آواز سنیں گے (نظر اٹھائیں گے تو دیکھیں گے کہ) عیسیٰ علیہ السلام (تشریف فرما) ہیں، اس وقت نماز فجر کی اقامت ہو رہی ہوگی مسلمانوں کے امام مہدی، پیچھے ہٹیں گے، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے، آگے بڑھو، کیوں کہ اس نماز کی اقامت تمہارے لیے ہوئی ہے چناں چہ اس وقت کی نماز مہدی پڑھائیں گے۔ پھر اس کے بعد کی نمازوں میں امام حضرت عیسیٰ ہوں گے''۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث:

"کیف انتم اذا نزل فیکم ابن مریم فامکم منکم"

"تمہارا اس وقت کیا حال ہوگا، جب ابن مریم تم میں نازل ہوں گے اور اس وقت تمہاری امامت تم ہی میں سے ایک فرد کرے گا"۔

جس کی تخریج امام مسلم نے مختلف الفاظ کے ساتھ "باب نزول عیسیٰ علیہ السلام" (ج:۱،ص:۸۷) کے تحت کی ہے۔ میں امامت سے مراد امامت کبریٰ (خلافت) ہے، جیسا کہ راوی حدیث ابن ابی ذئب نے اس کی صراحت کردی ہے(۱)۔ فرمان رسالت "وامامکم منکم" (تمہارا امام تم ہی میں سے ہوگا) سے مراد امام مہدی نہیں، بلکہ عیسیٰ علیہ السلام ہیں، کیوں کہ آپ -علیہ السلام- شریعت محمدیہ کے تابع ہوں گے (تو گویا امت محمدیہ کے ایک فرد ہوئے) اس لیے "منکم" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔ نیز آپ -علیہ السلام- کا شریعت محمدیہ کے تابع ہونا ضروری بھی ہے، کیوں کہ حکم زمانے کے لیے ہوتا ہے اور صاحب زمان خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہیں (اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شریعت کے احکامات وقوانین کا نفاذ لازم ہوگا، دوسری شریعت کے لیے گنجائش نہ ہوگی) چناں چہ "تفسیر ابن کثیر" میں "مسند احمد" کے حوالے سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"والذی نفسی بیدہ لو اصبح فیکم موسیٰ -علیہ السلام- ثم اتبعتموہ، وترکتمونی لضللتم، انکم حظی من الامم، وانا حظکم من النبیین"۔

"اس ذات عالی کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے! اگر خود موسیٰ علیہ السلام بھی تمہارے اندر آجائیں اور تم اس وقت مجھے چھوڑ کر ان کی اتباع کرنے لگو، تو تم گمراہ ہوجاؤ گے؛ کیوں کہ تم تمام امتوں سے صرف میرا حصہ ہو اور میں جملہ انبیاء میں صرف تمہارا حصہ ہوں"۔

یہ حدیث مذکورہ بالا روایت "لو ان موسیٰ کان حیا ما وسعہ الا اتباعی" کے لیے شاہد ہے؛ چوں کہ اس میں بھی عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر نہیں آیا ہے، جس سے بات واضح ہوگئی کہ اس مضمون کی کسی بھی

---

(۱) مکمل حدیث مع کلام راوی یہ ہے: "حدثنی زھیر بن حرب قال: حدثنی الولید بن مسلم، قال: ثنا ابن ابی ذئب عن ابن شھاب عن نافع مولی ابی قتادۃ عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: کیف انتم اذ انزل فیکم ابن مریم ،فامکم منکم، فقلت لابن ابی ذئب ان الاوزاعی حدثنا عن الزھری عن نافع عن ابی ھریرۃ واما مکم منکم. قال ابن ابی ذئب :تدری ما امکم منکم قلت: تخبرنی قال: فامکم بکتاب ربکم عزوجل وسنۃ نبیکم صلی اللہ علیہ وسلم" (مسلم شریف:۱/۸۷) (محمد صغیر)

حدیث میں عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر نہیں ہے (اور جن کتابوں کے بعض نسخوں میں موجود ہے وہ یقیناً نقل نویسوں کی غلطی کا نتیجہ ہے)

''صحیح مسلم، باب نزول عیسیٰ والفتن'' میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے جو دو حدیثیں مروی ہیں، وہ دونوں الگ لگ ہیں، ایک حدیث نہیں کہ شرح کا اتحاد ضروری ہو، ہاں ان الفاظ کے علاوہ دوسرے الفاظ سے امام مہدی کی بابت ابوہریرہؓ سے ایک حدیث ہے۔ دیکھئے: کنز العمال: ۲۶۰/۷، بلکہ امام مہدی عیسیٰ علیہ السلام کی امامت کریں گے، اس بارے میں بھی ابوہریرہؓ کی حدیث ہے ملاحظہ ہو: ''کنز العمال ۱۸۸/۷۔ نیز کتاب مذکور کی جلد: ۷، ص: ۱۶۸/ اور ۱۸۷/ میں بھی متعدد روایات ابوہریرہؓ کی ہیں، انہیں بھی دیکھ لیا جائے۔

کسی بھی ایسے شخص پر یہ بات پوشیدہ نہیں، جس کو کتب حدیث سے تھوڑی بہت مناسبت ہے کہ قرب قیامت زیادہ تر قتل وقتال کے جو واقعات پیش آئیں گے، وہ نصاریٰ اور مسلمانوں کے درمیان ہوں گے، جس کی وجہ سے اضطراب، بے چینی اور شورش کا عالم ہوگا۔ ایسے حالات میں مسلمانوں کی اصلاح کی ذمہ داری امام مہدی لیں گے اور نصاریٰ کی اصلاح کے لیے عیسیٰ علیہ السلام اتریں گے (کیوں کہ نصاریٰ ان کی قوم ہے)

حضور ﷺ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان کوئی نبی نہیں

یہ حدیث مذکور ہو چکی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''وانی اولی الناس بعیسی بن مریم ،لا نه لم یکن بینی وبینه نبی''

''میں عیسیٰ بن مریم کے سب سے زیادہ قریب ہوں، کیوں کہ میرے اور ان کے درمیان کوئی نبی نہیں ہوا''۔

اور خالد بن سنان کے متعلق ''مستدرک حاکم (ج:۲،ص:۶۵۴، رقم:۴۱۷۳)'' میں جو روایت ہے کہ ان دونوں حضرات کے درمیان مبعوث ہوئے، تو امام ذہبی نے اس روایت کو ''منکر'' کہا ہے جیسا کہ درمنثور (ج:۲،ص:۴۳۶) میں ارشاد باری: ''وَرُسُلاً نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ'' (النساء:۱۶۴) کے تحت ہے۔ ''تلخیص المستدرک'' کے مطبوعہ نسخے میں امام ذہبی کا یہ قول رہ گیا ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام کی عمر

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی عمر کے بارے میں صحیح قول یہ ہے کہ چالیس سال کی عمر میں آپ کو نبوت عطا ہوئی، اسّی ۸۰/ سال کی عمر میں آسمان پر اٹھا لیے گئے اور نزول کے بعد چالیس

سال دنیا میں رہیں گے،اس حساب سے کل عمر-آسمان پر رہنے کی مدت کو چھوڑ کر-ایک سوبیس برس ہوئی، جو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے دوگنا ہے۔اس کی مکمل وضاحت راقم سطور کے ایماء پر عزیزی مولوی بدر عالم صاحب نے اپنے رسالہ ''الجو اب الفصیح لمنکر حیا ۃالمسیح ''میں کردی ہے۔

امت محمدیہ کی فضیلت وولایت

مسلم نے ''باب نزول عیسٰی علیہ السلام'' (۱/۸۷) کے تحت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''لاتزال طائفة من امتی یقاتلون علی الحق ظاهرین الیٰ یو م القیٰمة.قال :فینزل عیسی ابن مریم.صلی الله علیه وسلم .فیقول امیرهم:تعال صل لنا ،فیقول :لا، ان بعـــــضکم علی بعض امراء ،تکرمة الله هٰذه الامة''.

''میری امت میں ایک جماعت -قرب- قیامت تک اعلاء کلمۃ الحق کے لئے مصروف جدو جہد رہے گی۔پھر عیسٰی ابن مریم نازل ہوں گے،تواس جماعت کا امیران سے کہے گا:''آئیے ہمیں نماز پڑھائیے''اس پر فرمائیں گے:نہیں،اللہ تعالیٰ نے اس امت کواعزاز بخشا ہے،اس لیے تم ہی میں سے بعض بعض کے امیر ہیں''۔

مراد یہ ہے کہ اس نماز میں امامت نہیں فرمائیں گے (جس میں نازل ہوں گے) تا کہ یہ شبہ نہ ہو کہ امت محمدیہ کی ولایت ختم کردی گئی (پہلی نمازاس امت کے فرد کی اقتداء میں اداء کر کے) جب اس ولایت کو عملاً ثابت کر دیں گے،تو پھر بعد کی نمازوں میں آپ علیہ السلام ہی امام ہوں گے ۔کیونکہ آپ مہدی سے افضل ہیں ؛چناں چہ آپ مہدی کو بالکل صحیح جواب دیں گے (جس وقت وہ آپ کو امامت کے لیے آگے بڑھانا چاہیں گے)''لا ،فانها لک اقیمت ''(کہ اس وقت اقامت آپ کے لیے کہی گئی ہے اس لیے آپ ہی امامت فرمائیں) جیسا کہ ابن ماجہ (کتاب الفتن:۲۹۸/۲)وغیرہ میں ابوامامہ سے ہے۔اگر عیسٰی علیہ السلام امامت کے لیے آگے بڑھ جائیں،جب کہ اقامت مہدی کے لیے ہوئی،تو یہ خیال ہوسکتا ہے کہ شاید مہدی معزول کردیے گئے،برخلاف بعد کی نمازوں میں (کہ ان میں آپ علیہ السلام کے لیے اقامت کہی جائے گی)یہ ایسا ہی ہے،جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو، جب کہ وہ نماز شروع کر چکے تھے،ارشاد فرمایا کہ:مصلیٰ سے نہ ہٹیں۔گویا کہ آپؐ نے فرمایا:اقامت آپ کے لیے ہوئی ہے؛اس لئے میں اس نماز کی امامت نہیں کرونگا،آپ ہی کیجئے۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسیٰ علیہ السلام کے قول: ”تکرمة الله هذه الامة“ کو ایک مزید فائدے کے لیے ذکر کیا، وہ یہ کہ امت محمدیہ کی ولایت عیسیٰ علیہ السلام کے، اس کا ایک فرد بن جانے کے بعد بھی باقی رہے گی، اس جملے کا مقصد آپؑ کے امامت نہ کرنے کی وجہ بیان کرنا نہیں، جس سے یہ شبہ ہو کہ آپ کبھی امام نہ ہوں گے۔

اس پر کسی کو یہ خلجان نہ ہو کہ یہ حدیث، مسلم شریف کی اس حدیث کے مخالف ہے، جو ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”ولا یؤمن الرجل الرجل فی سلطانه ، ولایقعد فی بیته علی تکرمته الا باذنه“

(مسلم: ۲۳۶/۱)

”کوئی شخص کسی کی سلطنت میں امامت نہ کرے اور نہ کسی کی مسند پر بغیر اجازت بیٹھے“۔

کیونکہ ”صحیح مسلم ،باب نزول عیسی“ میں ابوہریرہؓ کی حدیث، عیسیٰ علیہ السلام کے مرتبے، اس امت سے ان کے تعلق اور ان کی حیثیت کو بیان کرنے کے لیے ہے، نیز یہ کہ اس وقت آپ اس امت کے ایک فرد ہوں گے اور اس وقت بھی نبی ورسول، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوں گے۔

اذالناس ناس ،والزمان زمان

ہبوط آدم علیہ السلام اور نزول عیسیٰ علیہ السلام کی حکمت

معلوم ہونا چاہیے کہ آدم علیہ السلام کا آسمان سے ہبوط اور عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان پر صعود: دونوں واقعات ایک انداز کے ہیں، کیوں کہ آدم علیہ السلام کا ہبوط بھی صعود کے بعد عمل میں آیا تھا [اس لیے کہ آپ کی تخلیق زمین سے ہوئی تھی] اور عیسیٰ علیہ السلام کا نزول بھی صعود کے بعد ہوگا؛ البتہ دونوں میں فرق یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کا ہبوط دنیا کو آباد کرنے کے لیے ہوا اور عیسیٰ علیہ السلام کا نزول دنیا کے ختم ہونے کی تمہید ہوگی؛ لہٰذا معلوم ہوا کہ ان دونوں میں یکسانیت بھی ہے اور فرق بھی۔

ہبوط ہاروت و ماروت اور صعود ادریس علیہ السلام کی حکمت

البتہ ہاروت و ماروت کا آسمان سے اترنا اور ادریس علیہ السلام کا آسمان پر چڑھنا: یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہیں، ان دونوں واقعوں سے یہ بتایا گیا کہ مقدس بھی آلودگی میں مبتلا ہونے پر اپنے مقام

سے حسی اور معنوی طور پر گر جائے گا اور خاکی (تقدس کی وجہ سے) آسمانوں تک پہنچ جائے گا۔ اس امر کے لیے دو الگ الگ جنسوں کو منتخب کرنے میں یہی راز ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ: ہاروت و ماروت کا زمین پر اترنا ادریس علیہ السلام کے زمانے میں ہوا تھا۔

خروج دابۃ اور قتل شیطان

دابۃ الارض اور شیطان ایک دوسرے کے مقابل ہیں، اسی لئے کہا گیا ہے کہ: دابۃ الارض شیطان کو قتل کرے گا۔ جیسا کہ ''عقیدۃ السفارینی'' میں ہے۔ لیکن معاملہ یہ ہے کہ شیطان ایک ایسی نوع سے تعلق رکھتا ہے جس کو ہم نہیں دیکھ سکتے، اس کا کام بہکانا ہے، جب کہ دابۃ الارض مومن و منافق کو الگ کرنے کے لیے مامور ہے۔ ہوسکتا ہے کہ دابۃ الارض مخلوق کی ایسی قسم ہو جو مختلف شکلیں بدل سکے، ایمان تو اس پر لانا ضروری ہے، جس کا ثبوت حدیث میں ہو۔ نعوذ باللّٰہ من الزیغ والالحاد۔

کیا دابۃ الارض کا آنا اس علامت قیامت میں داخل ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ تم پر قیامت قائم نہیں ہوگی، یہاں تک کہ جانور تم سے بات کریں؟ (ممکن ہے) دابۃ الارض سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کے وقت نکلے گا [کذا فی فتح الباری] پس شیطان کا غلبہ نیز اس کو دی گئی مہلت اسی دن ختم ہو جائے گی۔

واللّٰہ سبحانہ وتعالٰی اعلم.

فصل

بشارت خاتم النّبیین ﷺ اور انجیل

انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ تمام بنی آدم کے سردار اور قصرِ نبوت کی آخری اینٹ ہیں۔ جیسا کہ مذکور ہوا؛ چناں چہ ''مرقس'' اور ''متی'' میں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے بطور تمثیل فرمایا کہ: ''ایک آدمی نے انگور کا باغ لگایا، اس کے ارد گرد چہار دیواری بنائی، اور انگور کشید کرنے کی بھٹی لگائی، برج بنایا، پھر باغبانوں کو ٹھیکہ پر، دے کر سفر میں چلا گیا۔ جب پھلوں کا موسم آیا تو اس نے اپنے خادم کو انگور لینے کے لیے بھیجا، باغ بانوں نے اسے مارا پیٹا اور نامراد واپس کر دیا۔ مالک نے دوسرے خادم کو بھیجا، باغ بانوں نے اسے بھی پتھروں سے مار مار کر خون آلود کر کے واپس کر دیا۔ اس نے تیسرے خادم کو بھیجا، انھوں نے اسے قتل کر ڈالا۔ پھر اس نے بہت سے دوسرے نوکروں کو بھیجا، باغ بانوں نے ان کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا، کچھ کو مارا جبکہ بعض کو تہہ تیغ کر دیا۔ مالک کے پاس اب ایک اکلوتا اور چہیتا بیٹا رہ گیا تھا، اس نے اسے بھی اس خیال سے بھیج دیا کہ باغ باں اس کا لحاظ کریں گے۔ جب باغبانوں نے بیٹے کو دیکھا تو آپس میں کہنے لگے کہ: یہی اس ساری جائداد کا وارث ہے، لہٰذا اسے قتل کر کے میراث پر قبضہ کر لیں؛ چناں چہ اسے پکڑ کر مار ڈالا اور لاش باہر پھینک دی۔

اب جب باغ کا مالک آئے گا تو ان باغ بانوں کے ساتھ کیا سلوک کریگا؟ ظاہر ہے کہ وہ آ کر ان ظالموں کو نیست و نابود کر ڈالے گا اور باغ دوسرے لوگوں کے سپرد کر دے گا۔

کیا تم نے یہ نوشتہ نہیں پڑھا کہ پتھر کے جس ٹکڑے کو معماروں نے مسترد کر دیا، وہی قصر کا آخری کونا ثابت ہوا، یہی وہ ہے جو سب کے سامنے طے ہو چکا ہے؛ اگر چہ وہ تمہاری نظروں میں انوکھا ہے۔ (انتہی)

یہ تمثیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کے تعلق سے انجیل میں موجود دلائل میں، قوی اور معنی خیز ہے۔ نصاریٰ نے اس کی غلط تاویلات کیں۔ یہ مثال اس فصل کی ابتداء میں ذکر کی گئی، اس کی تشریح یہ ہے کہ: پودا لگانے والا اللہ تعالیٰ ہے، پودا لگانے کی جگہ دنیا ہے، انگور کی بیل بنی آدم ہیں، چہار دیواری وحی الٰہی ہے، بھٹی احکام الٰہیہ ہیں، برج انبیاء علیہم السلام اور باغ باں وہ ہیں جنہیں دعوت پہنچی، خادم اوّل سے

موسیٰ علیہ السلام مراد ہیں، خادم ثانی سے یوشع بن نون علیہ السلام، اور خادم ثالث سے یحییٰ بن زکریا علیہ السلام اور ''کثیرین آخرین'' سے موسیٰ وعیسیٰ علیہم السلام کے درمیان مبعوث ہونے والے وہ انبیاء کرام مراد ہیں، جن سے متعلق تفصیلات کا علم نہیں، اکلوتے بیٹے سے مراد جس کو سب سے آخر میں اس قوم کے پاس بھیجا گیا خود عیسیٰ علیہ السلام ہیں (۱)۔

یہ لطیف تمثیل ہے، جس میں عیسیٰ علیہ السلام نے خود اپنی بابت خبر دی ہے۔ اوران لوگوں سے مراد جنہیں سب سے آخر میں انگور کا باغ دیا جائے گا، عرب (یعنی بنی اسماعیل) ہیں۔

اگر یہ شبہ ہو کہ لفظ ''برج'' سے انبیاء اور پھر لفظ ''فلاحین'' سے افراد امت کیوں مراد لیے گئے؟ تو جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ: اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالت شان اور آپ کی امت کی قدر ومنزلت کا اظہار مقصود ہے: کیوں کہ امت محمدیہ، جملہ امتوں سے افضل اور برتر ہے۔ نیز اس سے ارشاد باری ''کُنتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ'' اور فرمان نبوی ''علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل'' کی بھی تصدیق ہوتی ہے۔ اگر چہ اس حدیث پر کچھ کلام کیا گیا ہے، لیکن اس سے نہ صرف علی الاطلاق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالتِ قدر اور عظمتِ شان ظاہر ہوتی ہے، بلکہ جملہ انبیاء کرام پر بھی آپ کی فوقیت نمایاں ہے۔

پھر تمثیل کے اس نادر انداز کو دیکھئے: یوں معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام سے اس بارے میں دریافت کیا گیا (کہ وہ دوسرے لوگ کون ہے، جن کو بعد میں مالک نے باغ سونپا؟) تو آپ نے فرمایا: بنی اسماعیل۔ پھر جب اس پر یہ اعتراض کیا گیا کہ: کیا باندی کی اولاد میں نبی مبعوث ہوگا؟ اس پر آپ نے فرمایا: ''کیا تم نے اشعیاء کا یہ ارشاد نہیں پڑھا: ''ان الحجرۃ التی رفض البناؤن، صارت رأس الزاویۃ، ھذا ھو ماوقع عند الرب وھو فی نظر کم عجیب'' (وہ پتھر جسے معماروں نے پھینک دیا، وہی قصر کا آخری کونا ثابت ہوا، یہی منشاء خداوندی تھا، اگر چہ تمہیں عجیب لگ رہا ہے)۔ اگر تم مجھے جھٹلاتے ہو تو اپنے نبی اشعیاء کے بارے میں کیا کہو گے؟ (کیا اس کی بھی تکذیب کرو گے؟) وہ جسے آج تم حقیر سمجھ رہے ہو، وہی سب سے اعلیٰ مقام پر فائز ہوں گے، یہی تقدیر الٰہی ہے اور یہی اس وعدے کی تکمیل ہے جو اسماعیل علیہ السلام کی بابت اللہ جل شانہ نے ابراہیم علیہ السلام سے کیا تھا۔ (انتہی)

چناں چہ ''سفر تکوین'' (کتاب پیدائش) میں ہے کہ: ''اسمٰعیل علیہ السلام کی پیدائش کے بعد ابراہیم

(۱) اکلوتے بیٹے کی تعبیر صرف تمثیل کے لیے ہے، اس سے یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ عیسیٰ علیہ السلام، عیسائیوں کے خیال کے مطابق خدا تعالیٰ کے بیٹے ہیں، اللہ رب العزت تو ''لم یلد ولم یولد'' ہیں۔ (محمد صغیر)

علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ: کاش اسماعیل تیرے حضور جیتا رہے؟ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اسماعیل کے حق میں میں نے تیری دعا سن لی، دیکھ میں اسے برومند کروں گا، اس کو بہت بڑھاؤں گا، اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اس کو بڑی قوم بناؤں گا"۔ (انتہی)

رہی یہ بات کہ یہود ونصاری جو "سیلد اثنی عشر ملکا" کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ: "اسمٰعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹے بادشاہ ہوں گے" تو یہ بالکل غلط ہے؛ اس لیے کہ اسماعیل علیہ السلام کے بیٹے نہ تو بادشاہ ہوئے اور نہ ہی انھوں نے بادشاہت کا دعوی کیا۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ اس سے مراد وہ بارہ امیر ہیں، جو کل قریش سے ہونگے، جیسا کہ حدیث میں ہے(۱)۔

جب کہ وہ عہد جو بی بی ہاجرہ سے ہوا اس کی بابت "کتاب الخلیقہ" (کتاب پیدائش) میں ہے کہ: "ہاجرہ سے خداوند کے فرشتے نے کہا کہ تو حاملہ ہے اور عنقریب ایک بیٹا جنے گی، اس کا نام اسمٰعیل رکھنا، (۲) خدا نے تیرا دکھ سن لیا اور وہ بدوی ہوگا، اس کا ہاتھ سب کے اور سب کے ہاتھ اس کے خلاف ہوں گے" (انتہی)۔

"کتاب متی و کتاب اشعیاء" [۲۸-۱۶] اور مزامیر [۱۱۸-۲۲] میں ہے کہ:

"ان تلک الحجرة التی رفض البناؤن، وصارت رأس الزاوية، هذا هو عمل الرب، وهو في اعيننا عجيب"۔

"وہ پتھر جسے معماروں نے پھینک دیا، قصر کا آخری کونا ثابت ہوا، یہ سب کچھ خدا نے کیا، اگر چہ تمہیں عجیب لگ رہا ہے"۔

یہ بات یقینی ہے کہ مذکورہ بالا بیان آپ ﷺ کی نبوت پر صریح دلیل ہے؛ اس لیے کہ آپ ہی اولاد اسمٰعیل سے ہیں۔ نیز موسی علیہ السلام سے پہلے جن کے ٹھکرا دیے جانے کی بات کہی گئی ہے، اس سے اسمٰعیل علیہ السلام ہی مراد ہیں۔ "رأس الزاوية" دو خطوں کے سنگم کو کہا جاتا ہے؛ لہٰذا یہ سنگم ہی "خاتم" قرار پائے گا، اس لیے کہ دونوں خطوں کے سرے، زاویہ میں آکر مل جاتے ہیں اور وہیں ختم ہو جاتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ ان دونوں کی ابتداء کہاں سے ہے؟ تو اسکے تعیین کی چنداں ضرورت نہیں، بنا بریں "ملتقی الخطين" - دونوں خطوں کا سنگم - ہی دونوں کی انتہاء

(۱) حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "یکون اثنا عشر امیرا کلهم من قریش" (بخاری، کتاب الاحکام، باب الاستخلاف" جلد:۲ رص:۱۰۷۲- و "مسلم، کتاب الامارة: باب الناس تبع لقریش": ج:۲ رص:۱۱۹) (محمد صغیر)

(۲) اسماعیل "اسمع" اور "ایل" دو لفظوں سے مرکب ہے، عبرانی زبان میں "ایل" لفظ "اللہ" کے مرادف ہے اور عربی زبان کے "اسمع" اور عبرانی کے "شاع" کے معنی ہیں "سن"۔ چوں کہ اسماعیل علیہ السلام کی ولادت کے بارے میں اللہ تعالی نے حضرت ابراہیم کی دعا سن لی اور ہاجرہ کو فرشتہ سے بشارت ملی، اس لیے آپ کا یہ نام رکھا گیا، عبرانی میں اسکا تلفظ "شاع ایل" ہے۔ (قصص القرآن: ۱/۲۲۵) (محمد صغیر)

ہوگی اور یہ حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی ہے، جن پر اللہ رب العزت نے جماعت انبیاء کو ختم کر دیا۔

جہاں تک عیسیٰ علیہ السلام کے قول: "ھذا ھو عمل الرب" کا تعلق ہے، تو یہ ایک سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ چھوڑا ہوا پتھر رأس الزاویہ میں ٹھہر سکے گا؟ اور کیا ہاجرہ کی اولاد میں سے نبی ہو سکے گا؟ اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ: یہ بات اگرچہ تمہارے خیال میں تعجب خیز ہے، مگر مشیت ایزدی اور تقدیر الٰہی یہی ہے۔ یہ بات اشعیاء کے درج ذیل قول کے سیاق میں کہی گئی ہے:

"ھذا ما یقول الرب الالہ: ھا انا ذا، قد القیت فی صھیون حجرۃ اساس، الا بل زاویۃ اساس محقق، لا یخجل من یعتقدبھا"۔

"اللہ رب العزت فرماتا ہے کہ: میں نے صہیون میں ایک بنیادی پتھر لا کر ڈال دیا ہے، بنیادی ہی نہیں بلکہ زاویہ کا بنیادی پتھر ڈالا ہے، اس کا عقیدہ رکھنے والا انشاء اللہ رسوا نہیں ہوگا"۔

اس جملہ میں "ھذا" مخاطب کی تخصیص اور بہ غور سننے کی ترغیب کے لیے ہے، "ما" لفظاً مفرد اور معناً جمع "کل" کے معنی میں ہے۔ نیز لفظ "یقول" قول کے معنی میں ہے؛ پس اس کے معنی ہوئے "یہ پورا کا پورا فرمان باری تعالیٰ کا ہے" (اسے غور سے سنو)۔ "رب" کی صفت "الالہ" تعظیم و تخویف کے لئے ہے "ھا انا ذا، قد القیت فی صھیون حجرۃ اساس" میں اضافت لام کے معنی میں ہے، "الا بل زاویۃ" اساس سے بدل ہے، "اساس محقق"، "الا بل زاویۃ" سے بدل ہے اور "لا یخجل من یعتقدبھا" القاء حجر کی غایت ہے۔ پس اشعیاء کے قول کا مطلب یہ ہوا "یہی ارشاد باری ہے، جو اس پر یقین رکھے گا، اس کے وقوع کا منتظر رہے گا اور اس پر ایمان لائے گا، وہ ہرگز نادم و شرمندہ نہ ہوگا"۔ حاصل یہ کہ بعینہٖ اس کا مفہوم وہی ہے جو "متی" کی عبارت کا ہے۔ "متی" کے قول کے معنی یہ ہیں کہ: "وہ پتھر (یعنی اسماعیل) جسے معماروں (ابراہیم و سارہ) نے پھینک دیا تھا ["بناؤون" صیغۂ جمع کا استعمال یا تو عبرانی زبان کے قواعد کے تحت ہے، یا پھر جلالت شان کا اظہار ہے اور "رفض" فعل ماضی کا استعمال یہاں تاکید کے لیے ہے] اس کی حیثیت عمارت میں "رأس الزاویۃ" کی ہے اور اس سے مراد خاتم الانبیاء ہیں۔ متی اور اشعیاء دونوں کے قول میں وجہ مطابقت یہ ہے کہ "اشعیاء" کا قول اخبار کے لیے ہے اور "متی" کا قول وقوع اور ثبوت پر دلالت کرتا ہے۔

جعلنی اللہ وایاک ممن یسلک سواء الطریق.

نصاریٰ کی غلط تاویل

نصاریٰ اپنی عادت کے مطابق اس نص کا مصداق عیسیٰ علیہ السلام کو قرار دیتے ہیں، چناں چہ وہ کہتے ہیں

: کہ یہود عیسیٰ علیہ السلام کو حقیر سمجھتے تھے، اس لیے اس نص کا مصداق عیسیٰ علیہ السلام ہی ہیں۔ نصاریٰ کی بات قطعاً غلط اور باطل ہے۔ تاکید، عہد ذہنی کا فائدہ دیتی ہے؛ چوں کہ عیسیٰ علیہ السلام خود بنی اسرائیل میں سے تھے، اس لیے یہود کے نزدیک، بنی اسرائیل سے ہونے کی وجہ سے حقیر اور ناقابل اعتبار نہیں ہو سکتے، لہٰذا آپ اس کا مصداق نہیں ہیں۔ پھر عہد خارجی جس کی طرف موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں اشارہ کیا گیا، ضروری ہے کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے پہلے ہو چکا ہو؛ کیوں کہ یہاں صیغہ ماضی کا استعمال ہوا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے پہلے یہ واقعہ ہو چکا۔ علاوہ ازیں اگر موسیٰ علیہ السلام کے زمانے، یا اس سے پہلے، یہود نے عیسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا یا ناقابل اعتناء سمجھا ہوتا تو یقیناً آپ اسکا مصداق ہو سکتے تھے، مگر ایسا نہیں ہے (اس لیے کہ عیسیٰ علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام کے بہت بعد تشریف لائے ہیں، موسیٰ علیہ السلام سے پہلے مسترد کیے ہوئے تو حضرت اسماعیل ہیں، جن کی اولاد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے)۔

جو کچھ ہم نے لکھا اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ نص محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی نبوت کے بارے میں ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تمام انبیاء کے خاتم ہیں۔ اسی روایت کو صاحب "فتح البیان" نے بھی بعض علماء سے نقل کی ہے۔ میں نے جب "انجیل متی" ص:٢١ "انجیل مرقس" ص:١٢، اور "انجیل لوقا" ص:٢٠، کے نئے تراجم سے اس کا موازنہ کیا تو اس میں "الحجرة المرفوضه" کی جگہ "الحجر المرفوض" ملا، باقی عبارت اسی طرح ہے۔ ذالک فضل الله یؤتیه من یشاء.

حدیث میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر نے "فتح الباری" ج:٦، ص:٤٠٧، میں لکھا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد:

> "مثلی و مثل الا نبیاء، من قبلی کمثل رجل بنی داراً...... الحدیث" (مسلم: ٢٤٨/٢)
>
> "میری اور مجھ سے پہلے انبیاء کی مثال ایسی ہے، جیسے کسی شخص نے کوئی گھر بنایا...... الخ":

کے بارے میں ابن عربی کہتے ہیں کہ: "وہ اینٹ جس کی طرف اس میں اشارہ ہے، وہ مذکورہ گھر کے سب سے اہم مقام پر تھی کہ بغیر اس کے مکان قائم نہیں رہ سکتا۔ مذکورہ تشبیہ کا صحیح مطلب یہی ہے"۔ (انتہی)

یہ معنی اگر کسی حدیث سے ثابت ہوں تو فبہا، ورنہ یہی معنی مراد لینا کوئی ضروری نہیں، بلکہ ظاہر سیاق چاہتا ہے کہ وہ اینٹ ایسی جگہ پر ہو کہ اس کے نہ ہونے سے گھر ناقص اور ناتمام معلوم ہو؛ چناں چہ امام مسلم بواسطہ ہمام بن منبہ ابو ہریرہؓ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

> "الا موضع لبنة من زاویة منْ زوایاها" (مسلم: ٢٤٨/٢)

''مگر اس کے ایک گوشے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی''۔

اس سے یہ بات صاف ہوگئی کہ وہ اینٹ عمارت کے لیے باعث حسن وکمال ہوگی۔ ورنہ لازم آئے گا کہ اس اینٹ کے بغیر عمارت ادھوری ہو۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے، ہر نبی کی شریعت اپنے زمانے کے لحاظ سے کامل ومکمل رہی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انبیاء کرام کی کامل ومکمل شریعتوں کی بہ نسبت شریعت محمدیہ کی اکملیت کا اظہار مقصود ہے۔ سبحان اللہ! ان دو اولوالعزم انبیاء کرام کے حق میں یہ تمثیل کس قدر برمحل اور مطابق واقعہ معلوم ہوتی ہے۔ واللّٰہ یقول الحق وھو یھدی السبیل.

ایلیاء کون ہے؟

عبرانی زبان میں ''ایلیاء'' کے معنی ہیں ''اللہ کے نزدیک عظیم المرتبت'' جیسا کہ صاحب ''ناسخ'' نے [جوکہ عبرانی زبان کے ماہر ہیں] فارسی زبان میں ''بزرگوار من خدای'' سے اس کی تفسیر کی ہے۔ یہ ایک وصفی نام ہے، جس سے عظیم المرتبت مراد ہوتا ہے۔ اسی معنی وصفی کے اعتبار سے بیت المقدس کو بھی ایلیاء سے تعبیر کیا گیا ہے۔ علامہ قرافی کی ''الاجوبۃ الفاخرۃ'' میں انجیل متی، بشارت: ۱۵، کے حوالے سے ہے کہ:

''حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگردوں نے ان سے دریافت کیا کہ: کتب سماویہ، یہ کیوں کہتی ہیں کہ: ایلیاء ضرور آئے گا۔ تو آپؑ نے فرمایا ایک ایلیاء یقیناً آئے گا اور ہر چیز تم کو سکھائے گا، لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ ایک ایلیاء (یعنی نبی مراد خود حضرت عیسیٰ) تو آچکا، انھوں نے اسے پہچانا بلکہ جو چاہا اس کے ساتھ کیا''۔ (انتہی) نصاریٰ نے ایلیاء کی تفسیر نبی سے کی ہے۔

یہاں تین باتیں واضح ہوئیں: اول یہ کہ: ان لوگوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو یہ بتلایا کہ کتب سماویہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ آپ کے علاوہ اور کوئی دوسرا نبی ہوگا، اور آپ علیہ السلام نے ان لوگوں کی تصدیق بھی کی۔ دوم یہ کہ یہود ونصاریٰ کی صراحتاً تکذیب فرمائی اس بات میں کہ وہ نبی نہیں ہیں بلکہ اپنے آپ کو ایلیاء یعنی نبی قرار دیا اور ان لوگوں نے ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جس کا ارادہ تھا، چناں چہ آپ کی پیروی نہیں کی۔ سوم یہ کہ: آپ نے اس بات کی خبر دی کہ عنقریب وہ نبی مبعوث ہوکر سب کچھ سکھلائے گا۔ اور یہ چیز (یعنی ہر چیز کی تعلیم) ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور میں نہیں پائی گئی، اس لیے آپ ہی نبی موعود ہوئے۔ ان آیات سے نصاریٰ کا یہ دعویٰ بھی غلط ثابت ہوگیا کہ ناری زبانوں کا نزول ہوگا؛ کیوں کہ اس میں تصریح ہے کہ وہ نبی ہوگا [جیسا کہ قرافی نے آیات کا مطلب سمجھا] ناری زبان سے مراد وہ

نورانی شعلے ہیں جوان سے منور ہونے والوں کو جائیں گے۔

حافظ ابن قیم "ھدایۃ الحیاری" فصل:۳۴، میں "انجیل متی" کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ جب یحییٰ علیہ السلام کو قید کیا گیا تو انھوں نے اپنے شاگردوں کو مسیح علیہ السلام کے پاس یہ دریافت کرنے کے لیے بھیجا کہ آپ ہی "ایل" ہیں، یا کسی دوسرے کا ہم انتظار کریں؟ مسیح نے فرمایا: میں واضح طور پر یہ کہتا ہوں کہ: یحییٰ بن زکریا سے افضل آج تک کسی عورت نے نہیں جنا اور یہ کہ تورات اور دیگر انبیاء کی کتابیں کے بعد دیگر نبوت اور وحی کے ساتھ آتی رہیں، یہاں تک کہ یحییٰ تشریف لائے، اب اس وقت اگر تم چاہو تو اس بات کو مان لو کہ "ایل" یقیناً آئیں گے۔ جن کے سننے کے دو کان ہے وہ سن لیں، یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے آنے کی بشارت ہے، جس کو عبرانی زبان میں "ایل" کہتے ہیں۔ واضح ہو کہ اللہ کے رسول، اس کی کتاب اور اس کے دین کا آنا ہی، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا آنا ہے، جیسا کہ تورات میں ہے:

"جاء الله من طور سيناء"

"اللہ تعالیٰ طور سیناء سے آیا۔ (یعنی اس کے رسول موسیٰ علیہ السلام آئے)"

عبرانی عبارت کے یہ ترجمے متقدمین علماء نے کیے ہیں، جو میرے نزدیک نئے ترجموں کے مقابلے میں زیادہ معتبر ہیں، جب میں نے اس کی تحقیق کی تو واقعۃً بھی ایسا ہی ملا؛ چناں چہ "متی" کی مذکورہ عبارت نئے تراجم میں، گیارھویں اور سترھویں صحاح میں منتشر ہے۔ گیارھویں صحاح میں مذکور ہے کہ: "یقینی طور پر وہ آئیں گے"۔ یعنی زمانہ مستقبل میں اور سترھویں صحاح میں ہے کہ "البتہ وہ پہلے آئیں گے"۔ حالانکہ یہ کھلی ہوئی تحریف ہے۔ اسی طرح کاتبین "متی" کی جانب اس کی نسبت بھی دجل وفریب ہے۔ اس لیے کہ انجیل یوحنا کے صحاح اول میں ہے کہ ان لوگوں نے یحییٰ (علیہ السلام) سے سوال کیا کہ: کیا آپ مسیح ہیں؟ یا ایلیا یا نبی منتظر؟ دیکھیے یہاں پہلے آمد کی شرط ہے ہی نہیں اور "الفارق" ص:۳۸۶ر میں ہے کہ: یہود اور بعض نصاریٰ نے اس کی تفسیر ایسے نبی سے کی ہے، جو آخری زمانے میں مبعوث ہوگا، لیکن وہ اسے "الحبر الاعظم" سے تعبیر کرتے ہیں۔

حاصل یہ کہ انجیل میں تحریفات بہت ہیں جس پر "الفارق" کی گیارھویں فصل میں متنبہ کیا گیا ہے۔ چناں چہ اس میں تصریح ہیکہ آنے والے "ایلیاء" سے مراد خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جو کہ عظیم الشان نبی ہیں (آپ جیسی عظمت کسی اور کو حاصل نہیں ہوئی)

کتب سماویہ سے یہ بشارت اسلئے نقل کی گئی کہ ملعون قادیانی کے چند چیلوں نے جب اس کو دیکھا تو

نئے تراجم سے دھوکہ کھا کر اس سے، اس بدبخت کے الحاد پر استدلال کیا کہ: یہاں ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ: یقیناً ایلیاء آچکا اور ان لوگوں نے جو چاہا، اس کے ساتھ برتاؤ کیا۔ تو اس وقت حواریوں نے سمجھا کہ اس کا مصداق یوحنا ہیں اور کتب سابقہ میں جس ایلیاء کے آنے کی بشارت ہے اس کا مصداق یحییٰ علیہ السلام ہیں جو آچکے ہیں، اس لیے بشارت پوری ہوگئی۔ پس اس ملعون نے اس سے یہ استدلال کیا کہ کتب سماویہ میں جو دوبارہ آنے کی خبر ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا مثیل آئے گا۔ نہ کہ آپ اور ایسے ہی ہماری کتابوں میں جو خبر ہے کہ: عیسی علیہ السلام دوبارہ آئیں گے، اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ آپ کا مثیل آئے گا اور بہ قول اس بدبخت: اس کی آمد پر یہ بشارت پوری ہوگئی۔ حالانکہ معلوم ہے کہ ترجموں میں تحریف ہوئی ہے، ورنہ انجیل والوں کی بڑی حماقت سمجھی جائے گی، اس لیے کہ بعض ترجموں میں عیسی علیہ السلام کے الفاظ یہ ہیں: ''ایلیاء کی آمد مستقبل میں ہوگی''۔ یعنی کتب سماویہ میں جس کے آنے کی خبر دی گئی ہے، اس کا مصداق وہ ہے جو مستقبل میں آئے گا اور وہی ایلیاء بھی ہے، بعدازاں فرمایا: ''پہلے بھی آچکا ہے (یعنی ایلیاء) اور یہودیوں نے اس کے ساتھ بدترین سلوک کیا''۔ پھر حواریوں نے یہ بات کہاں سے سمجھ لی کہ عیسی (علیہ السلام) نے یحییٰ (علیہ السلام) کو مراد لیا۔ اور یہ کیوں درست نہیں کہ انکی مراد الیاس (علیہ السلام) ہوں، جو پہلے گذر چکے ہیں۔ خصوصاً جب کہ حضرت موسیٰ کی تجلی اور حضرت الیاس کا ذکر عیسی علیہ السلام سے پہلے ہو چکا۔ اس لیے انہیں کے بارے میں کہا ہو اور ہوتا بھی یہی ہے کہ ایک چیز کے ذکر سے دوسری یاد آتی ہے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عیسی علیہ السلام نے صیغۂ مستقبل کو ماضی سے تعبیر کیا ہو۔ الحاصل ایلیاء کا اطلاق کبھی بھی یحییٰ پر نہیں کیا گیا اور یہ ہو بھی نہیں سکتا، جب کہ فرمان باری ہے:

''لَمْ نَجْعَلْ لَهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا'' (مریم:۷)

''نہیں کیا ہم نے پہلے اس نام کا کوئی۔''

لہٰذا کسی گذشتہ نبی کا نام انکے لیے کیوں کر بولا جاسکتا ہے۔

الفارق: ص:۵۷ پر ہے کہ ''متی'' کا مترجم اس جملے میں منفرد ہے:

'' ''ان اردتم ان تقبلوا فهذا هو ايلياء المزمع، ان ياتى من له اذنان للسمع فليسمع''

''اگر تم قبول کرنا چاہو تو یہی وہ ایلیاء مزمع ہے، جس کے بارے میں یہ ہے کہ وہ آئیں گے، جن کے پاس سننے کے دو کان ہیں وہ سن لیں''۔

صاحب الفارق لکھتے ہیں کہ اس میں یوحنا (یحیٰ علیہ السلام) کے بات کی مخالفت ہے؛ انجیل یوحنا میں ہے کہ جب انھوں نے یحیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ: ''تب کیا ایلیاء آپ ہی ہیں؟ تو جواب تھا کہ: میں نہیں ہوں''۔ اس طرح خود یحیٰ نے وضاحت کردی کہ وہ ایلیا نہیں ہیں؛ لہٰذا انجیل کی یہ روایت بھی ساقط ہوجاتی ہے، جس میں یہ ہے کہ ''ایلیاء ان سے پہلے آئے گا''۔

صحیح یہ ہے کہ ایلیاء عیسی علیہ السلام کے بعد آئیں گے، نہ کہ پہلے۔ اس کی دلیل ''سفر ملاخیا۔ علیہ السلام۔'' کے آخر میں وہ وعدہ خداوندی ہے، جس میں کہا گیا ہے ''کہ: سنو میں تمہارے پاس رب عظیم کے خوف ناک دن (قیامت) کے آنے سے پہلے ایلیاء نبی کو بھیجوں گا''۔ یہ بات نبی ساعۃ رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی پر بھی صادق نہیں آتی۔ نیز لکھتے ہیں کہ: ہود نے انجیل میں تحریف کا اعتراف کیا ہے۔ ''الفارق'' کے ذیل میں ہے: کہ یہ چیستاں بلاشک احمد (ﷺ) ہیں، جس کو ''ایلیا'' کے ساتھ پہیلی میں بتلایا گیا ہے اور یہ پہیلی حروف ابجد کے حساب سے صادق ہے، جو یہودیوں کے یہاں مستعمل اور معتبر ہے(۱)۔

میں کہتا ہوں کہ ''ملاخیا'' کی چوتھی کتاب میں ''ایلیا'' کے ذکر سے پہلے حوریب کے زمانے کا ذکر ہے اور وہ طور پہاڑ ہے، حوریب کے عہد میں خاتم الانبیاء (ﷺ) کی بابت وصیت ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: ''اور وہ پہلے مصر سے نکلا پھر اپنی آخری عمر میں فاران کی چوٹی سے بشارت دی''۔ یہ بات خاتم الانبیاء (ﷺ) ہی کے ساتھ مخصوص ہے لہٰذا ایلیاء بھی آپ ہی ہیں۔ ایک بشارت میں ''ایلیا'' کو ''ماد ماد'' سے تعبیر کیا گیا ہے، جس کے معنی ہیں ''عظیم عظیم'' یہ بھی ''ایلیاء'' کے معنی کے قریب ہے۔ نیز ''ملاکی نبی'' کی بشارت میں بھی خاتم الانبیاء (ﷺ) کی بشارت ہے، جو عہد قدیم کی آخرت بشارت ہے، جسے ملاکی نبی نے غالباً آخری عمر میں سنایا تھا، علاوہ ازیں یہود خود اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ ''سفر ملاکی'' میں ''ایلیا'' سے مراد ایسا عظیم الشان نبی ہے، جو آخری زمانے میں آئے گا، لہٰذا معلوم ہوا کہ اس کے خلاف جو کچھ ہے وہ مرتبین اناجیل کی تلبیس اور عبارتوں میں کتر و بیونت کا نتیجہ ہے۔

اس بدبخت نے اپنے ایک اشتہار میں جو ''سر الخلافہ'' کے ساتھ شائع ہوا، تسلیم کیا ہے کہ: ''اسی

---

(۱) اس طرح کہ ''ایلیاء'' کے آخری ہمزہ کو بھی الف کا عدد دیدیا جائے، تو اس کے ابجدی حساب (۵۳) ہوں گے، جو بعینہ ''احمد'' کے بھی اعداد ہیں۔ اعداد ملاحظہ ہوں:

ا۔ ی ۔ل۔ ی ۔ا ۔ء (ایلیاء) ا۔ ح۔ م۔ د (احمد)

۱+۱۰+ ۳۰+۱۰ +۱+۱ = ۵۳، ۱+۸+۴۰+۴ = ۵۳ (محمد صغیر)

طرح ایلیاء کی واپسی اہل کتاب کے یہاں متواتر ہے''۔ یہی اس کم بخت کی عادت ہے کہ جو چیز اس کے منشاء کے خلاف ہو اس میں تحریفات کرتا رہتا تھا۔ اور جو چیز مطابق ہو اس کے متواتر ہونے کا ڈھنڈورا پیٹتا رہتا ہے، جب کہ بلا اختلاف صریح متواتر، مثلاً حیات عیسیٰ کے عقیدہ کو، کہتا ہے کہ: اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ بھی سلب ایمان اور توفیق الٰہی سے محرومی کی دلیل ہے۔ اس پر کوئی تعجب نہیں، کیوں کہ اس نے دنیوی لذات کی خاطر اپنا دین وایمان فروخت کررکھا ہے، تعجب تو اس کے ان بدنصیب پیروکاروں پر ہے، جنہوں نے بلا معاوضہ ایمان کا سودا کرلیا۔ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَالَهٗ مِنْ نُّوْرٍ.

حافظ ابن تیمیہ کی کتاب ''الجواب الصحیح'' ج:۳/ص:۲۶۴-اور ص:۲۸۲/، میں بشارت فاران کا تفصیل سے ذکر ہے۔ اسی طرح اشعیاء علیہ السلام کا تذکرہ بھی ج:۳، ص:۳۰۷/اور ص:۳۰۹/پر ہے۔ نیز ذیل ''الفارق''، ص:۳۷/میں شیلون کی بابت یعقوب علیہ السلام کی بشارت کی وضاحت کی گئی ہے شیلون عبرانی لفظ ہے، جس کا عربی ترجمہ ''الذی له الکل'' (جس کے لیے سب کچھ ہے) ہے اور یہ بھی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، علاوہ ازیں عیسیٰ علیہ السلام کی یہ بشارت کہ ''ارکون عالم'' (سردار دنیا) عنقریب آئیں گے، جیسا کہ انجیل یوحنا میں ہے، یہ بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے۔

لفظ ”توفی“

ایک تحقیقی تجزیہ

لفظ ”توفی“ کا غلط معنی لیکر اس بدبخت اور اس کے پیروکاروں نے بڑی بدتمیزیاں کی ہیں، اس لفظ کی بابت کتنے ہی صفحات سیاہ کر ڈالے، جگہ جگہ اور بار بار اسے چھیڑا، اپنی تمام تصنیفات میں اس پر اس قدر طول وطویل اور لایعنی بحثیں کی ہیں کہ قاری اکتا جائے۔ درحقیقت یہی اس کا مبلغ علم ہے، مگر جب حقیقت سے پردہ اٹھا تو وہ رسوا اور ذلیل وخوار ہوا اور اب اس کا حال اس شعر کے مطابق ہے:

ما زال سر الکفر بین ضلوعہ ❁ حتی اصطلی سر الزناد الواری

”کفر کا راز اس کی پسلیوں کے بیچ پلتا رہا، یہاں تک کہ روشن کرنے والے چقماق کے راز نے اس کو بھڑکا دیا“۔

یا جیسا کہ فارسی کا یہ شعر ہے:

بنمائی بصاحب نظری گوہر خود را ❁ عیسی نتواں گشت بتصدیق خری چند

”صاحب نظر کو اپنا موتی دکھلا، چند گدھوں کی تصدیق سے عیسی نہیں بن سکتا“۔

حقیقت وکنایہ

لفظ ”توفی“ کی تفسیر وتشریح سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت وکنایہ کے مفہوم کو بیان کر دیا جائے؛ تا کہ اس بحث کو سمجھنا آسان ہو(۱)۔

دسوقی فرماتے ہیں کہ بعض کے نزدیک کنایہ ایسا لفظ ہے، جو معنی حقیقی میں اس لئے مستعمل ہے تا کہ

(۱) کنایہ کے بارے میں یہ اختلاف ہے کہ کیا یہ کوئی مستقل نوع ہے، یا حقیقت ومجاز میں سے کسی ایک میں داخل ہے۔ اس سلسلے میں چار اقوال ہیں:

۱- مجاز وکنایہ دونوں ایک ہیں۔ ۲- حقیقت وکنایہ دونوں ایک ہیں۔ ۳- کنایہ نہ حقیقت ہے نہ مجاز؛ بلکہ یہ مستقل قسم ہے۔

۴- کنایہ کی تقسیم حقیقت ومجاز دونوں کی طرف ہوتی ہے، اگر لفظ کا استعمال معنی میں اس طرح ہو کہ اس سے لازم معنی مراد ہوں تب تو وہ حقیقت ہے اور اگر لازم کی تعبیر بواسطہ ملزوم کی جائے تو چونکہ لفظ کا استعمال غیر موضوع لہ میں ہوا ہے اس لئے مجاز ہوگا۔

صاحب کتاب علامہ کشمیریؒ یہاں اسی عقدہ کی نقاب کشائی کر رہے ہیں۔ (محمد صغیر)

اس سے مجاز کی طرف انتقال ہو۔اس تعریف کی بنیاد پر کنایہ حقیقت میں داخل ہوگا اس لئے کہ کسی لفظ کو معنی موضوع لہ میں استعمال کر کے معنی موضوع لہ ہی مراد لینا، حقیقت ہے، خواہ اس سے وہی ایک معنی موضوع لہ مراد لیا جائے، جیسا کہ ''صریح'' میں ہوتا ہے یا اس کے ساتھ معنی مجازی بھی مراد ہوں جیسا کہ کنایہ میں ہوتا ہے۔

دوسری رائے جسے یعقوبی نے لکھا ہے اور سکاکی کی بعض عبارتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ: کنایہ وہ لفظ ہے جس سے اس کے معنیٔ اصلی اور معنیٔ لازم دونوں بیک وقت مراد ہوں؛ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ معنی لازم اصل مراد ہوتا ہے اور معنی حقیقی، معنی لازم کے تابع۔ جن حضرات نے یہ لکھا ہے کہ: کنایہ ایسا لفظ ہے جس سے اس کا لازم معنی مراد لیا جائے اور اسکے ساتھ اس کے معنی ملزوم کا بھی مراد لینا درست ہو، ان کا بھی یہی مطلب ہے۔ اس لئے کہ لفظ ''مع'' متبوع پر داخل ہوتا ہے نہ کہ تابع پر؛ چنانچہ ''جاء زید مع الامیر'' تو کہا جاتا ہے، لیکن ''جاء الامیر مع زید'' کہنا درست نہیں۔

مزید لکھتے ہیں کہ: معنیٔ حقیقی مراد لینا، اس حیثیت سے کہ مقصود کی طرف انتقال ہو، کنایہ اور مجاز دونوں میں درست ہے، مگر اس حیثیت سے کہ معنی حقیقی ہی مراد ہو، کنایہ اور مجاز دونوں میں ممنوع ہے؛ لیکن بیک وقت دونوں کو اس طرح مراد لینا کہ مقصود صرف معنی لازم ہو، کنایہ میں تو درست ہے، مجاز میں نہیں۔ ''عروس الافراح'' میں تصریح ہے کہ: ''زید کثیر الرماد'' سے اس کی جود و سخا مراد ہوتی ہے، تاہم اس سے معنی حقیقی - بہت زیادہ راکھ والا - بھی مراد لیا جا سکتا ہے، جب کہ لازم و ملزوم دونوں کے افادے کا بیک وقت ارادہ کیا جائے۔ جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا اس سے یہ وہم نہیں ہونا چاہئے کہ اس سے جمع بین الحقیقة والمجاز یا جمع بین الحقیقتین لازم آتا ہے۔ اس لئے کہ یہاں تعدد ارادہ استعمال میں نہیں ہے، بلکہ افادہ میں ہے۔ پھر یہ کہ لفظ اپنے معنی موضوع لہ میں استعمال ہوا ہے اور ایسا ہوتا ہے کہ کوئی لفظ کسی ایک معنی میں استعمال کیا جاتا ہے مگر اس سے بہت سے معانی مقصود ہوتے ہیں۔

اگر یہ اشکال ہو کہ ''فلان طویل النجاد'' (فلاں لمبے پرتلے والا ہے، یعنی لمبے قد والا ہے) ''فلان رفیع العماد'' (فلاں لمبے ستون والا ہے، یعنی شریف آدمی ہے) ''فلان کثیر الرماد'' (فلاں بہت زیادہ راکھ والا ہے میں، یعنی سخی ہے) وغیرہ جملے استعمال کئے جاتے ہیں، اگر چہ وہ شخص صاحب نجاد و عماد اور صاحب رماد نہ ہو؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان چیزوں کے نہ ہونے سے یہ نہیں لازم آتا کہ ایسا کہنا صحیح نہ ہو، کیونکہ ان چیزوں کا وجود ہو سکتا ہے اور اس کے حق میں تحقق بھی ممکن ہے، تو ایسا کہنا بھی صحیح ہوگا اور جب کہنا صحیح

ہوا تو ایسا لفظ بول کر سخاوت کا معنی مراد لینا بھی صحیح ہے۔ہاں اگر ان چیزوں کا پایا جانا ممکن نہ ہو تو پھر مذکورہ بالا اعتراض ہو سکتا ہے۔یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کہا جائے: "زید طویل النجاد" اور مراد یہ ہو کہ وہ لمبے قد کا ہے۔یہ کنایہ ہوگا، کیونکہ کوئی ایسا قرینہ نہیں پایا جاتا جو طول نجاد سے خود پر تلے کی لمبائی مع قد کی لمبائی مراد لینے سے مانع ہو۔

ابن السبکی نے لکھا کہ: درست یہی ہے کہ "کنایہ" میں دو چیزیں مقصود ہوتی ہیں، ایک لفظ کا مدلول جسے ارادۂ استعمال کہا جاتا ہے، دوسرا الملزوم، یہی ارادۂ افادہ کہلاتا ہے؛ جب کہ مجاز میں ایک ہی شئی جو کہ لفظ کا مدلول ہے، مراد ہوتی ہے۔یا یہ کہا جائے کہ مجاز میں بھی دو چیزوں کا ارادہ ہوتا ہے: ارادۂ افادہ اور ارادۂ استعمال۔مگر اس میں دونوں ارادے محل واحد میں ہوتے ہیں۔یعنی اس سے استعمال اور افادہ دونوں کے اعتبار سے معنی غیر موضوع لہ کا ارادہ کیا جاتا ہے، برخلاف کنایہ کے۔

ابن السبکی مزید لکھتے ہیں کہ: فرض کرو کہ کنایہ کا استعمال معنی غیر موضوع لہ میں ہے، تو یہ کہنا کیسے درست ہے کہ مجاز کی تعریف میں قرینہ کی شرط لگانے سے کنایہ مجاز سے نکل گیا؟ اس لئے کہ کنایہ قرینے کا محتاج ہوتا ہے، مثلاً: اگر آپ "زید کثیر الرماد" کہیں اور کوئی قرینہ ایسا نہ ہو جو اس لفظ کو سخاوت کے لئے متعین کر دے، تو کنایہ سمجھ میں نہیں آئے گا۔بلکہ ذہنی انتقال یہ ہوگا کہ زید کوئی کوئلہ فروش، باورچی یا نان بائی ہے (جس کی وجہ سے اس کے پاس زیادہ راکھ جمع ہوگئی) اس کا جواب یہ ہے کہ کنایہ یقیناً قرینہ کا محتاج ہے؟ مگر جب کوئی لفظ کنایہ کے لئے زیادہ مشہور ہو تو قرینہ سے بے نیاز ہوتا ہے، جیسے: عرفی حقیقتیں، مگر وہ ایسا قرینہ نہیں جس کے باعث، مجاز کے مانند، معنی غیر موضوع لہ میں، لفظ کو استعمال کیا جائے، بلکہ اس سے ارادۂ استعمال کا فائدہ ہوتا ہے۔

جرجانی "دلائل الاعجاز" میں لکھتے ہیں کہ: مکنی عنہ، خود اس لفظ سے نہیں، بلکہ دوسری وجہ سے جانا جاتا ہے، چنانچہ کسی کی جانب کثرت رماد کی نسبت کرنے سے اس کا سخی ہونا معلوم نہیں ہوتا، بلکہ اسکی وجہ یہ ہے کہ یہ مدح وثنا ہے اور ظاہر ہے کہ راکھ کی زیادتی، مدح کی چیز نہیں (اس لئے سخاوت مراد لی گئی جس مین مدح کے معنی موجود ہیں۔)

زمخشری کہتے ہیں: کنایہ یہ ہے کہ: کسی چیز کو لفظ غیر موضوع لہٗ سے تعبیر کیا جائے۔جب کہ تعریض: ایک چیز ذکر کر کے، دوسری غیر مذکور چیز مراد لیے جانے کو کہتے ہیں۔ابن الاثیر "المثل السائر" میں فرماتے ہیں کہ: میری رائے میں کنایہ یہ ہے کہ جب وہ وارد ہو تو اس کو حقیقت اور مجاز دونوں اپنی اپنی جانب کھینچیں،

نیز اسے بیک وقت دونوں پر محمول کرنا درست ہو۔ چنانچہ آیت کریمہ ''اَوْ لاَ مَسْتُمُ النِّسَاءَ'' میں لمس کو حقیقی اور مجازی دونوں معنی پر محمول کرنا درست ہے اور دونوں صورتوں میں معنی بالکل صحیح ہوں گے (انتہی) اس کی دلیل یہ ہے کہ اصل وضع کے اعتبار سے ''کنایہ'' کا حاصل یہ ہے کہ ایک چیز بول کر دوسری چیز مراد لی جائے؛ چناں چہ کہا جاتا ہے: ''کنیت بکذا عن کذا '' اس جملے کی دلالت اس پر بھی ہوتی ہے، جسے ذکر کیا گیا اور اس غیر مذکور پر بھی، جو مراد ہے۔

یہ بھی لکھا کہ: کنایہ میں اخفاء کا مفہوم ہے، چنانچہ جب کسی شئی کو چھپانے کی بات کہی جاتی ہے تو ''کنیت الشیئ'' کہتے ہیں۔ یہ ان الفاظ میں بھی جاری ہے جن میں مجاز کو حقیقت کے ذریعہ چھپالیا جائے۔ لہٰذا ساتر اور مستور دونوں پر بیک وقت ''کنایہ'' دلالت کرے گا، البتہ ان دونوں میں ایک وصف جامع کا پایا جانا ضروری ہے۔ تاکہ غیر کنائی شئی، کنایے میں شامل نہ کی جاسکے۔ مثلاً باری تعالیٰ کے ارشاد:

''اِنَّ هٰذَا اَخِیْ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِیَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ'' (ص: ۲۳)

''یہ جو ہے بھائی ہے میرا، اس کے یہاں ہیں ننانوے دنبیاں اور میرے یہاں ایک دنبی''۔

میں لفظ ''نعجة'' کنایہ ہے نساء سے اور ان دونوں میں وصف جامع تانیث ہے۔

زمخشری مزید لکھتے ہیں: کنایہ یہ ہے کہ کسی معنی کی طرف اشارہ کرنے کا ارادہ ہو، مگر لفظ ایسا استعمال کیا جائے، جو اس معنی کے لئے وضع نہ کیا گیا ہو اور یہ لفظ اس معنی کے مشابہ ہو جس کی جانب اشارہ مطلوب ہے، جیسے ''فلان نقی الثوب'' (فلاں کا لباس پاکیزہ ہے) یعنی عیوب سے پاک ہے۔ جب کہ ''ارداف'' یہ ہے کہ کسی معنی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ایسا لفظ استعمال کیا جائے، جو دوسرے معنی کے لئے وضع کیا گیا ہو، مگر یہ معنی، مرادی مفہوم کا مرادف اور اس کے لئے لازم ہو مثلاً ''فلان طویل النجاد'' (فلاں لمبے پر تلے والا ہے) سے درازئ قد کی جانب اشارہ کیا جاتا ہے۔ یہاں طول نجاد، طول قامت کا مترادف اور اس کے لئے لازم ہے۔ برخلاف ''نقاء الثوب'' جو عیوب اور خامیوں سے مبرا ہونے سے کنایہ ہے، اس لئے کہ نقائے ثوب کے لئے عیوب سے پاکی لازم نہیں ہے، جیسا کہ طول نجاد کے لئے طول قامت لازم ہے۔

یہ بھی لکھا کہ: اگر اسی معنی کو ہم ان جملوں میں ادا کریں: ''نقاء الثوب من الدنس کنزاهة العرض من العیوب.'' (کپڑے کو میل کچیل سے صاف کرنا ایسا ہے جیسے آبرو کی عیوب سے حفاظت) تو مشابہت اور کنایہ و مکنی عنہ کے درمیان مناسبت واضح ہو جاتی ہے۔

مصنف ''نہایۃ الاعجاز'' اپنی کتاب کی فصل دوم'' ان الکنایة لیست من المجاز'' میں

کنایہ کی تعریف یوں کرتے ہیں: "ان الکناية عبارة عن ان تذكر لفظة وتفيد بمعنا ها معنى ثانيا هو المقصود "یعنی کنایہ یہ ہے کہ ایک لفظ ذکر کیا جائے، جو اپنے معنی ومفہوم سے ایک دوسرے مرادی معنی کا فائدہ دے۔ (پھر اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں) جب تو نے لفظ کے معنی سے مقصود کا فائدہ دیا تو ضروری ہوا کہ وہ معنی معتبر بھی ہو اور جب وہ معنی معتبر ہوا تو لفظ اپنے معنی موضوع لہٗ سے منتقل نہیں ہوا، لہٰذا مجاز بھی نہیں ہوگا۔ مثلاً: جب "زید کثیر الرماد" کہا جاتا ہے تو معنی موضوع لہٗ۔ کثرت رماد۔ اس کے سخی ہونے پر دلیل ہوتا ہے۔ پس یہ الفاظ اگر چہ اپنے حقیقی معنی میں مستعمل ہیں، لیکن "کثیر الرماد" ہونے سے مقصود معنی ثانی "سخاوت" کا فائدہ دینا ہے، جو معنی اول کے لئے لازم ہے۔ الحاصل جب کنایہ میں اس کے معنی اصلی کا اعتبار ضروری ہوا تو وہ قطعاً مجاز نہ ہوگا۔

کنایہ کے سلسلے میں انہیں چند امور کے نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں، اسلئے کہ اس مسئلہ پر مستقل تصانیف موجود ہیں، تفصیل کے لئے ان کی جانب مراجعت کی جائے۔ اس سلسلے میں "عروس الافراح" میں طویل گفتگو کی گئی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کنایہ وہ لفظ ہے، جسے اس کے معنی موضوع لہٗ میں استعمال کیا گیا ہو اور مقصود اس کے بعض مترادفات ہوں؛ لہٰذا مکنی بہ، معنی اصلی ہے اور وہ لفظ بلا کسی تردد کے اس میں استعمال کیا گیا ہے، لیکن مقصود وہی بعض مترادفات اور متابعات ہیں، جو مکنی عنہ ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ لفظ، مکنی عنہ پر ہی بولا جاتا ہے اور اسی میں استعمال ہوتا ہے؛ یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے۔ عام طور پر کنایات کا استعمال ایسی جگہ ہوتا ہے، جہاں بات کو چھپانا و پوشیدہ رکھنا پیش نظر ہو، کہ اس جگہ تصریح واظہار کو پسند نہیں کیا جاتا، یا صراحتاً ذکر کو قبیح سمجھا جاتا، یا بدشگونی لی جاتی ہے، ایسے بہت سے مقتضیات ہیں (جن کی وجہ سے کنایہ کا استعمال ہوتا ہے)

لفظ "توفی" لانے کی حکمت

ایسے مقامات پر مناسب نہیں کہ کنایات کی تفسیر ان کے مقاصد کے ساتھ کی جائے اور یہ کہا جائے کہ یہی اس کا مفہوم ہے، ورنہ تو نقض موضوع لازم آئے گا، یعنی مقصود تو اخفاء اور ستر تھا، لیکن اس بدبخت جیسے جاہلوں کی نادانی کے باعث اظہار اور افشاء ہو گیا، مثلاً لفظ "توفی" کو لے لیجئے کہ اس کے تمام مشتقات کسی چیز کو پورا پورا وصول کرنے کے لئے آتے ہیں، اسی لئے بڑی اور برگزیدہ شخصیات کی وفات کے لئے بجائے "موت"، از راہ احترام "توفی" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ ہاں کسی ضرورت کے تحت لفظ "موت" بھی استعمال ہوتا ہے۔

الغرض لفظ "توفی" یہاں بلا کسی تردد کے اپنے اصلی معنی میں ہے، اس سے ذرا بھی ہٹا نہیں ہے اور ایسا ممکن بھی نہیں، کیوں کہ یہ لفظ "موت" کا مرادف ہو کر بعینہ موت کے معنی میں ہوتا، تو متکلم کا مقصد یعنی ستر اور اظہار تقدیس جاتا رہتا۔ البتہ ان باریکیوں کا لحاظ اصحاب علم و فضل اور فصحاء و بلغاء ہی کرتے ہیں، اس بدبخت قادیانی جیسے جاہل کو ان کی کیا خبر۔

ابوالبقاء نے بھی یہی مرادلیا ہے، چنانچہ اپنی کلیات میں لکھتے ہیں:

"التوفی: الاماتة، وقبض الروح، وعليه استعمال العامة، او الاستيفاء واخذ الحق، وعليه استعمال البلغاء".

"توفی کے معنی موت دینے اور روح قبض کرنے کے ہیں، عوام الناس اسی معنی میں استعمال کرتے ہیں، دوسرا معنی پورا پورا لینے اور حق وصول کرنے کے ہیں، اس معنی میں علمائے بلاغت وفصاحت استعمال کرتے ہیں"۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ لفظ کا اصل مفہوم ہی بلغاء کے یہاں اس کا مصداق ہوتا ہے۔ البتہ کلیات کے سلسلے میں مفہوم مختلف ہو جاتا ہے، جیسا کہ قضیہ محصورہ کے مفہوم کے حوالے سے بعض مناطقہ کا طریقہ ہے کہ انھوں نے قضیہ محصورہ کو لام استغراق کے ذریعہ معرفہ کے مانند قرار دیا ہے نہ کہ لام جنس کے ذریعہ، اسی طرح علماء اصول کے نزدیک عموم کے بعض صیغوں میں بھی مفہوم مختلف ہو جایا کرتا ہے۔

ابن الاثیر "المثل السائر" میں لکھتے ہیں: اس موقع پر اگر یہ اعتراض ہو کہ عرف، اس رائے کے خلاف ہے، چنانچہ بہت سے الفاظ ایسے ہیں جب وہ بولے جاتے ہیں تو ان سے ان کے معنی مجازی سمجھے جاتے ہیں، نہ کہ معنی حقیقی، مثلاً لفظ "الغائط" عرف میں یہ لفظ قضائے حاجت کے لئے مخصوص ہے (چنانچہ جب بھی بولا جاتا ہے تو اس کے معنی مجازی یعنی قضائے حاجت ہی مفہوم ہوتا ہے) نہ کہ معنی حقیقی یعنی پست زمین؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ فقہاء کی رائے ہے، لیکن اصل بات یہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس لفظ سے اگر چہ موچی، لوہار، بڑھئی، نان بائی، اور ان جیسے دوسرے عوام الناس میں قضائے حاجت ہی کا معنی سمجھا جاتا ہے، وجہ یہ ہے کہ اس طرح کے افراد "غائط" کی اصل وضع جانتے ہی نہیں کہ یہ پست زمین کے لئے وضع کیا گیا ہے، لیکن خواص جو اصل وضع سے واقف ہیں، اس لفظ سے اس کے معنی حقیقی ہی سمجھتے ہیں نہ کہ کوئی اور معنی، چناں چہ ارشاد باری: "اَوْ جَاءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ" میں جب یہ لفظ وارد ہوا اور اس سے قضائے حاجت کا معنی مراد لیا گیا، تو اس کے ساتھ بعض ایسے الفاظ بھی لائے گئے جن سے قضائے حاجت کا مفہوم واضح ہو، نہ کہ پست زمین (چنانچہ فرمایا گیا: اَوْ جَاءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ)۔ بہر حال یہ بات معلوم ہوئی کہ "غائط" اور اس جیسے دوسرے الفاظ کے حقیقی اور وضعی معنی یہ ہیں، جسے حقیقت سے تعبیر کیا جائے گا اور مرادی معنی یہ ہیں، جسے مجاز کہا جائے گا۔

جہاں تک جہلاء کی بات ہے، تو ان کا قطعا کوئی اعتبار نہیں۔ تعجب تو ان فقہاء پر ہے جنھوں نے اسے مدون کیا اور جن کا یہ خیال ہے۔انتہی۔ (ابن الاثیر کے اس آخری جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ) وہ حقیقت عرفیہ اور مجاز متعارف کا انکار کر رہے ہیں اور فقہاء کہتے ہیں کہ یہ عوام کے حق میں وضع ثانی ہے۔ یہی بات انھوں نے الفاظ محرفہ کی بابت بھی کہی ہے مثلاً لفظ ''طلاق'' کو عوام الناس ''تلاک'' کہتے ہیں (اور ان کے اس لفظ کا اعتبار کر کے طلاق کا حکم لگا بھی دیا جاتا ہے) باوجود ان سب امور کے عوام بھی اس بات کو جانتے ہیں کہ کن مقامات پر تصریح کو قبیح اور کنایہ کو اچھا سمجھا جاتا ہے۔ چناں چہ عوام بھی برگزیدہ شخصیات کی موت کے لئے ایسے ہی الفاظ استعمال کرتے ہیں، جو تعظیم وتوقیر پر دلالت کرتے ہوں، اگر چہ انہیں ان الفاظ کے معانی موضوع لہ کا علم نہ ہو۔

مواقع کنایہ

''الاتقان فی علوم القرآن ،نوع:۵۴'' میں ایک مفید فصل ہے، جس میں صاحب اتقان فرماتے ہیں کہ کنایہ کے استعمال کے مختلف طریقے ہیں:

۱- مخاطب کے عدم قدرت پر تنبیہ کرنے کے لئے، جیسے ارشاد باری:

''وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ'' (اعراف: ۱۸۹)

''وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ایک جان سے''۔

میں ''نفس واحدۃ'' کنایہ ہے حضرت آدم علیہ السلام سے، اس میں تنبیہ ہے کہ دنیا خلق سے عاجز ہے اور میں نے ایک نفس سے سب کو پیدا کر دیا۔

۲- خوب سے خوب تر لفظ کی جانب انتقال۔ جیسے آیت کریمہ:

''اِنَّ هٰذَا اَخِیْ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِیَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ'' (ص: ۲۳)

''یہ جو ہے بھائی ہے میرا، اس کے یہاں ہیں ننانوے دنبیاں اور میرے یہاں ایک دنبی''۔

میں لفظ ''نعجة'' عورت سے کنایہ ہے۔ اہل عرب کی عادت تھی کہ وہ عورت کا تذکرہ بعنوان تصریح معیوب گردانتے تھے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں سوائے مریم علیہا السلام کے کسی بھی عورت کا ذکر نام کے ساتھ نہیں ہے۔ مریم کے نام کی صراحت بھی ایک اہم نکتے کے باعث کی گئی ہے۔ سہیلی لکھتے ہیں کہ: رمز شناسانِ زبان وادب کی عادت کے برخلاف، مریم علیہا السلام کا تذکرہ، ان کے نام کے ساتھ ایک نکتے کی وجہ سے ہے، شاہان دنیا اور دوسرے معزز لوگ نہ تو بر سر عام اپنی عورتوں کا تذکرہ کرتے ہیں اور نہ ان کا نام لیتے ہیں، بلکہ اہل وعیال جیسے الفاظ بطور کنایہ ان مواقع پر استعمال کرتے ہیں۔ البتہ باندیوں کے لئے یہ احتیاط ملحوظ نہیں

رکھتے۔نصاری نے مریم کی بابت نہایت غلط اور سنگین بات کہی (مثلاً کہا کہ اللہ کی بیوی ہیں اور ان کے بیٹے عیسیٰ اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، نعوذ باللہ من ذالک) اس لئے اللہ تعالی نے ان کے نام کی تصریح کر کے ان کے بے ہودہ قول کی تردید کی۔ نیز جہاں مریم کا نام ذکر کیا (وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا۔ تحریم :۱۲) وہاں عبودیت کی تاکید ذکر نہیں کی، جو ان کی تاکیدی صفت تھی (برخلاف ملائکہ کے کہ ان کے ذکر میں ''عباد الرحمن'' کی تصریح فرمائی: وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمَٰنِ إِنَاثًا۔ زخرف:۱۹) بلکہ عیسیٰ کے نسب کو ان کے ساتھ لگا دیا یہ بتلانے کے لئے کہ عیسیٰ کا کوئی باپ نہیں، اگر باپ ہوتے تو ان کی طرف نسبت ہوتی (اس طرح نصاری کی مکمل تردید ہوگئی)

۳- ایسے مواقع پر کنایہ کیا جاتا ہے، جہاں صراحت معیوب ہے۔ مثلاً: قرآن کریم میں ''جماع'' کو ملامسۃ، مباشرۃ، افضاء، رفث، دخول، سر، اور غشیان وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے، چناں چہ ارشاد باری ہے ''وَلَٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا (البقرۃ:۲۳۵) نیز ارشاد فرمایا: ''فَلَمَّا تَغَشَّاهَا'' (الاعراف:۱۸۹)۔ ابن ابی حاتم نے ابن عباس کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ (ارشاد باری: ''وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ''۔ البقرۃ:۱۸۷۔ میں) ''مباشرۃ'' سے مراد جماع ہے، لیکن اللہ تعالی نے صریح لفظ استعمال کرنے کے بجائے، مباشرت سے کنایہ کیا ہے۔ ابن عباس ہی کا قول ہے کہ انھوں نے فرمایا: اللہ تعالی کریم ہے، اس لئے کنایہ کیا کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں ''رفث'' سے جماع مراد لیا ہے۔ ''وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَن نَّفْسِهِ'' (یوسف:۲۳) میں ''مراودۃ'' سے خواہش جماع اور ''هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ'' (البقرۃ:۱۸۷) میں ''لباس'' سے جماع یا بوس وکنار، اسی طرح ''نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ (البقرۃ:۲۲۳) میں لفظ ''حرث'' سے جماع کا کنایہ کیا ہے۔ جب کہ ''أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنكُم مِّنَ الْغَائِطِ''۔ (المائدۃ:۶) میں ''الغائط'' سے بول و براز وغیرہ۔ ''كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ (المائدۃ:۷۵) میں ''اکل طعام'' سے قضائے حاجت اور ''يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ'' (الانفال:۵۰) میں لفظ ''ادبار'' سے سرین مراد لی ہے۔ چناں چہ ابن ابی حاتم نے مجاہد سے ''ادبارھم'' کی تفسیر ''استاھم'' نقل کی ہے۔

۴- ازراہ بلاغت وفصاحت کنایہ کی تعبیر اختیار کی جاتی ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

''أَوَمَن يُنَشَّأُ فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ'' (الزخرف :۱۸)

''کیا (خدا نے اولاد بنانے کے لیے لڑکی کو پسند کیا) جو کہ آرائش میں نشو ونما پائے اور وہ مباحثہ میں قوت بیانیہ (بھی) نہ رکھے''۔

اس میں کنایہ ہے کہ عورت اہم امور سے بے پرواہ ہو کر ظاہری ٹیپ وٹاپ اور آرائش وزیبائش میں لگی رہتی

ہے۔اگر کنایہ کے بجائے یہاں صراحتاً لفظ ''نساء'' مذکور ہوتا تو عورتوں کی اس فطرت وعادت کی جانب اشارہ نہ ہو پاتا۔آیت کریمہ کا مقصد ملائکہ سے اس کی نفی ہے۔اسی طرح ارشاد باری:

''بَلۡ یَدَاهُ مَبۡسُوۡطَتَانِ '' (مائدہ : ٦٤)

''بلکہ اس کے تو دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں''۔

میں اللہ تعالیٰ کی بے پایاں بخشش اور جود وسخاء سے کنایہ ہے۔

۵- اختصار کی غرض سے، مثلاً متعدد الفاظ کو لفظ فعل سے کنایہ کرنا، جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وَلَبِئۡسَ مَا کَانُوۡا یَفۡعَلُوۡنَ'' (مائدہ :۷۹)

''کیا ہی برا کام ہے جو کرتے تھے''۔

اور

''فَاِنۡ لَّم تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا ''(بقرہ:۲۴)

''پھر اگر ایسا نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے''۔

کہ یہ دراصل ''فَاِن لَّمۡ تَأۡتُوۡ بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِه'' سے کنایہ ہے۔

٦- مکنی عنہ کے انجام سے باخبر کرنا جیسے:

''تَبَّتۡ یَدَآ اَبِیۡ لَهَبٍ '' (تبت: ۱)

''ٹوٹ گئے ہاتھ ابی لہب کے''

اس میں معنی تو ایک خاص شخص کے علم کے ہی مقصود اور مراد ہیں، مگر اس جانب بھی اشارہ ہے کہ وہ جہنمی ہے۔اور اس کا انجام آگ ہے۔ایسے ہی:

''حَمَّالَةَ الۡحَطَبِ ، فِیۡ جِیۡدِهَا حَبۡلٌ'' (تبت :۴-۵)

''جو سر پر لئے پھرتی ہے ایندھن، اس کی گردن میں رسی ہے''۔

میں ''حَمَّالَةَ''، چغل خوری سے کنایہ ہے۔نیز اس عورت (ابولہب کی بیوی) کے انجام کی طرف یہ اشارہ بھی ہے کہ وہ جہنم کا ایندھن بنے گی اور اس کی گردن میں طوق ہوگا۔

شیخ بدرالدین بن مالک ''مصباح'' میں لکھتے ہیں کہ: صریح سے کنایہ کی طرف عدول، کسی خاص نکتہ کی وجہ سے کیا جاتا ہے، مثلاً: کسی چیز کی توضیح، موصوف کی حالت کا بیان، صورت حال کی صحیح تعیین، کسی کی تعریف یا برائی، اختصار، پردہ پوشی، حفاظت، اخفاء یا چیستان بنانا مقصود ہو، کسی مشکل چیز کو آسان لفظوں میں تعبیر کرنا، یا کسی بھونڈے مفہوم کو اچھے الفاظ میں ادا کرنا وغیرہ۔

تذنیب

ارداف کی تعریف وتشریح

کنایہ کے مشابہ، اقسام بدیع میں سے ایک قسم ارداف ہے، جس کی تعریف یہ ہے کہ: متکلم کسی معنی کو ادا کرنے کے لیے لفظ موضوع لہ اور دلالت اشاری سے تعبیر کرنے کے بجائے، مرادف لفظ کا سہارا لے، جیسے ارشاد باری:

"وَقُضِيَ الْاَمْرُ" (ہود: ۴۴)

"اور ہو چکا کام"

جس کی اصل یہ ہے "هلک من قضی الله هلاکه، ونجی من قضی الله نجاته" (ہلاک ہوگیا وہ جس کی ہلاکت کا فیصلہ اللہ تعالی نے کر دیا اور نجات پا گیا جس کی نجات کا فیصلہ اللہ تعالیٰ نے کر دیا) لیکن اس کے بجائے یہاں مترادف لفظ لایا گیا، چونکہ اس تعبیر میں اختصار نیز اس پر تنبیہ ہے کہ ہلاک ہونے والے کی ہلاکت اور نجات یافتہ کی نجات، ایسے حاکم کے حکم کے باعث ہوئی، جس کا فیصلہ اٹل ہوتا ہے۔ امر چوں کہ آمر کو مستلزم ہے؛ اس لیے اس حکم اور فیصلے سے، آمر کی قدرت اور غلبہ کا اندازہ ہوتا ہے اور اس طرح اس کے عذاب کے خوف اور ثواب کی امید میں مامور، مطیع اور فرماں بردار بن جاتا ہے۔ یہ ساری چیزیں لفظ موضوع لہ سے حاصل نہیں ہو سکتی تھیں۔ دوسری مثال: ارشاد ربانی ہے:

"وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ" (ہود: ۴۴)

"اور کشتی ٹھہری جودی پہاڑ پر"

اس کی حقیقت "جلست علی الجودی" ہے، لیکن اصل لفظ کے بجائے اس کا مرادف لایا گیا، چونکہ لفظ "استواء" میں اشارہ ہے کہ یہ جلوس ہر طرح سے مضبوط اور ناقابل تزلزل تھا، جس میں نہ کجی تھی اور نہ کسی ایک طرف جھکاؤ۔ ظاہر ہے کہ یہ مفہوم لفظ "جلست" سے نہیں حاصل ہو سکتا۔ تیسری مثال: ارشاد باری ہے:

"فِيْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ" (الرحمن: ۵۶)

''ان میں عورتیں ہیں نیچی نگاہ والیاں''

یہ اصل میں ''عفیفات'' کے معنی میں ہے، لیکن اس کے بجائے ''قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ'' لاکر یہ بتانا ہے کہ پاکدامن ہونے کے ساتھ ساتھ، وہ غیروں کی طرف نظر تک نہیں اٹھاتیں اور نہ اپنے شوہروں کے علاوہ کسی اور کی خواہش رکھتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مفہوم ''عفیفات'' کے لفظ سے ممکن نہیں۔

بعض محققین، کنایہ اور ارداف میں فرق کرتے ہیں کہ: کنایہ میں لازم سے ملزوم کی طرف انتقال ہوتا ہے اور ''ارداف'' میں مذکور سے متروک کی طرف۔ مثلاً ارشاد باری ہے:

''لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَسَاۗءُوْا بِمَا عَمِلُوْا، وَیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰی''(النجم: ۳۱)

''تاکہ وہ بدلہ دے برائی والوں کو ان کے کیے کا اور بدلہ دے بھلائی والوں کو بھلائی سے''

اس میں ''بالسوء'' کی جگہ ''بما عملوا'' لایا گیا، حالانکہ ''بالسُّوْءِ'' میں دوسرے جملے ''بالحسنیٰ'' سے مطابقت تھی۔ لیکن ادباً سوء کی نسبت اللہ عزوجل کی جانب نہ کی گئی، بلکہ ''عمل'' سے تعبیر کیا گیا۔

لفظ ''توفی'' معنیٰ ومفہوم

جب یہ باتیں ذہن نشین ہوگئیں تو معلوم ہونا چاہئے کہ لفظ ''توفی'' اپنے دیگر نظائر کی طرح لینے اور حاصل کرنے کے معنی میں ہے، جیسے: وفاء وعدہ، دین لازم کا ایفاء اور مدت مقررہ کو پورا کرنا۔ اس کی دلالت موت پر نہ تو لفظ کے اعتبار سے ہے اور نہ استعمال کے اعتبار سے۔ ہاں موت کے ساتھ جمع ہوسکتا ہے، کیوں کہ پوری عمر کو وصول کر لینے کے بعد موت ہی آنی ہے، تو یہ الگ بات ہے۔ اگر ارشاد باری ''اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ'' میں ''متوفی'' بمعنیٰ ''ممیت'' ہوتا، تو ''رَافِعُکَ اِلَیَّ'' کی کوئی ضرورت نہ ہوتی۔ اس وقت ''توفی'' جو موت کے معنی میں مشہور ہے، وہ کنایۃً ہے نہ کہ وضعاً، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ: یہ کنایہ بیانیہ نہیں ہے، بلکہ توفی کے لفظ میں کنایہ اصولیہ ہے، بالکل اسی طرح جیسے حنفیہ کے نزدیک طلاق کنائی ہوتی ہے، کہ اس کے الفاظ، معنیٰ طلاق میں خود اثر انداز ہوتے ہیں اور بینونت کی صلاحیت رکھتے ہیں، نہ یہ کہ وہ طلاق کی تعبیر ہوتے ہیں کہ ان سے طلاق رجعی واقع ہو، جیسا کہ شوافع کہتے ہیں۔ اس لیے میری تحقیق یہ ہے کہ: لفظ کا اصل مفہوم ہی بتقاضائے بلاغت لفظ کا مصداق ہوتا ہے۔ جیسا کہ ابوالبقاء کے حوالے سے گذر چکا۔ پس آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ: میں آپ کو وہ پوری مدت دیدوں گا، جو آپ کے لیے مقدر ہے، آپ کے دشمن آپ کے قتل پر قادر نہ ہوسکیں گے، بلکہ میں آپ کو طبعی موت دوں گا۔

توفی از ابتداء تا انتہا ساری عمر کو محیط ہے اور اس کے بیچ میں رفع ہے۔ پس چوں کہ توفی، عمر کے دونوں سروں میں ہے (اس لئے توفی کا تذکرہ پہلے کیا) اور رفع وسط میں ہے اس لئے اس کو موٴخر کیا، لہٰذا یہ اوقات میں عمر کو پورا کرنا ہوا۔ صاحب کشاف نے توفی کے مفہوم پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، ابن منیر کا اس پر لکھا ہوا حاشیہ بھی ضرور دیکھنا چاہیے۔ ''توفی'' بمعنیٰ ''ایک معین مدت تک پہنچانا'' سورۂ حج کی آیت:

''وَمِنْكُم مَنْ يُتَوَفّٰى وَمِنْكُم مَنْ يُرَدُّ اِلٰى اَرْذَلِ الْعُمُرِ'' (الحج: ۵)

''اور کوئی تم میں سے قبضہ کرلیا جاتا ہے اور کوئی تم میں سے پھر چلایا جاتا ہے نکمّی عمر تک''

اور ارشاد نبوی:

''ان للّٰه ما اخذ وله ما اعطی، وکل عنده بأجل مسمی''

''اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے، جو وہ لیتا ہے اور جو کچھ دیتا ہے اور ہر چیز کی اس کے یہاں ایک خاص و معین مدت ہے''۔

ان دونوں میں اجل معین تک پہنچانے کے معنیٰ میں توفی مستعمل ہے۔ رہی سورہ مومن کی آیت:

''وَمِنْكُمْ مَنْ يُتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ٥''

''اور کوئی کوئی تم میں سے پہلے ہی مر جاتا ہے تاکہ تم سب وقت مقرر تک پہنچ جاؤ اور تاکہ تم لوگ سمجھو''

تو ''مَنْ يُتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ'' کا مفہوم یہ ہے کہ پوری عمر کا لینا اس سے پہلے ہی مقدر ہو چکا ہے، پس یہاں بھی ''توفی'' اپنے معنیٰ سے جدا نہیں، چنانچہ کہا جاتا ہے: ''مات فلان وانت بوفاءٍ'' (فلاں چل بسا، لیکن تم ابھی اپنی پوری عمر میں چل رہے ہو) دیکھیے ''تاج العروس شرح قاموس: جلد: ۱۰، ص: ۳۹۵۔ اسی لفظ وفاً سے ''توفی'' ہے، حاصل یہ کہ حضرت عیسیٰ کی بابت ''توفی'' کی بات جبھی صحیح ہو سکتی ہے، جب کہ آپ پوری عمر گذاریں اور ایسا نزول کے بعد ہوگا، سورۂ مائدہ میں اسی کا تذکرہ ہے۔ ایسا نہیں کہ یہاں دو ''توفی'' پائی جارہی ہے، ایک رفع سے پہلے، دوسری نزول کے بعد اور نہ ہی یہ کہنا صحیح ہے کہ ''مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ'' میں تقدیم و تاخیر ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ ''توفی'' کے معنیٰ اگرچہ ''اخذ الشیٔ وافیا'' (کسی چیز کو پورا پورا لینا) ہے، لیکن متکلم کے نزدیک پورا پورا حصہ کیا ہے، اسے وہی متعین کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مفسرین نے ارشاد باری:

'' وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ '' (ھود: ۱۰۹)

''اور ہم دینے والے ہیں ان کو، ان کا حصہ (یعنی عذاب سے) بلا نقصان''

میں حال "غَیۡرَ مَنۡقُوۡصٍ" کی بابت اختلاف کیا ہے، کہ یہ حال مؤکدہ ہے، یا کچھ اور؟۔ "روح المعانی" جلد:۳، ص:۶۰۲، میں "کشاف" (۴۲۵/۲) کے حوالے سے ہے، کہ اس آیت میں "نصیب موفی" کا حال "غَیۡرَ مَنۡقُوۡصٍ" اس لیے لایا گیا کہ ہو سکتا ہے کہ، وصول کی گئی چیز ناقص ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ وہ کامل ہو، چنانچہ کہا جاتا ہے: "وَفیته شطر حقه، وثلث حقه" مطلب یہ ہے کہ میں نے اس کو مکمل آدھا یا مکمل تہائی حق دے دیا اور ابن منیر نے تجرید کی بنیاد پر "توفیۃ" کو محض "اعطاء" (دینے) اور "اخذ" (لینے) کے معنی میں لیا ہے۔ تاج العروس (ج:۱۰، ص:۳۹۵) میں ہے "توفی المدة ای بلغها" (یعنی وہ اس مدت کو پہنچ گیا) اسی میں یہ بھی مذکور ہے کہ "توفی المیت" کو بعض لوگوں نے "توفی الحق" سے مشتق مانا ہے، اس اعتبار سے کہ موت کے ذریعے اس حق کی وصول یابی ہوتی ہے، جو کائنات کے ذمہ باری تعالی کا قرض ہے اور کچھ نے اسے "استیفاء الأجل" سے مشتق مانا ہے، اس لیے کہ موت کے ذریعہ زندگی کی مدت مکمل ہو جاتی ہے۔ چناں چہ کہا جاتا ہے: ؎

كل حيّ مستكمل مدة العمـ ☆ ـر ومود إذا انتهى أمده

"ہر جان دار، مدت عمر کو مکمل لینے والا ہے اور جب اس کی مدت پوری ہوتی ہے، تو اس کو ادا کرنے والا ہے"۔

اگر یہ اشکال ہو کہ قاعدے کی رو سے "استیفأ" اور "توفی" میں فرق ہونا چاہیے، کیوں کہ "استیفأ" میں "سین" طلب کی ہے، جو استمرار و امتداد کے لیے آتی ہے۔ گویا "استیفاء" ایک امر ممتد ہے، اور "توفی" میں استمرار پر کوئی دلالت نہیں، بلکہ اس میں استفعال کی "مطاوعت" محسوس ہوتی ہے، جس کا تحقق آخری جز سے ہوتا ہے، اس صورت میں فرمان باری "اِنِّیۡ مُتَوَفِّیۡکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ" میں ترتیب باقی نہیں رہتی ہے۔

جواب یہ ہے کہ اگر چہ اس کا تحقق اخیر جز سے ہوتا ہے، لیکن ابتدا کی رعایت بھی ضروری ہے۔ کیوں کہ "مطاوعت" میں قبول اثر ہے، جو یہاں مجموعے کے تحقق کے بعد ہی ہو سکتا ہے اور جزء آخر کی طرف ذہن اس لیے جاتا ہے کہ اخذ وتناول کا ظہور، جزء آخر پر ہوتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ صرف وہی معتبر اور مراد ہے۔ چناں چہ صاحب روح المعانی:

"وَاِنَّمَا تُوَفَّوۡنَ اُجُوۡرَکُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ" (آل عمران:۱۸۵)

"اور تم کو پورے بدلہ ملیں گے قیامت کے دن"

کے تحت لکھتے ہیں کہ لفظ "توفیہ" میں اشارہ ہے کہ کچھ جزا و سزا روز قیامت سے پہلے ہی لوگوں کو مل جاتی ہے

(انتہی) یہ بھی ملحوظ رہے کہ سورہ آل عمران میں سورہ مائدہ کے برخلاف استقبال کا صیغہ ہے، لہٰذا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ''توفیہ'' کی مراد جو بھی ہو، رفع سے پہلے اس کی تکمیل ہونی چاہیے۔ کیونکہ صیغہ استقبال سے صرف اس کی ابتداء کا رفع سے پہلے ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے، نہ کہ اس کی بقا کا۔

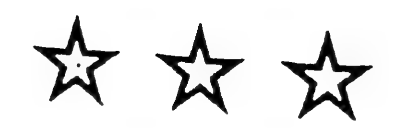
یہ ساری بحث اس صورت میں ہے، جب 'توفی'' بہ معنی اتمام عمر، زندگی کے اجزا پر ہو اور اگر اس کا مطلب کسی شخص کو لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا، لیا جائے، تو یہ مفہوم اگر چہ باعتبار لفظ، ساری عمر پر ممتد نہیں، لیکن عرف میں اس وقت بولا جاتا ہے، جب کوئی پوری عمر گذار کر اٹھالیا جائے اور وہ بھی طبعی موت سے نہ کہ قتل وغیرہ ہو کر۔ اس عرفی معنی کے اعتبار سے بھی عمر اور وفاء دونوں معنی ملحوظ ہوتے ہیں، اگر چہ یہ دونوں، ''توفی'' کے مدلول سے خارج ہیں نہ کہ اس کا جز، بلکہ شرط موقوف علیہ کے طور پر مراد ہیں، اس صورت میں بھی ترتیب رہتی ہے۔ اگر آپ سابقہ عبارتوں میں ان اعتبارات کو بہ خوبی ذہن نشین کرنے کے بعد سورہ حج وسورۂ مومن کی آیات میں بار بار غور کریں تو معلوم ہوگا کہ کس طرح اللہ جل شانہ نے تدریجی طور پر انسان کے تخلیقی مراحل کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے بعد اخیر میں اس کی وفات کا تذکرہ کیا ہے۔

میرے علم میں علماء نے، یہاں پر 'توفی'' اور ''استیفاء ''میں فرق نہیں کیا، جیسا کہ اس سلسلے کی بعض عبارتیں گذر چکیں۔ نیز روح المعانی، جلد:۶، ص ۵۰۶ر میں ارشاد باری: ''قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَلَكُ الْمَوْتِ'' (السجدہ: ۱۱) کی تفسیر ''يستوفى نفوسكم'' سے کی گئی ہے، یعنی ملک الموت تمہارے نفوس کو پورا پورا لے گا، اس کے اجزاء میں سے کچھ نہ چھوڑے گا اور تم میں سے کوئی بھی باقی نہ رہے گا۔ یہ بھی لکھتے ہیں کہ: 'توفی'' کے اصل معنی ''اخذ الشئى بتمامه'' ہیں۔ پھر اس کی تفسیر ''استيفاء'' سے کی ہے، کیوں کہ ''تفعل ''اور ''استفعال'' بسا اوقات ایک ہی معنی ادا کرتے ہیں جیسے: ''تقضيته و استقضيته'' اور ''تعجلته و استعجلته'' (انتہی) صبان کے بقول علماء نے تصریح کی ہے کہ: باب تفعل بھی طلب کے معنی میں مستعمل ہے جیسے ''تبينته'' کا معنی طلب بیان ہے۔ روح المعانی ہی میں ''کشف'' کے حوالے سے آیت کریمہ: ''وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ'' (اعراف: ۱۶۷) کے تحت ہے کہ: 'تأذن'' یہاں 'استأذن'' کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے اور علم صرف کی بعض کتابوں میں ہے کہ حدیث: ''ليس منا من لم يتغنّ بالقرآن'' (بخاری: ۲/۱۱۲۳) میں ''لم يتغن، لم يستغن '' کے معنی میں ہے۔ اسی طرح ''القاموس المحيط ''میں ہے کہ: ''تبقاه'' اور ''استبقاه'' میں کوئی فرق نہیں، دونوں ہم معنی ہیں ''اى أبقاه حيًا، ولم يتوفّه، ولم يستوفه''۔

صاحب ''المواهب اللدنيه ''مقصد رابع، میں معجزہ کی تفسیر کرتے ہوئے ''اساس'' کے حوالے

سے لکھتے ہیں کہ: "حدا یحدو ا و احتدی حداء" کے معنی ہیں گیت گانا، گنگنانا اور حدی خوانی کرنا، اسی وجہ سے "حادی الابل" اسے کہا جاتا ہے، جو اونٹ پر بیٹھ کر، اسے تیز چلانے کے لئے گیت گائے۔ اور "تحدی اقرانہ" بطور مجاز اس وقت بولا جاتا ہے، جب کوئی اپنے ہم عمروں کو مقابلہ کے لیے چیلنج کرے، اس کی اصل "حداء" ہے: "یتباری فیہ الحادیان، ویتعارضان، فیتحدی کل واحد منھما صاحبہ، ای یطلب حدائہ" (یعنی دو شخص حدی خوانی میں مقابلہ کرتے ہیں، پھر ان میں سے ہر ایک دوسرے سے حدی خوانی کا مطالبہ کرتا ہے) یہ ایسا ہے، جیسے کہا جاتا ہے: "تنوفاہ" بمعنی استوفاہ"۔ بعض معتبر حواشی میں ہے کہ: حدی خوانی کے وقت ایک شخص قافلے کے دائیں طرف کھڑا ہو جاتا اور دوسرا بائیں طرف، پھر ان میں سے ہر ایک دوسرے سے حدی خوانی کا مطالبہ کرتا، بعد میں یہ لفظ ہر مقابلے کے لیے استعمال ہونے لگا۔ [حاشیہ طیبی علی الکشاف]۔ "ادب الکاتب" میں ہے کہ: کبھی "استفعلت، تفعلت" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، پھر اس کی مثالیں بیان کرتے ہوئے لکھا کہ جیسے: "استنجز وتنجز حوائجہ" اسی طرح کی تشریحات خاصیات ابواب کے ذیل میں، متعدد علمائے لغت وصرف نے ذکر کی ہیں۔

یہ خیال ہرگز نہ ہونا چاہیے کہ اہل زبان اس لفظ کے مفہوم کی تعیین میں تذبذب وتردد کا شکار ہیں، کہ کبھی تو اس کی تشریح "قبض" سے کرتے تھے اور کبھی "استیفاء" سے جب کہ ان دونوں کے مابین فرق ہے۔ اس لیے کہ عرف میں ان دونوں اعتبارات سے موت کو لفظ "توفی" سے تعبیر کیا جاتا ہے؛ چنان چہ جس طرح "قُبِضَ فُلانٌ"، "مات فلان" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اسی طرح "قضی فلان نحبہ" بھی اسی معنی مستعمل ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے الفاظ ہیں، جو موت کے لیے بولے جاتے ہیں مثلاً: "اتمَّ فلانٌ رزقَہ" اور "اتمَّ فلان انفاسہ" (فلاں نے اپنی روزی مکمل کرلی، فلاں نے اپنے سانس پورے کرلیے) خلاصہ یہ کہ جب علمائے لغت نے ان دونوں اعتبارات کی دوسرے مقامات پر تصریح کی ہے تو "توفی" کے لفظ میں بھی یہ دونوں اعتبارات ملحوظ ہوں گے، عدم وضاحت سے یہ لازم نہیں آتا کہ علمائے لغت کو حقیقت حال کا علم نہیں۔ واللہ ولی الامور۔



تذییل

لفظ ''توفی'' اور اسلوب قرآنی

لفظ'' تـوفی '' کے معنی کی تشریح وتوضیح اگر اسلوب قرآنی اور اس کے سیاق وسباق کے ذیل میں دیکھی جائے تو اس کی متعدد صورتیں نکلتی ہیں: ایک یہ ہے کہ قرآن عزیز نے جگہ جگہ ''موت'' اور ''حیات'' کو تو مقابل ٹھہرایا ہے، لیکن ''توفی '' کو کسی ایک مقام پر بھی ''حیات'' کا مقابل قرار نہیں دیا، بلکہ ''توفی '' کا مقابلہ دوسری چیزوں کے ساتھ کیا۔ اس طرز کا بکثرت ہونا، اس کی دلیل ہے کہ ''توفی '' کے معنی ''موت'' کے نہیں۔

چناں چہ ان دونوں کے معنی و مفہوم کو مندرجہ ذیل آیات میں واضح کیا گیا ہے:

۱-''یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا'' (روم: ۵۰)

''زندہ کرتا ہے زمین کو، اس کے مرنے کے بعد''۔

۲-''اَلَّذِیْ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ'' (بقرہ: ۲۵۸)

''جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے''۔

۳-''اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتاً، اَحْیَآءً وَّاَمْوَاتاً'' (مرسلات: ۲۵، ۲۶)

''کیا ہم نے نہیں بنائی زمین سمیٹنے والی زندوں کو اور مردوں کو''۔

۴-''اَللّٰهُ یُحْیِیْكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ'' (جاثیہ: ۲۶)

اللہ ہی جلاتا ہے تم کو، پھر مارے گا تم کو۔

۵-''هُوَ اَمَاتَ وَاَحْیَا'' (نجم: ۴۴)

وہی ہے مارتا اور جلاتا ہے۔

۶-''لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْییٰ'' (اعلیٰ: ۱۳)

نہ مرے گا جہنم میں اور نہ جیئے گا۔

۷-''وَتُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ'' (ال عمران: ۲۷)۔

''اورتو نکالے زندہ،مردے سے اور نکالے مردہ زندہ سے''۔

۸-''یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَيِّ'' (روم:۱۹)

''نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے''۔

۹-'' وَلاَ تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ، بَلْ اَحْیَاءٌ''(بقرہ:۱۵۴)

''اور نہ کہو ان کو جو مارے گئے خدا کی راہ میں، کہ مردے ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں''۔

۱۰-''اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَاءٍ''(نحل:۲۱)

''مردے ہیں جن میں جان نہیں''۔

۱۱-''وَمَنْ یُّخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَيِّ''(یونس:۳۱)

''اور کون نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے''۔

۱۲-''وَتَوَکَّلْ عَلَی الْحَيِّ الَّذِیْ لاَیَمُوْتُ'' (فرقان:۵۸)

''اور بھروسہ کرا وپر اس زندہ کے جو نہیں مرتا''۔

نمرود کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا:

۱۳-''اَنَا اُحْیِیْ وَاُمِیْتُ ''(بقرہ:۲۵۸)

''نمرود نے کہا: میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں''۔

۱۴-''وَاُحْيِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰہِ''(آل عمران:۴۹)

''عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اور جلاتا ہوں مردے اللہ کے حکم سے''۔

۱۵-''رَبَّنَآاَمَتَّنَااثْنَتَیْنِ وَاَحْیَیْتَنَا اثْنَتَیْنِ''(مؤمن:۱۱)

''اے رب ہمارے تو موت دے چکا ہم کو دوبار اور زندگی دے چکا دوبار''۔

۱۶-''فَاَحْیَیْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا''(فاطر:۹)

''پھر زندہ کردیا ہم نے اس سے زمین کو، اس کے مرجانے کے بعد''۔

۱۷-''بِقٰدِرٍعَلٰٓی اَنْ یُّحْيِ الْمَوْتٰی'' (احقاف:۳۳)۔

''وہ قدرت رکھتا ہے کہ زندہ کرے مردوں کو''۔

۱۸-''وَاَنَّهٗ یُحْيِ الْمَوْتٰی''(حج:٦)

''اور وہ جلاتا ہے مردوں کو''۔

۱۹-"کَذٰلِکَ یُحْیِ اللّٰہُ الْمَوْتیٰ" (بقرہ: ۷۳)

"اسی طرح زندہ کرے گا اللہ مردوں کو"۔

۲۰-"یُحْیِ وَیُمِیْتُ وَھُوَ عَلیٰ کُلِّ شَیئٍ قَدِیْرٌ" (حدید: ۲)

"جلاتا ہے اور مارتا ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے"۔

وغیرہ آیات، ان تمام آیات میں موت اور حیات کو ایک دوسرے کے مقابلے میں ذکر کیا گیا ہے۔

اب "توفی" کے مقابلات ملاحظہ فرمائیں:

"توفی" کے مقابلے میں اس کے مفہوم کے اعتبار سے چند امور بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً ارشاد باری ہے:

"وَکُنْتُ عَلَیْھِمْ شَھِیْداً مَّادُمْتُ فِیْھِمْ، فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْھِمْ" (مائدہ: ۱۱۷)

"اور میں ان سے خبردار تھا جب تک ان میں رہا، پھر جب تو نے مجھ کو اٹھالیا، تو تو ہی تھا خبر رکھنے والا ان کی"۔

یہاں "توفی" کو "کون" کے مقابلہ میں لائے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد باری ہے:

"اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِھَا فَیُمْسِکُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْھَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰیٓ اِلیٰ اَجَلٍ مُّسَمًّی" (زمر: ۴۲)

"اللہ کھینچ لیتا ہے جانیں، جب وقت ہو ان کے مرنے کا اور جو نہیں مریں ان کو کھینچ لیتا ہے ان کی نیند میں، پھر رکھ چھوڑتا ہے، جن پر مرنا ٹھہرا دیا اور بھیج دیتا ہے اوروں کو ایک وعدہ مقررہ تک"۔

قول باری "والتی" کا مطلب یہ ہے کہ وہ نفس جو ابھی مرا نہیں، اس کو نیند میں لے لیتا ہے اور ارشاد باری "فی منامھا" "یتوفی" کے متعلق ہے نیز پہلی صورت میں "توفی النفس" کو "حین موتھا" کے ساتھ مقید کیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ "توفی" عین موت نہیں۔ پھر "توفی" کو موت اور نیند میں تقسیم کیا، جو اس کی صراحت ہے کہ "توفی" اور "موت" دو علیحدہ چیز ہیں، کبھی متحد ہوتی ہیں اور کبھی ایک دوسرے سے جدا۔ "فقطع دابر القوم الذین ظلموا". قاتلھم اللّٰہ.

بدبخت قادیانی کی بات کا حاصل یہ ہے کہ اس آیت میں "منام" کو موت مان لیا گیا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: "النوم اخو الموت" (۱) (نیند ایک طرح کی موت ہے) اسی حیثیت سے نیند پر

(۱) حدیث یہ ہے "عن جابر قال: سأل رجل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: أینام اھل الجنۃ؟ قال: النوم اخو الموت، ولایموت اھل الجنۃ" (شعب الایمان للبیھقی: ۱۸۳/۴، ۴۸۴۵) (محمد صغیر)

"توفی" کا اطلاق کیا گیا ہے۔ (انتہی) ایسا لگتا ہے کہ اسی کے رد، اور اس کے مکر و فریب کو ناکام بنانے ہی کے لیے قرآن کریم نازل ہوا ہے؛ چنانچہ آیت کریمہ نے اس طرح کی باطل تاویلوں کے دروازوں کو بند کرتے ہوئے صورت منام کو "والتی لم تمت" سے تعبیر کیا، جس سے اس بات کی وضاحت کردی کہ "توفی" کا اطلاق منام پر موت کے معنی میں نہیں، بلکہ منام "توفی" کی اقسام میں سے ایک نوع ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ: نیند پر موت کا اطلاق کبھی نہیں کیا جاتا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں خصوصی طور پر اس کا اعتبار نہیں کیا گیا ہے۔ سورہ "زمر" کی آیت میں "الانفس" سے مراد بظاہر ارواح ہیں نہ کہ اشخاص و افراد اور توفی سے مراد اس روح کو مکمل طور پر لینا ہے، یہ بات دونوں صورتوں میں مشترک ہے، خواہ لے لینے کے بعد ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جائے، جیسا کہ موت میں ہوتا ہے یا نہ منتقل کیا جائے (جیسا کہ نیند میں ہوتا ہے) پہلی صورت میں اس کو پورا لے لینا ہوا جب کہ دوسری صورت میں روک رکھنے کے معنی میں ہے۔

نفس کے مرنے سے مراد [حالانکہ نفس فنا نہیں ہوتا] یا تو اجسام نفس کی موت ہے اور ملابست کی وجہ سے "توفی" کی اضافت اس کی طرف کردی گئی ہے، یا خود اس نفس کی ہی موت ہے، مگر اس طرح، جس طرح اس کی موت ہوتی ہے اور وہ ایک لمبی مدت کے لیے اس کو لے لینا ہے، پس ارشاد ربانی "اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ" کے معنی ہوئے "یقبضها" (یعنی اللہ تعالیٰ نفس کو روک لیتے ہیں) یہ کہنا صحیح نہیں کہ: اس کے معنی "یمیتها" ہیں (یعنی اللہ تعالیٰ نفس کو مار ڈالتے ہیں) اس لیے کہ نفس کے لیے موت نہیں ہے۔ لیکن "حین موتها" میں مقامی ضرورت کی وجہ سے ادنیٰ ملابست کی بناء پر اضافت کردی گئی۔ ضرورت یہ ہے کہ جب "توفی" کو مقسم قرار دیا پھر "امساک" اور "ارسال" کی جانب اس کی تقسیم کی، تو ضروری ہوا کہ قسم اول میں جو چیز ہے، اس کی تصریح کردی جائے، تاکہ دوسری قسم سے ممتاز ہو جائے، اس لیے "حین موتها" ارشاد فرمایا گیا۔ اگر یہ قید ظاہر نہ کی جاتی تو یہ قسم، مقسم کی طرح رہتی، ممتاز نہ ہوتی۔ حاصل یہ کہ نفس کی طرف اضافت اگرچہ ادنیٰ ملابست کی وجہ سے ہے، لیکن اس سے پہلی قسم کسی التباس و اشتباہ کے بغیر متعین ہو جاتی ہے۔ جہاں تک نسبت اضافی کی بات ہے، تو اس میں ادنیٰ ترین ملابست کی رعایت عام ہے۔ بلکہ علمائے نحو کے یہاں تو مشہور یہ ہے کہ اضافت اسی کے لیے ہوتی ہے، برخلاف نسبت ایقاعیہ کے، کہ اس میں ملابست کا اعتبار بہت کم ہے، (اس قید کی وجہ سے) آیت نے اپنے معنی و مطلب کو مکمل طور پر واضح کردیا۔ اسی طرح "منامها" میں بھی اضافت، شاید ملابست ہی کے سبب ہے۔

اب یہ آیت، تین وجہوں سے اس پر دلالت کرتی ہے کہ "توفی" بمعنی "اماتة" نہیں ہے۔

۱۔ ''توفي'' نفس پر واقع ہے، حالانکہ ''اماتة'' کا وقوع نفس پر نہیں ہوتا۔

۲۔ قسم اول۔موت۔کو ''حین موتھا'' سے مقید کیا گیا، اگر ''توفی'' بمعنی ''اماتۃ'' ہے تو یہ قید غیر ضروری ہوئی۔

۳۔ ''توفی'' کو ''امساک'' اور ''ارسال'' کی طرف تقسیم کیا گیا، (حالاں کہ اگر ''توفی'' بمعنی ''اماتۃ'' ہے تو ''ارسال'' نینداس کی قسم کیسے بن سکتی ہے؟)

اس شقی قادیان نے جو یہ کہا ہے کہ ''توفی'' بمعنی ''قبض الروح'' (یعنی فقط روح کو لینا) ہے، بدن کا اس میں کوئی دخل نہیں۔تو یہ اس کی تحقیق نہیں، بلکہ حضرت شاہ عبدالقادر کی تفسیر سے سرقہ کیا ہے۔شاہ صاحب نے سورہ سجدہ کی تفسیر میں لکھا ہے اور اس پر تفریع کی ہے کہ نوم پر ''توفی'' کا اطلاق اسی وجہ سے ہے۔یہ دشمن عقل اس کو نہ سمجھ سکا۔توفی بالموت مجموعہ بدن اور روح پر واقع ہوتی ہے، کیوں کہ بدن منوں مٹی کے نیچے دفن اور غائب ہو جاتا ہے، لیکن علماء لغت نے بوجہ عدم خفاو وضوح اقتصار مراد، روح پر اختصار کیا۔اگر ان کی مراد قبض روح ہی ہو، تو کیا ہوا۔کیا نینداور موت میں فرق نہیں ہے؟ پس اس وقت بھی تقسیم ضروری ہوئی اور یہی مقصود ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ: بدن کو اس دنیا سے عالم سماء کی طرف منتقل کرنے میں بعض دنیاوی امور مثلاً: کھانا پینا وغیرہ، عالم سماء کے تقاضوں کے مطابق بند ہو جاتے ہیں، پس اس پر ''توفی'' کا اطلاق کر دیا جاتا ہے، اگر چہ روح، بدن کے لباس کو نہ اتارے۔تفسیر ابن جریر میں ہے:

''عن مطر الوراق فی قول اللہ ، اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ '' قال :متوفیک من الدنیا ، ولیس بوفاۃ موت''.

''مطرالوراق سے منقول ہے کہ مُتَوَفِّیْکَ کے معنی وفات بمعنی موت نہیں، بلکہ زمین سے اٹھا لینے کے ہیں''۔

نیز کعب الاحبار نے کہا:

''ما کان اللہ۔عز وجل۔لیمیت عیسی بن مریم، انما بعثہ اللہ ، داعیا ومبشرا، یدعوا اللہ وحدہ ، فلما رأی عیسی ۔علیہ السلام۔قلۃ من اتبعہ، وکثرۃ من کذبہ ، شکی ذٰلک الی اللہ ۔عز وجل۔ فاوحی اللہ الیہ ''اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ'' ولیس من رفعتہ عندی میتاً، وانی سابعثک علی الاعور الدجال فتقتلہ''. (انتھیٰ)

''مقصود باری عزاسمہ عیسی علیہ السلام کو وفات دینا نہیں تھا، آپ کو تو داعی و مبشر بنا کر بھیجا تھا، جو خدائے

واحد لاشریک کی طرف بلاتے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے متبعین کی قلت اور مکذبین کی کثرت دیکھی، تو اللہ تعالیٰ سے اس کی شکایت کی، جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ" میری مراد مار کر اٹھانا نہیں ہے۔ بلکہ میں دجال پر تم کو بھیجوں گا اور تم اس کو قتل کرو گے۔

گویا آپ علیہ السلام کا نزول اس بشارتِ ربانی کا تتمہ ہے، اس لیے کہ مقدمۃ الجیش ہی سب سے پہلے جنگ کیا کرتا ہے۔

احادیث میں روح کو آسمان کی طرف لے جانے کو موت اور دنیا کی طرف لوٹانے کو حیات؛ سے تعبیر کیا گیا ہے، سونے کے وقت کی دعاء کے الفاظ حدیث میں یہ ہیں:

"باسمک ربی وضعت جنبی، وبک ارفعه، فان امسکت نفسی فارحمها، وان ارسلتها فاحفظها بماتحفظ به عبادک الصالحین" (بخاری: ۹۳۵/۲)

"اے میرے پروردگار تیرے نام سے میں نے اپنے پہلو کو رکھا ہے اور تیری ہی مدد سے اٹھاؤنگا، اگر تو میری جان کو روک (قبض کر) لے تو اس پر رحم کرنا اور اگر چھوڑ دے تو اس کی حفاظت ان چیزوں سے کیجئے، جس سے نیک بندوں کی حفاظت کرتا ہے۔

اور نیند سے بیدار ہونے پر یہ دعا منقول ہے:

"الحمد لله الذی عافانی فی جسدی، ورد علی روحی، واذن لی بذکره" (عمل الیوم والليلة للنسائی: ۴۹۶/۱)

"تمام تعریفیں اس اللہ کی جس نے عافیت دی مجھے میرے جسم میں اور لوٹایا روح کو اور مجھے اپنے ذکر کی توفیق دی"۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث:

"مامن احد یسلم علی الا رد الله علی روحی، حتی ارد علیه السلام" (ابوداؤد: ۲۷۹/۱)

"جب بھی کوئی بندہ مجھے سلام کرے گا، تو اللہ تعالیٰ میری روح کو واپس کر دیں گے، تا کہ اس کا جواب دوں"۔

کے یہی معنی ہیں۔ ابوداؤد نے اس کی تخریج کی ہے اور حافظ ابن حجر نے سند کے متعلق لکھا ہے کہ: اس کے رواۃ ثقہ ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ:

"الذکر حیاة والنسیان موت"

"ذکر حیات ہے اور نسیان موت"۔

جیسا کہ علم کو حیات اور جہل کو موت کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے۔ مشہور ہے:

"الناس موتی واهل العلم احیاء"

"بے علم مرے ہوئے ہیں اور اہل علم زندہ"۔

پھر توفی انفس وارواح کی بابت اللہ تعالی کے لیے نقل وتحویل کی ضرورت نہیں ہے، جس طرح کہ امام شافعیؒ کے نزدیک قبضہ منقولات کے لیے نقل وتحویل کی ضرورت ہوتی ہے؛ بلکہ یہ تو ایک معاملہ ہے، دوسرے معاملہ کی جگہ، جیسا کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک قبضہ کے تام ہونے کے لیے فقط معاملے کا بدل جانا (اور تخلیہ کا ہو جانا) کافی ہے، انتقال وتحویل شرط نہیں۔ یہی معاملہ بدن سے روح کے تعلق کا بھی ہے، شاید بدن سے روح کا تعلق وہی ہے، جو ایک سوار کا اپنی سواری سے ہوتا ہے۔ نیز حدیث: "و آدم بین الروح والجسد" کا بھی یہی مفہوم ہے کہ مختلف ادوار میں بھی وہ آدم ہی ہیں۔ واللہ اعلم۔

روح کی بابت اس شقی قادیانی کا کلام جب مجھے سنایا گیا، تو ہنسی بھی آئی اور رونا بھی، کہ اس نے روح کو ایک ایسی قوت قرار دیا ہے، جو مادہ منویہ سے پیدا ہوتی ہے، پھر اس کا رفع کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ اس کی بات نہیں ہے، بلکہ اہل یورپ کا نظریہ ہے، جسے اس نے اپنا الہام و وحی بنا کر پیش کیا، اسکی عادت ہے کہ دوسروں کی باتیں چوری کر کے بڑی جسارت و جرأت کے ساتھ کہتا ہے کہ بذریعہ وحی یہ بات مجھے فرشتے نے بتلائی۔

ارشاد باری:

"هُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰکُمْ بِالَّیْلِ وَیَعْلَمُ مَاجَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ، ثُمَّ یَبْعَثُکُم فِیْهِ، لِیُقْضٰی اَجَلٌ مُّسَمًّی"(انعام: ۶۰)

"اور وہی ہے کہ قبضہ میں لے لیتا ہے تم کو رات میں اور جانتا ہے جو کچھ کہ تم کر چکے ہو دن میں۔ پھر تم کو اٹھا دیتا ہے اس میں تا کہ پورا ہو وہ وعدہ جو مقرر ہو چکا ہے"۔

میں "تـوفـی" کے مقابلے میں صرف دو لفظ ہیں: بعث اور جرح، لہٰذا منویہ مادہ کی قوت مراد لینا حماقت و جہالت کے سوا اور کیا ہے؟

انہی وجوہ (کہ توفی بمعنی اماتة نہیں ہے) میں سے ایک یہ بھی ہے کہ قرآن کریم میں "توفی" کی اسناد بہ کثرت فرشتوں کی طرف اور اللہ کی طرف کی گئی ہے، جب کہ "اماتة" کی نسبت پورے قرآن میں کسی ایک جگہ بھی اللہ کے سواء کسی اور کی طرف نہیں کی گئی۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ "تـوفـی" اور "امـاتـة" دونوں مترادف نہیں ہیں۔ چناں چہ ارشاد باری ہے:

"هُوَ يُحْيِ وَيُمِيتُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ" (یونس: ۵۶)

"وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے اور اسی کی طرف پھر جاؤ گے"۔

"حَتّٰى إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا" (انعام: ۶۱)

"یہاں تک جب آ پہنچے تم میں سے کسی کو موت تو قبضہ میں لے لیتے ہیں اس کو ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے"۔

اس آیت میں شرط اور جزاء میں اتحاد کے شبہ کی وجہ سے "اماتته رسلنا" نہیں فرمایا، بلکہ "تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا" فرمایا جو شرط "موت" کا مغایر ہے (۱)۔

وہ آیتیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ "توفی" اور "اماتة" مرادف نہیں، بلکہ مغایر ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے:

"فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ" (نساء: ۱۵)

"تو بند رکھو ان عورتوں کو گھروں میں، یہاں تک کہ اٹھا لیوے ان کو موت"۔

"توفی" اور "اماتة" کو مترادف مانتے ہوئے اگر "حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ" کی تفسیر "حتی یمیتھن الموت" سے کی جائے، تو ایسی رکاکت پیدا ہوگی جس سے قرآن کریم کو بچانا واجب ہے (۲)۔

دوسری آیت ہے:

"وَالَّذِينَ يَتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجاً" (البقرہ: ۲۳۴)

"بصیغۂ معروف مطابق قرأت علی رضی اللہ عنہ (یعنی تم میں سے وہ لوگ جو اپنی عمر پوری پوری لے لیتے ہیں اور اپنے بعد بیویوں کو چھوڑتے ہیں"۔

---

(۱) مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی "قصص القرآن" (ج:۴، ص:۱۱۴) میں تحریر فرماتے ہیں: "اس آیت میں ذکر موت ہی کا ہو رہا ہے لیکن پھر بھی "توفته" میں "توفی" کے معنی موت کے نہیں بن سکتے، ورنہ بے فائدہ تکرار لازم آئے گا، یعنی "احدکم الموت" میں جب لفظ "موت" کا ذکر آ چکا، تو اب "توفته" میں بھی اگر "توفی" کے معنی موت ہی کے لیے جائیں تو ترجمہ یہ ہوگا "یہاں تک جب آتی ہے تم میں سے ایک کسی کو موت، موت لے آتے ہیں ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے)" اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں دوبارہ لفظ موت کا ذکر بے فائدہ ہے اور کلام فصیح و بلیغ اور معجز تو کیا، روزمرہ کے محاورہ اور عام بول چال کے لحاظ سے بھی، پست اور لاطائل ہو جاتا ہے؛ البتہ اگر "توفی" کے حقیقی معنی "کسی شے پر قبضہ کرنا یا اس کو پورا لے لینا" مراد لیے جائیں تو قرآن عزیز کا مقصد ٹھیک ٹھیک ادا ہوگا اور کلام بھی اپنے حد اعجاز پر قائم رہے گا۔ (محمد صغیر)

(۲) "قصص القرآن" (ج:۴، ص:۱۱۵) میں ہے کہ اس آیت میں "توفی" کو موت کا فعل اور موت کو "توفی" کا فاعل قرار دیا گیا ہے۔ اور ہر ایک زبان کی نحو (گرامر) کا یہ مسئلہ ہے کہ فاعل اور فعل ایک نہیں ہوتے، کیوں کہ فعل، فاعل سے صادر ہوتا ہے، عین ذات فاعل نہیں ہوا کرتا تو اس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ توفی کے حقیقی معنی "موت" کے ہرگز ہرگز نہیں ہیں، ورنہ اسکا اطلاق جائز نہیں ہو سکتا۔ (محمد صغیر)

اس آیت میں "توفی" بمعنیٰ "اماتة" ممکن نہیں، بلکہ "استیفاء عمر" کے معنیٰ متعین ہیں۔

فرق آپ کو معلوم ہے کہ موت ایک امر دفعی ہے، اگر آیت کریمہ "مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ" میں "توفی" بمعنیٰ "موت" ہو تو اس کا وقوع کسی دوسرے وقت میں ہوگا (اور رفع پہلے ہوگا) اس صورت میں دونوں لفظوں کے درمیان ترتیب باقی نہ رہے گی اور اگر "توفی" بمعنیٰ "استیفاءِ عمر" (مقررہ مدت پوری کرنا) ہو تو ترتیب میں کوئی فرق نہیں آتا، اگر چہ اس کے فوراً بعد ہی موت ہو۔ مناسب اعتبارات، لطائف اور خاصیات میں بحث کرنے کی ضرورت جب ہے کہ ہم اسے اپنے معنیٰ موضوع لہ میں مستعمل قرار دے کر موت سے کنایہ مانیں، لیکن اگر ہم اسے اصل وضع کے اعتبار سے "أخذ" کے معنیٰ میں لیں تو بات بالکل واضح اور صاف ہے۔

قادیانی بدنصیب کو ان دقیق مباحث وحقائق کا علم نہیں، چناں چہ کہتا ہے کہ:

جب "توفی" کا فاعل اللہ تعالیٰ اور مفعول ذی روح ہو، اس صورت میں "توفی" کے معنیٰ "موت" ہوگا۔

ہاں: اس صورت میں غیر موت کے معنیٰ نادر اور قلیل ہیں، جیسے حیات عیسیٰ علیہ السلام کی ندرت (کہ آیت کریمہ "إِنِّي مُتَوَفِّيكَ" میں فاعل اللہ تعالیٰ اور مفعول ذی روح ہے، اس کے باوجود موت کے معنیٰ مراد نہیں)۔

حاصل یہ کہ اگر مقام صلاحیت رکھتا ہے، تو بلا نکیر دوسرے معنیٰ میں استعمال درست ہے اور اس سلسلے میں امثلۂ کثیرہ کا مطالبہ، عناد وسرکشی کے علاوہ کچھ نہیں، کیوں کہ یہاں مادہ ہی میں قلت ہے، نہ یہ کہ لفظ اس معنیٰ کی صلاحیت نہیں رکھتا؛ چناں چہ جہاں بھی مادہ میں صلاحیت ہے، بکثرت استعمال ہے، مثلاً آیت کریمہ:

"اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا" (زمر: ۴۲)

"اللہ کھینچ لیتا ہے جانیں، جب وقت ہو ان کے مرنے کا"۔

اور

"وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰى أَجَلٌ مُّسَمًّى" (انعام: ۶۰)

"اور وہی ہے کہ قبضہ میں لے لیتا ہے، تم کو رات میں اور جانتا ہے جو کچھ تم کر چکے ہو دن میں"۔

پھر تم کو اٹھا دیتا ہے اس میں، تا کہ پورا ہو وہ وعدہ جو مقرر ہو چکا ہے۔

(ان دونوں آیتوں میں "توفی" کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے اور مفعول ذی روح، اس کے باوجود کسی صورت سے "توفی بمعنیٰ موت" صحیح نہیں) اور معاند ایسے مادے میں، جن کا تحقق موت ہی سے ہوتا ہے، مطالبہ کرتا ہے کہ وہ موت کے علاوہ، دوسرے معنیٰ میں ہو، گویا کہ وہ یہ چاہ رہا ہے کہ خود لفظ موت بھی، موت

کے علاوہ دوسرے معنی کے لیے آئے۔

یہ ایسا ہی ہے جیسے اسماعیل علیہ السلام پر لفظ ''ذبیح'' کے اطلاق کا از روئے لغت مطالبہ کرنا کہ لفظ ذبیح دوسرے مواقع میں ایک معنی میں ہے اور یہاں (اسماعیل علیہ السلام پر اطلاق کی صورت میں) دوسرے معنی میں کیوں کر ہے؟ تو یہی کہا جائے گا کہ کسی دوسرے کے ساتھ اس جیسا واقعہ ہوا نہیں، ایسے ہی اس کا مطالبہ کرنا کہ لفظ ''مسیح'' کا اطلاق جب عیسیٰ علیہ السلام پر ہوتا ہے، تو کیوں ایک معنی مراد ہوتے ہیں اور جب اسکا اطلاق دجال اور اس کے متبعین مثلاً: اس بدنصیب قادیانی پر ہوتا ہے، تو دوسرے معنی؟ اسکے جواب میں یہی کہا جائے گا:۔

عزالامانة، اغلاها، وارخصها ☆ ذل الخيانةفافهم حكمةالبارى (١)

''امانت کی عزت وشرافت نے ہاتھ کی قیمت گراں کردی تھی، اب خیانت کی ذلت نے اس کی قیمت گرادی۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت سمجھ''۔

شریعت میں بکثرت ایسے الفاظ ہیں، جنکے معانی اہل زبان کے یہاں معروف نہیں، جیسے ''جاء هم بكتاب''، ''نزول الوحى'' اور ''تنزيل الكتاب'' وغیرہ کہ ان کے معانی شریعت سے ہی معلوم ہوئے۔ اسی وجہ سے اصولیین نے اصطلاح میں ان کے شرعی معانی بیان کیے، اور غریب القرآن سے بحثیں کیں، کمافی ''مقدمة المطول'' بلکہ اس کی وجہوں، نظائر اور مفردات وغیرہ سے بھی، کمافی ''الاتقان''۔

جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب واضح ہو کہ نوم کے لیے ''توفی'' کا اطلاق قرآن سے ہی معلوم ہوا، اس سے پہلے یہ مشہور نہ تھا، لہٰذا ''اخذ و تناول'' (لینے اور قبضہ کرنے) کے لیے بھی ''توفی'' کا اطلاق، قرآن ہی سے ماخوذ ہونا چاہیے۔ اس وضاحت سے ملحد قادیان کی اٹھائی ہوئی عمارت؛ برابر زمین ہوگئی۔

صحابہ کرام عیسیٰ علیہ السلام کے لیے ''توفی'' کے بجائے ''رفع'' کا لفظ استعمال کرتے تھے، کیوں کہ ''جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشاً، وَالسَّمَآءَ بِنَآءً، (بقرہ: ۲۲) اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰداً ۙ وَّالْجِبَالَ

(۱) اس شعر کا شان ورود یہ ہے کہ ایک شاعر ابوالعلاء المعری نے حدود اسلامی پر اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا:۔

يَدٌ بخمس مئين عسجدوديت ☆ مابالهاقُطِعت فى ربع دينار

''وہ ہاتھ کہ جس کی پانچ سو دینار دیت دی جاتی تھی اس کی کیا وجہ ہے کہ ربع دینار کے عوض کاٹ دیا جاتا ہے۔

تَحكم مالنا الاالسكوت له ☆ وان نعوذبمولانامن النار

یہ ایک حاکمانہ فیصلہ ہے، ہمارے لیے خاموشی کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں اور ہم آگ سے اپنے آقا کی پناہ چاہتے ہیں۔

اس کے جواب میں شیخ علم الدین السخاوی نے مذکورہ شعر کہا (ابوطصغیر)

اَوْتَاداً (عم: ۶، ۷) وَجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاساً" (عم: ۱۰) اور "فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ" (نحل: ۱۱۲) کی طرح یہ بھی قرآنی تعبیر ہے۔

یہ بحث طویل ہوگئی، مناسب ہے کہ اس موقع پر کتاب الایمان "درمختار" کا مطالعہ کیا جائے، علماء نے حقیقتِ لغویہ اور استعمال قرآنی، نیز عرف اور نیت متکلم میں فرق کیا ہے، بنیاد یہ ہے کہ صحابہ اور پوری امت محمدیہ کے یہاں عیسیٰ علیہ السلام کے لیے لفظ "توفی" کا استعمال متروک ہے، چناں چہ عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی تقریر میں کہا تھا:

"من قال: ان محمداً قد مات، قتلته بسیفی ھذا، وانما رفع کما رفع عیسی بن مریم" [الفرق بین الفرق، ص: ۱۲]

"اگر کسی نے یہ کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی، تو میں اس کی گردن ماردونگا، وہ تو اٹھالیے گئے، جس طرح کہ عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام اٹھائے گئے تھے"۔

اس تقریر میں عمر رضی اللہ عنہ نے "رفع" سے آپ کا اٹھایا جانا، اور عوام سے اوجھل کردیا جانا مراد لیا ہے، نہ کہ موت، بلکہ آپ نے تو صراحتاً موت کی نفی کی ہے۔ ابن سعد کی روایت کا بھی مفہوم یہی ہے، جس میں آتا ہے کہ جب علی رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو حسن رضی اللہ عنہ ممبر پر تشریف لائے اور فرمایا:

"ایھا الناس قد قبض اللیلة رجل لم یسبقه الاولون، ولقد قبض فی اللیلة التی عرج فیھا بروح عیسی بن مریم لیلة سبع وعشرین من رمضان"۔

"اے لوگو! رات ایک ایسے شخص کا انتقال ہوگیا، جس کی کوئی نظیر نہ تھی اور یہ سانحہ: ۲۷/ رمضان المبارک کی اس رات میں رونما ہوا، جس میں عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر اٹھایئے گئے تھے"۔

اگر اٹھایا جانا مراد نہ ہوتا تو عیسیٰ علیہ السلام کے لیے بجائے لفظ "عرج" کے آپ لفظ "قبض" استعمال کرتے اور عبارت یوں ہوتی "ولقد قبض فی اللیلة التی قبض فیھا عیسی بن مریم علیه السلام" (صاحب کتاب علامہ کشمیریؒ راویوں کے اختلاف الفاظ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ابن سعد کی روایت کے الفاظ، تو وہی ہیں، جو مذکور ہوئے، لیکن) ابن اسحاق اور دارمی کی روایت میں "بروح عیسیٰ علیه السلام" کے بجائے "بروح موسی" ہے اور "بروح موسی" سے صاعقہ موسیٰ مراد ہے، یعنی جس وقت طور پر حضرت موسیٰ پر بیہوشی طاری ہوئی۔ جب کہ "درمنثور" اور "مستدرک حاکم" ج: ۳، ص: ۱۴۳، میں "لیلة سبع و عشرین من رمضان" کے بجائے "لیلة اسری بعیسی"

وليلة قبض موسى " ہے۔

"مختصر الأجوبة الجلية، ارخص الدعوات النصرانيه" میں ہے کہ ایک نصرانی عالم "شیخ زیاد"، جب مشرف بہ اسلام ہوئے، تو ایک پادری "منیع" نے عیسی علیہ السلام کی وفات کے اثبات اور قتل وموت کی نفی کی بابت، قرآن میں تضاد دکھا کرانہیں اسلام سے منحرف کرنا چاہا، شیخ زیادہ نے اس کو بتایا کہ قرآن کی اصطلاح میں "توفی" کا اطلاق، موت کے علاوہ دوسرے معنی پر بھی ہے، تو "منیع" پادری نے اسلام قبول کرلیا۔ رحمهما الله والامر الی الله. (افسوس کہ ایک پادری تو اس لفظ کی وجہ سے مشرف بہ اسلام ہوگیا، مگر) زندیق پنجاب اسی لفظ کی وجہ سے کافر و مرتد ہوا۔ لا حول ولا قوة الا بالله۔

یہ بدبخت کرتا بھی کیا؟ یہ بھی دیکھا گیا کہ جب ائمہ لغت جیسے: زجاج وغیرہ کے تشریحی اقوال پیش کیے جاتے ہیں، تو کہتا ہے کہ: یہ لغت کے خلاف ہے۔ گویا بدبخت یہ سمجھتا ہے کہ ارباب لغت جب قرآن کی تفسیر کرتے ہیں، تو لغت میں اپنی ممتاز حیثیت سے علیحدہ ہوتے ہیں۔ اس کی حماقت وجہالت دیکھیے۔ ارشاد باری "حَتّٰى إِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ...... الآية" (الاعراف:۳۷) کی بابت زجاج لکھتے ہیں کہ: یہ آخرت کے بارے میں ہے۔ مراد یہ ہے کہ روز محشر جب عذاب کے فرشتے کفار کے پاس آئیں گے اور تمام کو، جہنم میں لے جائیں...... الخ۔ [کمافی خازن] الحاصل زجاج نے اس آیت کو عالم آخرت سے متعلق کیا ہے اور تمام کفار کو محشر میں جمع کرنے کا معنی "توفی" سے لیا ہے۔

یہ بات بھی ذہن نشیں رہے کہ جب لفظ "وفاء" جملہ دعائیہ "مات فلان وانت بالوفاء" میں درازیٔ عمر کے معنی میں ہے، تو لفظ "توفی" میں بھی اس معنی کی رعایت ضروری ہوگی اور کیوں کر نہ ہو؟ اس لیے کہ اس جملہ دعائیہ میں "وفاء" کو موت کے مقابل ٹھہرایا گیا ہے، لہٰذا موت اور وفاء دونوں میں فرق کرنا ضروری ہوا۔ نیز "وفی" بمعنی "کثر" بھی مستعمل ہے۔ علاوہ ازیں قاری کے لیے ضروری ہے کہ وہ "تمام" اور "وفاء" کے فرق کو بھی ملحوظ رکھے، اس لیے کہ لفظ "تمام" اختتام کے معنی میں ہے، اور "وفاء" مساوات کے معنی میں۔

انہی مذکورہ وجوہ (کہ توفی بمعنی اماتة نہیں ہے) میں یہ بھی ہے کہ "قبض ورد" وغیرہ کی نسبت، کمعیات میں، بہ کثرت روح کی طرف ہے، برخلاف موت کے کہ اس کی نسبت عموماً ابدان کی طرف ہوتی ہے؛ چوں کہ ان دونوں میں فرق ہے، اس لیے مذکورہ استعمال کے برعکس انہیں ذکر نہیں کیا گیا؛ چناں چہ "توفیت نفسه" تو کہا جاتا ہے، مثلاً ارشاد باری ہے: "اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ"، لیکن "مات زيد" کی طرح "ماتت نفس فلان" نہیں کہا جاتا۔ والله اعلم بالصواب.

حیات عیسیٰ سے متعلق آیتوں کی تفسیر اور بعض نکات

سیرت ابن ہشام کے حوالے سے گذشتہ صفحات میں ذکر ہوا کہ صاحب السیرۃ ابن اسحاق نے وفد نجران کی آمد کے تحت ''سورۂ آل عمران'' کے ایک حصہ کی تفسیر، اس انداز سے کی ہے، کہ جس سے اس کا سیاق وسباق ظاہر ہو جاتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پوری عبارت یہاں نقل کر دی جائے، تا کہ ان آیات پر غور وفکر کرنے والا دیکھے، تو اس کو اطمینان ہو اور اگر عربی زبان سے ذوق رکھتا ہو، تو وہ اور بھی محظوظ ہوگا۔

ان آیات کے سیاق وسباق سے مزید واقفیت کے لیے حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے ''موضح القرآن'' کے فوائد اور ابن تیمیہ کی ''الجواب الصحیح'' کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

وفد نجران کی آمد اور مباہلہ کا تذکرہ

ابن ہشام ج:۲،ص:۱۸۰، پر ابن اسحاق کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نجران کے نصاریٰ کا وفد آیا، جس میں ساٹھ سوار تھے، اُن ساٹھ میں سے چودہ سر برآوردہ تھے، پھر ان میں تین شخص ایسے تھے جو مرجع عام تھے، ایک عاقب جو قوم کا سردار، صاحب رائے اور صاحب مشورہ تسلیم کیا جاتا تھا جو کام ہوتا، اس کے مشورہ سے ہوتا، اس کا اصل نام ''عبدالمسیح'' تھا۔ دوسرا ''سید'' جو نجرانیوں کی دیکھ بھال، اسفار اور اجتماعات کا انتظام کرنے والا تھا، اس کا نام ''اَیْہَم'' تھا۔ تیسرا ابو حارثہ بن علقمہ، جوان کا دینی پیشوا، ماہر عالم اور امام تھا، یہ اصلاً بنی بکر بن وائل سے تھا، مگر نجرانیوں میں رہا، ان کی کتابیں پڑھیں اور کمال حاصل کیا، روم کے عیسائی بادشاہوں کو، دینی علوم میں اس کی مہارت کی خبر پہنچی تو انہوں نے اسے بڑا مرتبہ دیا، مال ومنال، خدم وحشم عطا کیے، اس کے لئے کلیسے بنوائے اور طرح طرح کے اعزازات سے سرفراز کیا۔

جب یہ لوگ نجران سے رسول اللہ ﷺ سے ملنے کے لئے روانہ ہوئے تو ابو حارثہ اپنے خچر پر سوار ہوا، اس کے ساتھ اس کا بھائی ''کرز بن علقمہ'' تھا، ابو حارثہ کے خچر نے ٹھوکر کھائی تو ''کرز'' نے کہا: ''تَعِسَ الابعد'' (دور والا برباد ہو) اس کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ تھے۔ اس پر ابو حارثہ نے کہا: ''وہ نہیں بلکہ تو

برباد ہو"۔ کرز نے کہا: یہ کیوں؟ بولا واللہ! یہی وہ نبی ہے جس کا ہم انتظار کر رہے تھے۔ کرز بولا جب آپ جانتے ہیں، تو پھر اس پر ایمان لانے میں کیا مانع ہے؟ اس پر کہنے لگا کہ دیکھتے نہیں کہ ان لوگوں نے ہمارے لیے کیا کیا کچھ کر رکھا ہے، ہمیں اعلیٰ مرتبہ دیا ہے، بے پناہ مال و دولت دے رکھی ہے، عزت دی ہے، مگر انہیں نبی آخرالزماں کی مخالفت کے سوا کوئی بات قبول نہیں، اگر میں صحیح بات کہہ دوں تو یہ کروفر ختم ہو جائے گا۔ کرز بن علقمہ کے دل میں یہ بات گھر کر گئی چناں چہ بعد میں اسلام قبول کرلیا اور یہ واقعہ خود ہی بیان کیا۔

ابن ہشام لکھتے ہیں کہ: نجران کے رئیسوں نے چند کتابیں ورثے میں پائی تھیں، جب ان کا رئیس مرجاتا اور ریاست وحکومت دوسرے کو مل جاتی، تو وہ ان کتابوں پر، اپنی مہر بھی لگا دیتا، اور پہلے کی مہریں نہ توڑتا۔ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں جو رئیس تھا، ایک دن ٹہلتا ہوا باہر نکلا تو ٹھوکر کھائی، اس کے بیٹے نے کہا: "تعس الأبعد" (دور والا برباد ہو) جس سے اس کی مراد رسول اللہ ﷺ تھے، یہ سن کر باپ نے اس سے کہا: ایسا نہ کہہ؛ کیوں کہ وہ نبی ہیں اور ان کا نام وضائع یعنی محفوظ کتابوں میں موجود ہے، جب باپ مر گیا، تو بیٹے نے مہریں توڑ دیں۔ اور جب ان کتابوں میں نبی اکرم ﷺ کا تذکرہ پایا تو اسلام قبول کرلیا، اسلام میں اس کی حالت اچھی رہی، حج بھی کیا، مندرجہ ذیل شعر اسی نے کہا ہے:ؔ

إلیک تَـعـدوا قَلِقاً وَضِینُهَا ☆ مُعْتَرِضاً فِیْ بَطْنِهَا جَنِیْنُهَا

مُخَالِفاً دِیْنَ النصَارىٰ دِیْنُهَا

اونٹنی تیری ہی جانب دوڑ رہی ہے اس حالت میں کہ اس کا کمر بند حرکت کر رہا ہے اور اس کے پیٹ میں بچہ اس کے آڑے آرہا ہے، درانحالیکہ اونٹنی والے کا دین نصاریٰ کے دین کے خلاف ہے۔

مصرع "معترضاً في بطنها جنينها" کا اضافہ اہل عراق نے کیا۔ ابن ہشام لکھتے ہیں کہ "وضین" "خرام الناقة" کو کہتے ہیں۔

محمد بن جعفر بن زبیر نے بیان کیا کہ یہ وفد جس وقت مدینہ منورہ پہنچا اور مسجد نبوی میں داخل ہوا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز عصر پڑھا چکے تھے، یہ لوگ اچھے کپڑے، اور جبے پہنے ہوئے تھے اور چادریں اوڑھے ہوئے، بعض صحابہ جنہوں نے انہیں اس روز دیکھا تھا کہتے کہ: ان کے بعد ان جیسا وفد ہم نے کبھی نہیں دیکھا، ان لوگوں کی نماز کا وقت ہو چکا تھا؛ اس لیے وہ مسجد نبوی ہی میں نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوگئے؛ اس پر صحابہ میں چہ می گوئی ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "دعوهم"، "انہیں نماز پڑھنے دو" چناں چہ ان لوگوں نے مشرق کی جانب رخ کر کے نماز پڑھی۔

وفد کے نمایاں افراد یہ تھے:

عاقب جس کا نام ''عبد المسیح'' تھا، جس کا نام ''اَیْھَم'' تھا، ابوحارثہ بن علقمہ، جو بنی بکر بن وائل سے تھا، اوس، حارث، زید، قیس، یزید، نُبیہ، خویلد، عمرو، خالد، عبداللہ اور یحنس۔ رسول اللہ ﷺ سے ابوحارثہ بن علقمہ، عاقب عبدالمسیح اور سید ایہم، نے گفتگو کی، باوجود اس کے کہ ان میں کچھ اختلاف بھی تھا، وہ شاہی دین کے پیرو تھے، ان میں سے بعض تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کہتے، بعض اللہ کا بیٹا اور بعض تین خداؤں میں کا تیسرا۔

عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کہنے والے، دلیل یہ دیتے تھے کہ: آپ مردوں کو زندہ کرتے، بیماریوں کو دور کرتے اور غیب کی باتیں بتاتے تھے، مٹی سے پرندے کی شکل بناتے اس میں پھونکتے تو وہ اڑنے لگتا۔

اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہنے والے یہ دلیل دیتے کہ: آپ کا کوئی باپ نہ تھا، گہوارے میں بات کی، آپ سے پہلے اولاد آدم میں کسی نے نہیں کی۔

تین میں کا تیسرا کہنے والے اللہ تبارک و تعالیٰ کا یہ ارشاد پیش کرتے کہ: اللہ تعالیٰ بہ صیغۂ جمع ''فعلنا'' ہم نے کیا ''امرنا'' (ہم نے حکم دیا) ''خلقنا'' (ہم نے پیدا کیا) اور ''قضینا'' (ہم نے فیصلہ کیا) فرماتا ہے، اگر اللہ ایک ہوتا تو بصیغۂ واحد ''فعلت'' (میں نے کیا) ''قضیت'' (میں نے فیصلہ کیا) ''امرت'' (میں نے حکم دیا) اور ''خلقت'' (میں نے پیدا کیا) فرماتا مگر چوں کہ اللہ، عیسیٰ اور مریم تینوں خدائی میں شریک ہیں، اس لیے بہ صیغۂ جمع لایا گیا، ان کی انہی باتوں کے تناظر میں متعدد آیات نازل ہوئیں۔

آل عمران کا نزول

ان کی گفتگو سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اَسْلِمَا'' (تم اسلام قبول کرلو) بولے کہ ہم تو اسلام پر ہیں ہی۔ آپ نے فرمایا: '' انکما لم تسلما فاسلما'' (تم اسلام پر نہیں ہو صحیح اسلام قبول کرو) کہنے لگے ہم آپ سے پہلے اسلام لاچکے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کذبتما، یمنعکما من الاسلام دعاؤکما للہ ولداً، وعبادتکما الصلیب، وأکلکما الخنزیر''.

''غلط کہتے ہو، تمہارا اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹا ماننا، صلیب کی پوجا اور خنزیر کا استعمال، اسلام کے لئے مانع ہے''۔

بولے! پھر عیسیٰ کا باپ کون ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذرا خاموش ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی بھرپور تردید میں سورۂ آل عمران کا ابتدائی حصہ اسی^ سے اوپر آیتوں تک، نازل کیا۔

ارشاد ہوا "الٓمّٓ ○ اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ"۔ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) اس کے اوامر میں کوئی شریک نہیں۔ آغاز اپنی ذات کی پاکی اور توحید سے ہوا کہ وہ شرکت وغیرہ سے پاک ہے، پیدا کرنے اور حکم دینے میں یکتا ہے: تاکہ عیسیٰ کے متعلق جو ان کا باطل عقیدہ ہے اس کی غلطی واضح ہوجائے۔

"اَلْحَیُّ" وہ سدا زندہ ہے، اس پر موت طاری نہیں ہوسکتی جب کہ عیسائیوں کے بقول عیسیٰ علیہ السلام وفات پاگئے اور سولی پر چڑھا دیئے گئے "اَلْقَیُّوْمُ" (اپنے مقام تسلط پر برقرار ہے) حالاں کہ ان کے قول کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام جہاں تھے، اس جگہ سے ہٹ گئے اور دوسری جگہ چلے گئے "نَزَّلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ": (اتاری تجھ پر کتاب سچی) یعنی جن امور میں انہوں نے باہم اختلاف کیا، اس میں جو بات واقعی تھی، اسے لیے ہوئے "وَاَنْزَلَ التَّوْرٰۃَ وَالْاِنْجِیْلَ" (اور اتارا توریت اور انجیل کو) یعنی موسیٰ علیہ السلام پر توریت اور عیسیٰ پر انجیل، اسی طرح اتاری، جس طرح ان سے پہلے دیگر انبیاء کرام پر کتابیں نازل ہوئیں۔ "وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ" (اور فرقان نازل فرمایا) یعنی عیسیٰ وغیرہ کے متعلق، ان کے فرقوں نے جو متضاد خیالات قائم کرلیے تھے، ان میں حق کو، باطل سے، ممتاز کرنے والی چیز، "اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ لَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ" (بیشک جو منکر ہوئے، اللہ کی آیتوں سے، ان کے واسطے سخت عذاب ہے اور اللہ زبردست ہے، بدلہ لینے والا) یعنی ان لوگوں کو اللہ سزا دینے والا ہے، جنہوں نے اس کی آیتوں کے جاننے اور ان آیتوں میں جو کچھ تھا، اسے سمجھنے کے بعد اس کا انکار کیا۔ "اِنَّ اللّٰہَ لَا یَخْفٰی عَلَیْہِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ" (اللہ پر چھپی نہیں کوئی چیز، زمین میں اور نہ آسمان میں) یعنی جو ارادے وہ کرتے ہیں، جو چالبازیاں وہ سوچتے ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام کی جو مشابہت بیان کرتے ہیں، سب اللہ کو معلوم ہے کہ اللہ سے غفلت اور کفر کرکے عیسیٰ علیہ السلام کو پروردگار اور معبود ٹھہرالیا ہے؛ حالاں کہ ان کے پاس جو علم ہے وہ اس کے خلاف ہے۔ "ھُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَآءُ" (وہی تمہارا نقشہ بناتا ہے، ماں کے پیٹ میں، جس طرح چاہے) یعنی اس بات میں تو کسی قسم کا شبہ نہیں کہ عیسیٰ بھی ان لوگوں میں سے تھے، جنہیں رحم مادر میں صورت دی گئی، اس کا نہ وہ جواب دے سکتے ہیں اور نہ انکار کرسکتے ہیں، انہیں بھی ویسی ہی صورت دی گئی، جس طرح آدم کی دوسری اولاد کو دی گئی، پھر وہ معبود کس طرح ہوسکتے ہیں؟۔

پھر ان شرکاء سے جو انہوں نے ٹھہرالیے تھے، اپنی ذات کی تنزیہہ اور یکتائی بیان فرمائی: "لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ" (کسی کی بندگی نہیں اس کے سواء، وہ زبردست ہے حکمت والا) یعنی ان لوگوں کو سزا دینے میں غالب ہے، جنہوں نے اس کا انکار کیا، وہ جب چاہے سزا دے سکتا ہے اور اپنے بندوں سے

وجوہ دلائل بیان کرنے میں حکیم ہے۔ "ھُوَ الَّذِیۤ اَنۡزَلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ مِنۡہُ اٰیٰتٌ مُّحۡکَمٰتٌ ھُنَّ اُمُّ الۡکِتٰبِ" (وہی ہے جس نے اتاری تجھ پر کتاب، اس میں بعض آیتیں ہیں محکم۔ یعنی ان کے معنی واضح ہیں۔ وہ اصل ہیں کتاب کی) ان میں پروردگار عالم کے دلائل ہیں، بندوں کا (گمراہی سے) بچاؤ ہے اور مخالف و غلط باتوں کی تردید۔ جنہیں ان کے مضمون سے پھیرا نہیں جاسکتا اور نہ مفہوم میں تغیر ہوسکتا ہے۔ "وَاُخَرُ مُتَشٰبِھٰتٌ" (اور دوسری ہیں مشابہ۔ یعنی جن کے معنی معلوم یا معین نہیں) انہیں ان کے معنی سے پھیرا جاسکتا ہے اور ان کی تاویل کی جاسکتی ہے ان کے ذریعہ اللہ نے بندوں کی آزمائش کی ہے، جس طرح حلال وحرام سے آزمائش کی گئی ہے، کہ غلط معنی کی طرف نہ لے جائیں اور حقیقی معنی سے نہ ہٹائیں۔ مزید فرمایا: "فَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِھِمۡ زَیۡغٌ" (سو جن کے دلوں میں کجی ہے) یعنی سیدھی راہ سے پھر جانے کی قابلیت ہے "فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَہَ مِنۡہُ" (وہ پیروی کرتے ہیں، متشابہات کی) یعنی ایسے راستے پر پڑ جاتے ہیں جو اس سے پھیر دے، تاکہ اس کے ذریعہ اپنی گھڑی ہوئی باتوں کو سچ ٹھہرائیں اور یہ ان کے لیے حجت بن جائے، حالانکہ جو بات انہوں نے کہی، انہیں خود اس میں شک وشبہ ہے "ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَۃِ" (گمراہی پھیلانے کی غرض سے) یعنی اشتباہ پیدا کرنے کے لئے "وَابۡتِغَآءَ تَاۡوِیۡلِہٖ" (اور مطلب معلوم کرنے کی وجہ سے) یعنی "خلقنا، وقضینا" کے معنی کو پھیر کر اپنی اس گمراہی کی طرف لے جانا چاہتے ہیں، جس کا انہوں نے ارتکاب کیا ہے (کہ خدا تین ہیں، اللہ، عیسی، مریم، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بہ صیغۂ جمع "خلقنا و قضینا" وغیرہ ارشاد فرمایا ورنہ "خلقت وقضیت" وغیرہ فرماتے) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَمَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَہٗۤ" (اور ان کا مطلب کوئی نہیں جانتا) یعنی اس "خلقنا، وقضینا" کا مطلب، جس کے معنی انہوں نے حسب منشاء لے لیے ہیں۔ اِلَّا اللّٰہُ وَالرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ یَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِہٖ، کُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا" (سوا اللہ کے، اور مضبوط علم والے کہتے ہیں ہم اس پر یقین لائے، سب ہمارے رب کی طرف سے اتری ہیں) پھر اس میں اختلاف کیوں کر ہوسکتا ہے، وہ پورا کا پورا ایک ہی کلام ہے اور ایک ہی پروردگار کی جانب سے ہے۔

پھر انہوں نے متشابہات کی تاویل کے لئے، ان محکمات کی طرف رجوع کیا، جن میں بجز ایک معنی کے، کوئی دوسری تاویل نہیں، ان کی اس بات سے کتاب منظم ہوگئی اور اس کے ایک حصے نے دوسرے حصے کی تصدیق کردی، اور اس کے ذریعہ حجت نافذ ہوگی، عذر ظاہر ہوگیا، کفر کا سر کچل دیا گیا، اللہ رب العزت ارشاد فرماتا ہے "وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ، رَبَّنَا لَا تُزِغۡ قُلُوۡبَنَا بَعۡدَ اِذۡ ھَدَیۡتَنَا" (اور سمجھانے سے وہی سمجھتے ہیں — یعنی ایسے معاملوں میں — جن کو عقل ہے۔ اے رب! نہ پھیر ہمارے دلوں کو، جب تو ہم

کو ہدایت کر چکا) یعنی اگر نئی باتیں نکال کر ہم اس طرف جھک پڑیں تو ہمارے دلوں کو اس طرف نہ جھکنے دے، "وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً، اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ" (اور عنایت کر ہم کو اپنے پاس سے رحمت، تو ہی سب کچھ دینے والا ہے)۔ پھر ارشاد ہوا: "شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ" (اللہ نے گواہی دی کہ کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا اور فرشتوں نے اور علم والوں نے) یعنی انہوں نے جو کچھ کہا، اسکے خلاف یہ سب گواہ ہیں "قَآئِمًا ۢ بِالْقِسْطِ ط لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ" (وہی حاکم، انصاف کا ہے، کسی کی بندگی نہیں سوا اس کے، زبردست ہے حکمت والا۔ بیشک دین جو ہے اللہ کے ہاں، سو یہی مسلمانی حکم برداری) یعنی اے محمد ﷺ! پروردگار کی توحید اور رسولوں کی تصدیق کے جس طریقے پر آپ ہیں وہی حقیقی دین ہے، "وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَ هُمُ الْعِلْمُ" (اور مخالف نہیں ہوئے کتاب والے، مگر جب ان کو معلوم ہو چکا) یعنی وہ جو بذریعۂ قرآن آپ کے پاس آچکا ہے کہ اللہ ایک ہے، جس کا کوئی شریک نہیں۔ "بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ط فَاِنْ حَآجُّوْكَ" (آپس کی ضد اور حسد سے، اور جو کوئی انکار کرے اللہ کے حکموں کا، تو اللہ جلدی حساب لینے والا ہے۔ پھر بھی اگر تجھ سے جھگڑیں) یعنی "خلقنا فعلنا اور "امرنا" جیسے صیغہ ہائے جمع سے جو وہ باطل اور بے بنیاد تاویل پیش کرتے ہیں، تو یہ نرا بے بنیاد شبہ ہے اور یہ بات کہاں تک درست ہے، اسے بھی وہ بخوبی جانتے ہیں "فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ" (تو کہہ دے میں نے تابع کیا اپنا منہ اللہ کے حکم پر) جو یکتا ہے۔ "وَمَنِ اتَّبَعَنِ" (اور انہوں نے بھی کیا جو میرے ساتھ ہیں) وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ" (اور کہہ دے کتاب والوں کو اور ان پڑھوں کو) یعنی جن کے پاس کوئی کتاب نہیں" ءَاَسْلَمْتُمْ ط فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ م بِالْعِبَادِ" (کہ تم بھی تابع ہوتے ہو؟ پھر اگر وہ تابع ہوئے، تو انہوں نے راہ پائی سیدھی اور اگر منہ پھیریں، تو تیرے ذمہ صرف پہنچا دینا ہے اور اللہ کی نگاہ میں ہیں بندے)

آگے اہل کتاب کے دونوں گروہ یہود و نصاریٰ کی اختراعات و مبتدعات کا ایک ساتھ ذکر کرتے ہوئے فرمایا: "اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ o وَيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ، فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ o اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَالَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ o اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ o ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا

اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۝ وَّغَرَّھُمْ فِیْ دِیْنِھِمْ مَّا کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ۝ فَکَیْفَ اِذَا جَمَعْنٰھُمْ لِیَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْہِ، وَوُفِّیَتْ کُلُّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ وَھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ۝ قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ " (جولوگ انکار کرتے ہیں، اللہ کے حکموں کا اور قتل کرتے ہیں پیغمبروں کو ناحق اور قتل کرتے ہیں ان کو، جو حکم کرتے ہیں انصاف کرنے کا، لوگوں میں سے، سو خوشخبری سنادے ان کو عذاب دردناک کی)۔ یہی ہیں جن کی محنت ضائع ہوئی دنیا میں اور آخرت میں اور کوئی نہیں ان کا مددگار، کیا نہ دیکھا تو نے ان لوگوں کو جن کو ملا کچھ ایک حصہ کتاب کا، ان کو بلاتے ہیں اللہ کی کتاب کی طرف، تاکہ وہ کتاب ان میں حکم کرے، پھر منہ پھیرتے ہیں بعضے ان میں سے تغافل کرکے، یہ اس واسطے کہ کہتے ہیں وہ: ہم کو ہرگز نہ لگے گی آگ دوزخ کی؛ مگر چند دن گنتی کے۔ اور بہکے ہیں اپنے دین میں اپنی بنائی باتوں پر، پھر کیا ہوگا حال جب ہم ان کو جمع کریں گے ایک دن کہ اس کے آنے میں شبہ نہیں اور پورا پاوے گا ہر کوئی اپنا کیا اور ان کی حق تلفی نہ ہوگی۔ تو کہہ یا اللہ مالک سلطنت کے۔ یعنی اپنے بندوں کی پرورش کرنے والے: اے وہ ذات جس کے سوا بندوں کے درمیان کوئی فیصلہ نہیں کرتا۔ "تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ ط وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ" (تو سلطنت دیوے جس کو چاہے اور سلطنت چھین لیوے جس سے چاہے اور عزت دیوے جس کو چاہے اور ذلیل کرے جس کو چاہے تیرے ہاتھ ہے سب خوبی)۔ یعنی تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ "اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝" (بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے) یعنی اپنے غلبے اور اپنی قدرت سے یہ کام کرسکنے والا تیرے سوا کوئی بھی نہیں۔ "تُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَتُوْلِجُ النَّھَارَ فِی الَّیْلِ وَتُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ" (تو داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرے دن کو رات میں اور تو نکالے زندہ مردہ سے اور نکالے مردہ زندہ سے اور تو رزق دے جس کو چاہے بے شمار) تیرے سوا کوئی ان امور پر قدرت نہیں رکھتا۔ صرف تو ہی یہ سب کچھ کرتا ہے، مطلب یہ ہے کہ میں نے عیسیٰ کو مردوں کو زندہ کرنے، بیماروں کو شفا دینے، مٹی سے پرندے پیدا کرنے اور غیبی امور کی خبر دینے کی قوت اس لیے عطا کردی تھی، تاکہ اس وجود کو (یعنی عیسیٰ کو) لوگوں کے لیے ایک نشانی بناؤں اور اس نبوت کی تصدیق ہو، جسے دے کر میں نے بنی اسرائیل کی طرف مبعوث کیا۔ مگر افسوس کہ انہی چیزوں کے سبب تم ان کے معبود ہونے کا دعوی کرنے لگے، (اس پر بھی تو غور کرو کہ) میرے قابو اور میری قدرت میں بہت کچھ ہے جو عیسیٰ کو نہیں دیا، مثلاً: بادشاہ بنانا، نبوت کا عہدہ دینا، دن میں رات کا اور رات میں دن کا داخل کرنا، مردہ سے زندہ کا اور زندہ سے مردہ کا نکالنا اور نیکوں یا بدوں میں سے جسے

چاہنا، بے حساب رزق دینا، غرض یہ تمام باتیں وہ ہیں جن پر میں نے عیسیٰ کو قدرت نہیں دی؛ لیکن تم نے ان حقائق سے کوئی عبرت حاصل نہ کی، اگر وہ معبود ہوتے تو یہ ان کے اختیار میں ہوتیں، حالانکہ تمہیں معلوم ہے کہ وہ مخالف طاقتوں سے بھاگ رہے تھے اور شہر بہ شہر، قریہ بہ قریہ منتقل ہو رہے تھے۔

پھر اہل ایمان کو نصیحت فرمائی اور انہیں ڈرایا، بعدازاں ارشاد فرمایا: "اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ" (اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی) یعنی اگر تمہارا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ تمہارے کام اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی عظمت کے اظہار کے لیے ہوتے ہیں "فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ" (تو میری راہ چلو، تا کہ محبت کرے تم سے اللہ اور بخشے گناہ تمہارے) یعنی تمہارے گذشتہ کفریہ اعمال "وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" (اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے) "قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ" (تو کہہ: حکم مانو اللہ کا اور رسول کا) کیوں کہ تم اسے جانتے ہو اور اپنی کتابوں میں اس کا تذکرہ پاتے ہو۔ "فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ" (پھر اگر اعراض کریں، تو اللہ کو محبت نہیں ہے کافروں سے)

اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کے حالات بیان فرمائے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کام کا ارادہ فرمایا، اس کا ظہور کیسے ہوا، چناں چہ ارشاد ہوا: "اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ ذُرِّيَّةً م بَعْضُهَا مِنْ م بَعْضٍ ۝ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (بیشک اللہ نے پسند کیا آدم کو اور نوح کو اور ابراہیم کے گھر کو اور عمران کے گھر کو سارے جہاں سے، جو اولاد تھے ایک دوسرے کی اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے)

پھر عمران کی بیوی اور اس کے قول کا ذکر ہوا: "اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا" (جب کہا عمران کی عورت نے، کہ اے رب! میں نے نذر کی تیرے، جو کچھ میرے پیٹ میں ہے، سب سے آزاد رکھ کر) یعنی میں نے اسے نذر کر دیا اور اللہ کی بندگی کے لیے اسے آزاد کر دیا، کہ اس سے کسی دنیوی کام میں استفادہ نہ کیا جائے: "فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى ط وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى" (سو تو مجھ سے قبول کر، بیشک تو ہی ہے سننے والا جاننے والا، پھر جب اس کو جنا تو بولی: اے رب! میں نے تو لڑکی جنی اور اللہ کو خوب معلوم ہے، جو کچھ اس نے جنا اور بیٹا نہ ہو جیسی وہ بیٹی) یعنی اس مقصد کے لیے جس کے لیے میں نے اسے آزاد کیا اور بطور نذر پیش کیا تھا (وہ لڑکے کے مثل خدمت بجا نہیں لا سکتی) "وَاِنِّيْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَاِنِّيْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" (اور میں نے اس کا نام رکھا مریم اور میں تیری پناہ میں دیتی ہوں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے) تو اس کے پروردگار نے کہا:

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا. (پھر قبول کیا اس کو اس کے رب نے، اچھی طرح کا قبول اور بڑھایا اس کو اچھی طرح بڑھانا اور سپرد کی زکریا کو) یعنی اس کے والد اور والدہ کے انتقال کے بعد۔ ابن ہشام فرماتے ہیں کہ "کفلها" کے معنی "ضمنها" کے ہیں، یعنی انھوں نے اسے اپنی ضمانت میں لے لیا۔ ابن اسحاق فرماتے ہیں کہ: پھر مریم اور زکریا کے احوال کو بیان کیا گیا۔ نیز زکریا نے جو دعا کی اور جو کچھ انھیں عطا ہوا، اس کا بھی ذکر ہوا کہ زکریا کو یحیٰ عطا کیے گئے۔ اس کے بعد مریم اور ان سے فرشتوں کی گفتگو کا ذکر یوں ہوا: "يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ○ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ○ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ" (اے مریم! اللہ نے تجھ کو پسند کیا اور ستھرا بنایا اور پسند کیا تجھ کو سب جہاں کی عورتوں پر۔ اے مریم! بندگی کر اپنے رب کی، سجدہ اور رکوع کر ساتھ رکوع کرنے والوں کے۔ یہ خبریں غیب کی ہیں جو ہم بھیجتے ہیں تجھ کو اور تو نہ تھا ان کے پاس) یعنی ان کے ساتھ نہ تھا "اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ" (جب ڈالنے لگے اپنے قلم کہ کون پرورش میں لے مریم کو) ابن ہشام نے لکھا کہ "اقلامهم" کے معنی "سهامهم" کے ہیں یعنی ان کے وہ تیر، جن کے ذریعہ انھوں نے مریم کے متعلق قرعہ اندازی کی، تو زکریا کا تیر نکلا اور زکریا نے مریم کو اپنی حفاظت میں لے لیا جیسا کہ حسن ابن ابی الحسن البصری کی رائے ہے۔

ابن اسحاق کی رائے ہے کہ: یہاں جس کفالت کا ذکر ہے یہ کفالت جریج راہب نے کی، جو بنی اسرائیل کا ایک بڑھئی تھا، مریم کو اپنے پاس رکھنے کا تیر اسی کے نام نکلا تھا اور وہی لے گیا، زکریاؑ نے اس سے پہلے ان کی نگرانی کی تھی۔ بنی اسرائیل میں سخت قحط پڑا، جس کی وجہ سے حضرت زکریاؑ مریم کو اپنے پاس رکھنے سے عاجز ہو گئے، تو قرعہ اندازی کی گئی کہ ان کی کفالت کون کرے، جریج راہب کا تیر، کفالت کے لئے نکلا اور اسی نے کفالت کی" وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ (اور تو نہ تھا ان کے پاس جب وہ جھگڑتے تھے) یعنی جب وہ لوگ مریم کی کفالت کے بارے میں جھگڑ رہے تھے، تو آپ ان کے پاس نہ تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ آپ کو ان باتوں کی خبر دے رہا ہے، جنھیں بنی اسرائیل چھپاتے ہیں؛ حالانکہ انھیں ان باتوں کا علم ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کے رسول پاک کی نبوت ثابت ہو جائے اور بنی اسرائیل پر حجت قائم ہو جائے۔

پھر فرمایا: "اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ" (جب کہا فرشتوں نے: اے مریم! اللہ تجھ کو بشارت دیتا ہے، ایک اپنے حکم کی جس کا نام

مسیح ہے، عیسیٰ مریم کا بیٹا) یعنی ان کے حقیقی واقعات یہ تھے، نہ کہ وہ جو تم کہتے ہو۔ " وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (مرتبہ والا دنیا اور آخرت میں) یعنی اللہ کے پاس: " وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ○ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِينَ ○ " (اور اللہ کے مقربوں میں۔ اور باتیں کریگا لوگوں سے جب کہ ماں کی گود میں ہوگا اور جب کہ پوری عمر کا ہوگا اور نیک بختوں میں ہے) گویا اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو عیسیٰؑ کے ان حالات کی خبر دے رہا ہے، جو آپ کی عمر کے تغیرات میں واقع ہوتے رہے، جس طرح بنی آدم کے حالات ان کی کم سنی اور بڑھاپے کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو گہوارے میں کلام کرنے کی خصوصیت مرحمت فرمائی تھی کہ یہ چیز آپ کی نبوت کے لئے ایک علامت ہو اور خدا کی قدرت کا ایک کرشمہ: " قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ " ۔ (بولی: اے رب! کہاں سے ہوگا میرے لڑکا اور مجھ کو ہاتھ نہیں لگایا کسی آدمی نے، فرمایا: اسی طرح اللہ پیدا کرتا ہے، جو چاہے) یعنی وہ جو چاہتا ہے، بنا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے، پیدا کر دیتا ہے، بشر ہو یا غیر بشر: " اِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ " (جب ارادہ کرتا ہے کسی کام کا، تو یہی کہتا ہے اس کو کہ: ہو جا، سو وہ ہو جاتا ہے) اور جیسی وہ چاہتا ہے ویسی ہی ہو جاتی ہے۔

پھر مریمؑ کو اس بات کی خبر دی کہ عیسیٰ کی پیدائش سے اس کا کیا ارادہ ہے؛ چناں چہ فرمایا: " وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ " (اور سکھاوے گا اس کو کتاب اور تہہ کی باتیں اور توریت) جو کہ بنی اسرائیل میں آپ سے پہلے حضرت موسیٰؑ ہی کے زمانے سے موجود تھی " وَالْاِنْجِيْلَ " (اور انجیل) یہ ایک دوسری نئی کتاب ہے، جو اللہ عزوجل نے آپؑ کو، نئی عنایت فرمائی، توریت میں بجز اس کے کہ موسیٰؑ کے بعد ایک نبی ہونے والا ہے، کسی اور کا تذکرہ نہ تھا۔ " وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ " (اور کرے گا اس کو پیغمبر بنی اسرائیل کی طرف۔ بیشک میں آیا ہوں تمہارے پاس نشانیاں لے کر تمہارے رب کی طرف سے) ایسی نشانی جس سے میری نبوت ثابت ہو اور میں اس کی جانب سے تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ " اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ " (کہ میں بنا دیتا ہوں تمہارے لئے گارے سے پرندہ کی شکل، پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو ہو جاتا ہے وہ اڑتا جانور۔ (اس) اللہ کے حکم سے) جس نے مجھے تمہاری طرف بھیجا ہے، جو میرا اور تمہارا دونوں کا پروردگار ہے " وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ " (اور اچھا کرتا ہوں مادرزاد اندھے کو اور کوڑھی کو)

ابن ہشام لکھتے ہیں کہ: " اکمہ " مادرزاد اندھے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ مشہور شاعر رؤبہ بن عجاج کہتا ہے:۔

هرجت فارتدار تداد الاكمه

''میں نے اسے ڈرایا تو وہ مادرزاد اندھے شخص کی طرح واپس ہو گیا''۔

''ھرجت'' کے معنی ہیں ''صحت بالاسد وجلبت علیه ''(یعنی میں نے شیر کو ڈرایا اور اس کے سامنے شور کیا)'' اکمه'' کی جمع ''کمهٌ'' آتی ہے۔انتہی۔

'' وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاُنَبِّئُکُمْ بِمَا تَاْکُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِیْ بُیُوْتِکُمْ ط اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لَّکُمْ ''(اور جلاتا ہوں مردے اللہ کے حکم سے اور بتا دیتا ہوں تم کو جو کھا کر آؤ اور جو رکھ آؤ اپنے گھر میں، اس میں نشانی پوری ہے تم کو) اس بات کی کہ میں تمہاری طرف اللہ کی جانب سے بھیجا ہوا ہوں: '' اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ o وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰاةِ ''(اگر تم یقین رکھتے ہو اور سچا بتاتا ہوں اپنے سے پہلی کتاب کو جو توریت ہے)یعنی پہلے آچکی ہے۔'' وَلِاُحِلَّ لَکُمْ بَعْضَ الَّذِیْ حُرِّمَ عَلَیْکُمْ ''(اور اس واسطے کہ حلال کر دوں تمہارے لئے بعضی وہ چیزیں جو حرام تھیں تم پر) یعنی یہ بتا دوں کہ وہ چیزیں تم پر حرام تھیں جس کی وجہ سے تم نے انھیں چھوڑ دیا تھا، اب بوجھ ہلکا کرنے کے لئے حلال کر دیا گیا ہے، تاکہ سہولت ہو اور تم دشواری سے نکل جاؤ۔ '' وَجِئْتُکُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ o اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ ''(اور آیا ہوں تمہارے پاس نشانی لے کر، تمہارے رب کی، سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو۔ بیشک اللہ ہے رب میرا اور رب تمہارا) آپ نے یہ بات اس لیے فرمائی تاکہ جو کچھ وہ کہہ رہے تھے کہ: آپ خدا، یا خدا کے بیٹے ہیں اس سے برأت ظاہر ہو جائے اور ان پر حجت قائم ہو جائے۔

'' فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ '' (سو اس کی بندگی کرو، یہی راہ سیدھی ہے) یعنی یہی وہ سیدھی راہ ہے، جس پر چلنے کے لئے میں نے تمہیں متوجہ کیا اور یہی ہدایت لیکر میں آیا ہوں۔'' فَلَمَّا اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْکُفْرَ '' (پھر جب معلوم کیا عیسیٰ نے بنی اسرائیل کا کفر) اور اپنے متعلق ان کے غلط منصوبے تو فرمایا:''مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰهِ ط قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ج اٰمَنَّا بِاللّٰهِ '' (کون ہے کہ میری مدد کرے، اللہ کی راہ میں؛ کہا حواریوں نے: ہم ہیں مدد کرنے والے اللہ کے، ہم یقین لائے اللہ پر) ان کا یہ قول ایسا تھا کہ اس کے سبب انھوں نے پروردگار کے یہاں فضیلت حاصل کی۔'' وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (اور تو گواہ رہ کہ ہم نے حکم قبول کیا) ان لوگوں کی روش ایسی نہ تھی جیسی ان حجت کرنے والوں کی تھی، بلکہ یہ کہتے تھے اور ان کا ایمان بھی یہی تھا:'' رَبَّنَا اٰمَنَّا بِمَا اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاکْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِیْنَ '' (اے رب! ہم نے یقین کیا اس چیز کا جو تو نے اتاری اور ہم تابع ہوئے رسول کے، سو تو لکھ لے

ہم کو ماننے والوں میں) پھر جب یہود عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے درپے ہوئے تو آپکے رفع کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا" وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ط وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ " (۱) (اور مکر کیا ان کافروں نے اور مکر کیا اللہ نے اور اللہ کا داؤ سب سے بہتر ہے) پھر بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے کیسے آپ کو اٹھا کر ان یہود سے پاک کیا اور انکے اس اقرار کا رد فرمایا کہ: وہ عیسیٰؑ کو سولی دے چکے ہیں، چناں چہ ارشاد ہوا: " اِذْقَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰىٓ اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا " (جس وقت کہا اللہ نے اے عیسیٰ! میں لے لوں گا تجھ کو اور اٹھا لوں گا اپنی طرف اور پاک کردونگا تجھ کو کافروں سے) جب کہ ارادہ کیا آپ کے قتل کا: "وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ " (اور رکھوں گا ان کو جو تیرے تابع ہیں، غالب ان لوگوں سے جو انکار کرتے ہیں قیامت کے دن کا) پھر پورے قصے کو بیان کرتے ہوئے آخر میں فرمایا: " ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ " (یہ پڑھ سناتے ہیں ہم تجھ کو آیتیں اور بیان تحقیقی) یعنی عیسیٰؑ اور ان کے حالات میں جو اختلافات ان لوگوں نے کئے، ان میں یہ قطعی اور فیصلہ کن بات ہے، جس میں باطل کی ذرا بھی آمیزش نہیں، اس لئے اس کے سوا کسی خبر کو قبول نہ کیا جائے:"اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ط خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ٥ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ " (بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک جیسے مثال آدم کی، بنایا اس کو مٹی سے، پھر کہا اس کو کہ: ہوجا، وہ ہوگیا۔ حق وہ ہے جو تیرا رب کہے) عیسیٰؑ کے واقعات کے بارے میں " فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ " (پھر تو مت رہ شک لانے والوں میں سے) یعنی آپ کے پروردگار کی جانب سے صحیح واقعہ بتلا دیا گیا، پس آپ اس سلسلے میں بالکل شک وشبہ نہ کیجئے، اگر چہ وہ کہتے ہیں کہ عیسیٰ بغیر مرد کے پیدا ہوئے (یہ کون سی تعجب کی بات ہے، بلکہ اس سے پہلے تو) میں نے اسی قدرت کے ذریعے آدم کو بغیر مرد وعورت، فقط مٹی سے پیدا کیا اور وہ بھی عیسیٰ ہی کی طرح گوشت، خون، بال اور کھال سے مرکب تھے، عیسیٰ کی پیدائش مرد کے بغیر اس سے زیادہ عجیب نہیں۔"فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ط فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَةَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ " (پھر جو کوئی جھگڑا کرے تجھ سے اس قصہ میں بعد اس کے کہ آچکی تیرے پاس خبر سچی تو، تو کہہ دے: آؤ بلاویں ہم اپنے بیٹے اور تمہارے بیٹے اور اپنی عورتیں اور تمہاری عورتیں اور اپنی جان اور تمہاری جان؛ پھر التجا

(۱) تفسیر عثمانی میں ہے کہ مکر کہتے ہیں لطیف اور خفیہ تدبیر کو۔ اگر وہ اچھے مقصد کے لئے ہو، اچھا ہے اور برائی کے لئے ہو، تو برا ہے، اسی لئے " ولا يحيق المكر السيئ " میں "مکر" کے ساتھ " سیئ " کی قید لگائی گئی اور یہاں خدا کو " خير الماكرين " کہا۔ (محمد صغیر)

کریں ہم سب اور لعنت کریں اللہ کی ان پر جو جھوٹے ہیں)
ابن ہشام کہتے ہیں کہ "نَبْتَهِلْ" کے معنی "نـدعوا باللعنة" لعنت بھیجنا، لعنت کی دعا کرنا ہیں،
چناں چہ قبیلہ بنو قیس بن ثعلبہ کا شاعر اعشٰی اپنے ایک قصیدے میں کہتا ہے:

لا تـقـعـدن وقـد اکـلتهـا حطبـاً ☆ تـعـوذ مـن شـرّهـا یـومـاً وتبتهل

جب لکڑی ڈال کر تو نے اسے تیز تر کر دیا، تو اب اس کے پاس مت بیٹھ، ایک روز اس کے شر سے پناہ مانگتا اور لعنت کی دعا کرتا ہے۔

"نَبْتَهِلْ" بہ معنی "نَدْعُوْا بِا للَّعْنَةِ" ہے، اہل عرب جب کسی پر لعنت بھیجتے ہیں تو" بهل الله فلاناً "یا" علیه بهلة الله " کہتے ہیں، ابن ہشام لکھتے ہیں کہ:" نبتهل " کے معنی رو رو کر دعا کرنے کے بھی ہیں

آگے ارشاد باری ہے " اِنَّ هٰذا " (بیشک یہی ہے) یعنی جو خبریں عیسیٰؑ کے متعلق لایا ہوں "لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ" (بیان سچا) اس بارے میں " وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ط وَاِنَّ اللّٰـهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ o فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ م بِالْمُفْسِدِيْنَ o قُلْ يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئاً وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً اَرْبَاباً مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ط فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوْا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ o" (اور کسی کی بندگی نہیں ہے سوا اللہ کے، اور اللہ جو ہے وہی ہے زبردست حکمت والا۔ پھر اگر قبول نہ کریں، تو اللہ کو معلوم ہیں فساد کرنے والے۔ تو کہہ: اے اہل کتاب! آؤ ایک بات کی طرف، جو برابر ہے ہم میں اور تم میں، کہ بندگی نہ کریں ہم، مگر اللہ کی اور شریک نہ ٹھہراویں اس کا کسی کو اور نہ بناوے کوئی کسی کو رب سوا اللہ کے۔ پھر اگر وہ قبول نہ کریں، تو کہہ دو: گواہ رہو کہ ہم تو حکم کے تابع ہیں) پس آپ نے انھیں انصاف کی ایک بات کی جانب دعوت دی اور لاجواب کر دیا۔

وفد نجران کی صلح

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اللہ تعالی کی طرف سے یہ خبر آئی اور آپ کے اور ان کے درمیان جھگڑے کا فیصلہ پہنچ گیا؛ لیکن وہ آپ کے بیان کردہ حقائق کی تردید ہی کرتے رہے، تو مباہلے کا حکم دیا گیا، چناں چہ آپ نے مباہلے کی دعوت دی، اب وہ گھبرائے اور بولے: اے ابوالقاسم! آپ نے جو دعوت دی ہے، اس میں ہمیں غور و فکر کا موقع دیں؛ کہ ہم مشورہ کرلیں، پھر آپ کے پاس آئیں، چناں چہ ان لوگوں نے "عاقب" سے جو کہ ذی رائے تھا، تنہائی میں گفتگو کی، اس سے پوچھا کہ عبد المسیح! تیری کیا رائے

ہے؟ بولا یقیناً تم جانتے ہو کہ محمد (ﷺ) واقعی اللہ کا رسول ہے اور یہ بھی جانتے ہو کہ جس قوم نے بھی اپنے نبی سے مباہلہ کیا تو ان میں کا کوئی بڑا، بوڑھا، باقی رہا ہو اور کم سن پھلے پھولے ہوں؟ اس لئے سن لو! اگر تم نے مباہلہ کیا تو تمہاری جڑیں اکھاڑ دی جائیں گی، اگر تمہیں اپنے دین کی محبت کے سوا دوسری کسی بات سے انکار ہو اور جو کچھ کہہ چکے ہو، اسی پر جمے رہنا چاہتے ہو، تو اس پیغمبر سے صلح کرلو اور اپنے وطن واپس چلو؛ چناں چہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے: ابوالقاسم! ہمیں یہی مناسب معلوم ہوا کہ آپ سے مباہلہ نہ کریں اور آپ کو آپ کے دین پر چھوڑ دیں اور ہم اپنے دین پر رہیں، البتہ آپ اپنے اصحاب میں سے کسی کو ہمارے ساتھ بھیج دیں، کہ وہ ہمارے مختلف فیہ مسائل میں فیصلہ کرے۔

محمد بن جعفر فرماتے ہیں کہ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" ائتونی العشیة ابعث معکم القوی الامین" (تم لوگ شام میں میرے پاس آؤ، میں انتہائی امانت دار کو تمہارے ساتھ بھیج دوں گا) راوی حدیث فرماتے ہیں کہ عمرؓ بن خطاب کہتے تھے کہ اس دن امیر بننے کی خواہش مجھے ہوئی۔ اس امید پر کہ شاید آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مجھے امیر منتخب کردیں، ظہر کے وقت مسجد میں جلدی پہنچ گیا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھا چکے تو اپنی دائیں اور بائیں جانب دیکھا؛ حالانکہ میں آپ کے سامنے تھا مگر آپ کی نظر ابوعبیدہؓ بن الجراح پر پڑی، انھیں بلا کر فرمایا:

"اخرج معهم فا قض بينهم با الحق فيما اختلفو ا فيه"

"ان لوگوں کے ساتھ جاؤ اور ان کے اختلافی معاملوں میں حق کے مطابق فیصلہ کرو"

اس طرح امارت ابوعبیدہؓ کے حصے میں آئی۔

مفسرین متفق ہیں کہ اس سورت کی ابتدائی تقریباً اسی ۸۰ آیتوں کا شان نزول، وفد نجران کا واقعہ ہے، نیز محدثین اور علمائے تاریخ وسیر کی بھی یہی رائے ہے، ان آیات کے مضامین سے واضح ہے کہ حضرت عیسیٰؑ بغیر باپ کے پیدا کئے گئے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالی نے عیسیٰؑ کی پیدائش کے واقعات کو جس تفصیل سے بیان کیا ہے، اس انداز سے کسی اور کا بیان نہیں کیا۔ آپ کی والدہ محترمہ کے دردزہ کو بھی ذکر کیا اور یہ کہ آپ اپنے ظاہری جسم کے ساتھ آسمان پر اٹھائے گئے۔ ابن اسحاق کی عبارتوں کو خوب اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ایک آیت دوسری آیت سے کس طرح مربوط ہے اور یہ کہ ان سب کے نزول کا مقصد ایک ہی ہے۔

یہاں تک کہ اللہ رب العزت نے فرمایا" وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ط وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ".

پھر اس بات کی خبر دی کہ اللہ تعالی نے آپؑ کو کیسے آسمان پر اٹھایا اور کفار سے پاک کیا، نیز یہود

کے اس دعوے کی تردید بھی فرمائی کہ انھوں نے آپ کو سولی دی ہے؛ چناں چہ جب یہود نے آپ کے قتل کا ارادہ کیا تو اللہ رب العزت نے فرمایا:

"یٰعِیسیٰ اِنِّی مُتَوَفِّیکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَهِّرُکَ مِنَ الَّذِینَ کَفَرُوا وَجَاعِلُ الَّذِینَ اتَّبَعُوکَ فَوقَ الَّذِینَ کَفَرُوا اِلیٰ یَومِ الْقِیٰمَةِ"

"اے عیسیٰ! میں لے لوں گا تجھ کو اور اٹھالوں گا اپنی طرف اور پاک کردوں گا تجھ کو کافروں سے اور رکھوں گا ان کو جو تیرے تابع ہیں، غالب ان لوگوں سے جو انکار کرتے ہیں قیامت کے دن تک"

یہ جملہ ہمارے مقصود کے بالکل موافق ہے، اس میں تصریح ہے کہ یہ آیات عیسائیوں کی اصلاح اور یہود کے تئیں حضرت عیسیٰؑ کو سولی دیے جانے کے تعلق سے ان کے اقرار واعتراف کی تردید کے لیے وارد ہوئیں؛ لہٰذا ان آیات کا مقصد سب سے پہلے عیسائیوں کی اصلاح، انھیں صحیح بات سنانا اور یہود کی تلبیس کو ختم کرنا ہے۔ جہاں تک یہود کی تردید کا تعلق ہے تو وہ یہاں مقصود نہیں، یا یوں کہا جائے کہ: اس میں انکے دعوے کی تردید ہے، خصوصا جب یہ بات ملحوظ ہو کہ یہ ارشاد اس وقت ہوا ہے جب حضرت عیسیٰؑ کا تذکرہ یہود کے مقابلے میں آیا۔ خذلھم اللّٰه تعالی.

علاوہ ازیں ابن اسحاق نے آیت میثاق کو اسی ذیل میں داخل کیا ہے، جیسا کہ "درمنثور" (۲/۱۷) میں ارشاد باری: "یَا اَهلَ الْکِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّونَ" کی تفسیر کے تحت ہے کہ ابن اسحاق، ابن جریر اور بیہقی نے دلائل میں؛ ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ نجران کے نصاری اور احبار یہود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر بحث ومباحثہ کرنے لگے۔ احبار یہود کہتے تھے کہ: ابراہیمؑ یہودی تھے اور نصاری کا دعوی تھا کہ: نصرانی تھے، اس پر اللہ تبارک تعالی نے فیصلہ کرتے ہوئے فرمایا:

"یٰۤاَهلَ الْکِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّونَ فِیۤ اِبرٰهِیمَ وَمَاۤ اُنزِلَتِ التَّورٰاةُ وَالاِنجِیلُ اِلَّا مِنۢ بَعدِهٖ اَفَلَا تَعقِلُونَ ٥ هٰۤاَنتُم هٰۤؤُلَآءِ حَاجَجتُم فِیمَا لَکُم بِهٖ عِلمٌ فَلِمَ تُحَآجُّونَ فِیمَا لَیسَ لَکُم بِهٖ عِلمٌ وَاللّٰهُ یَعلَمُ وَاَنتُم لَا تَعلَمُونَ ٥ مَا کَانَ اِبرٰهِیمُ یَهُودِیًّا وَّلَا نَصرَانِیًّا وَّلٰکِن کَانَ حَنِیفًا مُّسلِمًا ط وَمَا کَانَ مِنَ الْمُشرِکِینَ ٥ اِنَّ اَولَی النَّاسِ بِاِبرٰهِیمَ لَلَّذِینَ اتَّبَعُوهُ وَهٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِینَ اٰمَنُوا وَاللّٰهُ وَلِیُّ الْمُؤمِنِینَ ٥" (آل عمران: ۶۵۔ ۶۸)

"اے اہل کتاب! کیوں جھگڑتے ہو ابراہیم کی بابت؟ توریت اور انجیل تو اتریں اس کے بعد، کیا تم کو عقل نہیں، تم لوگ جھگڑ چکے جس بات میں، تم کو کچھ خبر تھی، اب کیوں جھگڑتے ہو ایسی بات میں جس کی تم کو

کچھ خبر نہیں؟ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے، نہ تھا ابراہیم یہودی اور نہ نصرانی، بلکہ حنیف تھا، یعنی سب جھوٹے مذہبوں سے بیزار اور حکم بردار اور نہ تھا مشرک۔ لوگوں میں زیادہ مناسبت ابراہیم سے ان کو تھی جو ساتھ اسکے تھے اور اس نبی کو اور جو ایمان لائے اس نبی پر اور اللہ والی ہے مسلمانوں کا"۔

ابورافع قرظی نے کہا: اے محمد! ﷺ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم تمہاری اسی طرح پرستش کرنے لگیں، جیسے نصاریٰ عیسیٰ بن مریم کو معبود بنائے ہوئے ہیں؟ وفد میں شامل اہل نجران میں سے ایک اور نے بھی یہی بات کہی، تو آپ ﷺ نے فرمایا: معاذ اللہ! ہم غیر اللہ کی بندگی کریں، یا دوسروں کو اس کی دعوت دیں، حق تعالیٰ نے ہم کو اس کام کے لئے نہیں بھیجا اور نہ اس کا حکم دیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

"مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ط اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ (آل عمران: ۷۹، ۸۰)

"کسی بشر کا کام نہیں کہ اللہ اسکو دیوے کتاب اور حکمت اور پیغمبر کرے، پھر وہ کہے لوگوں کو کہ: تم میرے بندے ہو جاؤ اللہ کو چھوڑ کر۔ لیکن یوں کہے کہ: تم اللہ والے ہو جاؤ۔ جیسے کہ تم سکھلاتے تھے کتاب اور جیسے کہ تم آپ بھی پڑھتے تھے اسے۔ اور نہ یہ کہے تم کو کہ ٹھہرالو فرشتوں کو اور نبیوں کو رب، کیا تم کو کفر سکھائے گا بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو چکے ہو"۔

اس کے بعد اس عہد کو ذکر کیا جو ان سے اور ان کے آباء واجداد سے لیا گیا تھا کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد پر آپ کی تصدیق کریں گے اور اپنے اوپر اس کا اقرار کریں گے، چناں چہ ارشاد فرمایا:

"وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ط قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ط قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ط قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ (آل عمران: ۸۱)

"اور جب لیا اللہ نے عہد نبیوں سے کہ جو کچھ میں نے تم کو دیا کتاب اور علم، پھر آوے تمہارے پاس کوئی رسول کہ سچا بتاوے تمہارے پاس والی کتاب کو، تو اس رسول پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے۔ فرمایا کہ: کیا تم نے اقرار کیا اور اس شرط پر میرا عہد قبول کیا؟ بولے: ہم نے اقرار کیا، فرمایا تو اب گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں"۔

علاوہ ازیں سیوطی نے ''درمنثور'' میں اس سورت کی ابتداء میں، سبب نزول کی بابت جو کچھ ذکر کیا ہے، اس پر بھی نظر رکھنا ضروری ہے، نیز ربیعؒ کی اس مرسل پر بھی غور کرنا ضروری ہے جو میرے نزدیک شان نزول کے سلسلے میں سیاق سورت کے زیادہ مناسب ہے؛ چناں چہ ''درمنثور'' میں ہے کہ ابن جریر اور ابن ابی حاتم ربیعؒ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا:

"ان النصارى اتوا رسول الله صلى الله عليه وسلم، فخاصموه فى عيسىٰ بن مريم وقالوا له : من ابوه ؛ وقالوا على الله الكذب البهتان فقال لهم النبى صلى الله عليه وسلم. الستم تعلمون انه لا يكون ولد الّا وهو يشبه اباه، قالو : بلى، قال : الستم تعلمون ان ربنا حىّ لا يموت، وان عيسىٰ ياتى عليه الفناء ؟ قالوا بلى، قال : الستم تعلمون ان ربنا قيمٌ على كل شىء يكلؤه ويحفظه ويرزقه ؟ قالوا : بلى، قال : فهل يملك عيسىٰ من ذلك شيئا؟ قالوا: لا، قال : افلستم تعلمون ان الله لا يخفى عليه شيئ فى الارض و لا فى السماء ؟ قالو : بلى، قال : فهل يعلم عيسىٰ من ذلك شيئاً الا ماعلم ؟ قالو : لا، قال :فان ربنا صور عيسىٰ (عليه السلام) فى الرحم كيف يشاء ، الستم تعلمون ان ربنا لاياكل الطعام، ولا يشرب الشراب. ولا يحدث الحدث ؟ قالوا : بلى، قال الستم تعلمون ان عيسىٰ حملته امهُ كما تحمل المراة ثم وضعته كما تضع المراة ولدها، ثم غذى كما تغذىّ المراة الصبى ثم كان يا كل الطعام، ويشرب الشراب، ويحدث الحدث؟ قالوا بلى ، قال :فكيف يكون هذا الها كما زعمتم ؟ فعرفوا ثم ابو الا الجحود. فانزل الله– (در منثور: ٢/٣)

''نبی ﷺ کے پاس نصاری آئے اور عیسیٰؑ کی بابت بحث مباحثہ کرتے ہوئے کہا: حضرت عیسیٰؑ کا باپ کون تھا؟ اور اللہ تعالی پر جھوٹا الزام و بہتان تراشی کرنے لگے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خطاب کر کے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ ہر بچہ اپنے باپ کے مشابہ (یعنی اس کا ہم جنس) ہوتا ہے (چناں چہ انسان کا بیٹا، انسان، حیوان کا بیٹا، حیوان اور جن کا بیٹا جن ہوتا ہے، لہٰذا اگر نعوذ باللہ، عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا مانا جائے، تو لازم آئے گا کہ عیسیٰؑ بھی خدا ہوں اور یہ ممکن نہیں، اس لئے کہ خدا کے لئے فنا نہیں اور عیسیٰؑ پر فنا آنے والی ہے، لہٰذا وہ خدا کے بیٹے نہیں ہو سکتے) انھوں نے اقرار کہ بیشک ہم جنس ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارا رب زندہ ہے، اسے کبھی موت نہیں آئے گی اور عیسیٰؑ پر فنا آنے والی ہے؟ انھوں نے کہا:

بیشک ہمیں معلوم ہے۔آپ نے فرمایا: کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارا رب ہر چیز کا نگہبان ہے، ہر چیز کو کھلاتا پلاتا اور روزی دیتا ہے، ہر چیز کی حفاظت کرتا ہے؟ انھوں نے کہا: بیشک، آپ نے فرمایا: کیا عیسیٰؑ ان میں سے کسی چیز کے مالک تھے؟ انھوں نے کہا: نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہیں معلوم نہیں کہ زمین وآسمان کی کوئی بھی چیز اللہ تعالی سے پوشیدہ نہیں؟ انھوں نے کہا: بیشک۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا عیسیٰؑ کو ان میں سے کسی چیز کا علم ہے، علاوہ ان چیزوں کے جو ان کو بتلائی گئیں؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہمارے رب نے عیسیٰؑ کو رحم مادر میں جس طرح چاہا بنایا، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہمارا رب نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے اور نہ اس کو حدث لاحق ہوتا ہے؟ انھوں نے کہا: بیشک؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہیں معلوم نہیں کہ: عیسیٰؑ کی والدہ کو حمل اسی طرح تھا، جیسا عورتوں کو ہوتا ہے، پھر ان کو جنا، جس طرح عورت اپنے بچے کو جنتی ہے، پھر دودھ پلایا، جس طرح عورت بچے کو پلاتی ہے، آپ دودھ چھوڑنے کے بعد کھانے پینے لگے، آپؑ کو پیشاب، پاخانے کی حاجت ہوتی؟ انہوں نے کہا: بیشک، آپ نے فرمایا: پھر کیوں کر عیسیٰؑ معبود ہوسکتے ہیں جیسا کہ تمہارا خیال (باطل) ہے؟ چناں چہ وہ لوگ اچھی طرح پہچان گئے (کہ عیسیٰؑ اللہ کے رسول ہیں، نہ کہ معبود وخالق) لیکن شرکشی کی وجہ سے بات، تسلیم کرنے سے انکار کردیا، (اسی کی بابت) اللہ تعالی نے فرمایا:

الٓمّٓ ٥ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ.

یہاں آپ ﷺ کے ارشاد: الستم تعلمون ان ربنا حی لا یموت، وأن عیسیٰؑ یاتی علیه الفناء؟ قالوا بلی، (کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارا رب زندہ ہے، اسے کبھی موت نہیں آئے گی اور عیسیٰؑ پر فنا آنے والی ہے؟ انھوں نے کہا، بیشک ہمیں معلوم ہے) کو ذہن نشین رکھنا ضروری ہے، اس لئے کہ اس میں آپ نے بصیغۂ استقبال ذکر فرمایا ہے کہ آپؑ پر ابھی فنا (موت) نہیں آئی ہے، بلکہ مستقبل میں آئے گی۔

الحاصل یہ مرسل روایت اس بات کو واضح کرتی ہے کہ ارشاد باری: "مُتَــــوَفِّیْکَ" کے معنی "استیفاء عمر" ہیں، یعنی آپ اپنی مدت عمر پوری کریں گے اس سے پہلے آپ کو موت نہیں آئے گی نیز حافظ ابن کثیر نے، تفسیر سورہ ال عمران میں، ابن ابی حاتم کے حوالے سے حضرت حسن کا ایک اثر نقل کیا ہے۔چناں چہ لکھتے ہیں::قال ابن ابی حاتم : حدثنا ابی، حدثنا احمد بن عبد الرحمن، حدثنا عبد اللہ بن ابی جعفر، عن ابیه، حد ثنا الربیع بن انس، عن الحسن ....الخ۔اس کے بعد حسن کا ایک اثر نقل کیا، پھر لکھا:

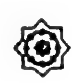
"قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم للیهود: ان عیسیٰؑ لم یمت، وانه راجع

الیکم قبل یوم القیمة"(ابن کثیر : ۱/۳۴۶، آل عمران:۵۵)

''حسن کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے فرمایا کہ: عیسیٰ مرے نہیں ہیں؛ بلکہ قیامت سے پہلے دنیا میں واپس آئیں گے''۔

ابن کثیر نے اسی روایت کو سورہ نساء میں دوسرے طریق سے موقوفاً بھی ذکر کیا ہے۔ الحاصل یہ روایت حضرت حسن سے موقوفاً و مرفوعاً دونوں طرح مروی ہے، علاوہ ازیں ابن جریر نے بھی اس روایت کو حضرت حسن ہی سے مرفوعاً نقل کیا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ آپؐ کا ارشاد " ان عیسیٰؑ یاتی علیه الفناء" امر واقع کا بیان ہو، نہ کہ ارشاد باری" انی متوفیک "کی تفسیر۔ واللہ الموفق.

جب آیت کریمہ کے ربط اور ان کے مقاصد کو، ابن اسحاق اور شاہ عبدالقادرؒ کے کلام کی روشنی میں، آپ سمجھ گئے اور ان کا شان نزول ذہن نشین ہوگیا، تو اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان آیتوں پر الگ الگ تفصیلی بحث کی جائے، تا کہ مسئلہ بالکل منقح ہو کر سامنے آجائے۔

آیت آل عمران

''وَمَکَرُوْا وَمَکَرَاللّٰہُ ط وَاللّٰہُ خَیْرُالْمٰکِرِیْنَ ○''

اور مسئلہ زیر بحث

آیت کریمہ ''وَمَکَرُوْا'' کا مطلب یہ ہے کہ: یہود نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے، آپ کی شریعت کو ختم کرنے اور آپ کے پیروکاروں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے، نیز آپ کو گوشۂ گمنامی میں ڈال نے کے لئے حیلہ اور مکر سے کام لیا، جیسا کہ اس پر، ان کے خلاف اپنی تدبیر کی بابت، ارشاد باری: ''اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ'' دلالت کر رہا ہے۔ قول باری: ''وَمَکَرَاللّٰہُ(۱)'' اس ذیل میں اصل الاصول ہے، جو اس پر دلالت کر رہا ہے کہ اللہ تعالی نے آپ کی نجات، دشمنوں سے گلوخلاصی، نیز آپ کے پیروکاروں کو منکرین پر غالبکرنے کے لیے ایسی خفیہ تدبیر کی، جو عقل وفہم سے بالاتر تھی، جس کی وجہ سے دشمن اپنے مکر میں پھنس گئے اور خود منہ کی کھائی؛ چناں چہ ان کفار کے عیسیٰ علیہ السلام کو پکڑنے وقید کرنے کی تدبیر کے مقابلے میں اللہ تعالی کی تدبیر ''توفی وتسلم'' ہے، ان کے ارادۂ قتل کے مقابلے میں ''رفع الی السماء'' ہے، ان کے درمیان باقی رہنے، ان کے اشتباہ میں پڑجانے، نیز اذیت دینے کے مقابلے میں ''تطھیر'' ہے جب کہ گوشۂ گمنامی میں ڈال دینے، پیروکاروں کو مٹادینے کے مقابلے میں، متبعین کا منکرین پر غالب وفائق ہونا ہے۔

بدبخت قادیانی کی طرح یہ نہیں کہا جاسکتا کہ دشمن آپ پر مسلط ہوئے اور نعوذ باللہ طرح طرح سے اہانت کی، یہاں تک کہ سولی پر چڑھادیا، جس کی وجہ سے آپ پر ایسی بے ہوشی طاری ہوئی کہ بے حس وحرکت

---

(۱) لغت عرب میں ''مکر'' کے معنی خفیہ تدبیر اور دھوکا کرنے کے ہیں۔ علم معانی کے قاعدہ ''مشاکلہ'' کے مطابق، جب کوئی شخص کسی کے جواب یا دفاع میں خفیہ تدبیر کرتا ہے، تو وہ اخلاق اور مذہب کی نگاہ میں کتنی ہی عمدہ تدبیر کیوں نہ ہو، اس کو بھی ''مکر'' ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے، جیسا کہ ہر زبان کے محاورہ میں بولا جاتا ہے ''برائی کا بدلہ برائی ہے'' حالاں کہ ہر شخص سمجھتا ہے کہ اگر کوئی کسی کے خلاف بدسلوکی کرے، تو اس کے ساتھ بھی اس معیار کی بدسلوکی اخلاق اور مذہب دونوں کی نگاہ میں ''برائی'' نہیں ہے، تاہم تعبیر میں دونوں کو ایک ہی انداز میں لکھا اور بولا جاتا ہے۔ اسی کو ''مشاکلہ'' کہتے ہیں اور یہ فصاحت وبلاغت کا اہم جز سمجھا جاتا ہے۔ (قصص القرآن: ۹۹/۴) (محمد صغیر)

مثل مردہ ہو گئے (اور وہ آپ کو مردہ سمجھ کر چھوڑ کر چلے گئے) چوں کہ آپ کی وفات نہیں ہوئی تھی، (اس لیے علاج و معالجہ کے بعد جب آپ کی طبیعت ٹھیک ہو گئی تو) سیر و تفریح کے لیے نکل گئے اور تقریباً ستاسی ۸۷ سال بہ قید حیات رہے، یہاں تک کہ کشمیر میں آکر وفات پائی، (بہ زعم خویش دشمنوں کی شازشوں کے خلاف، حضرت عیسیٰ کو بچانے کے لیے اللہ تعالی کی جانب سے یہ خفیہ تدبیر الٰہی اور صنعت لطیف تھی۔ (انتھی)

مردود قادیانی کی مذکورہ بات بالکل غلط ہے، بلکہ حضرت عیسیٰ کو بچانے کے لیے بالکل ایسی ہی تدبیر ہوئی تھی جیسی کہ ہجرت کے وقت حضور ﷺ کو بچانے کے لیے ہوئی بایں طور کہ حضرت علیؓ کو بستر پر چھوڑ کر حضور ﷺ کفار کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے مکہ سے نکل گئے اور کفار یہی سمجھتے رہے کہ محمد ﷺ ہی بستر پر ہیں (اسی طرح جب دشمنوں نے حضرت عیسیٰ کو سولی دینے کے لیے گھیر لیا، تو اللہ تعالی نے آپ کو زندہ آسمان پر اٹھالیا اور ایک دوسرے شخص کو آپ کی شبیہ دیدی، دشمنوں نے اسی کو عیسیٰ سمجھ کر سولی دیدی اور اللہ رب العزت نے اپنے نبی کو بہ حفاظت بچالیا)۔ مفسرین نے سورہ انفال کی آیت:

"وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْيَقْتُلُوْكَ اَوْيُخْرِجُوْكَ، وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ط وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ "(انفال : ۳۰)

''اور جب فریب کرتے تھے کافر کہ تجھ کو قید کردیں یا مار ڈالیں یا نکال دیں اور وہ بھی داؤ کرتے تھے اور اللہ بھی داؤ کرتا تھا اور اللہ کا داؤ سب سے بہتر ہے''۔

کی تفسیر میں تدبیر الٰہی کی بابت حضرت علیؓ کے بستر پر لیٹ جانے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیح و سالم سفر کر جانے ہی کو لکھا ہے، نیز حضرت علیؓ خود فرماتے تھے، جیسا کہ ''مواہب'' میں ہے:

وفيت بنفسي خير من وطئى الثرى ☆ ومن طاف بالبيت العتيق وبالحجر

''میں نے اپنے نفس کو اس ذات گرامی پر فدا کر دیا، جو زمین پر چلنے والوں، نیز کعبہ و حطیم کا طواف کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے''۔

رسول إلٰه خاف أن يمكروا به ☆ فنجاه ذوالطول الاله من المكر

''جو اللہ کا رسول ہے جب اسے دشمنوں کے فریب سے خطرہ لاحق ہوا تو بڑی طاقت والے معبود نے اسے دشمنوں کے داؤ سے بچالیا''۔

اور جیسا کہ حضرت صالح کی، دشمنوں سے حفاظت اور دشمنوں کی ہلاکت، کی بابت تدبیر الٰہی (کہ جب وہ آپ علیہ السلام کو ہلاک کرنے کے لئے جمع ہوئے، تو ایک پہاڑ سے، بھاری پتھر لڑھک آیا اور وہ سب کے

سب جہنم رسید ہو گئے اور اللہ کے نبی صالح علیہ السلام دشمنوں سے مکمل محفوظ رہے) کو لفظ ''مکر'' ہی سے تعبیر کیا ہے۔

چناں چہ ارشاد باری ہے:

''وَمَكَرُوْا مَكْراً وَمَكَرْنَا مَكْراً وَهُمْ لاَيَشْعُرُوْنَ'' (نمل: ۵۰)

''اور انہوں نے ایک خفیہ تدبیر کی اور ایک خفیہ تدبیر ہم نے کی اور ان کو خبر بھی نہ ہوئی''۔

پس اسی طرح حضرت عیسیٰ کی حفاظت کے لیے بھی خفیہ تدبیر ہوئی۔ جس کو ''مکر'' سے تعبیر کیا گیا، کہ آپ دشمنوں کی دست و برد سے مکمل محفوظ رہے اللہ نے بہ حفاظت آسمان پر اٹھالیا اور دشمن ذلیل و خوار رہے)

بد بخت قادیانی اپنی ساری عبارتوں میں کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی چیز کو بار بار دہراتا ہے، کہ کفار نے حضرت عیسیٰ کے ساتھ موت کے سوا سب کچھ کیا۔ میں حیران تھا کہ یہ بد بخت اس بات پر اتنا مصر کیوں ہے؟ لیکن جب میرے بعض احباب نے بتایا کہ اس کا مقصد اسلام کو نصاری سے قریب کرنا اور نصرانیت و اسلام سے چند باتیں لے کر، ایک درمیانی مذہب بنانا ہے، تو میرا تعجب رفع ہو گیا، کیونکہ واقعی معاملہ ایسا ہی تھا۔ طرفہ تماشا یہ کہ اس بد بخت کے چیلے چپاٹے کہتے ہیں کہ: اس کا مذہب و طریقہ تو نصرانیت کے خلاف ایک جنگ ہے، حالانکہ جب میں نے اس کے ان تمام عقائد و نظریات کی تحقیق کی، جن کا وہ قائل ہے تو واضح ہوا کہ اس نے یہ عقائد نصاری یا فرقۂ باطنیہ کے عقائد سے سرقہ کیے ہیں؛ چناں چہ اس قسم کے بعض نظریات، حافظ ابن تیمیہؒ کی کتاب '' الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح '' کے سے عنقریب ہی، آپ کے سامنے پیش کیے جائیں گے۔

مفہوم ''توفی'' اور اقوال مفسرین

ارشاد باری '' اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰىٓ اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ '' میں مذکور ''توفی'' کی تفسیر میں مفسرین نے کئی وجہیں ذکر کی ہیں [کمافی ''روح المعانی''] مگر دو وجہیں زیادہ قرین قیاس ہیں:

۱- ''توفی''، ''توفی الحق'' سے ماخوذ ہے؛ چنانچہ ''معالم التنزیل'' میں ہے ''انی متوفک ای انی متسلمک'' یعنی ''متوفیک''، ''متسلمک'' کے معنی میں ہے جو عرب کے قول ''توفیت منه کذا، ای تسلمته'' کے معنی میں ہے (جس کے لغوی معنی قبضہ کرنا اور پورا پورا لینا ہیں، گویا ''انی متوفیک'' کے معنی ہوئے: ''میں آپ کو پورا پورا لے لوں گا، اور مکمل طور پر آپ پر قبضہ کرلوں گا، کوئی آپ

کے قریب بھی پھٹک نہیں پائے گا‘‘)

۲۔ یا ’’توفی‘‘، ’’توفی المدة ‘‘ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ’’استیفاء المدة ‘‘ یعنی مدت پوری کرنا، کے ہیں۔

گویا حضرت عیسیٰ کو رسالت وتبلیغ کا فریضہ سپرد کر کے یہود کی طرف بھیجا گیا، تاکہ آپ ان پر گواہ ہو جائیں، اس کے علاوہ اور بھی دیگر امور رسالت ونبوت متعلق کیے گئے، جیسا کہ بادشاہ ارکان سلطنت میں سے جب کسی کو کسی خاص کام کی انجام دہی کے لیے کہیں بھیجتا ہے، تو اس کی نیز اس کے مفوضہ امور کی نگرانی بھی رکھتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی بارگاہ ایزدی میں آپ کو زندہ واپس بلالیا (ظاہر ہے) اس وقت مفوضہ کام کی ذمہ داری ختم ہوگئی، آپ دربار الٰہی میں داخل ہوگئے اور خدائی نگرانی کے تحت انجام دینے والے کار نبوت سے فارغ ہوگئے۔ جیسا کہ ارکان سلطنت کا وہ شخص (جس کو بادشاہ نے ذمہ داری دے کر کہیں بھیجا تھا) اپنے کام سے فراغت کے بعد دربار شاہی میں واپس آجائے۔ یہ تفصیل پہلی صورت میں ہے۔

رہی دوسری صورت تو ’’تفسیر کشاف‘‘ میں ہے:

’’اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ، ای مستوفی اجلک، ومعناه: انی عاصمک من أن یقتلک الکفار، ومؤخرک الی أجل کتبته لک، وممیتک حتف أنفک، لاقتلا بأیدیهم، ورافعک الیّ الی سمائی و مقر ملائکتی‘‘

’’اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ، انی مستوفی اجلک کے معنی میں ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ میں تم کو اس بات سے محفوظ رکھوں گا کہ کفار تمہیں قتل کر سکیں، بلکہ اپنے یہاں مقدر کردہ عمر تک زندہ رکھوں گا، پھر طبعی موت دوں گا، نہ کہ ان کے ہاتھوں قتل کے ذریعے، نیز تمہیں اپنے پاس یعنی آسمان پر اٹھالوں گا، جو ملائکہ کا مسکن ہے‘‘۔

’’تفسیر کبیر‘‘ میں اسی بات کو مختصراً یوں بیان کیا گیا ہے:

’’انی متوفیک، ای انی متمم عمرک، فحینئذ اتوفاک، فلااترکهم حتی یقتلوک، بل أنا رافعک الی سمائی، ومقر ملائکتی، وأصونک عن أن یتمکنوا من قتلک، وهذا تأویل حسن‘‘

’’ارشاد باری ’انی متوفیک‘ کا مطلب یہ ہے کہ میں آپ کی عمر پوری کروں گا، تب وفات دوں گا، لہٰذا میں آپ کو قطعاً اس حال میں نہیں چھوڑ سکتا کہ وہ قتل کریں، بلکہ آسمان پر اٹھالوں گا، جو فرشتوں کا مسکن ہے اور اس بات سے بچالوں گا کہ وہ آپ کو قتل کرنے پر قادر ہوسکیں۔ یہی توجیہ زیادہ بہتر ہے۔‘‘

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اتمام عمر ''توفی'' کی شرائط میں داخل ہے، ورنہ ان جیسے چوٹی کے علماء پر ''تفعل'' اور ''تفعیل'' یعنی ''توفی وتوفیة'' کا فرق مخفی نہیں، جیسا کہ تفصیلاً اس پر کلام ہو چکا، فلیراجع۔

''تفسیر کبیر'' کی عبارت اس جانب مشیر ہے کہ صاحب تفسیر کبیر ''توفی'' کو ''اخذ الحق علی الاجل المضروب'' (متعینہ مدت میں حق وصول کرنا) کے معنی میں لیتے ہیں، اس طرح ''اخذ'' کا خدا تعالیٰ اور حضرت عیسیٰ کی وفات کے وقت موعود؛ دونوں سے تعلق ہے، اگر ''اخذ'' کی اضافت اللہ تعالیٰ کی جانب ہو تو یہ اضافت ''اضافة المصدر الی فاعله'' کی قبیل سے ہوگی، یعنی اللہ تعالیٰ کا لینا اور وصول کرنا۔ اور اگر نسبت ''أجل مضروب'' کی جانب ہو تو یہ اضافت ''اضافة المصدر الی مفعوله'' کی قبیل سے ہوگی۔ یعنی حضرت عیسیٰ کی وفات کے وقت کو لینا اور وصول کرنا۔ پہلی صورت حضرت عیسیٰ کی زندگی کے آخری حصے میں ظاہر ہوگی، اگرچہ عبارت میں صراحتاً اس کا ذکر نہیں ہے؛ برخلاف دوسری صورت کے کہ اس کا ظہور ابتدائے عمر سے ہوگا، یہی وجہ ہے کہ نظم قرآنی میں ''توفی'' کا تذکرہ پہلے کیا گیا۔

نشنیدۂ کہ ہر کہ بمیرد تمام شد

پہلی توجیہ کی بناء پر ''اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ'' کے وعدے کا اطلاق رفع کے وقت سے، نزول کے وقت تک ہوگا، ابتداء رفع کے وقت سے ہوگی، اس کے بعد بقاء ہوگی اور ارشاد باری ''انی متوفیک'' ابتداء اور بقاء دونوں پر صادق آئے گا۔ اصول فقہ میں صدق فعل کی بحث آئی ہے کہ آیا صدق فعل کا تعلق ابتداء سے ہے یا انتہاء سے؟ جب کہ دوسری توجیہ کی بناء پر ''انی متوفیک'' کا وعدہ اول عمر سے لے کر، آخر عمر تک کو محیط ہوگا، جو رفع سے پہلے کو بھی متضمن ہے اور بعد کو بھی، نیز نزول کے بعد موت تک کے زمانے کو بھی شامل ہے؛ لہٰذا دونوں صورتوں میں سورہ آل عمران کی آیت کے چاروں الفاظ میں ترتیب علی حالہ برقرار رہی اور جو اس احمق، گمراہ و بد بخت نے، قلت علم، کثرت جہل نیز خارج از ایمان ہونے اور رسوائی و محرومی کی وجہ سے پروپیگنڈا کر رکھا ہے وہ خود بخود بے اثر ہو گیا۔

واضح رہے کہ سورۂ مائدہ کی آیت:

''فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ'' (آیت: ۱۱۷)

''پھر جب تو نے مجھ کو اٹھالیا تو تو ہی تھا خبر رکھنے والا''۔

میں، مذکورہ دونوں وجہیں، اپنی اپنی نظیر کے لیے جاری ہوں گی۔ عنقریب جس کی تفصیل آرہی ہے، ان شاء اللہ المستعان۔

اگرچہ مفسرین نے "فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي" کے معنی صرف رفع ہی ذکر کیے ہیں، البتہ "الانموذج الجليل في بيان أسئلة وأجوبة من غرائب التنزيل" میں چند اور معانی مذکور ہیں۔

یہاں اگر یہ اعتراض ہو کہ یہ تو نظم قرآنی میں ایک طرح کا انتشار ہوا، جس سے واہمہ ہوتا ہے کہ تم قرآن کے مقصد و مفہوم سے کورے ہو، ورنہ دو دو جہوں میں سے صرف ایک ہی وجہ متعین کرتے اور کہتے کہ: یہی مراد اصلی ہے، نیز دو دو جہوں کی صورت میں عموم مشترک کا شبہ بھی ہے، جسے زبان و ادب کی دنیا میں ناپسند سمجھا جاتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہرگز ایسی بات نہیں ہے (کہ عموم مشترک کا استعمال خلاف ادب ہے) بلکہ یہ تو اعلیٰ درجہ کی بلاغت و کمال کی بات ہے کہ متکلم ایسا لفظ استعمال کرے، جس کے کئی معانی ہو سکتے ہوں اور ان میں سے ہر معنی اپنے مقام و مقصد کے مناسب ہو، جسے فہم سلیم کے ساتھ قرآن پاک سے مناسبت ہوگی، وہ نظم قرآنی کو دیکھ کر خود سمجھ جائے گا کہ قرآن کریم کا عام اسلوب یہی ہے (کہ وہ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جن کی کئی توجیہیں ہو سکتی ہیں) اسی لیے حضرت علیؓ نے فرمایا:

"ان القرآن ذو وجوه"

"یعنی قرآن کئی ایک توجیہات و معانی کا حامل ہے"۔

نیز قرآن کی بابت حدیث میں ہے:

"لكل حرف حد، ولكل حد مطلع، (۱) (وقال صاحب مجمع بحار الانوار) ای لكل حد مصعد، يصعد اليه من معرفة علمه"

"ہر حرف کی ایک حد ہے اور ہر حد تک جانے کا ایک راستہ (صاحب مجمع بحار الانوار "مطلع" کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں) یعنی ہر حد کی کوئی نہ کوئی انتہاء ہے، جس تک قرآن کے علوم کی معرفت کے سبب پہنچا جا سکتا ہے"۔

چناں چہ جب "مطلع هذا الجبل من مكان كذا (۲)" بولا جاتا ہے تو "مطلع" سے آنے اور چڑھنے کا راستہ ہی مراد ہوتا ہے (یعنی اس پہاڑ پر جانے اور چڑھنے کا راستہ فلاں جگہ سے ہے۔ (انتہی) قرآن کریم کی یہ تعبیر اس عموم مشترک کے ضمن میں نہیں آتی، جسے اہل فنون ناپسند سمجھتے ہیں، یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے۔

(۱) مکمل حدیث یہ ہے: عن عبد الله ابن مسعود قال إن هذا القرآن ليس منه حرف الا له حد ولكل حد مطلع (رواه الطبراني كما فی مجمع الزوائد للهيثمی: ۱۵۳/۷) محمد صغیر

(۲) مجمع بحار الانوار: ۴۵۷/۳۔ (محمد صغیر)

اور قرآن کی اس قسم کی تعبیر پر کسی پریشانی واضطراب کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ واللہ الموفق للصواب۔

سورہ آل عمران کے چاروں کلمات کی ترتیب

خوب سمجھ لینا چاہیے کہ ارشاد باری: "اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ" بہ حیثیت جملہ مکمل اور مستقل ہے معانی کے لحاظ سے بالکل ظاہر اور عیاں ہے، مزید کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے، یعنی حضرت عیسیٰ ان کے لیے ایک نعمت خداوندی تھے۔ (نبی امت کے حق میں نعمت ہی ہوتا ہے) جیسا کہ حضرت علیؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"شھیدک یوم الدین، وبعیثک نعمة". کما فی النھایة".

"روز جزاء آپ کا گواہ ہونا اور مبعوث الی الخلق ہونا، نعمت الٰہی ہے"۔

یہاں "بعیث" بہ معنی صیغہ مفعول "مبعوث" ہے، نہ کہ بہ معنی اسم فاعل "باعث"۔ پس آیت کریمہ "اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ" کے معنی ہوئے "آپ ان لوگوں کے لیے ایک نعمت تھے، اب اپنی نعمت سے ان کو محروم کرتے ہوئے آپ کو اپنے پاس بلا لے رہا ہوں"۔ یہ کوئی مبہم بات نہیں ہے کہ "وَرَافِعُکَ اِلَیَّ" سے اس کی وضاحت کی جا رہی ہے، بلکہ "انی متوفیک" تو "رَافِعُکَ اِلَیَّ" سے بھی زیادہ اہم ہے؛ اس لیے کہ "انی متوفیک" آپؑ کے قتل کے درپے یہودیوں کے ساتھ معاملہ ختم کرنے کا اعلان ہے اور یہ کہ آپؑ کی بعثت کی نعمت سے ان کو محروم کر دیا، یہی سبب ہے کہ "انی متوفیک" کو "رافعک الی" پر مقدم کیا گیا، کیونکہ اصل مبحث یہی ہے اور کلام کا مقصد ومنشاء بھی، نیز یہی معاملے کی اصل جڑ اور بنیاد بھی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توفی ایسی ہے، جیسے بادشاہ کا سفارت کاروں کو تعینات ممالک سے واپس بلا لینا، یہ واپسی کبھی تو، خود انہی کی کسی مصلحت کے سبب ہوتی ہے، کبھی دونوں ممالک کے درمیان تعلقات ختم کرنے کے لیے اور کبھی سفارت کار کو اس سے اعلیٰ منصب عطا کرنے کی غرض سے۔ اسی طرح ملک میں تعینات سفیر کی بے دخلی، کبھی اس کی جان کی حفاظت کی خاطر عمل میں لائی جاتی ہے، یہ ضروری نہیں کہ اس سے دونوں ملکوں کے درمیان پائے جانے والے معاہدۂ صلح کے خاتمہ کا اعلان مقصود ہو۔ حاصل یہ کہ لفظ "توفی" حضرت عیسیٰ کو، جو باری تعالیٰ کی جانب سے، خلق کی طرف رسول وسفیر تھے، بارگاہ ایزدی جل جلالہ میں طلب کر لیے جانے پر دال ہے، جیسا کہ امام رازی نے سورہ سجدہ میں ذکر کیا ہے اور یہ مفہوم لفظ "موت" میں نہیں پایا جاتا، اس لیے "موت" کے بجائے "توفی" کا لفظ ذکر کیا گیا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ حضرت عیسیٰؑ کو، واپس بلا لینا صرف آپ کو نجات ہی دینے کے لیے نہ تھا، بلکہ یہودیوں کے ساتھ قطع تعلق کا اعلان بھی تھا، برخلاف رفع وتطہیر کے، کیوں کہ ان کا تعلق صرف حضرت عیسیٰ کی ذات سے ہے اور اگر ''رفع'' بغیر ''توفی'' یعنی ان سے نعمت سلب کیے ہوئے بغیر ہوتا، تو ممکن ہے کہ حضرت عیسیٰ کی، ان کے خلاف گواہی دوسرے طریقہ پر ہوتی، مثلاً: اللہ تعالیٰ آپ کو خصوصی طور پر باخبر کر دیتے اور پھر آپ اس کے مطابق گواہی دیتے، لہٰذا محض ''رفع'' اس بات پر دلالت نہ کرتا کہ حضرت عیسیٰ (بعد رفع ان کے حق میں ایسے ہو گئے، جیسے) ان کے نبی ہی نہ تھے، کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا رفع واسراء جب شب معراج میں ہوا تھا، تو اس وقت بھی آپ ہمارے نبی تھے، (اس کے برخلاف ''توفی'' اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جو رسالت ونبوت کا تعلق ان یہودیوں کے ساتھ تھا، اب وہ ختم ہو گیا اور حضرت عیسیٰ ان کے نبی نہ رہے کہ آپ پر ان کی بابت گواہی دینا لازم ہو) جیسا کہ امت کے تئیں نبی کی ایک ذمہ داری، ان کی بابت روز قیامت گواہی دینا بھی ہے اور جب ''توفی'' سے یہ معاملہ ہی ختم ہو گیا تو گواہی دینے کا فریضہ بھی باقی نہ رہا۔

اصل بات یہ ہے کہ دو الگ الگ وعدے ہیں: ایک ''توفی'' دوسرا ''رفع''۔ ''توفی'' کا ذکر سورۂ مائدہ میں آیا ہے، جس کے معنی ہیں نعمت بعثت کو، ان سے سلب کر لینا اور دعوت وتبلیغ سے محروم کر دینا، گویا اللہ تعالیٰ نے اپنی عطا کردہ نعمت ان سے واپس لے لی، اسی لیے یہاں ''فلما رفعتنی'' نہیں فرمایا گیا، کیونکہ یہ ظاہراً اور حساً قتل کے مقابلے میں ہے، جب کہ یہاں اس سے کوئی غرض نہیں، اس کے برخلاف سورۂ نساء میں رفع کا ذکر ہے (ارشاد ہے: ''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ'') کیونکہ ظاہراً قتل کی ضد اور مقابل ''رفع'' ہی ہے۔ ''رفع'' قتل سے بچانے کی راہ تھی، نہ کہ اس کا بدل اور قائم مقام، اس لیے کہ آیت آل عمران کے سیاق میں اسی مخلص اور ذریعہ نجات کا ذکر ہے، جب کہ یہاں سیاق مقاطعہ اور تعلقات کے خاتمے کا اعلان ہے اور یہ بات اسی صورت میں ہو سکتی تھی، جب زندہ ہی حضرت عیسیٰ کو اٹھایا جاتا، اگر موت کے بعد رفع ہوتا تو پھر سارا معاملہ ہی نمٹ چکا ہوتا، اب رفع سے کیا فائدہ؟ نیز موت اس بات کی علت نہیں کہ اس سے سلب نعمت ہی مقصود ہوتا ہے۔ لفظ ''توفی'' کی یہ تشریح وتوضیح حضرت عیسیٰ کی قوم کے اعتبار سے تھی، رہی حضرت عیسیٰؑ کے اعتبار سے، تو اس وقت ''توفی'' کے معنی ہوں گے: ''اخذ حق کان له -تعالیٰ-'' (اللہ تعالیٰ کا اپنا حق لے لینا) گویا اللہ تعالیٰ نے اپنی چیز واپس لے لی اور جب واپس لے لی، تو اب بعد میں پیش آمدہ حالات کی نگرانی اور اس پر باز پرس کا بھی سوال باقی نہ رہا، جس طرح بادشاہ جب اپنے نامزد کردہ حکام کو ریاستوں سے واپس دربار میں بلا لے، تو حکام کے ذمے نہ ریاست کی نگرانی باقی رہ جاتی ہے اور نہ ہی ان سے باز پرس

ہو سکتی ہے۔ یہ بات ارشاد باری :

"وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰکُمْ بِالَّیْلِ وَیَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ" (انعام : ۶۰)

"اور وہی ہے کہ قبضہ میں لے لیتا ہے تم کو رات میں اور جانتا ہے جو کچھ تم کر چکے ہو دن میں"۔

میں غور و فکر کرنے سے بھی ظاہر ہوتی ہے؛ کیونکہ توفی کی صورت میں مراقبہ اور دیکھ بھال و نگرانی کا ذکر نہیں ہوا؛ اس لیے کہ حضرت عیسیٰؑ کی نگرانی و نگہ داشت تو، ان کی گواہی، تبلیغ اور اس جیسے دیگر امور رسالت کے لیے مبعوث کیے جانے کے وقت ہوگی؛ پس واضح ہو گیا کہ اس وقت یہاں پر "اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ" ہی سرمایۂ کلام اور مطلوب و مقصود ہے، خطیب کی لاٹھی اور ٹیک نہیں ہے، جسے ذیلی اور ضمنی چیز مانا جاتا ہے، خود اللہ رب العزت نے سورہ مائدہ میں: "مَادُمْتُ فِیْهِمْ" کے مقابلے میں "فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ" ذکر کر کے، اس کی تفسیر کر دی ہے اور قاعدہ ہے "وبضدها تتبين الاشياء" (کہ اشیاء کی حقیقت اپنی اضداد سے ظاہر اور واضح ہوتی ہے) پس اللہ تعالیٰ کا آپؑ کو پورا پورا لے لینا اور ان کے درمیان نہ چھوڑنا ہی "توفی" کا اصل معنی قرار پایا، اسی لیے "مادمت فيهم حياً" نہیں فرمایا، اس لیے کہ حضرت عیسیٰؑ تو اٹھائے جانے کے وقت بھی زندہ تھے اور اس وقت بھی بہ قید حیات ہیں، ہاں نماز اور زکوۃ کے حکم میں ان کی ضرورت تھی، اس لیے وہاں "حَیًّا" کے ساتھ مقید کر کے "مَادُمْتُ حَیًّا" فرمایا اور یہاں یہ قید مناسب نہ تھی، اس لئے اسے ذکر نہ کیا۔

یہ ساری تشریح پہلی صورت یعنی "توفی" بہ معنی "اخذ الحق وتناوله" پر مبنی تھی۔ رہی دوسری صورت یعنی جب "توفی" کے معنی "توفيه عليه السلام بعد وفاء العمر" (عمر پوری ہونے کے بعد آپ کو لے لینا) لیے جائیں، تو اس وقت بہ حیثیت مفہوم "اخذه منهم بعد توفية عمره" (آپ کو ان سے، عمر پوری ہونے کے بعد لے لیا) کے معنی میں ہے؛ اگر چہ اس کا تحقق طبعی موت کے بعد ہوگا۔ چوں کہ بلاغت میں اعتبار مفہوم کا ہوتا ہے، جیسا کہ کنایہ کی بحث میں ہم ذکر کر چکے ہیں (فلیراجع) لھذا یہ بھی حضرت عیسیٰؑ کے ان کے درمیان رہنے کی نعمت سے، ان کی محرومی، نیز اللہ تعالیٰ کا ان سے معاملہ اور تعلقات ختم کر دینے پر دال ہے، اس صورت میں سابق میں مذکور علمی نکات علی حالہ برقرار رہیں گے۔

واضح رہے کہ "اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَهِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ" کے معنی یہ ہیں کہ: میں آپ کو وفات دینے کے درپے ہوں؛ لیکن فی الحال اپنے یہاں اٹھا لے رہا ہوں، کافروں سے پاک کر رہا ہوں اور جن لوگوں نے آپ کی اتباع کی ہے، انہیں قیامت تک، آپ کے منکرین پر غالب کر رہا ہوں۔ آپ کی وفات کا سلسلہ، اس کے

ابتدائی مراحل اوراس کی تیاری، آپ کے آسمان پر اٹھا لیے جانے کے وقت سے، آپ پر گزرنے والے آخری حالات تک ملحوظ رہی ہے۔ رہا آپ کا نزول فرمانا اور بعد النزول امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام۔ کے ساتھ چالیس سال اقامت پذیر رہنا، جیسا کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، تو اس کا تعلق آپ کے زمانۂ رسالت و دور نبوت سے نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق خاتم النبیین ﷺ کے زمانے سے ہے اور آپ علیہ السلام اس وقت امت محمدیہ کے درمیان وارد، مہمان کی حیثیت سے ہوں گے، دجال اکبر کو قتل کرنے کے لیے آئیں گے، جو آپ کا ہم نام (مسیح) ہوگا (یعنی مسیح ضلالت نہ کہ آپ علیہ السلام کی طرح مسیح ہدایت)۔ پس آپ کا یہ قیام، قیام بالتبع ہوگا نہ کہ بالاصالت، لھذا جب ''انی متوفیک'' سے ارادۂ توفی کی خبر دینا مقصود ہے اور رفع وغیرہ اسی مقصد کے لیے ہے، تو الفاظ کی ترتیب اپنی اصلی حالت پر برقرار رہی، اور لازم نہ آیا کہ رفع سے پہلے آپ کی موت ہوئی ہو، اس بات کو خوب سمجھ لو اور جان لو؛ کیونکہ بد بخت (قادیانی) کسی شئی کی خبر دینے کی ترتیب اور شئی کے وقوع کی ترتیب کے درمیان فرق نہیں کر پاتا۔ اخبار بالتوفی کا رتبہ یہاں مقدم ہے، کیونکہ باقی امور (رفع وتطہیر وغیرہ) اسی کی وجہ سے واقع ہوئے ہیں توفی کا وقوع اشغال زندگی کے بعد ہوگا، من جملہ اشغال زندگی میں سے رفع ونزول بھی ہے، (اس لیے ان کو مؤخر ذکر کرنا) اور توفی کی خبر کو [اس وجہ سے کہ وہی سب سے اہم امر ہے، باقی امور اسی کی وجہ سے ہیں] مقدم ذکر کرنا ضروری ہوا۔ اگر چہ نفس الامر میں اس کا وقوع ان وظائف واعمال سے فراغت کے بعد ہی ہوگا، جو آپ کے لیے مقدر ہیں۔

اس کی مثال ایسی ہی ہے، جیسے ارادۂ سفر کا اعلان اور باقی دیگر امور مثلاً: مناظر قدرت کا مشاہدہ اور سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات۔ ظاہر ہے کہ اعلان سفر، سفر سے طبعی طور پر مقدم ہوتا ہے، پس توفی کو مؤخر مان لینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ موت قیامت کے بعد آئے گی، جیسا کہ اس جاہل نے ''حمامة البشری'' کے حاشیے میں اس کا دعوی کیا ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ: اس نے اسے محمد سعید طرابلسی سے لکھوا کر، اپنی طرف منسوب کر لیا ہے، جو اس جاہل کی عام عبارتوں اور حاشیہ مذکور کی عبارت میں پائے جانے والے تفاوت سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ تقدیم وتاخیر کی بابت، مزید تفصیل کے لیے دیکھئے ارشاد باری: ''وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ'' (آل عمران: ۵۵) کے تحت ''روح المعانی'' ص: ۶۰۰۔ وہاں تصریح ہے کہ اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ موت اس ''جعل'' (غلبہ متبعین) کے بعد ہوگی، نہ کہ قیامت کے بعد۔

اگر کوئی ''انا آتیک وزائرک'' [بہ صیغۂ اسم فاعل] کہے تو یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ اس نے اپنی آمد کو واقع اور موجود بنا دیا، اسی وجہ سے بہ صیغۂ اسم فاعل تعبیر کیا، نہ کہ بہ صیغۂ استقبال، حالاں کہ ابھی

آمد کا تحقق نہیں ہوا۔ یہ تعبیر اس وقت اختیار کی جاتی ہے، جب انسان کسی کام کی آخری تیاری میں ہو، تو مبادئ فعل کو فعل کا درجہ دے کر، اسم فاعل سے تعبیر کر دیا جاتا ہے، گویا کہ وہ فعل واقع ہو چکا، جیسا کہ علماء عربیت نے جا بہ جا اس کی تصریح کی ہے۔

ابن اثیر نے اپنی کتاب ''المثل السائر'' میں لکھا ہے کہ: اسی قبیل سے فعل مستقبل کی بہ صیغہ مفعول خبر دینا بھی ہے، یہ اس لیے کیا جاتا ہے کہ اسم مفعول فعل ماضی کے معنی کو متضمن ہوتا ہے۔ اس موضوع پر تفصیل سے کلام گذر چکا ہے، اسی قبیل سے یہ ارشاد باری بھی ہے: ''اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَۃِ، ذٰلِکَ یَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ وَ ذٰلِکَ یَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ٥'' (ہود: ۱۰۳)

اس آیت میں اسم مفعول ''مجموع'' کو فعل مستقبل ''یجمع'' پر اس لیے ترجیح دی گئی (یعنی بجائے ''یجمع'' ''مجموع'' فرمایا گیا) کہ اس میں ''یوم'' کے، صفت جمع کے ساتھ متصف ہونے کا ثبوت و تحقق ہوتا ہے، نیز یہ کہ اس صفت کا موصوف وہی ''یوم'' ہے۔ اگر میری بات سمجھ میں نہ آتی ہو تو مذکورہ آیت اور ''یَوْمَ یَجْمَعُکُمْ لِیَوْمِ الْجَمْعِ'' (التغابن: ۹) کے درمیان موازنہ کر لو، تمہیں خود میرے قول کی سچائی معلوم ہو جائے گی۔

خلاصہ یہ کہ فعل مستقبل کو وجود میں داخل قرار دینا اور فعل کے بجائے صفت کے صیغوں سے تعبیر کرنا، مبادیات فعل کو فعل کے درجے میں اتار لینے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ صاحب ''روح المعانی'' نے ارشاد باری ''اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا'' (الفتح: ۱) کے تحت ذکر کیا ہے۔

اس تقریر سے ہمارے مقصد کے علاوہ آیات قرآنی کو بہ صیغہ صفات تعبیر کرنے کا نکتہ بھی واضح ہو گیا، نیز اس طرح دونوں وجہیں بھی قریب قریب ایک ہو جاتی ہیں، کیوں کہ ''توفی'' کی ابتداء دشمنوں کے درمیان سے آپ علیہ السلام کو اٹھا لینے کے وقت سے ہوئی، پس وہیں سے اس کے مبادیات بھی شروع ہو گئے اور اسی وقت سے حضرت عیسیٰؑ کا زمانہ و دور نبوت اختتام پذیر ہو گیا، اب آپ کا نزول حضور اکرم ﷺ کے زمانۂ نبوت کے تحت ہوگا، یہی اس ارشاد نبوی کا مفہوم ہے:

''انکم حظی من الامم و انا حظکم من النبیین'' (مسند احمد: ۲۶۶/۴)

''امتوں میں سے میرا حصہ صرف تم ہو، اور انبیاء میں سے تمہارا حصہ صرف میں ہوں''۔

گویا ''توفی'' [یعنی آپ کو انکے درمیان سے لے لینا] ''رفع'' کے مقدمات ہی میں سے ہے، کیوں کہ ''رفع'' ''اخذ'' کے بعد ہی ہوتا ہے اور اس کی انتہاء نزول و مکث کے بعد آپ کی وفات پر ہوگی۔

اس بات کو خوب اچھی طرح ذہن نشین کرلو۔ کیوں کہ اسلاف کے درمیان ''توفی'' کی تفسیر کی بابت اختلاف رہا ہے کہ وہ بمعنیٰ ''اخذ'' ہے، یا بہ معنیٰ ''رفع'' یا بہ معنیٰ ''اماتة''؛ بلکہ بعض نے تو کبھی اس کی تفسیر ''اخذ'' یا ''رفع'' سے کی ہے اور کبھی ''اماتة'' سے۔ جیسا کہ ترجمان القرآن سید الامة حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے ایک روایت یہ ہے کہ ''توفی'' بہ معنیٰ ''اماتة'' ہے، جب کہ صحیح سند سے مروی آپ کی تفسیر یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ زندہ آسمان پر اٹھا لیے گئے، چناں چہ در منثور میں ہے کہ عبد بن حمید، نسائی، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

''لما اراد اللّٰہ ان یرفع عیسی الی السماء خرج الی اصحابه وفی البیت اثنا عشر رجلا من الحواریین، فخرج علیهم من عین فی البیت، ورأسه یقطر ماء، فقال :ان منکم من یکفر بی اثنی عشر مرة، بعد أن آمن بی ، ثم قال :ایکم یلقی علیه شبهی ، فیقتل مکانی، ویکون معی فی درجتی، فقام شاب من احد ثهم سنا، فقال له: اجلس ، ثم عاد علیهم، فقام الشاب، فقال: اجلس، ثم عاد علیهم، فقام الشاب، فقال: انا، فقال: هو انت ذاک ، فالقی علیه شبه عیسی ، ورفع عیسی من روزنةفی البیت الی السماء...' الخ (در منثور ، ۲/۴۲۳، سورہ نساء:۱۵۷)

''جب اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان کی طرف اٹھالینے کا ارادہ فرمایا تو حضرت عیسیٰ اپنے اصحاب (حوارین) کے پاس آئے، اس وقت گھر کے اندر بارہ حواری تھے (اپنے اصحاب کے پاس آنے کا مطلب یہ ہے کہ) گھر میں جو چشمہ تھا، اس سے غسل کر کے حواریوں کے پاس آئے، دراں حالے کہ سر سے پانی ٹپک رہا تھا اور آکر آپ نے فرمایا: تم میں سے بعض ایسے بھی ہیں کہ مجھ پر ایمان لانے کے بعد بارہ مرتبہ کفر کریں گے۔ پھر فرمایا! تم میں سے کون اسے پسند کرتا ہے کہ میری شبیہ اس پر ڈالی جائے اور میری جگہ قتل کیا جائے (اور اس کے بدلے) وہ جنت میں میرا رفیق بنے؟ (یہ سن کر) ایک نوجوان جو کہ ان میں سب سے کم عمر تھا، کھڑا ہوا اور اپنے آپ کو اس کے لیے پیش کیا۔ آپ نے اس سے کہا تم بیٹھ جاؤ۔ پھر دوبارہ آپ نے یہی اعلان کیا۔ تو وہی نوجوان پھر کھڑا ہوا، آپ نے پھر اس سے بیٹھ جانے کو کہا: تیسری مرتبہ پھر جب آپ نے اعلان کیا، تو پھر وہی نوجوان کھڑا ہوا اور کہا کہ: میں ہوں (یعنی میں اس کے لیے تیار ہوں) آپ نے فرمایا کہ: بیشک تو ہی اس کا مستحق ہے، چناں چہ اس پر حضرت عیسیٰ کی شبیہ ڈال دی گئی اور حضرت عیسیٰ گھر کے روشن دان سے آسمان کی طرف اٹھالیے گئے...'' الخ۔

[امام نسائی کی ایک تفسیر ہے، جسے ان کے شاگرد حمزہ نے روایہ۔ کیا ہے] حافظ ابن کثیر، ابن ابی

حاتم کی سند سے اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ''یہ اسناد ابن عباس تک بالکل صحیح ہے اور نسائی نے بھی بہ واسطہ ابو کریب، ابو معاویہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر: ۱/۵۴۴، سورہ نساء: ۱۵۷)

اس بد بخت نے اسلاف کے اختلاف لفظی کو اجماع قطعی کے رد کرنے کا بہانہ بنالیا۔ لا حول و لا قوۃ الا باللہ اور یہ دعویٰ کیا کہ: ''توفی'' ''اماتۃ'' کے معنی میں ہے۔ اور اس کو مؤخر کرنا ترتیب ذکری سے (یعنی رفع وتطہیر وغیرہ کو مقدم ماننا اور ''توفی'' بہ معنی ''موت'' کے بارے میں کہنا کہ یہ قیامت کے قریب بعد نزول ہوگی) تحریف ہے؛ مگر مناظرین نے یہ کہہ کر اسے رسوا کردیا کہ: اگر تطہیر (وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا) سے مراد، یہود کی افترا پردازی سے، حضرت عیسیٰ اور آپ کی والدہ محترمہ کی برأت کا اظہار، بہ زبان خاتم الانبیاء ﷺ کرنا ہے، جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے، تو اسے ارشاد باری ''وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ'' سے مؤخر ہونا چاہیے تھا، اس لیے کہ فوقیت تو تطہیر سے پہلے ہوئی (تطہیر تو بہ زعم خویش حضور ﷺ کے ظہور کے بعد ہوئی) اور اگر تو ''تطهير'' کو بہ معنی ''انجاء'' لیتا ہے، تو ''رفع'' کو [جو بزعم خویش موت طبعی کے وقت ہوا] تیرے قول کے بہ موجب تقریباً ستاسی ۸۷؍ سال مؤخر ہونا چاہیے؟ حاصل یہ کہ ہر حال میں ترتیب ذکری فوت ہوتی ہے اور تیرے ہاتھ سوائے رسوائی، و نامرادی کے کچھ نہ لگے گا، ترتیب ذکری کے فوت کرنے کا الزام دوسروں پر لگاتا تھا اور خود اس کا مرتکب نکلا۔ و کفی اللہ المؤمنین القتال.

تفسیر ''البحر المحیط'' میں ہے کہ ارشاد باری: ''إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ''، ''مُتَوَفِّيكَ، مُطَهِّرُكَ'' اور ''جَاعِلُكَ'' میں سے ہر ایک سے متعلق ہوسکتا ہے، جیسا کہ ہم ''توفی'' کی تفسیر میں ذکر کر چکے ہیں کہ ''توفی'' کے معنی حضرت عیسیٰ کو دشمنوں سے بچا کے، مکمل طور پر اپنی بارگاہ میں بلالینا ہے اور یہ زمانۂ رفع سے، زمانۂ نزول، بلکہ موت تک ممتد ہے، اس جاہل کا یہ کہنا کہ لفظ ''توفی'' ''موت'' ہی کے معنی میں آتا ہے، اس کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے، نیز اس جاہل سے پوچھا جائے کہ کیا ''توفی'' اور ''رفع'' دونوں الفاظ کا استعمال، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سوا کسی اور کے لیے بھی ہوا ہے؟ ظاہر ہے کہ پورے قرآن اور حدیث میں سوائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے، کسی دوسرے کے متعلق، ان دونوں الفاظ کو ایک ساتھ ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ و اللہ الهادی.

اہل تواتر و اہل اجماع کی عبارتوں میں، حضرت عیسیٰ کی بابت صرف لفظ ''رفع'' کا ہی ذکر ملتا ہے، ''توفی'' کا نہیں، نیز حضرت ابو ہریرہ سے مروی حدیث معراج میں، خود حضرت عیسیٰ سے، اللہ تعالیٰ کی تعریف کی بابت، یہ الفاظ منقول ہیں: ''ورفعني وطهرني من الذين كفروا'' (اس میں بھی لفظ ''توفی'' نہیں ہے) یہ حدیث کتب زوائد وغیرہ میں موجود ہے، نیز محمد بن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں، سورہ

نجم کے تحت، تابعی کے نام میں جزم اور صحابی کے نام میں تردد کے ساتھ ذکر کیا ہے، تعین صحابی میں تردد کی وجہ سے سند حدیث پر کوئی فرق نہیں پڑتا (اس لیے کہ جہالت صحابی مضر نہیں ہے) جب کہ ''الخصائص'' میں جزم ویقین کے ساتھ، صحابی کا بھی ذکر ہے۔ فلیراجع.

پھر یہ کہ زمخشری اور رازی کے ذکر کردہ مقصد اور میرے مقصد میں کوئی تناقض نہیں، اس لیے کہ نظم قرآنی جوامع الکلم ہے، جو کئی معنوں اور مناسب اعتبارات کی حامل ہے اور یہ تو ایسے نکات ہیں، جن کے تعدد میں کوئی شک وشبہ ہی نہیں، نیز میں نے جو جزء سلبی کا حصر ''لا قتلا بایدیھم'' نکالا ہے، وہ میرے نزدیک اس بات کے اسی میں منحصر ہونے سے مستفاد ہے، جس کا اللہ تعالی نے ارادہ کیا ہے اور وہ توفی ہے، اس لیے کہ یہی اپنے مادے اور باعتبار مفہوم مخالف، قتل کا مقابل اور ضد ہے، اس کی نظیر یہ ارشاد باری ہے:

''لَوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَاقُتِلُوْا'' (آل عمران: ۱۵۶)

''اگر رہتے ہمارے پاس تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے''۔

(اس آیت میں موت طبعی کو ''مَاتُوْا'' اور اس کے مقابل ''موت بالقتل'' کو ''قُتِلُوْا'' سے بیان کیا ہے) گویا یہ بالکل ایسے ہی ہے، جیسے ضدین میں سے اگر ایک کو ذکر کر دیا جائے تو خود بہ خود دوسرے کی نفی ہو جاتی ہے، اور یہ نفی قصر ترکیبی کے اعتبار سے نہیں حاصل ہوتی ہے جیسے ''زید قائم'' کہ اس میں قیام کا تو حصر نہیں ہے، لیکن اس کی نفی ضرور ہو رہی ہے کہ وہ اس وقت بیٹھا ہوا نہیں ہے، اس لیے کہ مشتقات میں حصر کا فائدہ میرے نزدیک مخفی ہے، اگر چہ ''المفتاح'' میں '' وان ضیف الم فھم خفوف '' کے تحت مذکور ہے، خصوصاً جبکہ نواسخ جملہ بھی موجود ہو، جیسا کہ عربیت کا ذوق اس پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔ بلکہ اس بات سے حاصل ہے کہ یہ جملہ یہودیوں کے مقابلے میں بولا گیا ہے، پس ان کے قول کی تردید ہی جزء سلبی ہوئی۔

ہاں کلام میں عیسیٰ علیہ السلام کی شرافت وعظمت کی رعایت ضروری تھی اس لیے فعل ''توفی'' کی اسناد اللہ تعالیٰ نے خود اپنی جانب کی ہے (چناں چہ فرمایا ہے: ''اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ'') جیسا کہ علماء کرام نے حدیث ''وانا اجزی بہ'' (بخاری: ۱/۲۵۴) اور آیت کریمہ ''وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ'' (الحجر: ۲۹) اور اس جیسی دوسری مثالوں میں اس نکتے کو ذکر کیا ہے۔

یہاں موضوع بحث لفظ ''توفی'' سے متبادر تھا اور اس سے پہلے جو کچھ مذکور ہوا وہ اس کے معنی متضمن یعنی ''وفاء العمر'' کے اعتبار سے تھا، اتنی تفصیل سے اس لفظ کا مفہوم بھی واضح ہو گیا اور مسئلہ ترتیب کی گتھی بھی سلجھ گئی۔ واللہ الموفق وبہ نستعین.

توفی کی تقدیم

چند دیگر نکات

احقر اپنی یادداشت اور ڈائری میں مختلف مقامات میں، جن نکات کو قلم بند کر چکا ہے، یہاں انہیں کو بغیر کسی ترتیب کے جوں کا توں نقل کر رہا ہے، ناظرین کرام حسب ذوق انہیں اپنے صحیح مقامات پر رکھ لیں، ان میں سے بعض نکات تنزل کے طور پر وہ ہیں، جو ''توفی'' کو ''اماتت'' کے معنی میں لینے پر مبنی ہیں، چناں چہ میں نے لکھا ہے:

پہلا نکتہ

واضح ہو کہ اللہ تعالی نے خود ''توفی'' اور ''رفع'' کی ترتیب کی طرف اشارہ کر دیا ہے، چناں چہ سورہ نساء میں قتل کی نفی کے موقع پر رفع کو پہلے ذکر کیا، اس کے بعد شہادت کو، معلوم ہوا کہ رفع مقدم ہے، جب کہ سورہ مائدہ میں نفی شہادت کے موقع پر صرف ''توفی'' کا ذکر کیا جس سے معلوم ہوا کہ ''توفی'' مؤخر ہے۔ نیز ان کے ارادۂ قتل کے موقع پر بھی ''رفع'' مذکور ہے، اس سے معلوم ہوا کہ رفع کا مقصد قتل سے بچانا تھا اور یہ کہ رفع ارادۂ قتل کے وقت پایا گیا، جیسا کہ ہم آئندہ بیان کریں گے۔ انشاء اللہ تعالی ۔ نہ کہ ارادۂ قتل کے ستاسی ۸۷ سال بعد رفع ہوا، جیسا کہ اس جاہل قادیانی کا خیال ہے۔ پھر یہ بھی کہ توفی ارادۂ قتل کے بعد ہی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ ''رفع'' پہلے ہے اور ''توفی'' بعد میں۔ نیز ''توفی'' پر ''رفع'' کی تقدیم کا عقلی قرینہ بھی ہے اور وہ یہ کہ موت جملہ امور مفوضہ کی انجام دہی کے بعد ہوتی ہے۔ اور رفع جب رفعِ جسمانی ہی میں منحصر ہے، جیسا کہ آئندہ آ رہا ہے۔ تو ''رفع'' کی تقدیم خود ہی متعین ہو گئی، البتہ آیت میں ''توفی'' کا ذکر اس سے پہلے کیا گیا، تا کہ انجام سے پہلے ہی باخبر کر دیا جائے، یہ ایسا ہی ہے، جیسے جب کوئی شخص بات کو طول دینے لگتا ہے تو اس سے کہا جاتا ہے کہ: بھائی مختصراً بتاؤ کہ تمہارا اصل مقصد کیا ہے؟ اس پر وہ تفصیل سے گریز کرتا ہے اور اپنا منشا شروع میں ہی ظاہر کر دیتا ہے۔ ایسے ہی موقعہ پر کسی نے کہا ہے: ؂

قالوا: خراسان اقصی ما یراد بنا ☆ ثم القفول فقد جئنا خراسانا

''انھوں نے بتایا کہ خراسان ہماری آخری منزل ہے، پھر وہاں سے واپسی ہوگی، اس لیے کہ خراسان تو آ گئے''۔
تفصیل کے لیے دیکھئے: ''روح المعانی'' ۴۰۹/۵۔

پھر عبارت میں کسی ایسے لفظ کا ہونا بھی ضروری تھا، جس سے یہ پتہ چلتا کہ آپ کو لوگوں کے درمیان سے زندہ اٹھا لیا گیا ہے نیز اس سے انجام کار کی جانب اشارہ بھی ہوتا۔ اس پورے مفہوم کی ادائیگی ''توفی'' کے لفظ ہی سے ہو سکتی تھی، گویا 'توفی'' کا مطلب یہ ہوا کہ ''میں تمھیں ان کے بیچ سے صحیح و سالم اٹھانے والا ہوں، اس کے بعد موت دوں گا''۔ لیکن چوں کہ یہاں یہ عبارت ''توفی'' ہی کو بتانے کے لئے لائی گئی ہے، اس لئے اس کو مقدم کر دیا گیا، نیز چوں کہ ''دفع'' ''موت'' کے مقدمات میں سے ہے، اس لئے بھی مقصد کی تقدیم ضروری ہوئی، اگر اس کا تذکرہ نہ کیا جاتا تو بات مکمل نہ ہوتی اور یہ پتہ نہ چلتا کہ رفع کے بعد کیا ہوگا؟ اس لئے انجام کار کا تذکرہ پہلے ہی کر دیا گیا، یہ توجیہ اس صورت میں ہے جب کہ گزشتہ فصل میں دونوں توجیہوں کا باہمی ربط دکھانے کے سلسلے میں ذکر کردہ تفصیل سے صرف نظر کر لیا جائے۔

اگر ''موت'' کا لفظ صراحتاً ذکر کر دیا جاتا تو نجات اور خلاصی کا سیاق نہ رہ جاتا، یا ''موت'' کا تذکرہ ہوتا اور اسکے ساتھ بہ طور عادت رفع درجہ کا بھی ذکر ہوتا تو نہ نجات کی بات پائی جاتی اور نہ ہی حق تعالیٰ کی تدبیر لطیف اور کارسازی کا اندازہ ہوتا، علاوہ ازیں انجام و انتہا کا تذکرہ بھی ضروری تھا، اس لئے ایسے لفظ کا انتخاب کیا گیا جو عنوان کے مطابق مکمل طور پر وصول کر لینے کے معنی میں بھی تھا، لیکن اس کا تحقق باعتبار مصداق، موت سے ہوتا تھا۔ پھر یہ ساری باتیں ارادہ 'توفی'' کے لئے ذیلی اور ضمنی تھیں۔ اس لیے ان کا سبب بھی ''توفی'' قرار پایا اور یہ ذھناً اس کے تابع ٹھہریں۔

دوسرا نکتہ

یہ بھی احتمال ہے کہ ''اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ'' میں ''ایضاً'' مقدر ہو اور مراد یہ ہو کہ: ''میں آپ کو پورا پورا لے لوں گا، نیز اپنی طرف اٹھا بھی لوں گا اور کفار سے پاک بھی کر دوں گا، وغیر ذالک''۔ یعنی نہ صرف یہ کہ میں آپ کو پورا پورا لے لوں گا، بلکہ یہ یہ بھی کرونگا۔ واضح رہے کہ معطوفات کے سلسلے میں ''ایضاً'' وغیرہ کی تقدیر کے لیے نحات کی تصریح اور تائید کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اس کا فیصلہ خود ذوق

کرتا ہے، جیسا کہ عطف تلقین میں ہوتا ہے، چناں چہ ارشاد باری:

''قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَاماً قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ '' (البقرہ: ۱۲۴)

''حق تعالیٰ نے (حضرت ابراہیم سے) فرمایا کہ: میں تم کو لوگوں کا مقتدا بناؤں گا، انھوں نے عرض کیا: اور میری اولاد میں سے بھی کسی کسی کو (مقتدا بنایئے)''

میں ''ذُرِّیَّتِیْ '' کے بعد اور:

''وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِیْمُ: رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَداً اٰمِناً وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ ''(البقرہ: ۱۲۶)

''اور جب کہا ابراہیم نے: اے میرے رب! بنا اس کو شہر امن کا اور روزی دے اس کے رہنے والوں کو میوے، جو کوئی ان میں سے ایمان لاوے اللہ پر اور قیامت کے دن پر (اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا) اور جو کفر کرے اس کو بھی''۔

میں ''وَمَنْ كَفَرَ '' کے بعد ''ایضاً'' مقدر ہے۔ عطف تلقین کے علاوہ بھی مقام کی مناسبت سے ''ایضاً'' مقدر مانا جاتا ہے جیسا کہ:

''اِنَّكَ مَیِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّیِّتُوْنَ '' (الزمر: ۳۰)

''بیشک تجھے بھی مرنا ہے اور وہ بھی مر جائیں گے''۔

میں ''مَیِّتُوْنَ '' کے بعد اور:

''لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَةٌ ''(یونس: ۲۶)

''جنہوں نے کی بھلائی ان کے لیے ہے بھلائی اور زیادتی''

میں ''زِیَادَةٌ '' کے بعد ''ایضاً'' مقدر مانا گیا ہے۔ یا جیسا کہ ارشاد نبوی: "هو رجل وانت رجل " میں "انت رجل " کے بعد اور حدیث خلع ''نعم وزيادة ''(۱) میں ''زیادۃ' کے بعد ''ایضاً' مقدر ہے، نیز علیؓ کے قول ''والآن هو مؤمن ''(تو وہ بھی مؤمن ہے) دیکھیے: ''منہاج السنۃ'': ۶۱/۳۔ اور ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے قول ''فهم رجال ونحن رجال ''میں بھی ''ایضاً'' مقدر ہے۔ یا جیسا کہ شاعر کا یہ شعر: ؎

یا قرة العين كنت لی أنسا ☆ فی طول ليلی نعم وفی قصره

''اے میری آنکھ کی ٹھنڈک تو تو میری درازی شب اور کوتاہی میں بھی انیس وغم گسار رہی ہے''۔

(۱) حدیث یہ ہے ''عن ابن عباس رضی الله عنهما، ان رجلا خاصم امرأته الی النبی ﷺ فقال النبی ﷺ: اتردین حديقته قالت: نعم وزيادة، قال النبی ﷺ: اما الزيادة فلا'۔ (السنن الكبرى للبيهقی، ۵۱۴/۷) ابو طاصغیر

اس شعر کے اندر بھی ''وفی قصرہ '' کے بعد ''ایضا'' مقدر اور معتبر ہے۔ علاوہ ازیں قائل کے قول: ''ماجاء ک الا زید '' کے جواب میں ''جاء نی زید وھذا '' کہنا، بھی اسی قبیل سے ہے کہ یہاں بھی ''ھذا'' کے بعد ''ایضاً'' مقدر ہے۔

تیسرا نکتہ

''اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ '' سے یہ بھی مراد ہوسکتا ہے کہ ''میں آپ کو وفات بھی دینے والا ہوں'' جیسا کہ خود آپ کے ذہن میں بھی یہ بات ہے اور آپ کو یقینی طور پر معلوم بھی ہے، اس کے علاوہ مزید تین کام ایسے کر رہا ہوں، جن کا تمہیں علم نہیں ہے، پس وفات کی بات چوں کہ پہلے ہی سے ذہن و دماغ میں تھی اور اس کا علم ویقین بھی تھا، اس وجہ سے اسے مقدم کر دیا گیا، برخلاف ان تینوں کے۔ پھر ان تینوں میں ترتیب بھی ہے اور تسلسل بھی (اس لیے انھیں بعد میں ذکر کیا گیا) نیز یہ حضرت عیسیٰ پر دنیوی انعام ہیں (اس لیے بھی ان کی تاخیر مناسب ہوئی) علاازیں ''توفی '' کی تقدیم اس وجہ سے بھی مناسب ہے کہ ان تینوں سے اس کو کوئی مناسبت نہیں ہے، اگر معنی کا لحاظ کر کے ''اِنِّیْ رَافِعُکَ اِلَیَّ وَ مُتَوَفِّیْکَ '' کہا جاتا، تو ارشاد باری ''وَمُتَوَفِّیْکَ'' کے ذریعہ استدراک کا معنی حاصل نہ ہوتا، حالاں کہ مناسب یہ ہے کہ اس سے استدراک کا مفہوم ادا ہو، کیوں کہ ہر جاندار کے لیے اس کا ہونا ضروری ہے اور یہاں یہ مراد نہیں۔ اور اگر ''ثُمَّ مُتَوَفِّیْکَ '' کہا جاتا تو مطلب یہ ہوتا کہ: میں اس کو پہلے نہیں، بلکہ بعد میں کروں گا، حالانکہ یہ بھی مقصود نہیں ہے۔ واضح ہو کہ یہاں کلام محض ابتدائی اور استینافی نہیں ہے، بلکہ حضرت عیسیٰ کے حق میں طلبی ان کی خواہش پر، یا یہود کے مقابلے میں انکاری کے مانند ہے، یعنی یہ یہود کے ارادۂ قتل کا جواب ہے، لہٰذا اس وجہ سے بھی اس کی تقدیم مناسب تھی۔ نیز اسکا مفہوم یہ بھی ہے کہ ''میں آپ کو پورا پورا لینے کے درپے اور اس کی تیاری میں ہوں، جب کہ: دوسرے امور: توفی، رفع اور تطہیر وغیرہ فی الحال انجام دوں گا''۔ اس صورت میں بھی ''توفی '' کا حق یہ تھا کہ مقدم رہے: اگر مؤخر کر دیا جاتا تو یہ گمان کیا جاسکتا تھا کہ رفع الی السماء کے معاً بعد آسمان پر ہی، حضرت عیسیٰ کی وفات ہوگی، حالانکہ یہ مقصد نہ تھا۔

''روح المعانی'' ۳۶۰/۶، میں ارشاد باری:

'' وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ٥ وَلٰكِنَّا اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ، وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا

وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ o وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ"

(القصص: ۴۴۔۴۶)

"آپ (طور کے) مغربی جانب میں موجود نہ تھے جب کہ ہم نے موسیٰ کو احکام دیئے تھے (یعنی تورات) اور (وہاں خاص تو کیا موجود ہوتے) آپ (تو) ان لوگوں میں سے (بھی) نہ تھے جو (اس زمانہ میں) موجود تھے، (پس احتمال مشاہدہ کا بھی نہ رہا) لیکن (بات یہ کہ) ہم نے (موسیٰ کے بعد) بہت سی نسلیں پیدا کیں، پھر ان پر زمانہ دراز گذر گیا (جس سے پھر علوم صحیحہ نایاب ہو گئے اور پھر لوگ محتاج ہدایت ہوئے ...... اس لیے ہماری رحمت مقتضی ہوئی کہ ہم نے آپ کو وحی و رسالت سے مشرف فرمایا، جو کہ چوتھا طریق ہے خبر یقینی کا...) اور (جیسے آپ نے عطاء تورات کا مشاہدہ نہیں کیا اور صحیح و یقینی خبر دے رہے ہیں، اسی طرح موسیٰ کے قیام مدین کا مشاہدہ نہیں فرمایا، چناں چہ ظاہر ہے کہ) آپ اہل مدین میں بھی قیام پذیر نہ تھے کہ آپ (وہاں کے حالات دیکھ کر ان حالات کے متعلق) ہماری آیتیں (اپنے) ان (معاصر) لوگوں کو پڑھ پڑھ کر سنا رہے ہوں، لیکن ہم ہی (آپ کو) رسول بنانے والے ہیں (کہ رسول بنا کر یہ واقعات وحی سے بتلا دیے) اور (اسی طرح) آپ طور کی جانب (غربی مذکور) میں اس وقت بھی موجود نہ تھے، جب ہم نے (موسیٰ کو) پکارا تھا (کہ "یا موسیٰ انی انا اللّٰہ رب العلمین و ان الق عصاک" جو کہ ان کو نبوت عطا ہونے کا وقت تھا) لیکن (اس کا علم بھی اسی طرح حاصل ہوا کہ) آپ اپنے رب کی رحمت سے نبی بنائے گئے"۔

کے تحت ہے "کہ "قضاء امر" یعنی حضرت موسیٰ کو نبوت دی جانی، عطائے تورات و اہل مدین کے درمیان قیام [جس کی طرف ارشاد باری: "وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْ اَهْلِ مَدْيَنَ" میں اشارہ ہے] اور ندائے خداوندی کی واقعی ترتیب کو بدل دیا گیا ہے (اس لیے کہ آخر کی چیزیں پہلے وقوع پذیر ہوئیں اور "قضائے امر" یعنی نبوت بعد میں عطا کی گئی، جب کہ یہاں آیت کریمہ میں "قضائے امر" کو پہلے ذکر کیا گیا اور دوسری چیزوں کو بعد میں) تو اس کا مقصد اس امر کو واضح کرنا تھا کہ ان میں سے ہر ایک اس بات پر مستقل دلیل ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے موسیٰ علیہ السلام کے جو واقعات بیان کیے ہیں، ان کا علم آپ ﷺ کو بذریعہ وحیٔ الٰہی ہوا۔ اگر ترتیب وقوعی کی رعایت کرتے ہوئے اولاً اہل مدین میں حضرت موسیٰ کے قیام کے وقت آپ کی موجودگی، اس کے بعد نداء کے وقت آپ کی موجودگی اور اس کے بعد قضائے امر یعنی حضرت موسیٰ کو نبوت سے سرفراز کیے جانے کے وقت آپ کی موجودگی؛ کی نفی کی جاتی، تو وہم ہوسکتا تھا کہ یہ تینوں چیزیں ایک ہی بات کی دلیل ہیں، جیسا کہ سورہ بقرہ میں، بقرہ کے قصے کے تحت گذر چکا" (انتہی)

لیکن ''البحر'' میں بقرہ (گائے) کے قصے کو بلا تقدیم و تاخیر اسی انداز پر برقرار رکھا گیا ہے، جس ترتیب کے ساتھ قرآن کریم میں مذکور ہے، البتہ علم نحو سے شغف رکھنے والوں سے یہ مخفی نہیں کہ حرف عطف ''فا'' معطوفات کو ایک مسلسل لڑی کی طرح کر دیتا ہے جیسا کہ ابن سیدہ نے ''المخصص'' میں ذکر کیا ہے برخلاف ''واؤ'' کے کہ وہ معطوفات کی باہمی ترتیب پر دلالت نہیں کرتا، بلکہ مطلق جمع پر دلالت کرتا ہے، جیسے کسی نے مٹھی میں کنکریاں رکھ لی ہوں، ظاہر ہے کہ ان میں کوئی ترتیب نہیں ہوتی۔

چوتھا نکتہ

علاوہ ازیں آیت کریمہ کا نزول نصاری کی اصلاح کے لیے ہوا اور وہ انکے سامنے پڑھی بھی گئی، نصاری کے نزدیک عیسی علیہ السلام کی حقیقت اس الٰہ کی ہے، جس نے انسانی لبادہ اوڑھ لیا ہے، یا اس الٰہ کی ہے، جس کی فطرت ہی انسانی ہے، یا وہ انسان جو الٰہ سے نکلا ہے، ایسے موقع پر ''اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ'' نہیں کہا جائے گا، اس معنی کر کہ حضرت عیسی خالق نہیں ہیں، البتہ ایک مقرب مخلوق ضرور ہیں، اس لیے اس کی تقدیم ضروری ہوئی، کیوں کہ یہی سب سے اہم اور بنیادی بات تھی، بقیہ مذکورہ امور تو مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین مشترک ہیں، عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ عیسی علیہ السلام سولی پا کر تمام عیسائیوں کے گناہوں کا کفارہ بن گئے ہیں، اس لیے بھی مناسب ہوا کہ ''توفی'' کو مقدم کیا جائے، جس سے سولی کی نفی ہوتی ہے، اور اسی سے مسئلہ کفارہ کی بھی بیخ کنی ہو جاتی ہے۔

پانچواں نکتہ

''النهر المادمن البحر'' میں ہے کہ اللہ تعالی نے اس آیت کریمہ کا ''اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ'' سے آغاز یہ بتانے کے لیے کیا کہ عیسیٰ اس کی مخلوقات میں سے ہیں، خالق اور معبود نہیں ہیں۔ نیز ''مُتَوَفِّیْکَ'' کا ترجمہ ''نیند'' بھی کیا گیا ہے (اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوا کہ: ''میں پہلے آپ پر نیند طاری کروں گا، پھر اپنی طرف اٹھاؤں گا...الخ) یا پھر ''مُتَوَفِّیْکَ'' کا مطلب یہ ہے کہ: ''میں تمہیں زمین سے لے لوں گا''۔ چناں چہ پوری امت کا اجماع ہے کہ حضرت عیسی آسمان پر زندہ ہیں اور قرب قیامت زمین پر نزول فرمائیں گے، نیز حضرت عیسی کی بابت احادیث صحیحہ سے ثابت تمام باتوں پر بھی امت کا اتفاق اور اجماع ہے، (انتہی)

چھٹا نکتہ

واضح رہے کہ اس میں یہود بے بہبود پر رد بھی ہے بایں طور پر کہ اللہ تعالی نے آپ علیہ السلام کو اپنے پاس زندہ سلامت بلا کر "توفی" فرمائی، نہ کہ قتل وسولی کے ذریعہ (جیسا کہ یہود کا خیال باطل ہے) اس وجہ سے بھی تقدیم ضروری تھی، کیوں کہ یہی سب سے اہم بات تھی (اور قاعدہ ہے کہ اہم ترین بات کو پہلے ذکر کیا جاتا ہے) چناں چہ سیبویہ کہتا ہے کہ: اہل زبان وادب کو جس بات سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے اور جسے وہ اہم گردانتے ہیں، اسے پہلے بیان کرتے ہیں: لہٰذا اگر "انی رافعک الی ثم متوفیک" کہا جاتا تو یہ پہلے اعم پھر اخص نہ رہ جاتا، جولڑی میں مسلسل پروئے ہوئے موتیوں کے مانند ہوتا ہے، نہ کہ مٹھی کی کنکریوں کی طرح جو کیف ما اتفق ایک جگہ جمع ہو جاتی ہیں۔ واللہ اعلم بحقائق الامور.

ساتواں نکتہ

کبھی کبھار دل میں یہ بات بھی آئی کہ ارشاد باری: "اِذْقَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسٰی! اِنِّی مُتَوَفِّیْکَ" علمائے بدیع کی اصطلاح "القول بالموجب" (۱) کی طرح ہے۔

(۱) القول بالموجب یہ ہے کہ متکلم مقتضیٰ کلام مخاطب کو تسلیم کر لیتا ہے، مگر اس کے مقصود کی نفی کر دیتا ہے، اس طرح کہ علتِ حکمِ مخاطب کو کسی اور چیز میں ثابت کر دیتا ہے، یا کلامِ مخاطب سے بعض الفاظ کو مقصودِ مخاطب کے علاوہ اور معنی پر محمول کرتا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں:

۱- پہلی قسم یہ ہے کہ کلام غیر میں کوئی صفت واقع ہو، جو کسی ایسی چیز سے کنایہ ہو کہ اس کے لیے کوئی حکم ثابت کیا گیا ہو، پس متکلم اس وصف کو اس چیز کے علاوہ کسی اور چیز کے لیے ثابت کر دے، اس بات سے تعرض کیے بغیر کہ وہ حکم اس غیر کے لیے ثابت ہے یا نہیں جیسے قرآن مجید میں ہے "یَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَی الْمَدِیْنَةِ لَیُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ،وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ٥" (المنافقون: ۸۔ منافقین کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ واپس گئے تو البتہ عزت والے پست لوگوں کو مدینہ سے ضرور نکال دیں گے اور عزت صرف اللہ اور اس کے رسول اور جملہ مؤمنین کے لیے ہے) اس آیت کریمہ میں کلام غیر (یعنی منافقین) میں صفت عزت وذلت واقع ہے، جس پر "اعز" اور "اذل" دلالت کر رہا ہے، ان صفتوں سے منافقین نے ایک چیز کا کنایہ کیا اور وہ ہے صفت عزت سے خود ان کی ذات اور ذلت سے مؤمنین کی ذات، پھر ان کے لیے ایک حکم ثابت کیا اور وہ ہے اپنے لیے نکالنا اور مؤمنین کے لیے نکالا جانا۔ پس اللہ تعالی نے وصف عزت کے حکم "نکالنا" سے نفیاً واثباتاً تعرض کیے بغیر، اس وصف کی مراد کو بدل دیا، بایں طور کہ اس وصف عزت کو بجائے منافقین کے، مؤمنین کے لیے ثابت کر دیا۔

۲- دوسری قسم یہ ہے کہ غیر کے کلام سے کسی لفظ کو اس کے کسی متعلق کے ذکر کر دینے کی وجہ سے، کسی ایسے معنی پر محمول کرنا، جس کا وہ لفظ حقیقی یا مجازی طور پر احتمال رکھتا ہو، مگر غیر کے مرادی معنی کے خلاف ہو۔

جیسے ابن الحجاج اپنے ممدوح کے حق میں کہتا ہے:

قلت: ثقلت اذا تیت مرارا ☆ قال: ثقلت کاھلی بالایادی

مطلب یہ کہ جب یہود نے قتل وسولی کے ذریعہ عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کا ارادہ کیا، العیاذ باللہ۔ تو اللہ رب العزت نے ان کے مقابلے میں آپ علیہ السلام سے فرمایا: ''ہاں میں خود آپ کو وفات دینے والا ہوں، لیکن قتل اور سولی کے ذریعہ نہیں، بلکہ آسمان پر اٹھا کر اور مکمل طور پر اپنے حضور لا کر''۔ پس لفظ تو ایک ہی رہا مگر مراد بدل گئی، جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے۔

قلت: ثقلت اذ اتیت مرارا ☆ قال: ثقلت کا هلی بالایادی

''میں نے کہا: بوجھل بنا دیا میں نے جب کہ میں آیا بار بار، اس نے کہا کہ: آپ نے میرے شانوں کو احسانات سے گراں بار کر دیا''۔

دونوں مصرعوں میں لفظ ''ثقلت'' ایک ہی مادہ اور باب سے ہے، مگر مراد بالکل مختلف ہے۔

قول بالموجب کی دوسری قسم کی مثال یہ آیت کریمہ ہے:

''يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ، وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ٥'' (المنافقون: ۸)

''یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ: اگر ہم اب مدینہ میں لوٹ کر جاویں گے، تو عزت والا وہاں سے ذلت والے کو باہر نکال دے گا (یعنی ہم ان مسافر پردیسیوں کو نکال باہر کر دیں گے) اور (اس قول میں جو اپنے کو عزت والا اور مسلمانوں کو ذلت والا کہتے ہیں، یہ جہل محض ہے، بلکہ) اللہ ہی کی ہے عزت اور اس کے رسول کی، اور مسلمانوں کی لیکن منافق جانتے نہیں''۔

''میں نے کہا: بوجھل بنا دیا میں نے جب کہ آیا بار بار اس نے کہا آپ نے میرے شانوں کو احسانات سے گراں بار کر دیا''

یہاں شاعر نے ''ثقلت'' سے جو معنی مراد لیا ہے ظاہر ہے کہ وہ کھانے پینے وغیرہ کی مشقت ہے، جب کہ متکلم ممدوح نے اسی لفظ کو ثقالت احسانات پر محمول کیا، اس کے متعلق ''ایادی'' کو ذکر کرتے ہوئے، اس وجہ سے کہ یہ معنی لفظ مذکور کا محتمل ہے اور مجازی طور پر اس میں مستعمل ہے۔ دیکھیے ''تلخیص المفتاح، الفن الثالث ص: ۷۷:

"ومنه القول بالموجب وهو ضربان: احدهما ان يقع صفة فى كلام الغير كناية عن شئى اثبت له حكم مثبتها لغيره من غير تعرض لثبوته لغيره او نفيه عنه نحو:" "يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ،وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ ٥" والثانى حمل لفظ وقع فى كلام الغير على خلاف مراده بما يحتمله بذكر متعلقه كقوله شعر:

"قلت: ثقلت اذ اتيت مرارا ☆ قال: ثقلت كاهلى بالايادى" (محمد صغیر)

اس آیت کریمہ میں اللہ رب العزت نے ان کے قول ''اعز'' اور ''اذل'' کے معنی میں تبدیلی کیے بغیر، صرف مصداق میں تبدیلی فرمائی ہے (کہ عبداللہ بن ابی بن سلول نے تو ''اعــز'' سے منافقین و یہود کو مراد لیا اور ''اذل'' سے اللہ کے رسول اور حضرات صحابہ کو، تو اللہ رب العزت نے فرمایا کہ: ''اعز'' تو محمد ﷺ، آپ کے اصحاب اور مومنین ہیں۔ جس سے خود ثابت ہوگیا کہ ''اذل'' عبداللہ بن ابی بن سلول اور اسکے تبعین ہیں) یہ نکتہ بڑا دل نشین اور شاعر کے اس شعر کا مصداق ہے: ع

''اذ اذاقها من ذاقها يتمطق''

''اس کو جو بھی، جب بھی چکھے گا چٹخارے لے گا''۔

یا جیسا کہ کہا گیا ہے: ـہ

''شرک النفوس ونزهة ما مثلها ☆ للمطمئن وعقلة المستوفز''(۱)

''اس کی گفتگو دلوں کو پھانسنے کا ایک جال ہے اور اطمینان سے سننے والے کے لئے بلا کی دلچسپی کی چیز ہے اور اٹھنے کے لیے تیار شخص کو الجھا کر روک لینے والی ہے''۔

آیت بالا میں لفظ ''متــوفــی'' کو ذکر فرمایا اور یہود کی منشاء کے مطابق لفظ ''قتل'' کو نامناسب قرار دیتے ہوئے، اس سے تعبیر نہیں کیا۔

قول بالموجب کی مثال یہ شعر بھی ہے: ـہ

لقد بهتوا لما رأوني شاحبا ☆ فقالوا به عين، فقلت: و عارض

''وہ ہکا بکا رہ گئے جب میرا رنگ فق دیکھا، تو انھوں نے کہا کہ: اسے نظر لگ گئی ہے، میں نے کہا: رخسار بھی''۔

قائلین نے ''عین'' سے نظر بد لگانے والے کی نظر مراد لی، جب کہ شاعر نے اس سے معشوق کی نگاہ ناز اور رخسار مراد لیا۔

---

(۱) یہ شعر ابن الرومی کا ہے، اس کے پہلے کے دو اشعار یہ ہیں:

وحديثها السحر الحلال لو انها ☆ لم تجن قتل المسلم المتحرز

اس کی گفتگو حلال جادو کے مرادف ہے۔ اگر چہ اس نے کسی پرہیزگار مسلمان کے قتل کا جرم نہیں کیا۔

ان طال لم يملل وان هي اوجزت ☆ ود المحدث انها لم توجز

اگر دراز ہو تو بار خاطر نہ بنے اور اگر وہ مختصر کر دے تو مخاطب کی خواہش ہو کہ کاش مختصر نہ کرتی۔ (التمہید لابن عبد البر ۵/۱۷۵، م: مغرب، ۱۳۸۷ھ) محمد صغیر

اسی سے ملتی جلتی صنعت، صنعت مشاکلت (۱) ہے، اس کی مثال میں علمائے معانی نے یہ آیت ذکر کی ہے، جسے حضرت عیسی نے اللہ تعالی سے عرض کیا تھا:

"تَعْلَمُ مَافِیْ نَفْسِیْ وَلَآ اَعْلَمُ مَافِیْ نَفْسِکَ "(المائدہ : ۱۱۶)

---

(۱)صنعت مشاکلت: محسنات بدیعیہ کی ایک صنعت ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کو ایسے لفظ سے ذکر کیا جائے جو لفظ اس کے لئے غیر موضوع ہو، بوجہ اس کے کہ وہ چیز اس غیر کی صحبت میں تحقیقاً یا تقدیراً واقع ہو۔

اردو میں اس کی مثال:

بدی کی بدی سہل ہووے جزا ☆ جو تو مرد ہے کر برے کا بھلا

بد کار سے بدی کا انتقام لینا بدی نہیں ہے، مثلاً چور کو چوری کی سزا دینا برا نہیں ہے؛ مگر چوں کہ دونوں ایک جگہ ذکر ہوئے ہیں اس لیے بدی کے انتقام کو بھی بدی ہی سے تعبیر کر دیا۔

تحقیقی کی مثال ارشاد باری: "تَعْلَمُ مَافِیْ نَفْسِیْ وَلَآ اَعْلَمُ مَافِیْ نَفْسِکَ "(مائدہ:۱۱۶-تو جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے جی میں ہے) یہاں بطور مشاکلت "مَافِیْ نَفْسِکَ" فرمایا گیا، کیوں کہ اللہ رب العزت نفس سے پاک و منزہ ہے۔

تقدیری کی مثال: "قولو آ امنّا باللہِ وَمَا اُنْزِلَ اِلَیْنَا...... صِبْغَۃَ اللہِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللہِ صبغۃ "(بقرہ:۱۳۶-۱۳۸-تم کہہ دو کہ: ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو اترا ہم پر... ہم نے قبول کر لیا رنگ اللہ کا، اور کس کا رنگ بہتر ہے اللہ کے رنگ سے) اس میں "صِبْغَۃَ اللہِ" مصدر "امنّا باللہِ" کے مدلول کا مؤکد ہے، اصل عبارت اس طرح ہے "صبغۃ اللہ بالایمان صبغۃ ای طہرنا اللہ تطہیراً" کیوں کہ اللہ پر ایمان لانے کا مطلب یہی ہے کہ وہ مومنوں کو شرک و کفر وغیرہ سے پاک و صاف کرتا ہے۔ پس ایمان کے لیے تطہیر لازم ہوئی اور "آمنا" "تطہیر اللہ" پر مشتمل ہوا، معلوم ہوا کہ "صبغۃ اللہ" بہ معنی "تطہیر اللہ" ہے۔

رہی یہ بات کہ "تطہیر" کو "صبغ" سے کیوں تعبیر کیا گیا سو اس کی وجہ یہ ہے کہ "تطہیر" چوں کہ صبغ تقدیری کے نزدیک واقع ہے اس لیے بر بنائے مشاکلت "صبغۃ اللہ" سے تعبیر کیا۔

اس مشاکلت کی تفصیل یہ ہے کہ: عیسائیوں میں قدیم دستور ہے کہ وہ جب کسی کو اپنے مذہب میں داخل کرتے ہیں، یا ان کے یہاں کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کو زرد پانی میں جس کا نام "معمودیہ" ہے غوطہ دیتے اور نہلاتے ہیں پھر یہ کہتے ہیں: یہ ان کے لیے ذریعہ تطہیر اور نجات ہے۔

اس عقیدے کی تردید کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس ظاہری رنگ سے کیا ہوتا ہے کوئی کسی حوض میں ہزار غوطے لگائے اور سر سے پاؤں تک رنگ میں رنگ اٹھے، اس سے کوئی فائدہ نہیں، رنگ تو خدائی رنگ ہے، یعنی کلمہ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" جو انسان کی روح اور دل کو رنگین کر دیتا ہے، خدا تعالی کے اس رنگ باطنی سے کون سا رنگ اچھا ہو سکتا ہے؟ انسان اس رنگ میں رنگین ہو کر ہمیشہ ہمیش اسی کی عبادت میں مستغرق رہتا ہے سوائے مسلمانو! تم نصاری سے یہ کہو "آمنا باللہ.....الآیۃ۔

پس یہ لفظ "صبغ" نہ قرآن میں مذکور ہے نہ کلام نصاری میں؛ ہاں "غمس" موجود ہے، جس سے صبغ ہی مراد ہے گو اس کا تکلم نہیں ہوا۔ اس آیت کے نزول کا سبب بھی یہی "غمس" ہے اس سے ثابت ہوا کہ صبغ تو حقیقت میں مذکور نہیں لیکن تقدیری طور پر موجود ہے اور تطہیر چوں کہ اس صبغ تقدیری سے قرب میں واقع ہے بلہذا بنا بر حصول مشاکلت صبغ سے تعبیر کیا گیا۔

(دیکھئے تلخیص المفتاح: ص ۶۹) ابو طہ صغیر

''تو جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے جی میں ہے''۔

نیز اس ارشاد باری کو بھی پیش کیا ہے، جو حضرت عیسیٰ کی قوم کو بہ طور علامتِ نصرانیت پانی میں رنگنے کی بابت وارد ہے (جسے بپتسمہ کہا جاتا ہے) ''صِبْغَةَ اللّٰهِ'' (البقرہ:۱۳۸)۔ زمخشریؒ نے سچ کہا ہے کہ علم معانی کی مسافت کئی سالوں میں طے کی جا سکتی ہے، ارشاد باری ''وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ'' میں بھی صنعت مشاکلت ہی ہے اور اسی صنعت مشاکلت کے طور پر ارشاد ہے ''اِنِّیْ مُتَوَفِّيْكَ''۔

ان کا مکر بالکل اسی طرح تھا، جیسا کہ اس شعر میں بیان کیا گیا ہے:؎

واخوان حسبتهم دروعا ☆ فكانوها ولكن للأعادي

''کتنے بھائی ہیں، جنھیں میں نے زرہ تصور کیا اور وہ زرہ تھے، مگر دشمنوں کے لیے''۔

وقالوا: قد صفت منا قلوب ☆ لقد صدقوا ولكن من ودادي

''انھوں نے کہا کہ: ہمارے تئیں ان کے دل صاف ہیں، انھوں نے بالکل سچ کہا ہے، مگر ان کے دل میری محبت سے بالکل صاف تھے''۔

صاحب ''ایضاح'' نے اس شعر کو مشاکلت کی مثال میں پیش کیا ہے؛ لہٰذا اس میں مجاز مقابلہ کی کوئی ضرورت نہیں، ہاں ذوق و مناسبتِ فن کی ضرورت ضرور ہے اور وہ اب کہاں؟

اس پر یہ اعتراض بھی وارد نہیں ہوگا کہ آپ نے ''استيفاء'' بہ معنیٰ ''تسلم'' کو راجح قرار دیدیا ہے، جب کہ فرمان باری ''وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ'' کا تقاضہ یہ ہے کہ ارشاد باری ''اِنِّیْ مُتَوَفِّيْكَ'' ''وَمَا قَتَلُوْهُ'' کے بالمقابل وہم وزن ہو اور رفع دونوں جگہ مشترک باقی رہے۔



خاتمۂ بحث

اگر ارشاد باری "مُتَوَفِّیکَ" بہ معنی "اماتت" ہوتا تو اس کا دارِ دنیا سے دارِ آخرت کی جانب کوچ کرنے کے وقت ہونا ضروری تھا، جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

أزف الترحل غير أن ركابنا ☆ لما تزل برحالنا وكان قد

"کوچ کا وقت قریب ہوگیا، مگر ابھی ہماری سواریاں کجاوے کے ساتھ اپنی جگہ سے ٹلیں نہیں، ہاں اب ہٹا ہی چاہتی ہیں"۔

ورنہ پھر اس ارشاد کا کیا محل ہے اگر آپ علیہ السلام کی تقریباً دو تہائی عمر اس کے بعد باقی رہی جیسا کہ اس بد بخت قادیانی کا خیال ہے، بلکہ لازم تھا کہ یہ ارشاد موت کے قریب ہی ہو، اس لیے کہ موت کے قریب ہونے پر ہی اس میں ایک گونہ تسلی ہوسکتی ہے، ورنہ تو کوئی فائدہ نہیں۔ تو اس صورت میں "توفی" یا تو "تناول" کے معنی میں ہوگا، یا "استیفاء" کے۔

خلاصہ یہ کہ اس کے مفہوم کا موت سے قریب وقوع ضروری تھا؛ اس لیے کہ اس سے آپ علیہ السلام کو ان کے مکر (ارادۂ قتل) اور ان سے نجات دہی کی خبر دینا مقصود ہے۔ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ یہ کوئی ایسا فعل ہو جس کا آپ علیہ السلام کو کفار سے نجات دینے میں دخل ہو، رہی موت طبعی تو اس کا ایک متعین وقت ہے، اس کا نجات دینے نہ دینے سے کیا تعلق، سوائے اس کے کہ "توفی" استیفاءِ عمر (مدت عمر پوری ہوجانے) یا پورا پورا لے لینے کے معنی میں ہو، جس کے بعد موت ہی ہے، لیکن اس وقت موت (دشمنوں سے حفاظت کے لیے) کی فائدے کی چیز نہ ہی ہوگی، اور نہ ہی سیاق کے مناسب ہوگی (بلکہ یہ تو ایسا ہی ہوگا کہ گویا دشمن سے نجات دلانے کے بجائے اس سے یہ کہا جا رہا ہے کہ دشمنوں کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گا، بلکہ خود ہی مار دوں گا۔ العیاذ باللہ)

یہاں یہ بات جان لینی مناسب ہوگی کہ اگر نظم قرآنی "اِنِّیْ مُتَوَفِّیکَ" کے بجائے "اِنِّیْ اَنَا مُتَوَفِّیکَ" ہوتی، تو اس سے حکم کی خبر معلوم نہ ہوتی؛ بلکہ اس کا تعلق فاعل کی بابت خبر دینے سے ہوتا کہ وہ کون ہے؟ (اللہ تعالیٰ خود ہیں یا کوئی بندہ؟) اور ذکر کردہ اعتراضات بھی اس پر وارد نہ ہوتے، اب جب کہ عبارت ایسی نہیں ہے، تو بحث فقط اس میں منحصر رہ گئی کہ یہ اس معنی میں ہے کہ میں ہی تم کو وفات دینے والا

ہوں کسی اور کو تم پر مسلط نہیں کروں گا، یعنی اس میں موصوف کا حصر صفت پر ہے، نہ کہ صفت کا موصوف پر (کہ میں تم ہی کو وفات دینے والا ہوں) پس یہ اصل صفت کی خبر دینی ہوئی، اس جہت سے یہ مثل ابتدائی کلام ہوا اور اس وقت ضروری ہے کہ یہ خبر عزمِ سفر کے قریب ہو، نیز یہ بھی ضروری ہے کہ ''اماتت'' کے علاوہ کسی اور معنی میں ہو اور اس عبارت سے جو عدم تسلیط (قتل پر یہودیوں کا قادر نہ ہونا) سمجھا جارہا ہے تو یہ مادہ سے سمجھا جارہا ہے نہ کہ ترکیب سے، جیسے کہا جاتا ہے ''زید صدیقی'' تو یہ عبارت اصل مفہوم کے اعتبار سے نفی عداوت کے لیے ہے نہ کہ قصر کے مشہور طریقوں کے اعتبار سے (اگرچہ تعلق ودوستی پر بھی دلالت کر رہی ہے) اور اگر ''مُتَوَفِّیْکَ'' اماتت ہی کے معنی میں ہو تو ضروری ہے کہ مراد ''اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ'' ہی ہو لیکن رفع کے ساتھ۔ اس بنیاد پر یہ جملہ از قبیل طلب ہے۔ توفی کو مقدم اس لیے کیا گیا کہ یہی مدار گفتگو ہے اور اسی پر کلام بھی پہلے ہوا۔ سیاقِ آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کلام سفر کرانے کے لیے وارد ہوا ہے اور مراد یہ ہے کہ یہ بات فتیح اور بری سمجھی جائیگی کہ یوں کہا جائے: ''آپ کو موت میں خود دوں گا نہ کہ ان کے ہاتھوں ملے گی اور یہ کہ میں خود آپ کو اوپر اٹھالوں گا نہ کہ یہ لوگ اٹھائیں گے''۔ لیکن اگر یہ مطلب ہو کہ میں آپ کو مکمل طور پر لے رہا ہوں قتل نہیں کر رہا بلکہ اپنے پاس اوپر اٹھا رہا ہوں اور ان کے بیچ چھوڑنے والا نہیں، تو یہ سیاق سے زیادہ قریب ہے۔ اس سے بھی زیادہ قریب تر بات یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ: ان میں سے ہر ایک، یہود کے مکر وفریب اور سازش کے مقابلے میں وارد ہوا ہے؛ چناں چہ ان کی قتل کی سازش کے مقابلے میں حق تعالیٰ نے فرمایا ''اِنِّیْ متوفیکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ''۔ یا جیسے کہ ارشاد باری ہے:

''وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (البقرہ: ۳۰)

''اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے رب نے، فرشتوں سے، کہ: ضرور میں بناؤں گا زمین میں ایک نائب''۔

ان یہود کا مکر وفریب آخری امر میں ہوگا اور قتل کے ارادے سے ہوگا، یہاں اللہ رب العزت نے اپنے کلام کا آغاز آپؑ کے قطعی طور پر ان کے درمیان ہونے، ان کے مکر سے آپ کو بچانے اور بنی اسرائیل کو ایذا پہنچانے سے باز رکھنے، کی اطلاع دینے سے کر رہے ہیں نہ کہ آپ کو مارنے اور مقصد بعثت کے پایۂ تکمیل کو نہ پہنچنے کی خبر سے۔ ایسے موقع پر تو موت کا واقع ہونا، دشمنوں کے سپرد کرنے اور تنہا چھوڑنے کے مرادف ہوگا۔ العیاذ باللہ۔ نیز اس شخص کی بابت کہ جس کو سولی دی گئی ہو یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ نجات پا گیا، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ: اس کی زندگی کے ایام ابھی کچھ باقی تھے مگر موت کی وجہ سے دنیا کے جنجال سے جلد نجات پا گیا۔ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ اگر ''توفی'' بہ معنی موت اور ''رفع'' بہ معنی رفع درجات ہو تو سارے الفاظ

حسب معمول اور حسب عادت ہوئے، اس لیے کہ ہر انسان کو موت سے دوچار ہونا ہے (آپ کے لیے کوئی خصوصیت نہ ہوئی، نیز رفع درجات بھی چوں کہ عام ہے، اس لیے اس موقعہ پر رفع درجات کا وعدہ بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتا، چناں چہ ارشاد باری ہے):

"یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ" (مجادلہ: ۱۱)

"اللہ تعالیٰ تم میں ایمان والوں کے اور ان لوگوں کے جن کو علم عطا ہوا ہے درجے بلند کر دے گا"۔

تو اب ایسے لفظ کا ہونا ضروری ہوا، جو ان کے درمیان سے آپ علیہ السلام کو اٹھا لینے پر دلالت کرے۔ نیز یہ بھی واضح ہو کہ زمانۂ موت اور رفع درجہ کو ذکر نہیں کیا گیا، چناں چہ قرآن میں سوائے سورہ مائدہ کے آپ علیہ السلام کی موت پر کوئی دلیل نہیں، (اور سورہ مائدہ میں جس موت کا ذکر ہے) اس کا تعلق قرب قیامت سے ہے۔ (پس اس صورت میں بھی میرا مدعا ثابت رہا کہ ابھی آپ علیہ السلام کی موت واقع نہیں ہوئی، بلکہ قیامت کے قریب بعد نزول ہوگی)۔

پھر یہ کہ زمین سے آپ علیہ السلام کا رفع اور عمومی احوال سے تخصیص (کہ تمام انسان تو زمین ہی میں زندگی بسر کر کے وفات پاتے ہیں، لیکن آپ کی زندگی کے ایک طویل ایام آسمان پر گذریں گے) باوجودے کہ قاعدہ ہے: "انه ما من عام الا وقد خص منه البعض" یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آیت "صعق"۔

("وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰہُ" (زمر: ۶۸)

"اور قیامت کے روز صور میں پھونک ماری جاوے گی جس سے تمام آسمان اور زمین والوں کے ہوش اڑ جاویں گے مگر جس کو خدا چاہے۔ وہ اس بے ہوشی اور موت سے محفوظ رہے گا۔)"

اور آیت کریمہ:

"کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ" (قصص: ۸۸)

"سب چیزیں فنا ہونے والی ہیں، بجز اس کی ذات کے"۔

میں استثناء فرمایا ہے یہ بدبخت لمبی زندگی کو محال قرار دیتا ہے، حالاں کہ ہر نبی کو دنیا و آخرت میں سے کسی ایک میں رہنے کا اختیار دیا جاتا ہے، اندازہ لگائیے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام اپنا ہاتھ بیل کی پیٹھ پر رکھ دیئے ہوتے تو آپ کی کتنی دراز عمر ہوتی؟ (۱)

(۱) صحیح حدیث میں ہے کہ جب فرشتۂ موت موسیٰ علیہ السلام کی روح قبض کرنے آیا، تو آپ نے اسے ایک طمانچہ مارا، جس سے اس کی آنکھ پھوٹ گئی، چناں چہ وہ دربار الٰہی میں واپس گیا اور صورت واقعیہ کو بیان کیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: جا کر موسیٰ کو میرا پیغام پہنچاؤ کہ: اگر آپ طویل زندگی چاہتے ہیں تو کسی بیل کی پیٹھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیجئے، آپ کے ہاتھوں کے نیچے جتنے بال آجائیں گے، ان میں سے ہر ایک بال کے عوض آپ کی

عیسیٰ و آدم علیہما السلام میں مماثلت

عیسیٰ علیہ السلام کی بابت ارشاد باری ہے:

"اِنَّ مَثَلَ عِیْسیٰ عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ" (آل عمران: ۵۹)

"بیشک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک ہے جیسے مثال آدم کی"۔

پس جب آپ حضرت آدم کی طرح ہیں تو ضروری ہوا کہ آپ کی عمر بھی آدم اور آدم ثانی نوح علیہما السلام جیسی ہو (یعنی آپ کی بھی انتہائی طویل عمر ہو، جس طرح ان دو سابقہ انبیاء علیہم السلام کی تھی؛ اس لئے اس بد بخت کا استبعاد بالکل بے محل ہے)۔ نیز اہل جنت کی ہیئت و عمر کی بابت جو حدیث آئی ہے (۱) وہ بھی اس پر دلالت کرتی ہے کہ آپ علیہ السلام کی ہیئت کہوات (ادھیڑ عمر) سے زیادہ نہ ہوگی اور یہی آیت کریمہ کی

زندگی میں ایک سال کا اضافہ ہو جائے گا۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

عن ابی ہریرۃ قال: اُرْسِلَ مَلَکُ الْمَوْتِ الیٰ موسی علیہ السلام، فلمّا جاءہ صَکَّہٗ فَفَقَأَ عَیْنَہٗ، فَرَجَعَ الیٰ رَبِّہٖ، فقال: اَرْسَلْتَنِیْ الی عبدٍ لا یرید الموتَ، قال: فردَّ اللّٰہُ الیہ عینہ وَقال: ارجع الیہ، فقل لہٗ: یضع یَدَہٗ علی مَتْنِ ثَوْرٍ فلہ بما غطَّتْ یَدُہٗ بکُلِّ شعرۃٍ سنۃٌ، قال: ای ربِّ ثم مَہْ، قال: ثم الموت، قال: فالآن فسأل اللّٰہ ان یدنیہ من الارضِ المقدّسۃِ رَمْیَۃً بِحَجَرٍ. فقال: رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فلو کنت ثَمَّ لاریتُکُمْ قبرہٗ الی جانب الطریق تحت الکثیب الاحمر". (بخاری، ج: ۱ ص: ۴۸۴. ومسلم: ج: ۲، ص: ۲۶۷، واللفظ لہٗ)

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ موت کا فرشتہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیجا گیا، جب وہ آیا تو حضرت موسیٰ نے اسے ایک طمانچہ مارا اور اس کی آنکھ پھوڑ دی، وہ لوٹ کر پروردگار کے پاس گیا اور عرض کیا کہ: آپ نے مجھے ایسے بندے کے پاس بھیجا جو موت نہیں چاہتا، اللہ تعالیٰ نے اس کی آنکھ درست کر دی اور فرمایا جا، اور اس بندے سے کہہ: تم اپنا ہاتھ ایک بیل کی پیٹھ پر رکھو، جتنے بال تمہارے ہاتھ تلے آجائیں گے، ان میں سے ہر ایک بال کے عوض تمہاری زندگی میں ایک سال کا اضافہ ہو جائے گا۔ حضرت موسیٰ نے عرض کیا: اے پروردگار! پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟ حکم ہوا پھر مرنا ہے۔ حضرت موسیٰ نے کہا تو پھر ابھی ہی سہی (یعنی اسی وقت موت کی آغوش میں جانے کے لئے تیار ہوں؛ لیکن میری یہ دعا ضرور ہے کہ تدفین کے لئے) اے رب کریم! مجھے ارض مقدس (بیت المقدس) سے قریب کر دے، اگر چہ ایک پھینکے ہوئے پتھر کے بقدر ہو (اس کے بعد) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ: اگر میں بیت المقدس کے قریب ہوتا تو تمہیں حضرت موسیٰ کی قبر (کا نشان) دکھا دیتا، جو ایک راستہ کے کنارے پر سرخ ٹیلے کے قریب ہے۔ (ابوطہ صغیر)

(۱) عن معاذ بن جبل ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: یدخل اھل الجنۃ الجنۃ جرداً مرداً مکحّلین ابناء ثلثین او ثلاث و ثلاثین سنۃ۔ (ترمذی: ۸۱/۲)

حضرت معاذ بن جبل روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جنتی جنت میں اس طرح داخل ہوں گے کہ ان کا بدن بالوں سے صاف ہوگا، بے داڑھی کے جوان ہوں گے، ان کی آنکھیں سرگیں ہوں گی اور تیس یا تینتیس سال کی عمر کے لگیں گے۔ (محمد صغیر)

مراد بھی ہے۔ دنیا ساری کی ساری اپنے طول وعرض میں ایک دائرہ کی طرح ہے جس کا مرکز حق جل مجدہ کی ذات بابرکات ہے۔ جہاں رات ودن کا نام ونشان نہیں او رنہ ہی زمانہ اور مرور زمانہ کا تصور، وہیں سے مقربین پر طیٔ زمان کا حکم کیا جاتا ہے، ارشاد ربانی ہے:

"وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (حج:۴۷)

"اور آپ کے رب کے پاس کا ایک دن ایک سال برابر ہے، تم لوگوں کے شمار کے مطابق"۔

(یعنی تمہارے ایک ہزار برس کی گنتی اللہ رب العزت کی بارگاہ میں سمٹ کر ایک دن کے برابر ہے، پس اگر حضرت عیسیٰ پر بھی وہی طیٔ زمان ہو، جس میں آپ کی ذات پر کوئی تغیر وتبدل نہ ہو تو کوئی استبعاد نہیں)۔

عیسیٰ آسمان پر زندہ ہیں

جس نے بھی اس بدبخت قادیانی کی طرح رب ذوالجلال کی قدرت کاملہ کو اپنی ناتواں اور درماندہ عقل کی ترازو سے تولا، وہ گمراہی کے گڑھے میں جا گرا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے (جس کو چاہے زمین پر رکھے اور جس کو چاہے آسمان پر) اسی قادیانی جیسے بدبختوں کو مخاطب کرتے ہوئے رب ذوالجلال نے ارشاد فرمایا۔ جیسا کہ فصل اول میں گذر چکا:-

"اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝ وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ۝ وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ" (زخرف:۵۹-۶۱)

"عیسیٰ (علیہ السلام) تو محض ایک ایسے بندے ہیں جن پر ہم نے (مقبولیت اور کمالات نبوت دے کر اپنا) فضل کیا اور ان کو بنی اسرائیل کے لئے (اولاً اور دوسروں کے لئے بھی ثانیاً) ہم نے (اپنی قدرت کا) ایک نمونہ بنایا تھا (تاکہ لوگ یہ سمجھ لیں کہ خدا تعالیٰ کے لیے اس طرح بغیر باپ کے پیدا کرنا بھی کچھ مشکل نہیں) اور (ہم تو اس سے زیادہ عجیب وغریب امور پر قادر ہیں، چنانچہ) اگر ہم چاہتے تو تم سے فرشتوں کو پیدا کردیتے (جس طرح تم سے تمہارے بچے پیدا ہوتے ہیں) کہ وہ زمین پر (انسان کی طرح) یکے بعد دیگرے رہا کرتے (یعنی پیدائش بھی آدمیوں کی طرح ہوتی اور موت بھی، پس بغیر باپ کے پیدا ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کے زیر قدرت نہیں رہے، لہٰذا یہ امر حضرت عیسیٰ کے معبود ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا؛ بلکہ اس طرح پیدا کرنے میں بعض حکمتیں تھیں جن میں سے ایک تو اوپر بیان ہوئی کہ انہیں اپنی قدرت کا ایک نمونہ بنانا تھا) اور (دوسری حکمت یہ تھی کہ) وہ (یعنی عیسیٰ علیہ السلام اس طرح

پیدا ہونے میں امکان) قیامت کا ذریعہ ہیں (اس طرح کہ قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے میں اس سے زیادہ اور کیا بُعد ہے کہ دوبارہ زندگی خلاف عادت ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے سے ثابت ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ خلاف عادت امور کے صادر کرنے پر قادر ہے، پس اس سے قیامت و آخرت کے عقیدے کا صحیح ہونا ثابت ہوگیا اور جب تم نے عقیدۂ آخرت کی یہ دلیل سن لی) تو تم لوگ اس (کی صحت) میں شک مت کرو اور (توحید و آخرت وغیرہ عقائد میں) تم لوگ میرا اتباع کرو"۔

یہاں ملائکہ کا ذکر کیا اور ان سے یہ استدلال کیا کہ: کیا ملائکہ جن کی عمریں لمبی ہوتی ہیں، زندہ نہیں؟ آسمان پر چڑھتے اور اترتے نہیں؟ اور زمین پر چلتے نہیں ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو زمین میں تمہاری جگہ فرشتوں کو لاکر بسادیں (سوال یہ ہے کہ جب ان سب چیزوں کو مانتے ہو، تو پھر) حضرت عیسیٰ کے معاملے میں تمہیں کیا استبعاد نظر آتا ہے اور دونوں جگہوں میں کیا فرق ہے؟ پس یہ وہ امور ہیں، جن کو اس بدبخت نے مشکل سمجھا، جب کہ قرآن حکیم اس کے بیان سے فارغ ہوچکا ہے؛ چنانچہ ارشاد ہے:

"وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ"

"کہ عیسیٰ علامات قیامت میں سے ایک علامت ہیں"۔

ان کی ذات کو ہم نے آسمان میں محفوظ کر رکھا ہے۔ شاید ارشاد باری:

"وَجَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ ۝" (مریم: ۳۱)

"اور مجھ کو برکت والا بنایا، میں جہاں کہیں بھی ہوں (خواہ دنیا میں خواہ آسمان میں)"

اور

"وَجِیْهًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ ۝" (آل عمران: ۴۵)

"اور عیسیٰ باآبرو ہیں (خدا تعالیٰ کے نزدیک) دنیا میں بھی (کہ ان کو نبوت عطا ہوئی) اور آخرت میں (بھی) اور من جملہ مقربین (عند اللہ ہیں)"

بھی اسی نہج پر ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کے وجیہہ ہونے کو دنیا اور آخرت دونوں میں ذکر کیا، اور مقرب ہونے کو دنیا سے آسمان پر اٹھائے جانے اور دنیا میں نازل ہونے تک قرار دیا، یا پھر دو کو ذکر کرکے استیعاب مراد لیا ہے کہ ہر حال میں آپ مقرب ہی ہیں۔

نتیجہ بحث

جب نوم پر "توفی" کا اطلاق ثابت اور محقق ہے، خود قرآن کریم کی دو آیتوں سے بھی اس کی تائید

ہوتی ہے، تو عالم ارض سے عالم سماء کی طرف اٹھالینے اور لے جانے پر بھی اس کا اطلاق ایک آیت؛ بلکہ سورہ آل عمران اور سورہ مائدہ کی دو آیتوں سے ثابت ہے۔

نیز یہ بھی ضروری ہوا کہ وہ ذات جس کو لیا اور پکڑا گیا یعنی جس کا رفع ہوا اور وہ ذات جس کو کفار سے پاک کیا گیا، ایک ہی ہو، اس لئے کہ دونوں آیتوں (آیت ''توفی'' اور آیت ''تطہیر'') کا مورد خطاب ایک ہی ہے۔ نہ کہ وہ ذات کہ جس کی توفی ہوئی، فقط اس کی روح کو، کل سے جز کی طرف منتقل کرتے ہوئے اٹھالیا گیا ہو اور ایک تہمت سے بچا کر دوسری تہمت سے دامن کو داغ دار کر دیا گیا ہو، حاصل یہ کہ ان چاروں با عظمت مرتبوں کا مورد و مخاطب ہر حال میں ایک ہی ذات ہے، نہ کہ ایک ذات سے روح کی طرف منتقل کیا گیا، پھر بہتان تراشی کی طرف۔

نیز یہ بات بھی ظاہر ہے کہ ''نیند'' پر ''توفی'' کا اطلاق قرآن کریم ہی سے معلوم ہوا، ورنہ اس سے پہلے لوگوں کے درمیان ''نیند'' پر ''توفی'' کا اطلاق معروف نہ تھا اور اگر کسی نے اطلاق کیا بھی، تو نادر اور شاذ کے درجے میں ہونے کے سبب اسے ایک طرح کا استعارہ ہی سمجھا گیا اسی طرح ''تسلم'' (قبضہ کر لینے) پر بھی ''توفی'' کا اطلاق قرآن ہی سے معلوم ہوا، اس لئے کہ اطلاق اللفظ علی معنیً میں صرف اس امر کا لحاظ کیا جاتا ہے کہ اس لفظ میں اس مفہوم کی گنجائش ہو، نہ یہ کہ وہ لفظ اس مفہوم میں معروف اور مشہور بین الناس ہو [اس کی تفصیل کے لئے دیکھئے: ''روح المعانی'' ۳۰۴/۳، بابت ''وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً''] مگر افسوس کہ اس بدبخت پر یہ واضح چیزیں نہ کھلیں اور اس کی بدبختی اس پر غالب رہی۔

معجزات عیسیٰ عبدیت کی دلیل ہیں نہ کہ معبودیت کی

سہیلی کہتے ہیں کہ: عیسائی پادریوں کا احیاء موتی اور خلق طیر سے حضرت عیسیٰ کے الہ و معبود ہونے پر استدلال کرنا بالکل باطل ہے، بلکہ اگر وہ غور و فکر سے کام لیں تو اندازہ ہوگا کہ یہ امور تو خود ان کے خلاف حجت ہیں، اس لئے کہ اللہ رب العزت نے دوسرے انبیاء کے برعکس آپ کو ایسے معجزات عطا کیے، جن سے آپ کی تکذیب کرنے والوں کے دعوے کی بھی تردید ہو جاتی ہے۔

نیز آپ کو الہ یا فرزند الٰہ ہونے کا عقیدہ رکھنے والوں اور اس بات کو محال سمجھنے والوں کا زعم بھی باطل ہو جاتا ہے کہ: کوئی انسان بغیر باپ کے کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؟ چناں چہ آپؑ کے مٹی میں پھونک مارنے کے سبب اس کا پرندہ بن جانا، اس کی دلیل ہے، یہ بالکل ایسا ہی ہے، جیسا کہ حضرت آدم کے ساتھ ہوا کہ مٹی

کا پتلا بنا کر اس میں روح پھونک دی گئی اور یہ پتلا حضرت آدم کی شکل میں ایک زندہ انسان بن گیا؛ لہٰذا حضرت عیسیٰؑ کے پھونک مارنے سے، مٹی کا پرندہ بن جانا حضرت آدم کی تخلیق سے زیادہ تعجب کی بات نہیں۔

یہ سب کچھ اللہ رب العزت ہی کا کیا ہوا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ایسے ہی حضرت عیسیٰؑ کا مردوں کو زندہ کرنا اور بچپن میں بات چیت کرنا، ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی والدہ صدیقہ کے گریبان میں پاکیزہ روح پھونک کر آپ کو پیدا کیا گیا، نہ کہ کسی کے نطفۂ ناپاک سے، یہی سبب ہے کہ دیگر تمام انسانوں کی بہ نسبت، آپ کے اندر روحانی طاقت کہیں زیادہ ہے۔ حاصل یہ کہ آپ کے معجزات روحانی ہیں، جو اس پر دلالت کرتے ہیں کہ حیات روحانی کے ساتھ، آپ کی مناسبت زیادہ اور مضبوط تر ہے؛ اسی وجہ سے آپ قرب قیامت تک زندہ اور باقی بھی رہیں گے۔

ابی بن کعبؓ سے مروی ہے کہ: ''جو روح مریم کے سامنے انسانی شکل میں ظاہر ہوئی تھی، اسی سے استقرار حمل ہوا اور عیسیٰؑ پیدا ہوئے، یہ روح مریم کے منہ سے ان کے شکم میں داخل ہوئی تھی''۔ امام کشی نے اس روایت کو حضرت اُبی تک سند حسن سے مرفوعا روایت کیا ہے۔

اللہ رب العزت نے صرف آپؑ کو مادر زاد اندھوں اور برص کے مریضوں کو شفایاب کرنے کا معجزہ عطا فرمایا: تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ درحقیقت ان دونوں باتوں کو حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ معنوی مشابہت ہے اور وہ یہ ہے کہ آپؑ کا سابقہ دو گروہوں سے پڑا، ان میں سے ایک گروہ جو نور بصیرت سے محروم ہونے کے سبب اندھا ہو گیا تھا، اس نے آپ کی نبوت کی تکذیب کی، یہ یہود بے بہبود کا طبقہ تھا اور دوسرا گروہ نصاریٰ کا تھا جن کے قلوب آپ پر ایمان لانے کے سبب روشن وسفید ہو گئے تھے، مگر انھوں نے آپؑ کی تعظیم میں بے جا غلو کر کے اپنے ایمان کو فاسد اور خراب کر لیا، پس ان کی مثال اس برص زدہ شخص سی ہے جو بیماری کی وجہ سے سفید ہو گیا ہو۔ (جنھیں حضرت عیسیٰ ہی ٹھیک کر سکتے ہیں اور پہلے گروہ کی مثال مادر زاد اندھے جیسی ہے، انھیں بھی حضرت مسیح ہی درست کر سکتے ہیں)

اس لئے اللہ رب العزت نے آپؑ کو دونوں فرقوں کے خلاف ایسے معجزات و دلائل عطا فرمائے، جن سے ان کے دعوائے باطل کی تردید ہو جاتی ہے؛ چناں چہ دلائل حدوث سے آپ کی عبودیت و بندگی ثابت ہوتی ہے اور ربوبیت کی نفی ہوتی ہے، آپؑ کے خصائص معجزات سے آپ کی والدہ مریم صدیقہ کی پاک دامنی کی تصدیق وتائید اور شبہ بدکاری کی تردید ہوتی ہے، نیز آپؑ کی نبوت اور آپ کی والدہ کی صدیقیت کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ حاصل یہ کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت سے مسیح ہدایت (حضرت عیسیٰؑ) کی شخصیت میں ایسی نشانیاں

ودیعت کی گئیں جو آپ کے حال کے مشابہ تھیں۔ جیسا کہ ظاہری شکل وصورت کے اعتبار سے مسیح ضلالت (کانادجال) میں ایسی چیزیں پیدا کی جائیں گی جو اس کی ظاہری اور باطنی حالت کے مناسب ہوں گی، اس نکتہ پر بندہ اپنی ایک دوسری کتاب میں سیر حاصل بحث کر چکا ہے۔فا الحمد للّٰہ علی ذلک (انتہی)

ایک غلطی کا ازالہ

کسی جعل ساز کے لئے یہ کہہ کر دھوکہ دینے کا موقعہ باقی نہیں رہتا کہ ہر ذی روح کی وفات اپنے وقت مقررہ پر ہی ہوگی، اس کے علاوہ اس میں دوسرا کوئی احتمال نہیں ہے اور نہ عمر کے بڑھنے و گھٹنے کا کوئی امکان، چنانچہ ارشاد باری ہے:

" فَإِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ٥" (الاعراف : ۳۴)

''پھر جب آپہنچے گا ان کا وعدہ، نہ پیچھے سرک سکیں گے ایک گھڑی اور نہ آگے سرک سکیں گے''۔

اس لیے کہ بعض مواقع کے لحاظ سے تو بات یہی ہے، لیکن بعض دوسرے مواقع کے اعتبار سے ارشاد باری ہے:

" وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ " (فاطر : ۱۱)

''اور نہ کسی کی عمر زیادہ کی جاتی ہے اور نہ کسی کی عمر کم کی جاتی ہے،مگر یہ سب لوح محفوظ میں لکھا ہوتا ہے''۔

جس میں گھٹنے اور بڑھنے کو بھی تقدیر الٰہی میں شامل کر دکھا ہے۔

مفسرین نے اس میں لمبی بحثیں کی ہیں، آپ اس آیت اور:

" هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا ط وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ..الا یہ " (انعام: ۲)

''وہ اللہ ایسا ہے جس نے تم سب کو مٹی سے بنایا پھر ایک وقت معین کیا اور دوسرا وقت معین خاص اللہ ہی کے نزدیک معلوم ہے''۔

کی تفسیر، کتب تفاسیر میں دیکھیں، یہاں ان آیتوں کی طرف اشارہ ہی پر اکتفاء کیا جارہا ہے۔

حسبنا اللّٰہ ونعم الوکیل.



فصل

بابت ارشاد باری: "وَرَافِعُکَ اِلَیَّ"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع جسمانی ہے

اس آیت سے متعلق اکثر باتیں سورہ نساء کی آیتوں کے تحت آئیں گی، یہاں صرف اتنی بات ہے کہ ہر اس شخص پر جو کہ قرآن وحدیث پر ایمان رکھتا ہے اور اس بات کا اعتقاد رکھتا ہے کہ پوری کی پوری امتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کسی باطل عقیدہ پر جمع نہیں ہوسکتی، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس پر بھی ایمان رکھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع، رفع جسمانی ہے، آیات قرآنی سے اس کا قطعی ثبوت ملتا ہے، جب کہ اجماع امت قرآن کے قطعی الدلالت علی المعنی ہونے پر ہوچکا ہے، آسمان کی طرف رفع جسمانی آپؑ کی معراج ہے، راغب نے "مفردات القرآن" میں اس آیت کا یہی مطلب لیا ہے، جیسا کہ "البحر المحیط" میں ان کے حوالے سے مذکور ہے، نہ کہ فقط رفع درجہ۔ اس لئے کہ آیت کریمہ کی پہلی اور حقیقی مراد رفع جسمانی ہی ہے۔ جس کی دلیل قطعی یہ ہے کہ بالاتفاق علماء تاریخ وحدیث، یہ آیتیں وفد نجران کی بابت ان کے عقیدے کی اصلاح کے لیے نازل ہوئیں اور ان کے سامنے پڑھ کر سنائی گئیں، جن کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ ذات وجسم کے ساتھ آسمان پر اٹھائے گئے۔ پس اگر اسلام کا عقیدہ اور تعلیمات قرآنی اس کے خلاف تھی تو ضروری تھا کہ عبارات قرآنی میں کوئی ایسا لفظ نہ آتا جو نصاریٰ کو ہمیشہ ہمیش کے لئے گمراہی کے گڑھے میں ڈھکیل دیتا اور اس وقت سے لیکر قیامت تک ان کو اس معاملے میں حیرت میں ڈال دیتا، اس لئے کہ جب وہ اس آیت کو سنیں گے تو ضرور رفع جسمانی پر محمول کریں گے، اس وقت قرآن ایک باطل عقیدے پر ان کا تعاون کرنے والا خیال کیا جاتا، نیز اگر وہ قرآن کریم سے ہدایت چاہتے تو بھی ہدایت نہ پاتے۔ العیاذ باللہ۔ یہ ایسی بات ہے جس سے قرآن کریم کو محفوظ رکھنا ضروری ہے۔

جب یہ فیصلہ ہوگیا کہ قرآن حکیم صرف ان کے عقیدۂ قتل وصلب ہی کے خلاف ہے، نیز مسئلہ کفارہ کی

بھی نفی کرتا ہے، رہا ان کا عقیدہ رفع جسمانی تو اسے قرآن بھی ثابت کرتا ہے اور ان کی موافقت کرتا ہے۔ نعوذ بـالـلّٰـہ! اگر معاملہ نفس الامر میں ایسا نہ ہوتا (یعنی رفع جسمانی نہ ہوا ہوتا) تو ان آیتوں کے ذریعہ (جو کہ ان کی بابت نازل ہوئیں) ان کو ہمیشہ ہمیش کے لئے گمراہ کرنا ہوتا؛ کیوں کہ قرآن بعینہٖ انہی الفاظ کے ساتھ نازل ہوا، جس کے وہ پہلے سے قائل تھے، بلکہ مسلمانوں کو بھی گمراہ کرنا ہوتا، جن کے دین میں سرے سے ایسا کوئی عقیدہ ہی نہ تھا، اب جب کہ مسلمانوں نے جو کہ نصاریٰ کے اصل دین کے مخالف ہیں، اس عقیدے میں ان کی موافقت کی اور اس پر اجماع بلا فصل کیا، بلکہ اہل کتاب کے ان علماء نے بھی موافقت کی جو اسلام میں داخل ہوئے جیسے: عبداللہؓ بن سلام، کعب الاحبارؒ اور وہب بن منبہؒ ان تینوں حضرات سے حضرت عیسیٰؑ کی حیات کی بابت، کتب حدیث میں آثار بھی منقول ہیں۔ دیکھئے: ''درمنثور'' اور ''جامع ترمذی'' وغیرہما۔ ان آیات وآثار کو ان کے معنی اصلی سے وہی پھیر سکتا ہے، جس کے دل میں ایمان ہی نہ ہو اور وہ کافروں میں سے ہو۔

عیسیٰ علیہ السلام سے کئے گئے چاروں وعدوں کی ترتیب فصاحت وبلاغت کی آئینہ دار ہے

جب رفع کے معنی متعین ہوگئے، تو یہ بات راجح ہوگئی کہ ''تـوفـی'' بہ معنی ''دربار الٰہی میں فی الحال پورا پورا لے لینا ہے'' اگر چہ فی المآل اس کی انتہا موت ہی ہے۔ ''البحر المحیط'' میں ہے کہ ان چاروں باتوں (۱۔ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ. ۲۔ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ. ۳۔ وَمُطَهِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ۔ ۴۔ وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ) کی ترتیب انتہائی فصاحت وبلاغت کی آئینہ دار ہے بایں طور کہ اولاً: تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو اس بات کی خبر دی کہ میں آپ کو پورا پورا لینے والا ہوں (پس آپ دشمنوں سے گھبرایئے نہیں) ان کو آپ پر غلبہ وقدرت حاصل نہیں ہوگی، بلکہ یہ آپ تک پہنچ بھی نہ سکیں گے (سوال ہوتا ہے کہ بچانے کی کیا شکل ہوگی؟ بہ ظاہر کوئی سامان نظر نہیں آتا، اس کے جواب میں) ثانیاً: آپ کو رفع الی السماء، ملائکہ کے ساتھ سکونت اور وہاں ایک طویل زمانے تک اپنے رب کی عبادت کرنے کی خوش خبری دی جاتی ہے (یعنی فی الحال بچانے کی شکل یہ ہے کہ میں آپ کو بہ جسدہ آسمان پر اٹھالیتا ہوں، جس کی وجہ سے یہ دشمن آپ کا کچھ نہیں کر پائیں گے) ثالثاً: رفع الی السماء کی وجہ سے کفار کے ناپاک ہاتھوں سے ہمیشہ ہمیش کے لئے محفوظ وپاک رہنے کی خبر دی۔ یہ بشارت رفع سے لیکر قرب قیامت میں نزول

فرمانے تک، پورے زمانے کو شامل ہے۔ آپؑ کی بابت یہ انتہائی عظیم بشارت ہے کہ آپ دشمنوں سے ابتداء میں بھی محفوظ رہیں گے اور آخر میں بھی (کبھی بھی دشمن آپ پر غلبہ نہیں پائیں گے) چوں کہ رفع اور توفی دونوں ایک ہی زمانے کے ساتھ خاص ہیں تو قرآن کریم نے اولاً انہی کو بیان کیا، جب کہ تطہیر ہر زمانے کو شامل ہے، اس لئے اس کے ذکر کو ان دونوں سے موخر کیا، ان تینوں بشارتوں کے بعد [جو کہ آپؑ کی ذات اقدس کے ساتھ خاص ہیں] آپ کے متبعین کی برتری اور ہر منکر پر فوقیت وغلبہ کی خوش خبری دی گئی، تا کہ اس سے آپ کی آنکھ ٹھنڈی ہو اور دل کو سرور حاصل ہو (جیسا کہ اولاد و وارثین وغیرہ کی خوش حالی سن کر انسان کو مسرت ہوتی ہے) چوں کہ یہ چوتھی بشارت یعنی منکرین پر آپ کے متبعین کی بلندی وغلبہ، متبعین کے اوصاف میں سے تھی، لہٰذا اس کو ان تینوں اوصاف سے موئخر ذکر کیا، جو کہ آپ کی ذات بابرکات سے تعلق رکھتے تھے؛ اس لئے کہ ذاتی اوصاف بہ ابتداء زیادہ اہم ہے۔ اس کے بعد بہ طور خوش خبری اس وصف رابع کو بیان کیا، جو دنیا میں متبعین کی بابت ہے، تا کہ آپ کو کامل سکون وسرور حاصل ہو جائے، ان انعامات واکرامات سے جو آپ کو اور آپ کے متبعین کو عطا ہوئے۔ (انتہی)

(صاحب بحر نے ان چاروں وعدوں کی ترتیب ذکری کی بابت جس نکتے کو بیان کیا) اس کے تئیں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ علوم قرآنی میں سے ہے اور ان علوم وہبیہ میں سے ہے، جو علمائے اسلام کو ملک علام کی جانب سے عطا ہوئے ہیں۔ بات ہے تو صرف یہی ہے ورنہ پھر کچھ بھی نہیں ہے۔

حدیثِ مطلب

اس کا مطلب ہرگز وہ نہیں ہے جسے یہ بد بخت گڑھتا اور علم وایمان سے محروم اپنے بدقسمت متبعین کے سامنے ڈینگیں مارتا ہے؛ چناں چہ یہ لعین اپنی کتاب ''ازالۃ الاوہام'' وغیرہ میں اس طرف گیا ہے کہ (''اِنِّیْ رَافِعُکَ اِلَیَّ'') سے مراد آپؑ کی روح کو مقعد صدق پر اٹھانا اور آسمان پر ٹھکانا دینا ہے، جیسا کہ ''حمامۃ البشری'' میں لکھا ہے، جسے اس نے طرابلسی مذکور کی کتاب -ص:٣٥- سے نقل کیا ہے۔ اس کے جواب میں علمائے اسلام نے یہ کہتے ہوئے اس کے منہ میں تالا لگا دیا کہ: وہ چیز جسے یہود نے قتل کرنے اور سولی دینے کا ارادہ کیا تھا، وہ آپؑ کا جسم اطہر ہی تھا (نہ کہ روح) اس لیے رفع بھی اسی کا ہوا۔ یہ بد بخت پھر یہ کہنے لگا کہ: رفع سے مراد رفع درجہ ہے، جسے اس کے متبعین منہ پھاڑ پھاڑ کر رفع روحانی سے تعبیر کرتے ہیں اور پہلے قول کو رفع روح سے۔ اس کمینے نے اس بات کو اپنے عربی خطوط کے مجموعہ -ص:١٦٥- کے حاشیے میں

بھی ذکر کیا ہے۔ افسوس یہ بد بخت خود ہی اپنی بات کو اور اس کے انجام کو نہیں سمجھتا اور پاگلوں کی طرح الٹی سیدھی باتیں بکتا رہتا ہے؛ چناں چہ علمائے اسلام نے اس کے جبڑے کو کاٹ دیا اور اس کی خباثتوں کو ختم کر دیا۔ یہی اس افتراء پردازی کا صحیح بدلہ بھی ہے۔ کیوں کہ بالا جماع رفعِ درجہ مقربین کا نصیبا ہے ہی، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

"يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ" (مجادله : ۱۱)

''اللہ تعالیٰ تم میں ایمان والوں کے اور (ایمان والوں میں) ان لوگوں کے (اور زیادہ) جن کو علم (دین) عطا ہوا ہے (اخروی) درجے بلند کر دے گا''۔

(پس رفع درجات میں آپؑ ہی کی کیا خصوصیت ہے؟ جسے اس انتہائی اہم اور نازک موقع پر، جب کہ دشمنوں کے نرغے میں تھے اور وہ آپ کے قتل کے درپے تھے، ذکر کیا جاتا؟ اگر آپ کے لئے اس میں تسلی کا کوئی سامان تھا تو رفع جسمانی ہی کی صورت میں ہے، جیسا کہ علمائے اسلام کا عقیدہ ہے)۔

جب توفی اس کے نزدیک بہ معنیٰ موت ہے اور رفع بہ معنیٰ رفع درجہ، تو سارے کے سارے الفاظ مقربین کے تئیں مطابق عادت ہی رہے اور عبارت قرآنی کسی نئے فائدے سے خالی رہی، اس لئے کہ حضرت عیسیٰؑ کو تو اس میں کوئی شک وشبہ ہی نہ تھا۔ اگر چہ سولی بھی دے دی گئی ہوتی -العیاذ باللہ- کہ اللہ رب العزت کے نزدیک آپ بلند مرتبے والے اور مقربین میں سے ہیں اور رفع درجات ہر حال میں حاصل ہے، نیز اگر یہاں رفع درجہ ہی مقصود تھا تو ضروری تھا کہ اسی کو مقدم کیا جاتا، کیوں کہ یہی جز مقصود تھا، نیز اس لئے بھی اس کی تقدیم ضروری تھی کہ اس ملعون کے زعم باطل کے مطابق یہ جملہ دشمنوں کے اس قول کا رد ہے کہ آپ کو موت لعنت ہوئی۔ یہ بات کیسے صحیح ہو سکتی ہے (کہ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ آپ کو موت لعنت نہیں ہوگی) جب کہ آپؑ کو مصیبت اخرویہ سے حفاظت وسلامتی کا علم پہلے سے تھا، چناں چہ آپ نے ماں کی گود ہی میں بہ حکم خداوندی فرما دیا تھا:

"وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا" (مريم : ۳۳)

''اور سلام ہے مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن میں مروں اور جس دن اٹھ کھڑا ہوں زندہ ہو کر''۔

نیز اگر رفع سے رفع درجہ مراد ہو تو آپؑ کے نزول موعود سے ضروری اور بدیہی طور پر رفع درجہ کی ضد یعنی درجات سے نزول مراد ہوگا (حالانکہ کسی نبی ورسول کی بابت ایسا خیال گمراہی وضلالت ہے) اللہ بچائے ایسی غلط سوچ، نفس کی کجی اور دین کی گمراہی سے۔ رہی یہ بات جو یہ بدنصیب چکی کے گدھے کی طرح

دانت پیس پیس کر کہتا ہے کہ: ''جس کو سولی دی گئی، وہ بہ حکم تورات ملعون ہے۔ (سولی دینے سے) یہود کا مقصد بھی یہی تھا (کہ آپ ملعون ہو جائیں) مگر اللہ رب العزت نے سورہ نساء میں (بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ'' فرما کر) اس کی تردید کر دی (کہ تم کہتے ہو کہ عیسیٰ ملعون ہیں، یہ بالکل غلط ہے؛ بلکہ انھیں رفع درجہ حاصل ہے'') (انتہی)۔ سو علمائے اسلام نے تورات کی عبارتوں کو نقل کر کے اسے رسوا کر دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ تورات میں اسی مصلوب کو ملعون قرار دیا گیا ہے جو اپنے کسی جرم کی وجہ سے مستحق لعنت ہوا ہو، پھر بہ حکم تورات اس کو سولی دی گئی ہے۔ نہ کہ اس شخص کو ملعون قرار دیا گیا ہے، جسے ظلماً سولی پر چڑھا کر شہید کر دیا گیا ہو، ایسی بات تو کسی بھی دین سماوی میں ممکن ہی نہیں (کہ ہر مصلوب ملعون ہے، خواہ اس نے کوئی جرم نہ کیا ہو)۔ رہی قرآن کی غرض تو وہ سرے سے واقعے ہی کی نفی کرنا اور اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہے، نہ کہ کسی زعم فاسد (کو تسلیم کرتے ہوئے اور اس) کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے نتیجہ مرتب ہونے کا انکار، چناں چہ اس نے منشائے شبہ کی جڑ ہی اکھاڑ دی، لیکن یہ بد بخت گمراہی و بے دینی پر چلتا رہا اور ایمان کی طرف راہ نہ پا سکا۔ (چناں چہ یہود کی ہاں میں ہاں ملا کر صرف نتیجہ - یعنی موت لعنت - کا منکر رہا)۔ العیاذ باللہ۔



فصل

بابت ارشاد باری: ''وَمُطَهِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا''

اللہ رب العزت نے عیسیٰ علیہ السلام کے دشمنوں کو نجس اور گندہ قرار دیا اور آپ کی ان سے نجات دہی کو پاک کرنا، جو رفع جسمانی ہی سے ہو سکتا ہے، کیوں کہ کفار کے پنجوں سے اللہ تعالیٰ کا آپ کو بچانا، آپ کی ذات اور جسم کی حفاظت کے بغیر ممکن ہی نہیں، جیسا کہ انبیاء علیہم السلام کی حفاظت وصیانت کی بابت اللہ رب العزت کا طریقہ کار رہا ہے، نیز یہی سلف سے منقول بھی ہے، چنانچہ ''درمنثور'' (ج:۲، ص:۶۴، ۶۵) میں ہے کہ: ''ابن جریر اور ابن ابی حاتم روایت کرتے ہیں کہ حسنؒ ارشاد باری: ''وَمُطَهِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا'' کی تفسیر ''طهره من اليهود والنصارى والمجوس ومن كفار قومه'' سے کرتے ہیں (یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہود، نصاریٰ، مجوس اور آپ کی قوم کے کفار سے پاک کیا) نیز درمنثور ہی میں مذکورہ روایت سے تھوڑا پہلے بہ حوالہ اسحاق بن بشر و ابن عساکر حضرت حسنؒ سے ان الفاظ کے ساتھ اس کی تفسیر منقول ہے ''ومخلصك من اليهود فلا يصلون الى قتلك'' (میں آپ کو یہود سے بچالوں گا، لہٰذا وہ آپ کو قتل نہ کر سکیں گے) اور بہ حوالہ ابن جریر، محمد بن جعفر بن الزبیر سے شان نزول کی بابت منقول ہے ''اذهموا منك بما هموا'' (کہ یہ آیت کریمہ اس وقت نازل ہوئی، جب یہود نے عیسیٰ علیہ السلام کے تئیں برا ارادہ کیا۔ یعنی آپ کے قتل کے درپے ہوئے، تو آپ کی تسلی کے لیے یہ آیت نازل ہوئی کہ آپ گھبرایئے نہیں میں آپ کو ان سے بچالوں گا اور چھٹکارا دے دوں گا) دیگر مفسرین سے بھی اس آیت کی بابت ایسی ہی باتیں منقول ہیں۔

اس جاہل کا کہنا ہے [غالباً انجیل برناباس سے اس نے یہ قول لیا ہے، اس لیے کہ یہ بات اس میں مجھے ملی] ''کہ: اس آیت کی بابت مفسرین نے جو کچھ لکھا ہے، مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں، میرے نزدیک آیت کی مراد آپ اور آپ کی والدہ کی بہ زبان خاتم الانبیاء ﷺ، یہود کی تہمتوں اور الزام تراشیوں سے، براءت و پاکی کا اظہار ہے''۔ علمائے اسلام نے اس کے اس قول کی تردید بایں طور فرمائی کہ حضور ﷺ تو یہاں محض حضرت عیسیٰ ﷺ کی اس بات کے ناقل ہیں، جو انہوں نے اپنی اور اپنی والدہ صدیقہ کی پاکی و براءت کی

بابت شیر خوارگی کی عمر میں فرمائی تھی، نیز آپ ﷺ انہیں الفاظ کو نقل بھی کر رہے ہیں (جو حضرت عیسیٰ نے فرمائے تھے، نہ کہ اپنی طرف سے کوئی نئی بات فرما رہے ہیں) اور ان الزامات سے برأت اس سے پیشتر "تکلم فی المھد" سے ہو چکی ہے (اور جو امر پہلے گذر چکا ہو اس کا آئندہ وعدہ نہیں ہو سکتا) حالاں کہ یہاں وعدہ کیا جا رہا ہے، جو من جانب اللہ عنقریب واقع ہوگا۔ (اور وہ جسم ہی کی حفاظت وصیانت کی بابت ہو سکتا ہے، ورنہ) بعد موت تہمتوں سے براءت کے کیا معنیٰ؟ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:۔

لا لفینک بعد الموت تندبنی ☆ وفی حیاتی مازودتنی زادی

"میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ مرنے کے بعد تو مجھ پر روئے، جب کہ زندگی میں تو مجھے میرے حصہ کا توشہ بھی نہیں دیا"۔

(یعنی جب زندگی میں اچھا برتاؤ نہیں تھا تو مرنے کے بعد رونے سے کیا فائدہ؟ اسی طرح دشمنوں کے حملے کے وقت اگر عیسیٰ علیہ السلام کی حفاظت نہیں کی گئی، بلکہ بہ قول قادیانی دشمنوں نے آپ کو زدوکوب کیا، میخیں ٹھوکیں اور طرح طرح سے ستایا، ان سب مصیبتوں سے گزرنے اور وفات پا جانے کے بعد برأت کا اعلان کیا گیا۔ تو سوال یہ ہے کہ ایسی براءت کس کام کی اور اس براءت سے کیا فائدہ؟)۔

حاصل کلام یہ کہ "توفی" کا نتیجہ تسلم (قبضہ کرنا اور پورا کا پورا لے لینا) اور "رفع الی السماء" کا نتیجہ "دشمنوں سے پاک کرنا" ہے۔ پس اس سے دوبارہ یہ ثابت ہو گیا کہ رفع سے مراد رفع جسمانی ہی ہے، نیز احادیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ چناں چہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

"ان رھطاً من الیھود سبوہ وامہ، فدعا علیھم فمسخھم قردۃ وخنازیر، فاجتمعت الیھود علی قتلہ، فاخبرہ اللہ بانہ یرفعہ الی السماء، ویطھرہ من صحبۃ الیھود"

"کہ یہود کی ایک جماعت نے عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کی والدہ مطہرہ کو سب وشتم کیا، اس پر آپ نے بددعا کردی، تو وہ مسخ ہو کر بندر وخنزیر بن گئے، جس کی وجہ سے یہود آپ کو (معاذ اللہ!) قتل کرنے کے لئے جمع ہو گئے، اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو بشارت دی کہ (آپ گھبرائیے نہیں) میں آپ کو آسمان پر اٹھا لوں گا اور ان کی صحبت سے پاک کردوں گا"۔

نسائی وغیرہ نے اس حدیث کی تخریج کی ہے کما ذکرہ فی "السراج المنیر"۔ لہٰذا قادیانی کی بکواس کا مقصد سوائے انوکھی باتوں کے بیان کرنے اور سلف کے طریقے سے ہٹنے کے کچھ نہیں ہے، موسیٰ علیہ السلام کی یہود کی اتہام طرازی سے برأت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"فَبَرَّاَهُ اللهُ مِمَّا قَالُوْا ط وَكَانَ عِنْدَ اللهِ وَجِيْهاً" (احزاب : ۶۹)

"اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو بری ثابت کردیا اور وہ اللہ کے نزدیک بڑے معزز پیغمبر تھے"۔

اور عیسیٰ علیہ السلام کی وجاہت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا:

"وَجِيْهاً فِى الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ" (آل عمران، ۴۵)

"عیسیٰ باآبرو ہوں گے (خدا کے نزدیک) دنیا میں (بھی کہ ان کو نبوت عطا ہوگی) اور آخرت میں بھی کہ اپنی امت کے مؤمنین کے باب میں مقبول الشفاعت ہوں گے اور منجملہ مقربین (عنداللہ) ہوں گے"۔

جب کہ یہ بات واضح ہے کہ مصلوبیت و مقتولیت اس عالم دنیوی میں ذلت و رسوائی کا سبب ہے، جو منافی وجاہت ہے، چوں کہ آپ کو "وجیھاً فِی الدُّنیا وَالآخِرَةِ" سے موصوف کیا گیا، اس لیے آپ مصلوب نہیں ہو سکتے) یہی آیت کریمہ :

"وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِیْ اِسْرَآئِيْلَ عَنْكَ (مائدہ: ۱۰)

"اور جب روکا میں نے بنی اسرائیل کو تجھ سے"۔

سے بھی مراد ہے۔ آیت کریمہ "وَاِذْ كَفَفْتُ ...الآیہ"، "وَجِيْهاً فِى الدُّنْيَا... الآیہ" کی جگہ پر اور "وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ... الآیہ" کے عوض کے طور پر وارد ہوئی ہے، گویا "وَاِذْ كَفَفْتُ ... الآیہ، کی جو مراد ہے، وہی "وَجِيْهاً فِى الدُّنْيَا... الآیہ" اور "وَمُطَهِّرُكَ ... الآیہ. کا بھی مفہوم ہے۔ سرسید احمد خاں نے جو کچھ ذکر کیا ہے وہ بالکل لغو بے معنی بات ہے "کف" اور "تطہیر" میں آپ کی نجات وہی بہ تمام و کمال موجود ہے، اسی وجہ سے "واذ نجیتک عنهم" (۱) نہیں کہا گیا، پس "تطہیر" اور "کف"

(۱) مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹیؒ "شہادۃ القرآن ج:۱ص:۹۵-۹۶ میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

آیت مبارکہ: "واذ كففت بنى اسرائيل عنك" میں لفظ "کف" کے متعلق ایک دقیق نکتہ یہ ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِیْ اِسْرَآئِيْلَ عَنْكَ" (اور جب ہٹار کھا میں نے تجھ سے بنی اسرائیل کو) اور یہ نہیں فرمایا: "واذ نجيتك من بنى اسرائيل" (یعنی جب بچایا تجھ کو بنی اسرائیل سے) جیسے کہ دوسرے مقام پر بنی اسرائیل کو اپنی نعمت یاد کرائی "وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ" (بقرہ:۴۹- اور جب بچایا ہم نے تم کو آل فرعون سے، پہنچاتے تھے تم کو بہت برا عذاب) کیوں کہ اس صورت میں وہم پڑ سکتا ہے کہ یہود نے حضرت عیسیٰ کو گرفتار کرلیا ہوگا اور کچھ اذیت بھی پہنچائی ہوگی؛ مگر آخر کار اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کے ہاتھ سے بچالیا ہوگا۔ جیسا کہ عقیدہ ملعونہ ذکر کیا جاتا ہے، جس طرح کہ بنی اسرائیل فرعون کے ملک میں غلام تھے اور وہ ان کو ہر طرح کی تکالیف پہنچاتا تھا، مگر آخر کار اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کے ظلم سے نجات دی؛ لیکن پہلی صورت میں یعنی قرآن شریف کے الفاظ میں اس وہم کی سراسر تردید ہے۔ یعنی اول تو لفظ نجات (بچانا) کی بجائے لفظ "کف" (ہٹار کھا) استعمال کیا، دوم یہ کہ "کف" کا مفعول بنی اسرائیل کو کیا، نہ کہ "ک" ضمیر مخاطب کو، جو عیسیٰ کے لیے ہے۔ یعنی یہ نہیں کہا: "کففتک عن بنی اسرائیل" (ہٹار کھا تجھ کو بنی اسرائیل سے) کیوں کہ ارادہ ضرر پہنچانے کا یہودیوں کا تھا، نہ

کے معنی یہ ہوئے کہ وہ اپنے ہاتھ بھی آپ کو نہیں لگا سکتے (مارنے اور قتل کرنے کی بات تو دور) نہ کہ جیسا اس بد بخت کا زعم ہے کہ انہوں نے سوائے موت ہر طرح کی آپ کو اذیت دی، سولی پر لٹکایا اور بے عزت کیا، یہ تو العیاذ باللہ! یہود و نصاریٰ کی اتباع میں قرآن کریم کو پس پشت ڈال دینا ہے۔

یہ جو میں نے کہا کہ: ان سب باتوں کو اس نے نصاریٰ سے چرایا ہے اور اسلام، مسلمان نیز قرآن مبین کی واضح نصوص کو پس پشت ڈال کر اسلام کے قلادے کو گردن سے پھینک دیا اور گمراہ و برباد ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آیت کریمہ میں اس بات پر بھی دلالت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو اس واقعہ (مکر یہود) کے بعد زمین پر باقی نہیں رکھا (بلکہ آسمان پر زندہ اٹھالیا) کیوں کہ بنی اسرائیل اولاد انبیاء سے تھے، نیز مسلمان بھی تھے، وہ کافر تو اس وقت ہوئے جب انہوں نے حضرت عیسیٰ کی رسالت و نبوت کا انکار کیا، پس جب اللہ تعالیٰ نے انکے درمیان آپ کو رکھنا پسند نہ کیا اور نہ ہی ارض مقدس میں (جو کہ سرزمین انبیاء ہے) تو دوسرے بت پرستوں کیساتھ (کفرستان میں) آپ کو کیوں کر رکھ سکتا تھا، جیسا کہ اس بے دین قادیانی کا خیال ہے کہ آپ علیہ السلام کشمیر میں مدفون ہیں، یہ ایک خیالی اور فرضی وسوسہ ہے، جس کی عقل و نقل میں کوئی اصل نہیں۔ آیت کریمہ کا مدلول عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کفار کے رہن سہن اور معمولی تعلقات کی بھی نفی کرنا ہے (نہ کہ ہمیشہ ہمیش کے لیے کفرستان میں مدفون ہونے کو ثابت کرنا) فخذل ذلک المفتری واخزاه، ولا حول ولا قوة الا باللہ۔

انہی کو ہٹا رکھنے کا ذکر مناسب ہے۔ سوم یہ کہ "کف" کا صلہ "عن" ذکر کیا جو بُعد (دوری) کے لیے آتا ہے۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول برحق سے دشمنوں کو بالکل ہٹائے رکھا اور آپ کے پاس تک پھٹکنے نہ دیا، تو پھر وہ کس طرح آپ کو کوئی اذیت پہنچا سکتے ہیں اور کیسے صلیب پر کھینچ سکتے ہیں؟ یہی آیت یعنی "وَاِذْ كَفَفْتُ" دوسری آیت "وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" (کافروں سے تجھے پاک رکھنے والا ہوں) کی صحیح تفسیر ہے، کہ اس میں بھی تطہیر سے مراد یہی ہے کہ عیسیٰ یہودیوں کے ہاتھ سے پاک رہیں گے۔ جملہ معتبر تفاسیر میں اس آیت "وَاِذْ كَفَفْتُ" کے ذیل میں ایسا ہی مذکور ہے جیسا کہ ذکر کیا گیا، کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک رسول حضرت روح اللہ علیہ السلام کو یہود کے ہاتھ میں گرفتار نہیں ہونے دیا اور کوئی گزند پہنچنے نہیں دیا"۔ (محمد صغیر)

فصل

بابت ارشاد باری: "وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ... الآية"

اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ متبعین سے مراد اولاً ہدایت یافتہ نصاری ہیں، ثانیاً مسلمان اور اتباع سے مراد اتباع صحیح ہے (یعنی ان کے بتلائے ہوئے طریقے پر چلنا) نہ کہ فقط دعوائے محبت، ظاہری اتباع اور ادعائے اتباع۔ اس بابت شوکانیؒ کا ایک مستقل رسالہ بھی ہے، جس کا خلاصہ "فتح البیان" میں موجود ہے، انھوں نے اتباع کو عام رکھا ہے، خواہ اتباع حقیقی ہو، یا صوری جیسا کہ نصاری کی اتباع۔ وہ فرماتے ہیں کہ نصاری، کے اس عموم کے تحت داخل ہو جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ دین صحیح پر کسی درجے میں قائم ہیں، بلکہ وہ سب کے سب آخرت میں ہلاک و برباد ہونے والے ہیں، اسی وجہ سے اس آیت کریمہ کے بعد ارشاد باری ہے:

"ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝ فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَاباً شَدِيْداً فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ، وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝" (آل عمران: ۵۵-۵۷)

"پھر (جب قیامت آجائیگی اس وقت) میری طرف ہوگی سب کی واپسی، سو میں (اس وقت) تمہارے (سب کے) درمیان (عملی) فیصلہ کردوں گا، ان امور میں جن میں تم باہم اختلاف کرتے تھے (من جملہ ان امور کے مقدمہ ہے عیسیٰ علیہ السلام کا)، تفصیل (فیصلہ کی) یہ ہے کہ: جو لوگ (ان اختلاف کرنے والوں میں) کافر تھے، سو ان کو (ان کے کفر پر) سخت سزا دوں گا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور ان لوگوں کا کوئی حامی نہ ہوگا اور جو لوگ مومن تھے اور انھوں نے نیک کام کئے تھے، سو ان کو اللہ تعالیٰ ان کے (ایمان اور نیک کاموں کے) ثواب دیں گے اور (کفار کو سزا ملنے کی وجہ یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ محبت نہیں رکھتے (ایسے) ظلم کرنے والوں سے (جو خدا تعالیٰ یا پیغمبروں کے منکر ہوں)"

واضح رہے کہ اسم ضمیر لوٹاتے ہوئے: "وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَهُمْ" نہیں فرمایا (بلکہ "فوق الذين كفروا" فرمایا) اس لئے کہ یہ کفار جو ترک اتباع کی وجہ سے کافر ہو گئے ہیں۔ ان کفار کے

علاوہ ہیں جنھوں نے سرے سے اتباع ہی نہیں کی، اوران کفار میں سے بہت سے گزر چکے اور بہت سے قیامت تک آنے والے ہیں۔ اس بابت حافظ ابن تیمیہ کی کتاب ''الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح'' سے کچھ باتیں احقر نے نقل کی ہیں، جنھیں کتاب مذکور کے مختلف مقامات سے جمع کیا ہے اور یہاں ایک ساتھ ذکر کررہا ہوں، ان میں سے بعض باتیں تو گزشتہ فصلوں اور بحثوں کے سمجھنے میں مفید ومعین ہوں گی اور بعض آنے والی بحثوں میں، قارئین کرام ان باتوں کو خود مناسب موقع ومحل پر منطبق کرلیں۔ ابن تیمیہ کے شاگرد ابن کثیر نے اس تفسیر کو اپنی مشہور تفسیر (تفسیر القرآن العظیم) میں اور ابن قیم نے اپنی کتاب ''ہدایۃ الحیاری'' میں ذکر کیا ہے۔ دیکھئے سورہ اعراف کی آیت: ۱۵۷:

''اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ ط فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ o''

''جولوگ ایسے رسول نبی امی کا اتباع کرتے ہیں، جن کو وہ اپنے پاس تورات وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں (جن کی صفت یہ بھی ہے کہ) وہ ان کو نیک کاموں کا حکم فرماتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں اور پاکیزہ چیزوں کو ان کے لئے حلال بتاتے ہیں (گو وہ پہلی شرائع میں حرام تھیں) اور گندی چیزوں کو (بدستور) ان پر حرام فرماتے ہیں اور ان لوگوں پر (پہلے شرائع میں) جو بوجھ اور طوق (لدے ہوئے) تھے (یعنی سخت اور شدید احکام جن کا ان کو پابند کیا تھا) ان کو دور کرتے ہیں (یعنی ایسے سخت احکام ان کی شریعت میں منسوخ ہوجاتے ہیں) سو جو لوگ اس نبی پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں اور اس نور کا اتباع کرتے ہیں، جو ان کے ساتھ بھیجا گیا ہے (یعنی قرآن) ایسے لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں (کہ ابدی عذاب سے نجات پائیں گے)''۔

اس آیت میں تمام مومنین کو ایک امت قرار دیا گیا ہے، جو آنے والے نبی امی کی اتباع کرتے ہیں کہ یہ بھی گزشتہ انبیاء کی اتباع ہے، اس لئے کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنی اتباع کا حکم اس بنیاد پر دیا کہ جس نے آپ ﷺ کی اتباع کی، اس نے درحقیقت خدا کے حکم کی اتباع کی، چناں چہ ارشاد نبوی ہے: ''من اطاعنی فقد اطاع اللہ'' نیز دین اسلام اصولی طور پر شروع سے آخر تک (از آدم تا محمد صلی اللہ علیہما وسلم) ایک ہی ہے، ہر زمانے میں مختلف انبیاء کی آمد اور ان کی اتباع سے، دین میں تعدد لازم نہیں آتا، کہ دین کے بنیادی

اصول تو ہمیشہ ایک ہی رہے ہیں، ارشاد ربانی ہے:

"شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ" (شوری: ۱۳)

"اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے واسطے وہی دین مقرر کیا، جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جس کو ہم نے آپ کے پاس وحی کے ذریعہ بھیجا ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم، موسیٰ کو حکم دیا تھا (اور ان کی امم کو یہ کہا تھا) کہ اس دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا"۔

(مراد اس دین سے اصول دین ہیں، جو مشترک ہیں تمام شرائع میں، مثلاً توحید و رسالت وغیرہ)(۱)

ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں پہلے باضابطہ صاحب شریعت رسول حضرت نوح کا ذکر ہے، پھر "وَالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ" سے آخری صاحب شریعت رسول حضور اکرم علیہ کا تذکرہ، اس کے بعد علی الترتیب ان دونوں رسل کے درمیان آنے والے اولوالعزم رسل: حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کا تذکرہ کیا گیا۔ یہی وہ وصیت تھی، جس کا عہد و پیمان سب سے لیا گیا تھا۔

الغرض دین بھی ایک ہی اور حق بھی ایک ہی ہے، انبیاء کرام علیہم السلام کی اتباع سے تعدد نہیں ہوا، اوّل سے آخر تک حق ایک ہی چیز ہے اور تمام اہل حق ایک ہی قوم ہیں مسلم شریف کی یہ حدیث اس پر بالکل صادق آتی ہے:

"عن جابر بن عبدالله قال: سمعت النبی صلی الله علیه وسلم یقول: "لا تزال طائفة من امتی، یقاتلون علی الحق، ظاهرین الی یوم القیٰمة، قال: فینزل عیسی ابن مریم صلی الله علیه وسلم فیقول امیرهم: تعال! صل لنا، فیقول: لا، ان بعضکم علی بعض امراء، تکرمة الله هٰذه الامة" (مسلم ۱/۸۷)

"حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ علیہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: میری امت میں ایک جماعت (قرب) قیامت تک حق کے لیے سربلندی کے ساتھ برسرِ پیکار رہے گی، فرمایا: پس عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام نازل ہوں گے، تو اس جماعت کا امیر ان سے کہے گا "آئیے! نماز پڑھائیے" آپ فرمائیں گے: نہیں، اللہ نے اس امت کو اعزاز بخشا ہے۔ اس لیے تم (ہی) میں سے بعض، بعض کے امیر ہیں"۔

(۱) علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی اس آیت کے تحت لکھتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں حق تعالیٰ نے صاف طور پر بتلا دیا کہ اصل دین ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے، کیوں کہ عقائد، اخلاق، اور اصول دیانات میں سب کے سب متفق رہے ہیں، البتہ بعض فروع میں حسب مصلحت زمانہ کچھ تفاوت ہوا اور دین کے قائم کرنے کے طور و طریق ہر وقت میں اللہ تعالیٰ نے جدا ٹھہرا دیے ہیں، جس کو دوسری جگہ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا فرمایا گیا ہے (ترجمہ شیخ الہند ص: ۶۴۴) محمد صغیر

تفسیر ''درمنثور'' میں اس بابت بہت سے آثار منقول ہیں، ان میں سے چند ایک ملاحظہ ہوں:

"اخرج ابن ابی حاتم وابن عساکر عن النعمان بن بشیر سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: "لا تزال طائفة من امتی ظاهرین لا یبالون من خالفهم حتی یأتی امر اللہ". قال النعمان: فمن قال: انی اقول علی رسول اللہ ما لم یقل فان تصدیق ذلک فی کتاب اللہ –تعالی– قال اللہ تعالی: "وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ". (درمنثور: ۶۵/۲)

''ابن ابی حاتم وابن عساکر روایت کرتے ہیں کہ: حضرت نعمان ابن بشیر نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ میری امت کا ایک گروہ مخالفین کی پرواہ کیے بغیر حق کی سربلندی کے لیے برسرپیکار رہے گا، یہاں تک کہ قیامت (قریب) آجائے گی۔ حضرت نعمان کہتے ہیں اگر کوئی یہ کہے کہ: میں حضور ﷺ کی جانب ایسی بات منسوب کررہا ہوں، جسے آپ نے نہیں فرمایا ہے، تو اس کی تصدیق قرآن کریم میں موجود ہے، ارشاد باری ہے: ''وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ'' (اور رکھوں گا ان کو جو تیرے تابع ہیں، غالب ان لوگوں سے جو انکار کرتے ہیں، قیامت کے دن تک)

نیز اس حدیث کو صاحب ''کنز العمال'' [ص: ۱۳۱، ج: ۷] نے ''المختارہ للضیاء'' کی جانب بھی منسوب کیا ہے غالباً یہ حدیث ''حسن'' کے درجے کی ہے۔

دوسری حدیث جسے ابن عساکر نے حضرت معاویہ بن ابی سفیان سے روایت کیا ہے، یہ ہے:

"عن معاویة بن أبی سفیان قال: سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: انها لن تبرح عصابة من امتی یقاتلون علی الحق، ظاهرین علی الناس حتی یأتی امر اللہ، وهم علی ذلک، ثم قرأ بهذه الآیة: "يٰعِيْسٰى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ". (درمنثور: ۶۵/۲)

''معاویہ بن ابی سفیان فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ: میری امت میں ایک جماعت غلبہ کے ساتھ، حق کی خاطر لوگوں سے قتال و جہاد کرتی رہے گی، یہاں تک کہ قیامت (قریب) آجائے گی اور وہ اسی حال پر رہیں گے''۔ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی: ''يٰعِيْسٰى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ...'' الخ؛ اے عیسیٰ، میں لے لوں گا تجھ کو اور اٹھالوں گا اپنی طرف اور پاک کردوں گا تجھ کو کافروں سے اور رکھوں گا ان کو جو تیرے تابع ہیں غالب ان لوگوں سے جو انکار کرتے ہیں، قیامت کے دن تک''۔

میں کہتا ہوں کہ: ''فتح الباری'' میں بھی اسی سند سے یہ حدیث ہے، جس میں یہ اضافہ ہے ''قال

معاذ : وھم بالشام ''(یعنی حضرت معاذ بن جبل نے فرمایا کہ: وہ جماعت شام میں ہے) بخاری: (۵۱۴/۱) میں بھی یہی ہے۔ لیکن مسند احمد میں حضرت ابو امامہ کی حدیث میں ہے: ''انھم ببیت المقدس ''(یعنی وہ گروہ بیت المقدس میں ہے) اسی طرح طبرانی میں بھی بہ روایت ابو عثمان نہدی و ابو ہریرہ ہے، نیز ابن حجر فرماتے ہیں کہ: ان لوگوں سے مراد جو بیت المقدس میں ہوں گے، وہ لوگ ہیں، جن کا دجال نکل کر محاصرہ کرے گا، پھر حضرت عیسیٰ انہی کے درمیان نازل ہوں گے، دجال کو قتل کریں گے اور دین اسلام مکمل طور پر حضرت عیسیٰ کے زمانے میں غالب ہو جائے گا۔ (انتہی)

اس امت محمدیہ کی فضیلت حضرت عیسیٰ کے نزول اور بیت المقدس و شام کی فضیلت کی بابت قولی وفعلی بہت سی احادیث ''کنز العمال'' میں موجود ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے:

''لا تزال طائفة من امتی یقاتلون علی الحق، ظاھرین علی من ناواھم حتی یقاتل آخرھم الدجال ''(حم، د، ک، عن عمران بن حصین) (کنز العمال: ۱۲/ ۱۶۵/ ۳۴۵۰۳)

''میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق کی سربلندی کے لیے مخالفین پر غلبے کے ساتھ برسرپیکار رہے گا، یہاں تک کہ اس امت کا آخری فرد دجال سے قتال کرے گا'' (اس روایت کو احمد، ابو داؤد اور حاکم نے حضرت عمران بن حصین سے روایت کیا ہے)

نیز اسی ''کنز العمال ''میں ہے:

''کذبوا الآن جاء القتال، الآن جاء القتال، لا یزال اللّٰہ یزیغ قلوب اقوام تقاتلونھم، ویرزقکم اللّٰہ منھم حتی یأتی امر اللّٰہ، وھم علی ذٰلک، و عقر دار الاسلام بالشام (ابن سعد عن سلمة ابن نفیل الحضرمی) .(۱۲/ ۱۷۸، رقم ۳۴۵۵۵)

''وہ جھوٹ کہیں گے کہ: اب قتال واجب ہوا، اب قتال واجب ہوا۔ اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کے قلوب ٹیڑھا کرتے رہیں گے، جن سے تم قتال کرو گے اور ان سے تمہیں رزق عطا فرمائیں گے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا آخری حکم (قیامت) آجائے، جب کہ وہ لوگ اسی حالت میں رہیں گے اور دار الاسلام کا مرکز تو شام میں ہے''۔ (اس روایت کو ابن سعد نے حضرت سلمہ بن نفیل حضرمی سے روایت کیا ہے)''۔

یہاں صاحب ''کنز العمال'' نے فقط ابن سعد کے حوالے سے اسے ذکر کیا، لیکن اس سے ایک حدیث پہلے (یعنی نمبر: ۳۴۵۵۳ پر) جب اسے ذکر کیا تو پوری ایک جماعت کی طرف منسوب کیا: حم (مسند احمد)، والدارمی، ن (النسائی)، البغوی، طب (طبرانی)، حب (ابن حبان)، ک (مستدرک حاکم) ض

(سنن سعید ابن منصور) عن سلمة بن فضیل الکندی''۔

تیسری روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ہے، وہ فرماتے ہیں:

"ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یقول : لا تزال عصابة من امتی، یقاتلون علی الحق ظاھرین ، حتی ینزل علیھم عیسی ابن مریم. "قال الاوزاعی: فحدثت به قتادة. فقال :لا اعلم اولٰئک الا اھل الشام" (کنز العمال : ۶۱۸/۱۴، رقم: ۳۹۷۲۴)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: عیسی ابن مریم کے نازل ہونے تک میری امت میں ایک جماعت حق کے لیے سربلندی کے ساتھ برسرپیکار رہے گی۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ: میں نے یہ حدیث قتادہ کو سنائی تو انھوں نے کہا: میں سمجھتا ہوں کہ وہ جماعت اہل شام کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے(۱)۔ (اس روایت کو ابن عساکر نے روایت کیا ہے)

یہ احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ آیت کریمہ کا یہ ٹکڑا (''وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِلَی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ '' قرب قیامت میں حضرت عیسی علیہ السلام کے نزول کی خبر دیتا ہے، یا اس کا مقصد اساسی ہی یہی ہے، نیز اس سے یقین کے ساتھ یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ ارشاد باری:

" وَاِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ "(نساء : ۱۵۹)

''اور جتنے فرقے ہیں اہل کتاب کے سو یقین لاویں گے، اس پر اس کی موت سے پہلے)''۔

میں دونوں ضمیریں: ''بہ'' اور'' موتہ '' حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کی طرف لوٹ رہی ہیں اور اس معنی میں دونوں آیتوں کی تفسیر، احادیث مرفوعہ متواترہ سے، مرفوع ہو جاتی ہے، دونوں آیتوں کا مقصد لابدی طور پر ایک ہی ہے، اور کیوں نہ ہو، جب کہ پہلی آیت آپ علیہ السلام کے حالات، تاریخ اور سوانح پر مشتمل ہے۔ فسبحان من لا یسھو ولا ینسی.

(جب آیت کا مفہوم یہ ہے) تو اب نفس اس بات کا خواہاں نہیں رہے گا کہ: یہاں (اس آیت کریمہ میں) حضرت عیسی کے نزول کا ذکر کیوں نہیں ہے؟ جب قرب قیامت میں حضرت عیسی کے نزول کو مقدر فرمادیا ہے اور اس وقت مسلمان اور آپ کی قوم (نصاری) آپ کی اتباع کریں گے، تو آخر میں فرمادیا: ''اِلَی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ'' ورنہ آپ علیہ السلام کی شریعت کی بقا اور غیر منسوخ ہونے کا وہم ہو سکتا تھا۔

(۱) اس جماعت سے کون سی جماعت مراد ہے؟ اس میں ائمہ حدیث کے مختلف اقوال ہیں، ایک وہ ہے جو حضرت قتادہ کا اوپر نقل کیا گیا۔ علامہ نووی شارح مسلم کی رائے یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ یہ پوری جماعت کسی خاص طبقہ یا خاص علاقہ سے تعلق رکھتی ہو؛ بلکہ ہو سکتا ہے کہ یہ جماعت مسلمانوں کے تمام یا اکثر طبقات میں منتشر اور متفرق طور پر موجود ہو، یعنی اس جماعت کے کچھ افراد مثلاً: محدثین میں پائے جاتے ہوں، کچھ فقہاء میں، کچھ صوفیاء میں، کچھ مجاہدین میں، کچھ مبلغین میں وغیرہ وغیرہ۔ (حاشیہ نمبر: ۲، علامات قیامت اور نزول مسیح، ص ۸۵) محمد صغیر

چوں کہ آیت کریمہ کے عموم میں مسلمان بھی داخل ہے، اس لیے یہاں (''وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ'') میں لفظ ''اتباع'' ذکر کیا گیا، نہ کہ ''ایمان''۔ کیوں کہ مسلمانوں کا تو پہلے ہی سے حضرت عیسیٰ پر ایمان ہے (کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں اور قرب قیامت میں نزول فرمائیں گے) برخلاف ''وَإِنْ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ'' کے، کہ یہاں لفظ ''ایمان'' لایا گیا، معلوم ہوا کہ ''اتباع'' ایمان وتصدیق سے زائد چیز ہے؛ اسی لیے آپ کی اتباع کرنے والوں کو، خواہ یہ اتباع پوری قوم سے من حیث القوم ہی ہو، نہ کہ فرداً فرداً، ہر ایک کو قرب قیامت تک منکرین پر غلبہ عطا کیا گیا۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی سورہ ''صف'' کی آیت:

(''فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ'' (صف: ۱۴)

''پھر ایمان لایا ایک فرقہ بنی اسرائیل سے اور منکر ہوا ایک فرقہ پھر قوت دی ہم نے ان کو جو ایمان لائے تھے ان کے دشمنوں پر، پھر ہو رہے غالب'')۔

کی یہی تفسیر ذکر فرمائی ہے۔ چناں چہ تفسیر ''درمنثور'' میں سورہ ''نساء'' کی آیت: ۱۵۷: ''وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ'' کے تحت، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک اثر مذکور ہے، جس میں ہے:

''وقالت فرقة: كان فينا عبدالله ورسوله، وهؤلاء المسلمون، فتظاهرت الكافرتان على المسلمة، فقتلوها، فلم يزل الاسلام طامساً حتىٰ بعث الله محمداً ﷺ. فانزل الله: فَاٰمَنَتِ الطَّآئِفَةُ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ'' يعني الطائفة التي آمنت في زمن عيسىٰ عليه السلام: ''وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ'' التي كفرت في زمن عيسى - عليه السلام - فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا'' في زمن عيسىٰ عليه السلام. باظهار محمد دينهم على دين الكافرين. (درمنثور: ۲/۴۲۳) قلت: وهو الذي قال ابن كثير فيه: وهذا اسناد صحيح الى ابن عباس''.

''اور ایک فرقہ نے کہا کہ: خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہم میں تھا، یہ فرقہ مسلمانوں کا تھا۔ پس دونوں کافر فرقے مسلمانوں پر غالب ہو گئے اور ان کو کچل دیا، چناں چہ اسلام مغلوب رہا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا، اسی کی بابت ارشاد باری ہے ''فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ'' (پھر ایمان لایا ایک فرقہ بنی اسرائیل سے) یعنی وہ فرقہ جو کہ عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں مومن تھا۔ (آپ ﷺ کی بعثت کے بعد انھوں نے اسلام قبول کرلیا، جیسے حضرت عبداللہ بن سلام وغیرہ) ''وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ'' (اور منکر ہوا ایک فرقہ) وہ

فرقہ جو کہ آپ علیہ السلام کے زمانے ہی میں کافر تھا، اس نے حضور ﷺ کے ساتھ بھی کفر کیا۔ ''فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' (پھر قوت دی ہم نے (اللہ رب العزت نے) ان کو جو ایمان لائے تھے) یعنی عیسیٰ علیہ السلام ہی کے زمانے میں مومن تھے۔ نبی آخر الزماں ﷺ کی بعثت کے ذریعے اور ان کے دین کو کافروں کے دین پر غلبہ دیا (میں کہتا ہوں: حافظ ابن کثیر اس اثر کی سند کی بابت کہتے ہیں کہ: اس کی سند ابن عباس تک بالکل صحیح ہے)

اس اثر کا ایک ٹکڑا: ''رفعه عليه السلام من روزنة في البيت الى السماء'' گذر چکا۔

پس ثابت ہوا کہ اتباع سے مراد صحیح اور معتبر اتباع ہے۔ قرآن کریم نے صرف آپ علیہ السلام کے ابتدائی اور آخری حالات ذکر کیے، جب کہ ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے درمیانی حالات سے صرفِ نظر کر لیا، اس صورت میں آیت ''آل عمران'' عام ہوئی، جب کہ آیت ''صف'' کا ظاہر یہ ہے کہ: یہ بنی اسرائیل کے ان لوگوں کی بابت ہے، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے، اس موقع پر آیت ''حدید''(۱) کو بھی پیش نظر رکھا جائے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والے بنی اسرائیل پہلے (تنہا) یہود پر غالب ہوئے، پھر محمد ﷺ کے ساتھ۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ: اکثر بنی اسرائیل حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کے دین میں داخل ہو گئے تھے، بہت کم ہی یہودیت پر باقی رہے۔ رہے اہل روم و یورپ کے نصاریٰ تو وہ بنی اسرائیل میں سے ہیں ہی نہیں کہ ان سے اعتراض وارد ہو۔ پھر فوقیت کی اس بات کو تسلیم کرنے میں کیا اشکال ہے؟ اس لیے کہ مسلمان ہزار سال سے زیادہ عرصے تک پوری دنیا پر غالب رہے، اب مغلوب ہو گئے ہیں، تو یہ بھی علامات قیامت کی حدیثوں میں مذکور ہے اور عنقریب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان سے نزول کے بعد پوری دنیا پر پھر غالب ہو جائیں گے۔ انشاء اللہ۔

نبی اکرم ﷺ نے ہمارے غلبے کی خوش خبری بھی دی تھی اور مغلوب ہونے کی وعید بھی۔ حدیث

---

(۱) ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰىٓ اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا، وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ، وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ۵ وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا، مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ط فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ط وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۵ (حدید: ۲۷)

پھر ان کے بعد اور رسولوں کو یکے بعد دیگرے بھیجتے رہے اور ان کے بعد عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا اور ہم نے ان کو انجیل دی (ان کی امت میں دو قسم کے لوگ ہوئے، ایک ان کی اتباع یعنی ان پر ایمان لانے والے اور دوسرے انکار کرنے والے) جن لوگوں نے ان کی اتباع کیا تھا ہم نے ان کے دلوں میں شفقت اور ترحم پیدا کر دیا اور (ہماری طرف سے تو ان لوگوں کو صرف احکام میں اتباع کرنے کا حکم ہوا تھا، لیکن ان متبعین میں بعضے ایسے ہوئے کہ) انھوں نے رہبانیت کو خود ایجاد کر لیا، ہم نے ان پر اس کو واجب نہ کی تھی، لیکن انھوں نے حق تعالیٰ کی رضا کے واسطے اس کو اختیار کر لیا تھا، سو انھوں نے اس (رہبانیت) کی پوری رعایت نہ کی۔ سو ان میں سے جو (حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر) ایمان لائے ہم نے ان کو ان کا اجر دیا (مگر ایسے کم تھے) اور زیادہ ان میں نافرمان ہیں (کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے)۔ ابو طہ صغیر۔

کے مطابق یہ سب چیزیں ہو چکیں؛ پھر آپ ﷺ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان سے نزول اور (دوبارہ) امت محمدیہ کے غلبہ کی خوش خبری دی، جو عنقریب پوری ہوگی۔ ان شاء اللہ۔

لہٰذا پختہ ایمان والوں کو چاہیے کہ (ان حالات میں) ثابت قدم رہیں، جب ہمارے نبی ﷺ کا دین دائمی ہے، نیز اللہ رب العزت نے حضرت عیسیٰ سے فرمایا دیا ہے ''وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِلَى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ'' تو ضروری ہے کہ حضرت عیسیٰ اسی شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کے تابع ہو کر حاکم عادل اور مصنف کی حیثیت سے نازل ہوں۔ یہاں ''کلمۃ اللہ'' و ''روح اللہ'' کی بابت بھی ایک نکتہ ہے، جس سے ارشاد باری: ''وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ'' کی تفسیر ہی میں ارشاد باری:

''وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ط وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا'' (توبہ: ۴۰)

''اور اللہ تعالیٰ نے کافروں کی بات (اور تدبیر) نیچی کر دی (کہ وہ ناکام رہے) اور اللہ ہی کا بول بالا رہا''۔

بھی داخل ہو جائے گا۔



”الجواب الصحیح“ اور ”ھدایۃالحیاریٰ“ سے چند باتیں

مندرجہ ذیل باتیں حافظ ابن تیمیہؒ کی کتاب ”الجواب الصحیح“ اوران کے شاگرد حافظ ابن قیمؒ کی کتاب ”ھدایۃ الحیاریٰ“ سے پیش کی جارہی ہیں۔

کیا حضرت عیسیٰ کی صفت ناسوتی کا قتل ہوا؟

نصاری کہتے ہیں کہ: محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو آسمانی کتاب (قرآن مجید) لے کر آئے، اس میں حضرت عیسیٰ کے بارے میں یوں مذکور ہے:

”اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللہِ وَکَلِمَتُہٗ ط اَلْقٰھَآ اِلٰی مَرْیَمَ وَرُوْحٌ مِّنْہُ“

(نساء: ۱۷۱)

”مسیح عیسیٰ ابن مریم تو اور کچھ نہیں، البتہ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ تعالی کے ایک کلمہ ہیں، جس کو اللہ تعالی نے مریم تک پہنچایا تھا اور اللہ تعالی کی طرف سے ایک جان ہیں“۔

جو ہمارے عقیدے کے بالکل مطابق ہے، اس لیے کہ اس میں ہے کہ: وہ ہماری طرح ایک انسان تھے، جو مریم کے بطن سے پیدا ہوئے اور اللہ تعالی کا کلمہ اور اس کی روح ہیں، جو آپ میں حلول کیے ہوئے ہے (گویا حضرت عیسیٰ ناسوتی و لاہوتی دونوں صفات کے حامل و مجموعہ ہیں) اور جب واقعہ یہ ہے، تو یہ نہیں ہوسکتا کہ اللہ کا کلمہ اور اس کی روح بالکل ہماری طرح محض ایک مخلوق ہو، (اور اسے فنا ہو، جب کہ یہ بھی متعین ہے کہ آپ کو سولی دی گئی۔ اس لیے ماننا پڑے گا کہ) ارشاد باری:

”وَمَاقَتَلُوْہُ وَمَاصَلَبُوْہُ وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ“ (نساء: ۱۵۷)

”کہ انھوں نے نہ تو حضرت عیسیٰ کو قتل کیا اور نہ سولی پہ چڑھایا، لیکن ان کو اشتباہ ہوگیا“۔

میں حضرت عیسیٰ کی اس صفت الٰہیہ کی جانب اشارہ کیا گیا، جو اللہ کا کلمہ ہے، جسے نہ تو کوئی تکلیف پہنچی اور نہ کوئی دقت و پریشانی پیش آئی بلکہ اس کو اٹھالیا گیا، (یعنی آیت کریمہ میں سولی اور قتل کی جو نفی ہے، وہ فقط آپ علیہ السلام کی صفت لاہوتی سے متعلق ہے، کہ صفت لاہوتی کو نہ تو قتل کیا گیا اور نہ سولی دی گئی، رہی صفت ناسوتی تو اس کی نفی نہیں ہے اس لیے ہم کہتے ہیں اسی صفت کا قتل ہوا اور سولی دی گئی۔) اسی طرح ارشاد باری ہے:

"یٰعِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَهِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ" (آل عمران :۵۵)

"اے عیسیٰ! میں لے لوں گا تجھ کو اور اٹھالوں گا اپنی طرف اور پاک کردوں گا تجھ کو کافروں سے اور رکھوں گا ان کو جو تیرے تابع ہیں غالب، ان لوگوں سے جو انکار کرتے ہیں، قیامت کے دن تک"۔

اور سورہ مائدہ میں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

"وَکُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ ۚ وَاَنْتَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ" (۱۱۷)

"میں ان کی (حالت پر) مطلع رہا، جب تک ان میں (موجود) رہا (سو اس وقت تک کا حال تو میں نے مشاہدہ کیا ہے، اس کے متعلق بیان کر سکتا ہوں) پھر جب آپ نے مجھ کو اٹھالیا (اس وقت صرف) آپ ان (کے احوال) پر مطلع رہے (اس وقت مجھ کو خبر نہیں کہ ان کی گمراہی کا سبب کیا ہوا اور کیوں ہوا؟) اور آپ ہر چیز کی پوری خبر رکھتے ہیں"۔

یہاں موت سے مراد اس صفت ناسوتی (طبیعت انسانی) کی موت ہے، جو مریم عذراء کے بطن سے پیدا ہوئی اور جو سورہ نساء میں ہے:

"وَمَا قَتَلُوْهُ یَقِیْنًا ۚ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ ۚ" (نساء: ۱۵۸)

"اور انھوں نے (یعنی یہود نے) حضرت عیسیٰ کو یقینی بات ہے کہ قتل نہیں کیا (جس کا وہ دعوی کرتے ہیں) بلکہ ان کو خدا تعالی نے اپنی طرف اٹھالیا"۔

تو یہاں نفیٔ قتل اور اثباتِ رفع اس صفت لاہوتی کی بابت ہے، جو اللہ کے کلمہ سے پیدا ہوئی۔ اس بنیاد پر ہم کہتے ہیں کہ: مسیح علیہ السلام کی صفت ناسوتی کو زدوکوب کیا گیا اور سولی دی گئی، جب کہ صفتِ لاہوتی کے ساتھ یہ کچھ بھی نہیں ہوا (بلکہ وہ آسمان پر اٹھالی گئی)

پہلا جواب: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قتل ہوا ہی نہیں

اس کا جواب حافظ ابن تیمیہ نے مختلف طرح سے دیا ہے، چناں چہ پہلی وجہ ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ: مسیح مر گئے ہیں اور نہ یہی کہ وہ قتل کر دیے گئے ہیں، بلکہ فرمایا:

"یٰعِیسٰۤی اِنِّی مُتَوَفِّیکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَهِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا"

"یعنی اے عیسیٰ! میں لے لوں گا تجھ کو اور اٹھالوں گا اپنی طرف اور پاک کردوں گا تجھ کو کافروں سے"۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

"فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ وَاَنْتَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ"،

"پھر جب آپ ہی نے مجھ کو اٹھالیا تو آپ ان (کے احوال) پر مطلع رہے اور آپ ہر چیز کی پوری خبر رکھتے ہیں"۔

اور اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

"فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّیْثَاقَهُمْ وَکُفْرِهِمْ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْبِیَآءَ بِغَیْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ط بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَیْهَا بِکُفْرِهِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا ο وَبِکُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰی مَرْیَمَ بُهْتَانًا عَظِیْمًا ο وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰکِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ο وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ لَفِیْ شَکٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ط وَمَا قَتَلُوْهُ یَقِیْنًا ο بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ وَکَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا ο وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْکِتٰبِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ج وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَکُوْنُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا ο فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَیْهِمْ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ کَثِیْرًا ο وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَکْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ" (سورہ نساء: ۱۵۵۔۱۶۱)

"ان کو جو سزا ملی سو ان کی عہد شکنی پر اور منکر ہونے پر اللہ کی آیتوں سے اور خون کرنے پر پیغمبروں کا ناحق اور اس کہنے پر کہ: ہمارے دل پر غلاف ہے، سو یہ نہیں بلکہ اللہ نے مہر کر دی ان کے دل پر کفر کے سبب، سو ایمان نہیں لاتے مگر کم، اور ان کے کفر پر اور مریم پر بڑا طوفان باندھنے پر اور ان کے اس کہنے پر کہ: ہم نے قتل کیا مسیح عیسیٰ مریم کے بیٹے کو جو رسول تھا اللہ کا۔ اور انھوں نے نہ اس کو مارا اور نہ سولی پر چڑھایا؛ لیکن وہی صورت بن گئی ان کے آگے۔ اور جو لوگ اس میں مختلف باتیں کرتے ہیں تو وہ لوگ اس جگہ شبہ میں پڑے

ہوئے ہیں، کچھ نہیں ان کو اس کی خبر صرف انکل پر چل رہے ہیں اور اس کو قتل نہیں کیا بیشک، بلکہ اس کو اٹھا لیا اللہ نے اپنی طرف اور اللہ ہے زبردست حکمت والا۔ اور جتنے فرقے ہیں اہل کتاب کے سو عیسیٰ پر یقین لاویں گے اس کی موت سے پہلے اور قیامت کے دن ہوگا ان پر گواہ، سو یہود کے گناہوں کی وجہ سے ہم نے حرام کیں ان پر بہت سی پاک چیزیں جو ان پر حلال تھیں۔ اور اس وجہ سے کہ روکتے تھے اللہ کی راہ سے بہت اور اس وجہ سے کہ سود لیتے تھے اور ان کو اس کی ممانعت ہو چکی تھی اور اس وجہ سے کہ لوگوں کا مال کھاتے تھے ناحق''۔

پس اللہ نے یہودیوں کی کئی چیزوں میں مذمت کی:

۱- ''وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا'' (حضرت مریم صدیقہ پر زنا کا الزام لگانے پر)۔

۲- ''اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ'' (حضرت عیسیٰ رسول اللہ کے قتل کرنے کے دعوے پر) جس کی بابت ارشاد باری ہے: ''وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ'' اللہ رب العزت نے ان سب باتوں کی نسبت یہود کی جانب کی اور اس پر ان کی مذمت فرمائی، جب کہ نصاریٰ کا یہاں کوئی ذکر نہیں کیا، اس لیے کہ حضرت عیسیٰ کے مشابہ شخص کو (عیسیٰ سمجھ کر) سولی دینے والے یہود تھے۔ نصاریٰ میں سے کوئی بھی اس معاملہ میں ان کے ساتھ شامل نہ تھا، بلکہ حواری تو خوف کے مارے چھپ گئے تھے، سولی کے وقت ان میں کوئی بھی موجود نہ تھا، صرف یہود ہی وہاں موجود تھے اور انھوں نے ہی لوگوں کو خبر دی کہ مسیح کو (العیاذ باللہ) ہم لوگوں نے سولی دیدی ہے، نصاریٰ میں سے جن لوگوں نے حضرت عیسیٰ کو سولی دینے، کے واقعے کو بیان کیا ہے، انھوں نے یہود ہی سے نقل کیا ہے۔

موت مسیح سے پہلے یہود و نصاریٰ کا آپ پر ایمان لانا

پھر فرماتے ہیں کہ ارشاد باری:

''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۝'' (النساء: ۱۵۹)

''اور جتنے فرقے ہیں اہل کتاب کے سو عیسیٰ پر یقین لاویں گے اس کی موت سے پہلے''۔

(میں ''موتہ'' کی ضمیر کے مرجع) کی بابت اکثر علماء کی رائے ہے کہ حضرت عیسیٰ ہی مرجع ہیں اور اس کے معنی ہیں ''قبل موت المسیح'' (اس صورت میں آیت کریمہ کا صحیح مطلب یہ ہوا کہ: آئندہ زمانے میں ایک ایسا وقت آنے والا ہے، جس میں اہل کتاب بھی حضرت عیسیٰ پر ضرور حضرت عیسیٰ کے مرنے سے پہلے ایمان لے آئیں گے)۔ دوسرا ضعیف قول یہ ہے کہ ضمیر کا مرجع یہود ہیں، تب معنی ہوں گے ''قبل موت

الیھود ‘‘(یعنی ہرایک یہودی اپنی موت سے پہلے حضرت عیسیٰ پر ایمان لائے گا) جیسا کہ انتہائی ضعیف قول یہ بھی ہے کہ مرجع حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں یعنی ’’قبل موت محمد ﷺ‘‘ (معنی ہوئے ’’ہرایک کتابی محمد ﷺ کی موت سے پہلے آپ ﷺ پر ایمان لائے گا‘‘۔ آخری دونوں قول صحیح نہیں) اس لیے کہ اگر کوئی کتابی حضور ﷺ پر یا حضرت عیسیٰ پر اپنی موت سے پہلے ایمان لائے، تو وہ اس کے لیے نفع بخش اور نجات دہندہ ہوگا، اس لیے کہ اللہ تعالی بندے کی جاں کنی کی حالت سے پہلے کی، توبہ قبول کرتا ہے (حالاں کہ یہ بداہۃً باطل اور خلاف واقع ہے، کہاں کون توبہ کرتا ہے) اور اگر کہا جائے کہ جان کنی کے بعد کا ایمان مراد ہے، تو اس کے ذکر سے کوئی فائدہ نہیں (اس لیے کہ جان کنی کے بعد کا ایمان وتوبہ مقبول نہیں) نیز ہر ایک شخص موت کے بعد غیب کی ان چیزوں پر ایمان لاتا ہے، جس کا وہ انکار کرتا تھا، پس حضرت عیسیٰ پر ایمان لانے کی کوئی خصوصیت نہ رہ گئی، علاوہ ازیں یہاں ’’قبل موتہ‘‘ فرمایا گیا، نہ کہ ’’بعد موتہ‘‘ (حالاں کہ مذکورہ مطلب مراد لینے کی صورت میں ’’بعد موتہ‘‘ کا موقع تھا) حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد -صلوات اللہ علیہم وسلامھم - دونوں پر ایمان لانے میں کوئی فرق نہیں ہے، (ایک پر ایمان لانا دوسرے پر ایمان لانا ہی ہوگا، اس لیے کہ دین محمدی میں حضرت عیسیٰ کی نبوت ورسالت کی تصدیق اور دین عیسوی میں محمد ﷺ کی نبوت ورسالت کے ساتھ آپ ﷺ کی آمد پر یقین اور بعد آمد اتباع لازم ہے) البتہ وہ یہودی جو یہودیت پر مرتا ہے وہ حضرت محمد اور حضرت عیسیٰ -علیہما الصلاۃ والسلام- دونوں کا منکر اور حالت کفر پر مرتا ہے، اسی وجہ سے فرمایا گیا ’’وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ‘‘.

ارشاد باری ’’لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ‘‘ (۱) ایسا فعل ہے، جس پر قسم کھائی گئی ہے (یعنی لام حرف قسم داخل ہے)

(۱) مرزا قادیانی ’’لیؤمنن ‘‘ مضارع مؤکد کو جو استقبال کے لیے آتا ہے، حال کے معنی میں لیتے ہوئے، آیت کریمہ کا ترجمہ کرتا ہے: ’’کوئی اہل کتاب نہیں، مگر البتہ ضرور ایمان رکھتے ہیں کہ مسیح یقینی طور پر صلیب کی موت سے نہیں مرا، صرف شکوک وشبہات ہیں، ان کی طبعی موت پر ایمان لانے سے پہلے‘‘ (ازالہ الاوہام خورد، ص: ۳۸۵، وکلاں، ص: ۱۵۸ بہ حوالہ ’’اسلام اور قادیانیت ایک تقابلی مطالعہ‘‘)

مولوی محمد احسن امروہی، مضارع مؤکد کو بہ معنی حال استعمال کرنے کی وکالت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ: ’’نون ثقیلہ کا مضارع کو استقبال کے معنی میں کر دینا تو مسلم ہے، مگر چوں کہ لام تاکید حال کے واسطے آتا ہے اور ’’لیؤمنن‘‘ پر لام تاکید اور نون تاکید ہر دو آئے ہیں، اس لیے صیغہ کو حال واستقبال دونوں کے لیے سمجھنا چاہیے، نہ کہ خالص استقبال کے لیے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ امروہی صاحب ’’لیؤمنن‘‘ میں لام برائے تاکید نہیں ہے، جو حال کے معنی میں آتا ہے، بلکہ یہ لام قسم کا ہے اور استقبال خبری پر نون تاکید آنے کے لیے اس سے پہلے کوئی ایسا کلمہ ضروری ہے جو قسم پر دلالت کرے؛ کیوں کہ جو استقبال محض خبر ہو، اس پر نون تاکید بغیر اس کے نہیں آسکتا کہ اس کے اول میں ایسا کلمہ ہو، جو تاکید پر دلالت کرے اور جو لام حال کے لیے آتا ہے، اس کے ساتھ نون تاکید نہیں آسکتا، کیوں کہ نون تاکید استقبال کے لیے آتا ہے اور حال کی تاکید نہیں ہوسکتی۔ پس آیت کریمہ کا صحیح مفہوم ہوا: ’’آئندہ زمانہ میں ایک ایسا زمانہ

جو فعل مضارع کو معنیٔ مستقبل کے ساتھ خاص کر دیتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ ایمان لانا اللہ تعالیٰ کے اس بات کی اطلاع (کہ اہل کتاب ایمان لائیں گے) دینے کے بعد ہوگا۔ (اس لیے کہ صیغۂ مستقبل ہے، جو زمانۂ آئندہ پر دلالت کرتا ہے، پس اس آیت کے نزول کے بعد کا ہی زمانہ مراد ہو سکتا ہے۔ ضمیر کا مرجع ''اہل کتاب'' کو ٹھہرانے کی صورت میں آیت کا ترجمہ ہوگا: ''نہیں کوئی اہل کتاب میں سے مگر البتہ ایمان لاتا ہے حضرت عیسیٰ پر اپنے مرنے سے پہلے''، اس تقدیر پر ''لیؤمنن'' کا خاص استقبال کے لیے نہ رہنا صاف ظاہر ہے، کیوں کہ اہل کتاب اس آیت کے نزول سے پہلے بھی مرتے تھے اور اس کے نزول کے وقت بھی، پس کتابی کی طرف ضمیر لوٹانا ہرگز ہرگز صحیح نہیں)۔ نیز اگر ''قبل موت الکتابی'' مراد ہوتا تو ''لیؤمنن بہ'' کے بجائے ''وان من اہل الکتاب الا من یؤمن بہ'' ہوتا۔

علاوہ ازیں یہاں: ''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ'' فرمایا گیا، جو یہود ونصاریٰ دونوں کو شامل ہے، جس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ تمام اہل کتاب خواہ یہودی ہوں یا نصرانی، عیسیٰ علیہ السلام کی وفات سے پہلے عیسیٰ۔ علیہ السلام۔ پر ایمان لائیں گے، یہ اس لیے ہوگا کہ جب آپ نازل ہوں گے اور یہود ونصاریٰ اس بات پر ایمان لائیں گے کہ آپ اللہ کے رسول برحق ہیں، (تو اس بات کی خود بہ خود تردید ہو جائے گی) کہ آپ جھوٹے ہیں، جیسا کہ یہود کہتے ہیں، یا کہ آپ اللہ ہیں جیسا کہ نصاریٰ کہتے ہیں۔ اس عموم کو اپنے معنیٔ عام پر باقی رکھنا زیادہ اولیٰ ہے اس بات سے کہ کہا جائے ''ہر کتابی اپنی موت سے پہلے آپ پر ایمان لائے گا''۔ اس لیے کہ یہ ہر یہودی ونصرانی کے ایمان لانے کو مستلزم ہے، جو خلاف واقعہ ہے، نیز جہاں ارشاد باری: ''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ'' سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ تمام اہل کتاب حضرت عیسیٰ کی وفات سے پہلے حضرت عیسیٰ پر ایمان لائیں گے، وہیں اس کے عموم سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ مراد وہ کتابی ہیں جو حضرت عیسیٰ کے نزول کے وقت موجود ہوں گے، وہ تمام کے تمام آپ پر ایمان لائیں گے، نہ کہ وہ جو مر چکے ہوں گے۔ یہ ایسا ہی ہے، جیسے کہا جاتا ہے: ''مکہ ومدینہ کے علاوہ تمام شہروں میں دجال داخل ہوگا'' تو اس سے مراد وہ شہر ہیں جو اس وقت موجود ہوں گے، نہ کہ وہ جن کا نام ونشان بھی باقی نہ ہوگا۔

اہل کتاب کے، بعدِ نزول، حضرت عیسیٰ پر ایمان لانے کا سبب بالکل ظاہر ہے، اس لیے کہ اس وقت ہر ایک پر یہ بات بالکل عیاں ہو جائے گی کہ آپ رسول برحق اور مؤید من اللہ ہیں، نہ جھوٹے ہیں اور نہ

آنے والا ہے کہ سب اہل کتاب اس میں حضرت عیسیٰ پر، حضرت عیسیٰ کے مرنے سے پہلے، ایمان لے آئیں گے۔ (دیکھیے: ''شہادۃ القرآن'' ج: ۲، ص: ۳۳ تا ص: ۴۵) محمد صغیر

رب العالمین وخدا، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بعد نزول، اہل کتاب کے آپ پر ایمان لانے کے واقعے کو بیان فرمایا، نیز جب اللہ تعالیٰ نے اپنے قول: ''اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ'' سے آپ کے رفع الی السماء کو ذکر کیا، (تو یہ وہم ہو سکتا تھا کہ شاید اب آپ ہمیشہ ہمیش وہیں رہیں گے) حالاں کہ قیامت سے پہلے دنیا میں تشریف لانا اور یہیں دنیا میں موت کا واقع ہونا مقدر ہے۔ (اس وہم کو بھی ختم کرنے کے لیے) اللہ تعالیٰ نے ان کے، قبل موت آپ پر ایمان لانے کو ذکر کیا، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ہے:

''اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ○ وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ○ وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ○ وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ○ وَلَمَّا جَآءَ عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ○ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ○ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ط هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ○ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْ م بَيْنِهِمْ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ○'' (زخرف: ۵۹۔۶۵)

''عیسیٰ-علیہ السلام-تو محض ایک ایسے بندے ہیں، جن پر ہم نے (مقبولیت اور کمالات نبوت دے کر اپنا) فضل کیا اور بنی اسرائیل کے لیے (اولاً اور دوسروں کے لیے بھی ثانیاً) ہم نے (اپنی قدرت کا) ایک نمونہ بنایا تھا (تاکہ لوگ یہ سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کو اس طرح بغیر باپ کے پیدا کرنا بھی کچھ مشکل نہیں) اور (ہم تو اس سے زیادہ عجیب وغریب امور پر قادر ہیں، چناں چہ) اگر ہم چاہتے تو تم سے فرشتوں کو پیدا کر دیتے (جس طرح تم سے تمہارے بچے پیدا ہوتے ہیں) کہ وہ زمین پر (انسان کی طرح) یکے بعد دیگرے رہا کرتے (یعنی پیدائش بھی آدمیوں کی طرح ہوتی اور موت بھی، پس بغیر باپ کے پیدا ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کے زیر قدرت نہیں رہے، لہٰذا یہ امر حضرت عیسیٰ کے معبود ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا، بلکہ اس طرح پیدا کرنے میں بعض حکمتیں تھیں، جن میں سے ایک تو اوپر بیان ہوئی کہ انھیں اپنی قدرت کا ایک نمونہ بنانا تھا) اور (دوسری حکمت یہ تھی کہ) وہ (یعنی عیسیٰ علیہ السلام اس طرح پیدا ہونے میں امکان) قیامت کے یقین کا ذریعہ ہیں (اس طرح کہ قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے میں اس سے زیادہ اور کیا بُعد ہے کہ دوبارہ زندگی خلافِ عادت ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے ہونے سے ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ خلافِ عادت امور صادر کرنے پر قادر ہے، پس اس سے قیامت وآخرت کے عقیدے کا صحیح ہونا ثابت ہو گیا اور جب تم نے عقیدۂ آخرت کی یہ دلیل سن لی) تو تم لوگ اس (کی صحت) میں شک مت کرو

اور (توحید اور آخرت وغیرہ عقائد میں) تم لوگ میرا اتباع کرو، یہ (مجموعہ جس کی طرف میں تم کو بلاتا ہوں) سیدھا راستہ ہے اور تم کو شیطان (اس راہ پر آنے سے) روکنے نہ پاوے، وہ بیشک تمہارا صریح دشمن ہے اور جب عیسیٰ (علیہ السلام کھلے کھلے) معجزات لے کر آئے تو انھوں نے (لوگوں سے) کہا کہ: میں تمہارے پاس سمجھ کی باتیں لے کر آیا ہوں (تا کہ تمہارے عقائد کی اصلاح کروں) اور تا کہ بعض باتیں (منجملہ اعمالِ حلال وحرام کے) جن میں تم اختلاف کر رہے ہو، تم سے بیان کر دوں (جس سے اختلاف واشتباہ رفع ہو جائے، جب میں اس طرح آیا ہوں) تو تم لوگ اللہ سے ڈرو (اور میری نبوت کا انکار نہ کرو، کیوں کہ یہ خدا کی مخالفت ہے) اور میرا کہا مانو (کیوں کہ نبوت کی تصدیق کے لیے یہ ضروری ہے اور عیسیٰ علیہ السلام نے یہ بھی کہا کہ:) بیشک اللہ ہی میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے، سو (صرف) اسی کی عبادت کرو (اور) یہی (توحید) سیدھا راستہ ہے، سو (باوجود عیسیٰ علیہ السلام کے اس واشگاف بیان توحید کے پھر بھی) مختلف گروہوں نے (اس بارے میں) باہم اختلاف ڈال لیا (یعنی توحید کے خلاف طرح طرح کے مذاہب ایجاد کر لیے، چناں چہ توحید میں نصاریٰ وغیر نصاریٰ کا اختلاف بھی معلوم ہے) سو ان ظالموں (یعنی مشرکین اہل کتاب وغیر اہل کتاب) کے لیے ایک پُر درددن کے عذاب سے بڑی خرابی (ہونے والی) ہے"۔

۔ صحیحین (بخاری ومسلم) میں روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لیوشکنّ ان ینزل فیکم ابن مریم اماما مقسطا وحکما عدلا، فیکسر الصلیب، ویقتل الخنزیر، ویضع الجزیة" (مسلم : ۱/۸۷، بخاری : ۱/۴۹۰)

"ضرور بالضرور عنقریب تمہارے درمیان ابن مریم امام منصف اور حاکم عادل کی حیثیت سے نازل ہو کر، صلیب کو توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، اور جزیہ کو موقوف کر دیں گے"۔

نیز ارشاد باری:

"وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۝ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ط وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝" (نساء : ۱۵۷، ۱۵۸)

"انھوں نے (یعنی یہود نے) نہ ان کو (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو) قتل کیا اور نہ ان کو سولی پر چڑھایا، لیکن ان کو (یعنی یہود کو) اشتباہ ہو گیا اور جو لوگ (اہل کتاب میں سے) ان کے (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کے) بارے میں اختلاف کرتے ہیں، وہ غلط خیال میں (مبتلا) ہیں، ان کے پاس اس پر کوئی (صحیح) دلیل (موجود) نہیں،

بجز تخمینی باتوں پر عمل کرنے کے اور انھوں نے (یعنی یہود نے) ان کو (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو) یقینی بات ہے کہ قتل نہیں کیا (جس کا وہ دعوی کرتے ہیں) بلکہ ان کو خدا تعالی نے اپنی طرف اٹھالیا اور اللہ تعالی بڑے زبر دست حکمت والے ہیں"۔

اس بات کا بیان ہے کہ اللہ تعالی نے آسمان پر آپ کو زندہ اٹھالیا اور قتل سے محفوظ رکھا اور اس بات کا بھی بیان ہے کہ اہل کتاب، آپ کی وفات سے پہلے آپ پر ایمان لائیں گے۔ اسی طرح ارشاد باری: "وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" بھی ہے۔ پس اگر وفات پا چکے ہیں (جیسا کہ قادیانی کہتا ہے) تو آپ میں اور دوسرے میں کوئی فرق نہیں۔ (کہ بہ طور خصوص مذکورہ اوصاف آپ کی بابت ذکر کیے جاتے)۔

رفع عیسیٰ روح مع الجسم ہوا

کلام عرب میں لفظ "التوفی" کے معنی "الاستیفاء والقبض" (پورا پورا لینا اور قبضہ کرنا) ہیں، جس کی تین صورتیں ہیں: اول: "توفی النوم"۔ ثانی: "توفی الموت"۔ اور ثالث: "توفی الروح والبدن جمیعا" (یعنی روح اور بدن دونوں کو لے لینا اور قبضے میں کرلینا) یہاں یہی مراد ہے، اس لیے کہ اس توفی کی وجہ سے آپ علیہ السلام ان ضروریات زندگی سے فارغ ہو گئے، اہل زمین جن کے محتاج ہیں، مثلاً کھانا، پینا، لباس پہننا اور بول و براز کرنا۔ اللہ تعالی نے آپ کو (بدن مع الروح) آسمان ثانیہ پر اٹھالیا ہے اور دوبارہ نزول تک آپ وہیں رہیں گے، وہاں آپ کی حالت اس قسم کی نہیں، جیسی زمین والوں کی ہے، یعنی کھانا، پینا، لباس پہننا، سونا، بول و براز وغیرہ کرنا۔ (بلکہ آپ فرشتوں کی طرح رہتے ہیں)

دوسرا جواب: مرفوع ذات توفی ہی ہے

دوسرا جواب یہ ہے کہ: "نصاری کا یہ کہنا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے ناسوت کی موت مراد ہے، مناسب نہیں ہے، بلکہ انہیں الفاظ اصلی کے اعتبار سے کہنا تھا کہ: "اللہ تعالی نے آپ کی توفی سے ناسوت کی توفی مراد لیا ہے" (اس لیے کہ کلام اللہ میں لفظ "توفی" ہی ہے، نہ کہ موت) الحاصل خواہ لفظ "موت" استعمال کیا جائے، یا لفظ "توفی" (نصاری کے اعتقاد کے مطابق) اس کا وقوع ناسوت ہی پر ہوا ہے، نہ کہ اس کے علاوہ اور کسی چیز پر۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ ارشاد باری "اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ

اِلَیَّ" سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ ذات جس کی "تُوفی" ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ کی جانب اسی کا رفع بھی ہوا ہے، (یہی حق اور درست ہے) نصاریٰ کا یہ کہنا ہے کہ: رفع حضرت عیسیٰ کی صفت لاہوتی کا ہوا ہے، اگر یہاں آیت کریمہ میں "مُتَوَفِّیْکَ" کے بجائے "موت" ہوتا، تب بھی ان کی یہ بات نص قرآنی کے خلاف تھی، اب جب کہ "موت" نہیں تو بدرجہ اولیٰ خلاف ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے مرفوع غیر ذات توفی کو قرار دیا، حالاں کہ قرآن بتلاتا ہے کہ مرفوع ذات توفی ہی ہے۔ ایسے ہی دوسری آیت میں ہے:

"وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْناً ۝ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۝" نساء: ۱۵۷)

"اور انھوں نے (یعنی یہود نے) ان کو (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو) یقینی بات ہے کہ قتل نہیں کیا (جس کا وہ دعویٰ کرتے ہیں) بلکہ ان کو خدا تعالیٰ نے اپنی طرف اٹھالیا"۔

جو یہود کے اس قول:

"اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ (النساء: ۱۵۷)

"کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم کو جو کہ رسول ہیں اللہ تعالیٰ کے قتل کردیا"۔

کی تکذیب وتردید کرتا ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ یہود نے لاہوت کے قتل کرنے کا دعویٰ نہیں کیا تھا اور نہ ہی حضرت عیسیٰ کے لیے صفت لاہوتی تسلیم کرتے تھے، نیز اللہ تعالیٰ نے نصاریٰ سے (جو کہ صفت لاہوتی آپ علیہ السلام کے لیے ثابت کرتے تھے) دعوائے قتل کو نہیں ذکر کیا کہ یوں کہا جائے کہ ان کا مقصد ناسوت کا قتل تھا نہ کہ لاہوت کا، بلکہ قتل کے دعوے کو یہودیوں کی طرف سے نقل کیا ہے جو صرف صفت ناسوتی ہی ثابت کرتے ہیں اور اسی کے متعلق ان کا گمان ہے کہ انھوں نے اس کو قتل کردیا، اللہ رب العزت نے اسی کی تردید میں فرمایا: "وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْناً ۝ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۝" پس آیت کریمہ سے ثابت ہوگیا کہ رفع اسی کا ہوا تھا، جس کی بابت دعوائے قتل تھا اور وہ ناسوت ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ قتل کی نفی بھی ناسوت ہی کی ہے اور اثبات رفع بھی ناسوت ہی کی بابت ہے (صفت ناسوتی ولاہوتی کی تقسیم پھر یہ کہ ناسوت کا قتل ہوا اور لاہوت کا رفع، بالکل لغو اور بکواس ہے)

نصاریٰ رفع ناسوت کے مقر ہیں، لیکن ان کا گمان یہ ہے کہ پہلے آپ کو سولی دی گئی، پھر آپ قبر میں ایک دن یا تین دن رہے، اس کے بعد آسمان پر اٹھایا گیا اور ناسوت کے باپ لاہوت کے ساتھ جا بیٹھے۔ نیز ارشاد باری: "وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْناً ۝" کا مطلب یہ ہے کہ آپ علیہ السلام کے قتل کی نفی وانکار ایک یقینی بات ہے، جس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے، برخلاف ان کے جنھوں نے اس نفی قتل سے اختلاف کیا، وہ قتل وعدم قتل

کی بابت مشکوک ہیں، قتل کے بارے میں انہیں یقین نہیں ہے۔ اس لیے کہ قتل کی ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ اسی وجہ سے نصاریٰ کا ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ حضرت عیسیٰ کو سولی نہیں دی گئی، وجہ یہ ہے کہ مصلوب کو سولی دینے والے یہود ہیں اور حضرت عیسیٰ کی شناخت، غیر عیسیٰ سے مشتبہ ہوگئی تھی، جیسا کہ قرآن ناطق ہے، ایسے ہی دوسرے اہل کتاب پر بھی حضرت عیسیٰ کی شناخت غیر سے مشتبہ ہوگئی اور وہ یہ پہچان نہ سکے کہ ان میں کون مسیح ہے، یہاں تک کہ بعض لوگوں نے ان دشمنوں سے یہ کہا کہ: میں پہچانتا ہوں، چناں چہ جس کی شناخت انھوں نے کی (اسی کو ان لوگوں نے سولی دیدی اور وہ عیسیٰ ہی تھے یا کوئی دوسرا، یہ بات ان پر مشتبہ رہ گئی، قرآن کریم نے اس اشتباہ کو ختم کرتے ہوئے فرمایا: ''وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْناً ٥'' کہ انھوں نے یقینی طور پر عیسیٰ کو قتل نہیں کیا ہے''، آیت کریمہ کا صحیح مفہوم یہی ہے) اور یہ کہنا کہ آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ: ''انھوں نے یقینی طور پر قتل نہیں کیا، بلکہ ظن وگمان کے طور پر'' انتہائی کمزور بات ہے۔

تیسرا جواب: اثبات رفع لاہوت، نص قرآنی کے خلاف ہے

تیسرا جواب یہ ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے:

''اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا'' (آل عمران: ۵۵)

''جس وقت کہا اللہ نے: اے عیسیٰ! میں لے لوں گا تجھ کو اور اٹھالوں گا اپنی طرف اور پاک کردوں گا تجھ کو کافروں سے''۔

فرمایا، پس اگر رفع لاہوت کا ہوا ہوتا، تو ذات باری کے لیے مناسب تھا کہ اپنی ذات یا اپنے کلمے کے لیے ''انی رافعک الی'' فرماتے۔ ایسے ہی ارشاد باری: ''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ'' ہے، کہ بہ قول نصاریٰ مسیح ہی اللہ ہیں، (تو آیت کا مطلب ہوا کہ اللہ نے اللہ کو اپنی طرف اٹھالیا) اور یہ بات ظاہر ہے کہ اپنی ذات کا رفع اپنی ہی ذات کی طرف ممتنع ومحال ہے۔ نیز جب انھوں نے کہا کہ: ''وہ کلمہ'' ہیں، جس کا مطلب ان کے نزدیک یہ ہے کہ وہ کلمہ ہونے کے باوجود معبود وخالق ہیں، گویا کہ وہ ''کلمہ'' کو تورات وقرآن وغیرہما کے درجے میں نہیں رکھتے، جو کلام اللہ ہیں اور جن کی بابت ارشاد ربانی ہے:

''اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ'' (فاطر: ۱۰)

''اچھا کلام اسی تک پہنچتا ہے''۔

بلکہ ان کے نزدیک وہ کلمہ، اللہ ہے جو خالق ورازق اور دونوں عالم کا رب ہے اور یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ رب العالمین کا رفع رب العالمین ہی کی طرف ممتنع ہے۔(الجواب الصحیح، ج:۲،ص:۲۸۰)

تمام انبیاء نے اپنی امتوں کو دجال سے ڈرایا

یہاں اس بات کا جان لینا مناسب ہوگا کہ کتب سابقہ میں مسیح علیہ السلام کی آمد کی بشارت اسی طرح دی گئی ہے، جس طرح کہ حضرت ﷺ کی۔ نیز اسی طرح مسیح دجال سے بھی ان کتابوں میں خبردار کیا گیا تھا اور تینوں امتیں یعنی مسلمان، یہود اور نصاریٰ سب اس پر متفق ہیں کہ تمام انبیاء کرام نے مسیح دجال سے اپنی امت کو ڈرایا اور خبردار کیا ہے، چناں چہ حدیث صحیح میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

"ما من نبی الاوقدأ نذر امته المسیح الدجا ل، حتی نوح أ نذر أ مته، وسأقول لکم فیه قو لا لم یقله نبی لأ مته: انه اعو ر، وان ربکم لیس بأ عور، مکتو ب بین عینیه "ک ف ر" یقرؤه کل مؤ من قا رئی و غیر قا ری"

"جتنے بھی نبی دنیا میں تشریف لائے، سب نے اپنی امت کو مسیح دجال سے ڈرایا؛ یہاں تک نوح (علیہ السلام) نے بھی اپنی امت کو اس سے ڈرایا۔ ہاں اس کی بابت ایک بات میں تم سے بتلاتا ہوں، جو کسی نبی نے اپنی امت کو نہیں بتلائی، وہ یہ ہے کہ: وہ کانا ہوگا، اور تمہارا رب کانا نہیں۔ اس کی دونوں آنکھوں کے بیچ (یعنی پیشانی پر) "ک، ف، ر" (کافر) لکھا ہوگا، جسے ہر مومن پڑھ لے گا، خواہ وہ پڑھا لکھا ہو یا نہ ہو۔

خروج دجال وظہور مسیح پر اتفاق اور اتباع میں اختلاف

نیز تینوں امتیں اس پر بھی متفق ہیں کہ انبیاء کرام نے جس مسیح کی آمد کی بشارت دی وہ اولاد داؤد (علیہ السلام) میں سے ہوگا۔ الغرض تینوں امتیں اس بات پر متفق ہیں کہ انبیاء کرام نے اولاد داؤد (علیہ السلام) میں سے مسیح ہدیٰ (عیسیٰ علیہ السلام) کی آمد کی بشارت دی اور مسیح ضلالت (کانا دجال) کے خروج کی بھی اطلاع دی، اور اس پر بھی متفق ہیں کہ مسیح ضلالت (کانا دجال) اور مسیح ہدایت (عیسیٰ علیہ السلام) میں سے کسی کا بھی ابھی خروج ونزول نہیں ہوا ہے، بلکہ عنقریب ہوگا۔

پھر مسلمان اور نصاریٰ اس پر بھی متفق ہیں کہ مسیح ہدایت حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام ہی ہیں، جب کہ یہود اس کے منکر ہیں کہ مسیح ہدایت، عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) ہیں، حالاں کہ وہ اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ

حضرت عیسیٰ اولادِ داؤد (علیہ السلام) میں سے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ: وہ مسیح جن کی آمد کی بشارت انبیا نے دی ہے، ان پر تمام کی تمام امتیں ایمان لائیں گی، جب کہ ان کے گمان میں حضرت مسیح بن مریم کی بعثت فقط دین نصاریٰ کے ساتھ ہوئی اور وہ ایسا دین ہے، جس کا باطل ہونا ظاہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسیح دجال خروج کرے گا تو یہ یہودبے بہبود (مسیح ہدایت سمجھ کر) اس کی اتباع کریں گے؛ چناں چہ اصبہان کے ستر ہزار یہودی، جن کے اوپر طیلسانی چادریں ہوں گی، اس کے ساتھ ہولیں گے (اور مسلمانوں سے ان کی جنگ ہوگی) مسلمانوں کو یہود پر غلبہ حاصل ہوگا اور مسلمان ان کو تہ تیغ کریں گے؛ یہاں تک کہ (اگر ان میں سے کوئی) کسی پتھر اور درخت (کی آڑ میں چھپے گا، تو وہ) بھی پکاریں گے کہ: اے مسلم! دیکھ یہ یہودی میرے پیچھے چھپا ہوا ہے، آ! اس کو مار۔ جیسا کہ حدیث صحیح سے ثابت ہے۔ نصاریٰ اس بات کو تو مانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ ہی مسیح ہدایت ہیں اور یہ کہ آپ تشریف بھی لا چکے ہیں، نیز اس بات کے بھی قائل ہیں کہ عنقریب دوسری مرتبہ پھر آپ کا ظہور ہوگا؛ لیکن ان کا خیال یہ ہے کہ دوسری مرتبہ آپ قیامت کے دن آئیں گے؛ تاکہ لوگوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دیں، اس لیے کہ ان کے عقیدے کے مطابق آپ ہی اللہ ہیں، یعنی وہ لاہوت ہیں جو طبیعت انسانی میں ظاہر ہوں گے۔ جیسا کہ ان کے گمان میں اسی صفت کے ساتھ اس سے پہلے تشریف لا چکے۔ رہے مسلمان تو اس سلسلے میں ان کا ایمان اسی کے مطابق ہے، جس کی انبیاء کرام نے خبر دی ہے اور جو خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریح کے مطابق ہے آپ کا ارشاد ہے:

”یو شک ان ینزل فیکم ابن مریم حکما عدلا، واماما مقسطا، فیکسر الصلیب ویقتل الخنزیر ویضع الجزیة“.

”عنقریب عیسیٰ ابن مریم تم میں حاکم عادل اور امام مقسط کی حیثیت سے نازل ہو کر صلیب کو توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے اور خراج لینا بند کردیں گے“۔

حدیث صحیح میں یہ بھی ہے کہ: آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ”جھوٹا، کانا، مسیح ضلالت جب خروج کرے گا، تو عیسیٰ بن مریم دمشق کے مشرقی جانب منارے کے پاس نزول فرمائیں گے، اس وقت وہ ہلکے زرد رنگ کے دو کپڑوں میں (ملبوس) ہوں گے اور اپنے دونوں بازو دو فرشتوں کے کندھوں پر رکھے ہوں گے، جب دجال آپؑ کو دیکھے گا تو اس طرح پگھلنے لگے گا، جس طرح کہ نمک پانی میں پگھلتا ہے، چناں چہ آپ اسے پکڑیں گے اور مقام لد کے مشرقی دروازے سے تقریباً دس قدم کے فاصلے پر نیزے سے قتل کردیں گے، یہی آیت کریمہ: ”وَاِنْ مِّنْ

اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۝"(نساء: ۱۵۹) کی تفسیر ہے کہ حضرت عیسیٰ پر نزول کے بعد، آپ کی وفات سے پہلے، تمام لوگ ایمان لائیں گے اس وقت نہ تو کوئی یہودی رہے گا اور نہ نصرانی، سوائے دین اسلام کے اور کوئی دین باقی نہ رہے گا۔ عیسیٰ علیہ السلام کی مذکورہ صفات اہل کتاب کی کتابوں میں بھی موجود ہیں، لیکن نصاریٰ کا خیال یہ ہے کہ دوسری مرتبہ آپ قیامت کے بعد آئیں گے اور یہ کہ آپ ہی اللہ ہیں۔

الحاصل ان کو اس مرتبہ بھی دھوکہ ہوگا، جیسا کہ آمد اول کے وقت دھوکہ ہوا اور یہ گمان کر بیٹھے کہ آپ ہی اللہ ہیں۔ جب کہ یہود آپ کی آمد کے ہی منکر ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ ذات جس کی آمد کی بشارت دی گئی ہے، وہ حضرت عیسیٰ نہیں ہیں اور نہ ہی وہ جو دوسری مرتبہ آئیں گے، چناں چہ وہ آپ علیہ السلام کے علاوہ کسی اور کے منتظر ہیں؛ حالاں کہ پہلی مرتبہ آپ انہی کی طرف مبعوث کیے گئے، لیکن انھوں نے آپ کو جھٹلا دیا۔ عنقریب دوسری مرتبہ پھر آپ تشریف لائیں گے اور ہر وہ شخص جو اس وقت روئے زمین پر ہوگا، خواہ یہودی ہو یا نصرانی آپ پر ایمان لائے گا، سوائے ان لوگوں کے جو مار ڈالے گئے ہوں گے، یا اپنی موت مر گئے ہوں گے، اس وقت ان لوگوں کا کذب ظاہر ہو جائے گا، جنھوں نے آپ کو جھٹلایا، آپ کی والدہ محترمہ پر بہتان لگایا اور کہا کہ: آپ ولد الزنا ہیں، نیز ان لوگوں کا بھی کذب ظاہر ہو جائے گا، جنھوں نے آپ کی بابت غلو کیا اور کہا کہ: آپ ہی اللہ ہیں۔

چوں کہ حضرت عیسیٰ امت محمدیہ میں نازل ہوں گے، اس طرح یہ ان کے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک ایسا نکتہ رابطہ واتصال ہے، جو ان دونوں کے علاوہ کسی اور کے درمیان نہیں ہے، چناں چہ حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

"انا اولی الناس بعیسیٰ ابن مریم لانه لم یکن بینی وبینه نبی" (مسند احمد: ۲/۴۰۶)

"میں عیسیٰ ابن مریم کے سب سے زیادہ قریب ہوں؛ کیوں کہ میرے اور ان کے درمیان کوئی نبی نہیں ہوا"۔

نیز دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ فرمایا:

"کیف تهلک أمة انا فی اولها، وعیسی فی آخرها" (نحوه فی مشکوٰة: ۵۸۳)

"وہ امت کیسے ہلاک ہو سکتی ہے، جس کے شروع میں میں ہوں اور آخر میں عیسیٰ"۔

اس روایت سے دونوں حضرات کے یکے بعد دیگرے آنے کی وجہ بھی معلوم ہوگئی، جیسا کہ حضرت اشعیاء علیہ السلام نے اپنی پیشین گوئی میں کہا تھا "راکب الحمار وراکب الجمل" (کہ گدھے پر سواری

کرنے والا اور اونٹ پر سواری کرنے والا دونوں ایک ساتھ آئیں گے) (الجواب الصحیح: ج:۳، ص:۳۰۵)

اناجیل کے مؤلفین سولی کے وقت موجود نہ تھے

وہ اناجیل (۱) جو اس وقت اہل کتاب کے پاس ہیں، ان میں حضرت مسیح کے سولی دیے جانے کا ذکر ہے، جب کہ یہ اناجیل چار لوگوں سے مروی ہیں: مُرقس، لُوقا، یوحنا، اور متی (۲) اور ان چاروں میں سے کوئی

(۱) حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی ''اظہار الحق'' کے باب اول میں عہد قدیم و جدید کی کتابوں کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: عیسائی حضرات ان کتابوں کی دو قسمیں کرتے ہیں: ایک وہ کتاب جن کی نسبت ان کا دعوی ہے کہ یہ اُن پیغمبروں کے واسطہ سے ہمارے پاس پہنچی ہیں، جو حضرت عیسی سے پہلے گذر چکے ہیں۔ دوسری وہ کتابیں جن کی نسبت وہ دعوی کرتے ہیں کہ عیسی علیہ السلام کے بعد الہام کے ذریعہ لکھی گئی ہیں۔ پہلی قسم کے مجموعہ کو ''عہد عتیق'' (پرانا عہد نامہ) اور دوسری قسم کے مجموعہ کو ''عہد جدید'' (نیا عہد نامہ) کہتے ہیں اور دونوں عہدوں کے مجموعے کا نام بائبل رکھتے ہیں، یہ یونانی لفظ ہے، جس کے معنی کتاب کے ہیں۔

پھر دونوں عہدوں کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ قسم ہے، جس کی صحت پر تمام قدماء مسیحیین متفق ہیں، دوسری قسم وہ جس کی صحت میں اختلاف ہے۔ (عہد قدیم کی کتابوں کا تعارف کرانے کے بعد مصنف ''لکھتے ہیں) عہد جدید کی وہ کتابیں جن کی صحت پر اتفاق ہے، یہ کل بیس ۲۰ کتابیں ہیں: (۱) انجیل متی (۲) انجیل مرقس (۳) انجیل لُوقا (۴) انجیل یوحنا۔ ان چاروں کو اناجیل اربعہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور لفظ انجیل انہی چاروں کے ساتھ مخصوص ہے اور کبھی کبھی مجازاً تمام عہد جدید کی کتابوں کے لیے بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے، یہ لفظ معرب ہے، اصل یونانی لفظ ''انگلیون'' تھا، جس کے معنی بشارت اور تعلیم ہیں۔ (ملخص از: بائبل سے قرآن تک، اردو ترجمہ اظہار الحق، ج:۱، ص:۳۰۵-۳۱۶) محمد صغیر

(۲) ''بائبل سے قرآن تک'' کے محقق مشہور عالم دین حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ ان چاروں حواریوں کا حاشیہ میں تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

۱-مُرقُس (میم اور قاف پر پیش ہے) یہ حضرت عیسی کے حواری جناب پطرس کے شاگرد ہیں، عیسائی حضرات کہتے ہیں کہ: اسکندریہ کا کلیسا انھوں نے ہی قائم کیا تھا، انھیں ۶۸ء میں قتل کیا گیا، ان کی انجیل سابقہ انبیاء کی بشارتوں سے شروع ہوتی ہے، جو حضرت مسیح کی تشریف آوری پر دی گئیں اور حضرت عیسیٰ کے عروج آسمان پر ختم ہو جاتی ہے، اس میں ۱۶ رباب ہیں، انگریزی میں اسے (mark) کہا جاتا ہے۔

۲-لُوقا (Luke) اپنے زمانہ میں طبیب تھے، پولس کے سفروں میں ان کے ساتھ رہے، جیسا کہ (کلسیوں کے نام: ۱۴/۴) اور (اعمال: ۱/۱۶) سے معلوم ہوتا ہے، تقریباً ۷۰ء میں انتقال ہوا، ان کی انجیل حضرت یحیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے واقعہ سے شروع ہوتی ہے اور ۲۴ رابوں میں عُروج آسمان تک کے واقعات و احکام درج ہیں۔ (ج:۱، ص:۳۱۵، حاشیہ:۵،۶)

۳-یوحنا (حاء مفتوح ہے) (JOHN) حبیب ابن زبدی، حضرت عیسیٰ کے بارہ حواریوں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، انجیل اربعہ میں سے چوتھی انجیل آپ ہی سے منسوب ہے اور عہد نامہ جدید کے مجموعہ میں تین خط اور ایک کتاب ''مکاشفہ'' بھی آپ کی طرف منسوب ہے، آپ عمر بھر یہودیوں کے ظلم و ستم برداشت کیے اور پہلی صدی عیسوی ہی میں آپ کا انتقال ہوگیا۔ یاد رہے کہ عیسائی حضرت یحیٰ کو بھی یوحنا کہتے ہیں، مگر اس کے ساتھ ''المعتمد'' کی قید ہے، یہاں وہ مراد نہیں ہیں۔ (ج:۱، ص:۲۷۴: حاشیہ:۱)

۴-متی (الف مقصورہ کے ساتھ) (MATHTHEW) حضرت عیسیٰ کے بارہ حواریوں میں سے ایک ہیں، آپ ''کفرناحوم'' میں جو فلسطین کا ایک

بھی سولی دیے جانے کے وقت وہاں موجود نہ تھا اور نہ ہی حضرت عیسیٰ کے حواریوں میں سے کوئی وہاں تھا، وہاں تو فقط یہود کی ایک جماعت تھی، چناں چہ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ: ان لوگوں کو معلوم تھا کہ جس کو سولی دی گئی وہ حضرت مسیح کے علاوہ دوسرا آدمی ہے، لیکن وہ جان بوجھ کر جھوٹ بولے اور کہے کہ مصلوب حضرت مسیح ہوئے۔ جس کی وجہ سے آپ علیہ السلام کی سولی کی بابت ان لوگوں کو شبہ ہوگیا، جن کو ان لوگوں نے خبر دی۔ متکلمین میں سے ایک جماعت معتزلہ وغیرہ کا بھی یہی خیال ہے، نیز ابن حزم وغیرہ بھی اسی کے قائل ہیں، جب کہ بعض کا کہنا ہے کہ: جن لوگوں نے سولی دی، انھیں کو یہ اشتباہ ہوا، یہی اکثر حضرات کی رائے ہے۔ پہلا گروہ آیت کریمہ: ''وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ٥'' کی تفسیر یوں کرتا ہے کہ ''لوگوں کو مشتبہ کردیا، آپ علیہ السلام کی سولی کی بابت، ان لوگوں نے جنھوں نے سولی کی خبر دی'' اور جمہور تفسیر کرتے ہیں'': آپ علیہ السلام کی سولی کی بابت، ان لوگوں کو اشتباہ ہوا ہے، جو کہتے ہیں کہ: ہم نے سولی دی''۔ جیسا کہ اس واقعہ کو بالتفصیل دوسری جگہ بیان کرچکا ہوں۔ [الجواب الصحیح ج:۱، ص:۲۴۴]

عود الی المقصود

مسلمان اور اہل کتاب دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ دو مسیح آئیں گے، ایک مسیح ہدایت حضرت داؤد علیہ السلام کی نسل سے ہیں، دوسرا مسیح ضلالت (کانا دجال) جس کی بابت اہل کتاب کہتے ہیں کہ: یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی اولاد میں سے ہوگا۔ پھر دونوں اس بات پر بھی متفق ہیں کہ مسیح ہدایت عنقریب آئیں گے، جیسا کہ مسیح ضلالت آئے گا۔ لیکن اہل اسلام اور اہل کتاب میں سے نصاریٰ کا عقیدہ یہ ہے کہ: مسیح ہدایت سے مراد حضرت عیسیٰ ابن مریم ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے رسول بنا کر بھیجا تھا (پھر آسمان پر اٹھالیا) اور اب دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے۔ مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق قرب قیامت میں قیامت قائم ہونے سے پہلے تشریف لائیں گے اور مسیح ضلالت دجال کو قتل کریں گے، صلیب کو توڑ دیں گے خنزیر کو قتل کر دیں گے اور اس وقت روئے زمین پر سوائے دین اسلام کے کوئی دین باقی نہ رہے گا، تمام کے تمام اہل کتاب خواہ یہودی ہوں یا نصرانی آپ علیہ السلام پر ایمان لائیں گے، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ٥'' (نساء: ۱۵۹)

شہر تھا، شر دصول کرنے پر مامور تھے، آپ کو شہید کیا گیا، مگر یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ کب اور کہاں؟ (ج:۱، ص:۲۷۰، حاشیہ:۳) واضح رہے کہ اناجیل اربعہ کی نسبت مذکورہ حواریوں میں سے کسی کی طرف بھی صحیح نہیں ہے، تفصیل کے لیے دیکھیے ''اظہار الحق'' یا اس کا اردو ترجمہ ''بائبل سے قرآن تک'' (محمد صغیر)

''اور جتنے فرقے ہیں اہل کتاب کے سو عیسیٰ پر یقین لاویں گے، اس کی موت سے پہلے''۔

''مَوْتِہٖ'' کی ضمیر کے مرجع کی بات صحیح قول یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ ہیں اور آیت کریمہ کا مطلب ہوا کہ: ''تمام اہل کتاب حضرت عیسیٰ پر، حضرت عیسیٰ کی وفات سے پہلے ایمان لائیں گے''۔ دوسری جگہ ارشاد باری ہے:

''وَاِنَّہٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَۃِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِھَا'' (زخرف: ٦١)

''اور وہ نشان ہے قیامت کا، سو اس میں شک مت کرو''۔

حب کہ نصاریٰ کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ ہی اللہ ہیں، قیامت کے دن مخلوق کے حساب و کتاب اور اعمال کا بدلہ دینے کے لیے تشریف لائیں گے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جس کی وجہ سے وہ گمراہ ہوئے۔ رہے اہل کتاب میں سے یہود تو یہ اس بات کے تو معترف ہیں کہ مسیح ہدایت آئیں گے، لیکن ان کے گمان میں حضرت عیسیٰ مسیح ہدایت نہیں تھے؛ بلکہ ان کے زعم باطل کے مطابق آپ علیہ السلام ایسے دین نصاریٰ کے ساتھ تشریف لائے جس میں تحریف ہو چکی تھی اور محرف دین و مذہب کا داعی یقیناً جھوٹا ہوگا۔ (العیاذ باللہ) یہی سبب ہے کہ یہود اب بھی دونوں مسیحوں (ضلالت و ہدایت) کی آمد کے منتظر ہیں۔ (الجواب الصحیح ج:۱، ص:۳۴۱۔ ج:۲، ص:۱۱۳)

حضرت عمر مُحَدَّثْ و مُلْهَمْ تھے

اسی وجہ سے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا۔ کما فی الحدیث الصحیح:

''عن ابی ھریرۃ قال: قال النبی ﷺ: لقد کان فیما کان قبلکم من الامم ناس محدَّثون(۱) فان یک فی امتی احد(۲) فانہ عمر'' (بخاری: ۱/۵۲۱۔ ومسلم: ۱/۲۷۶)

۱۔ ''مُحدَّث'' کے معنی کی تشریح کرتے ہوئے صاحب ''مظاہر حق'' لکھتے ہیں کہ ''محدَّث'' یہاں ''مُلْهَمْ'' (صاحب الہام) کے معنی میں ہے، یعنی وہ روشن ضمیر شخص جس کے دل میں غیب سے کوئی بات پڑے، اس کو ''محدث'' اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ گویا اس سے غیبی طاقت بات کرتی ہے، اس کو وہ بات بتاتی ہے، جو دوسروں کو معلوم نہیں ہوتی اور پھر وہ شخص اس بات کو دوسروں تک پہنچاتا ہے، ''مجمع البحار'' میں لکھا ہے کہ: ''محدث'' اس شخص کو کہتے ہیں، جس کے دل میں (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) کوئی بات ڈالی جاتی ہے اور پھر وہ شخص ایمانی حدس و فراست کے ذریعہ اس بات کو دوسروں تک پہنچاتا ہے، اور یہ مرتبہ اسی شخص کو نصیب ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نوازنا چاہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے: ''محدث'' وہ شخص ہے، جس کا ظن یعنی گمان (کسی بھی مختلف فیہ بات کے) اسی پہلو کو اختیار کرے جو صواب یعنی صحیح ہو اور آخر میں اس کی رائے اس طرح صائب ثابت ہو، جیسے کسی جاننے والے نے اسے بتا رکھا ہو۔ بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ: ''محدث'' کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے، جس کے فرشتے اس سے کلام کرتے ہوں۔ یہ قول غالباً اس بنیاد پر ہے کہ ایک روایت میں ''محدثون'' کے بجائے ''متکلمون'' کا لفظ نقل ہوا ہے۔ (مظاہر حق جدید، ج:۷، ص:۲۹۱)

۲۔ ''فان یک فی امتی احد...'' الخ اس جملہ کی تشریح کرتے ہوئے صاحب ''مظاہر حق'' لکھتے ہیں کہ: اس کا مقصود اس امت میں ''محدث'' کے وجود کو مشکوک و مشتبہ کرنا نہیں ہے، امت محمدیہ تو پچھلی تمام امتوں سے افضل و اعلیٰ ہے۔ اگر پچھلی امتوں میں ''محدث'' ہوا کرتے تھے، تو اس

''تم سے پہلے (یعنی سابقہ) امتوں میں محدَّث ہوکرتے تھے، اگر میری امت میں کوئی محدث ہوا تو وہ عمر ہوں گے''۔

سابقہ امتوں میں محدثین کے وجود کی بابت تو آپ نے جزم ویقین سے فرمایا، لیکن امت محمدیہ میں ان کے وجود کو معلق رکھا، اگر چہ یہ تعلیق محقق ہو چکی۔ اس لیے کہ جب یہ امت آپ علیہ السلام کے بعد کسی دوسرے نبی ہی کی محتاج نہیں، تو بدرجہ اولی کسی محدث کی محتاج نہ رہی (لیکن پھر بھی امت کی فضیلت ظاہر کرنے کے لیے اس میں مُلْہَمْ و محدَّث پیدا کیے گئے۔ رہیں سابقہ امتیں تو چوں کہ وہ ایک نبی کے بعد دوسرے نبی کی محتاج رہتی تھیں، اس لیے محدثین وملہمین کی بھی حاجت انھیں رہتی تھی، (چوں کہ یہ امت کسی نبی آخر یا محدث وملہم کی محتاج نہیں ہے) اس لیے جب حضرت عیسیٰ تشریف لائیں گے تو اسی شریعت محمدیہ کے مطابق فیصلہ کریں گے۔ (الجواب الصحیح: ۱/۳۶۰)

یہود ودیگر کفار پر نصاریٰ اوران سب پر مسلمانوں کے غلبہ کی بشارت

نصاریٰ کا یہ کہنا [کہ: ہمارے حق پر ہونے کی قرآن میں سب سے بڑی دلیل وشہادت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روز قیامت تک کے لیے ہمیں کفار پر غلبہ عنایت فرمایا ہے] درست نہیں ہے، بلکہ اگر غور کیا جائے تو مذکورہ دلیل ان کے خلاف جاتی ہے، نہ کہ ان کے حق میں، اس لیے کہ اللہ رب العزت نے حضرت مسیح کو یہ خوش خبری دی تھی کہ وہ ان لوگوں کو روز قیامت تک کفار پر غلبہ دے گا، جو ان کے متبعین ہیں۔ اللہ کی خبر برحق، اس کا وعدہ سچا اور وہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔ چنانچہ جب حضرت عیسیٰ پر ایمان لانے والوں نے، آپ کی اتباع کی تو اللہ تعالیٰ نے یہود وغیرہ دیگر کفار پر غلبہ عنایت فرمایا، پھر جب اللہ رب العزت نے حضرت محمد علیہ السلام کو اس دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا، جس کے ساتھ حضرت مسیح اور دیگر انبیائے سابقین مبعوث ہوئے تھے، نیز حضرت محمد علیہ السلام مصدِّق بھی تھے اس دین کے، جسے حضرت عیسیٰ لائے تھے، جیسا کہ حضرت عیسیٰ نے احمد (علیہ السلام) نامی ایک رسول کی، اپنے بعد آنے کی بشارت دی تھی، تو گویا امت محمدیہ (علی صاحبہا الصلاۃ والسلام) حضرت مسیح کی زیادہ پیروکار ہوئی بہ مقابلہ ان نصاریٰ کے جنھوں نے آپ علیہ السلام کی شریعت کو بدل دیا اور آپ کی بشارت کو جھٹلا دیا، جس کی وجہ سے اللہ رب العزت نے امت

امت میں ان کا وجود یقینی طور پر بہ طریق اولیٰ ہوگا۔ پس ان الفاظ کا مقصد تاکید وتخصیص ہے۔ یعنی اس امت میں صرف حضرت عمر، ان خصوصیات واوصاف کے حامل ہیں، جن سے ان کا ''محدث'' ہونا ظاہر ہے۔ (مظاہر حق جدید ج: ۷، ص: ۲۹۰) ابوطہ صغیر

محمدیہ کو قیامت تک کے لیے نصاریٰ پر بھی اسی طرح غلبہ عنایت فرمادیا جس طرح سے یہود پر۔

الحاصل نصاریٰ، دین عیسوی میں تحریف وتبدیلی کے بعد حضرت مسیح کے متبعین میں نہ رہے، بلکہ انھوں نے یہود کی پیروی اختیار کرلی، جو آپ علیہ السلام کو جھٹلانے اور سب وشتم کرنے میں تمام حدوں کو پار کر چکے تھے، جس کی وجہ سے اولاً وہ حضرت عیسیٰ کی تکذیب کرنے والے ہوئے، ثانیاً حضرت محمد ﷺ کی اور حضرت عیسیٰ کی پیروی سے کوسوں دور ہو گئے، چناں چہ فقط یہود پر غلبہ پانے والے ہوئے، رہی امت محمدیہ ''علی صاحبھا الصلاۃ والسلام'' تو یہی درحقیقت حضرت مسیح کی پیروکار ہے، بقیہ تمام کے تمام آپ کے منکر وکافر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امت محمدیہ ''علی صاحبھا الصلوٰۃ والسلام'' کو یہود ونصاریٰ دونوں پر، قیامت تک کے لیے غلبہ عنایت فرمایا گیا؛ چنانچہ جب مسلمانوں نے نصاریٰ سے جہاد کیا تو فتح یاب ہوئے اور ان سے بیت المقدس، اس کے آس پاس کے شہروں، جزیروں اور عرب کا سارا علاقہ چھین لیا، نیز مسلمان مسلسل نصاریٰ پر غلبہ ہی پاتے جارہے ہیں اور قیامت تک پاتے رہیں گے، تمام مسلمانوں پر نصاریٰ کبھی بھی غلبہ نہیں پائیں گے۔ ان شاء اللہ (۱)۔

ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت پر ان کے گناہوں کے سبب وقتی طور پر غلبہ پاجائیں، پھر اللہ تعالیٰ ان کے مقابلے میں مسلمانوں کی مدد کرے۔ اگر نصاریٰ حضرت مسیح کے پیروکار ہوتے اور مسلمان آپ علیہ السلام کے منکر، تو ضروری تھا کہ اللہ رب العزت تمام مسلمانوں پر ان کو غلبہ عنایت فرماتا، اس لیے کہ تمام

---

(۱) رہا یہ اعتراض کہ اس زمانے میں بہ ظاہر مسلمانوں پر نصاریٰ کا غلبہ ہے اور مسلمان مغلوب ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی علامات قیامت میں سے ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے جہاں مسلمانوں کے غلبہ کی خوش خبری دی تھی، وہیں قرب قیامت میں مغلوب ہونے کی وعید بھی سنائی تھی، چناں چہ حضرت ثوبانؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''یوشک الامم ان تداعی علیکم کما تداعی الاکلۃ الی قصعتھا فقال قائل و من قلّۃ نحن یومئذ قال: بل انتم یومئذ کثیر، و لکنکم غثآء کغثاء السیل و لینزعَنّ اللہ من صدور عدوکم المھابۃ منکم، ولیقذفن اللہ فی قلوبکم الوھن، فقال قائل: یارسول اللہ! وما الوھن؟ قال: حب الدنیا وکراھیۃ الموت''. (ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب فی تداعی الامم علی الاسلام، ج: ۲، ص: ۵۹۰)

''قریب ہے کہ دیگر امتیں تم پر اس طرح ٹوٹ پڑیں جیسے کھانے والے پیالے پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ایک صحابی نے عرض کیا: ہم لوگ شاید اس زمانے میں تعداد میں کم ہوں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں؛ بلکہ اس زمانے میں تمہاری تعداد بہت ہوگی، لیکن تمہاری مثال اس زمانے میں سیلاب کی جھاگ جیسی ہوگی (کہ جدھر کو بہایا بہہ گئے اور اس کی وجہ یہ ہوگی کہ) اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہارا خوف نکال دے گا اور تمہارے دلوں میں ''وھن'' پیدا کردے گا، ایک صحابی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ''وھن'' کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: دنیا کی محبت اور موت سے نفرت۔ (محمد صغیر)

مسلمان حضرت مسیح کی الوہیت کے منکر ہیں اور نصاریٰ کی تکفیر کرتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ حضرت مسیح کے اصل پیروکار مسلمان ہیں نہ کہ نصاریٰ۔ (الجواب الصحیح، ج:۲،ص:۲۶۳۔ ج:۱،ص:۲۶۲۔ ج:۲،ص:۶۴)

نصاریٰ کے نزدیک بھی رفع عیسیٰ جسمانی ہوا

میں کہتا ہوں (حافظ ابن تیمیہ) کہ آدمی کا اپنے بدن کے ساتھ آسمان کی طرف جانا، حضرت عیسیٰ مسیح کے واقعے سے ثابت ہو چکا ہے، کیوں کہ آپؑ آسمان کی طرف اٹھائے گئے اور عنقریب پھر زمین پر نازل ہوں گے۔ یہ وہ عقیدہ ہے جس میں نصاریٰ مسلمانوں کے موافق ہیں، کیوں کہ مسلمانوں کی طرح نصاریٰ بھی کہتے ہیں کہ: مسیح علیہ السلام اپنے جسم و روح کے ساتھ آسمان پر اٹھائے گئے۔ اور اس کے بھی قائل ہیں کہ پھر دوبارہ زمین پر اتریں گے، جیسا کہ حضور ﷺ نے احادیث صحیحہ میں خبر دی ہے۔ لیکن بہت سے نصاریٰ اسکے قائل ہیں کہ: حضرت عیسیٰ کو سولی دینے کے بعد دفن کر دیا گیا تھا، پھر آپ قبر سے زندہ ہو کر آسمان پر چلے گئے اور یہود یہ کہتے ہیں کہ: آپ کو سولی دی گئی اور پھر قبر سے نہیں اٹھے، جب کہ مسلمان اور اکثر نصاریٰ یہ کہتے ہیں کہ: آپ کو سولی نہیں دی گئی، بلکہ بلا صلب آسمان کی طرف اٹھا لیا گیا، پھر مسلمان اور بعض نصاریٰ جو مسلمانوں کے موافق ہیں، اس کے قائل ہیں کہ آپ زمین پر قیامت سے پہلے اتریں گے اور یہ کہ آپ علیہ السلام کا نزول علامات قیامت میں سے ہے، جیسا کہ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ سے ثابت ہے؛ جب کہ بہت سے نصاریٰ اس بات کے قائل ہیں کہ آپ کا نزول ہی یوم قیامت ہے اور یہ کہ آپ ہی اللہ ہیں، جو مخلوق سے حساب و کتاب لیں گے۔ (جیسا کہ حضرت عیسیٰ آسمان پر اپنے جسم کے ساتھ اٹھائے گئے) اسی طرح حضرت ادریس اور اہل کتاب کے بہ قول حضرت الیاس بھی اپنے جسم کے ساتھ آسمان پر اٹھائے گئے۔ (الجواب الصحیح:۱۶۵/۴)

میں کہتا ہوں (علامہ کشمیری) کہ ''امانۃ النصاری'' [جسے ''شریعۃ الایمان'' یا تسبیحہ'' اور ''ھدایۃ الحیاری'' کے مطابق ''سنھودسی'' بھی کہتے ہیں] میں ہے، نیز ابن حزم وغیرہ نے بھی ذکر کیا ہے، (کہ نصاریٰ کہتے ہیں) ''نؤمن باللہ واحد'' (ہم ایک ہی خدا پر ایمان رکھتے ہیں)۔ نیز اسی کتاب میں آگے حضرت مسیح کی بابت اپنے عقیدہ کو یوں لکھتے ہیں:

''الذی من اجلنا نحن البشر و من اجل خطایانا ینزل من السماء''

''یعنی مسیح وہ ہیں جو ہماری وجہ سے انسانی لبادہ میں دنیا میں آئے اور پھر دوبارہ ہمارے گناہوں کی وجہ سے (گناہوں سے پاک کرنے کے لیے) آسمان سے اتریں گے''۔

آگے مزید لکھتے ہیں:

"وصلب عنا علی عهد بیلاطس وتألم و قبروقام من الاموات فی الیوم الثالث علی ما فی الکتب، وصعد إلی السماء، وجلس علی یمین الرب، وایضا یاتی بمجد لیدین الاحیاء والاموات، الذی لا فناء لملکه"

"حضرت عیسیٰ بیلاطیس کے عہد میں ہماری طرف سے سولی پر چڑھے، انھیں تکلیف بھی ہوئی اور قبر میں تدفین بھی عمل میں آئی، پھر نصاریٰ کی کتابوں کے مطابق تدفین کے تیسرے روز مردوں کے بیچ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور آسمان پر جا کر حق تعالیٰ کی دائیں جانب رونق افروز ہوئے۔ نیز یہ کہ وہ عظمت و مرتبت کے ساتھ پھر آئیں گے؛ تا کہ زندوں اور مردوں کو بدلہ دیں۔ حضرت عیسیٰ وہ ہیں، جن کی بادشاہت کے لیے فنا نہیں ہے"۔

بشارت احمد و تصدیق عیسیٰ

ذرا مسیح علیہ السلام کی اس بشارت میں غور فرمایئے، جس کے نصاریٰ بھی منکر نہیں ہیں:

"ان ارکون العالم سیاتی، ولیس لی من الامر شیئ"

"رئیس عالم عنقریب آنے والا ہے اور اس وقت مجھے کوئی اختیار نہ ہوگا (یعنی میرے بعد ایک ایسا رسول آنے والا ہے، جس کی بعثت پورے عالم اور جن وانس کی طرف ہوگی اور اس وقت میرا دین (یعنی عیسوی منسوخ ہو جائے گا)"۔

یہ حضرت محمد اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام دونوں کی نبوت پر بیک وقت کیسی عمدہ شہادت ہے، اس لیے کہ اس کے مطابق جب حضرت محمد ﷺ مبعوث ہوں گے، تو کار نبوت آپ ﷺ کے ذمے ہوگا، نہ کہ حضرت مسیح کے۔ پس اس وقت پورے عالم پر (خواہ یہود ہوں یا نصاریٰ) آپ ﷺ کی اطاعت اور آپ کے حکم کی تابعداری واجب ہوگی اور امر دین صرف آپ کے پاس ہوگا اور نصاریٰ کے پاس جو مذہب رہ جائے گا، وہ حق سے کئی گنا زیادہ باطل ہوگا۔ پھر اس کی رہی سہی حقانیت بھی حضور ﷺ کی شریعت سے منسوخ ہوگئی۔

اس طرح حضرت عیسیٰ کا ارشاد گرامی اپنے دینی بھائی حضرت محمد ﷺ کی پیشین گوئی سے مکمل ہم آہنگ ہے؛ چنانچہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"ینزل فیکم ابن مریم حکما عدلا، واماما مقسطا، فیحکم بکتاب الله فیکم"

"عیسیٰ ابن مریم تمھارے درمیان حاکم عادل و امام مقسط کی حیثیت سے نازل ہوں گے اور کتاب اللہ (قرآن) کے مطابق تمھارے درمیان فیصلہ کریں گے"۔

نیز دوسری جگہ آپ نے اسی بات کو ان الفاظ میں فرمایا:

"یاتیکم بکتاب ربکم"

"وہ تمہارے پاس تمھارے رب کی کتاب کے ساتھ آئیں گے"۔

پس دونوں معزز رسولوں کا قول بالکل ایک جیسا ہے، پہلے نے دوسرے کی آمد کی بشارت دی اور دوسرے نے پہلے کی نبوت ورسالت کی تصدیق فرمائی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جانب سے دی گئی ایک دوسری بشارت پر غور فرمائیں:

"الم تر الی الحجر الذی أخره البناؤن صار اساسا للزاویة"

"ذرا دیکھو کہ جس پتھر کو معماروں نے مؤخر کر دیا، وہی کونے کا پتھر ثابت ہوا"۔

پھر دیکھیں کہ درج ذیل حدیث نبوی سے یہ کس قدر ہم آہنگ ہے:

"مثلی ومثل الأنبیاء قبلی کمثل رجل بنی دارا فأکملها وأتمها الا موضع لبنة منها، فجعل الناس یطوفون بها ویعجبون منها، ویقولو ن هلّا وضعت تلک اللبنة؟فکنت انا تلک اللبنة" (نحوه فی البخاری : ۱/۱ ۵۰، ومسلم : ۲/۲۴۸)

"میری اور سابقہ پیغمبروں کی مثال ایسی ہے، جیسے کسی نے محل تیار کیا اور اسے مکمل کر دیا، ہاں ایک کونے پر ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی، دیکھنے والے آتے ہیں اور عمارت کی خوب صورتی دیکھ کر عش عش کرتے ہیں اور مالک مکان سے کہتے ہیں: یہ اینٹ کیوں نہ رکھی گئی (کہ عمارت مکمل ہو جاتی ؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا) میں ہی وہ انیٹ ہوں (جس سے اس قصر نبوت کی تکمیل ہوئی")

ایسے ہی ایک بشارت میں وارد حضرت مسیح کے ان الفاظ پر غور فرمایئے:

"ان ذلک عجیب فی اعیننا"

"یہ ہماری نظروں میں عجیب ہے"۔

نیز آپ علیہ السلام کے اس قول پر بھی توجہ کریں:

"إن ملکو ت اللہ سیؤخذمنکم و یدفع الی آخر"

"عنقریب اللہ کی بادشاہی تم سے لے کر دوسرے کو دے دی جائے گی"۔

کہ آپ اسے کیسے مطابق پاتے ہیں اس ارشاد باری کے:

"وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (الانبیاء : ۱۰۵)

''اور ہم نے لکھ دیا ہے زبور میں نصیحت کے پیچھے کہ آخر زمین پر مالک ہوں گے میرے نیک بندے''۔

اور اس ارشاد کے:

''وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ط يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ط وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ'' (النور:۵۵)

''تم میں جو لوگ ایمان لاویں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالی وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمادے گا، جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی اور جس دین کو (اللہ تعالی نے) ان کے لیے پسند کیا ہے (یعنی اسلام) اس کو ان کے لیے قوت دے گا اور (ان کو جو دشمنوں سے طبعی خوف ہے ان کے اس خوف کے بعد اس کو امن سے بدل دے گا، بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں (اور) میرے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کریں (یہ وعدہ اللہ تعالی کا مشروط ہے دین پر پوری طرح ثابت قدم رہنے کے ساتھ) اور جو شخص بعد (ظہور) اس (وعدہ) کے ناشکری کرے گا (یعنی دین کے خلاف راستہ اختیار کرے گا) تو (ایسے شخص کے لیے یہ وعدہ نہیں، کیوں کہ) یہ لوگ نافرمان ہیں''۔

نیز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس قول پر بھی غور کیجئے جو فارقلیط مبشر بہ کی بابت ہے:

''يفشى لكم ا لأسرار، ويفسر لكم كل شئى، فا نی ا جيئكم بالا مثا ل، وهو يأتيكم بالتأويل''.

''وہ بھیدوں کو تم پر ظاہر کرے گا، ہر چیز کی تم سے وضاحت کرے گا، اس لیے کہ میں تو تمہارے پاس امثال لایا ہوں اور وہ تاویل وتفسیر لائے گا''۔

کہ یہ قول اس آیت قرآنی پر کس طرح صادق آتا ہے:

''وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ'' (نحل: ۸۹)

''اور اتاری ہم نے تجھ پر کتاب، کھلا بیان ہر چیز کا''۔

اور اس ارشاد کے:

''مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ'' (یوسف: ۱۱۱)

"یہ قرآن کوئی تراشی ہوئی بات تو ہے نہیں، بلکہ اس سے پہلے جو آسمانی کتابیں (نازل) ہو چکی ہیں یہ ان کی تصدیق کرنے والا ہے اور ہر (ضروری) بات کی تفصیل کرنے والا ہے اور ایمان والوں کے لیے ذریعہ ہدایت ورحمت ہے"۔

جب آپ تورات، انجیل اور دیگر کتب سماوی پر غور کریں گے اور پھر قرآن کریم کا دقت نظر سے مطالعہ کریں گے، تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ قرآن ان سابقہ کتابوں کے اجمال کی تفصیل، مثالوں کی تاویل اور ان کے رموز کی تشریح و تفصیل ہے۔ یہی مطلب ہے حضرت عیسیٰ کے اس قول کا:

"واجیئکم با لامثال، ویجیئکم با لتا ویل، ویفسر لکم کل شئی"

"میں تمہارے پاس امثال لے کر آیا ہوں، وہ تاویل لائے گا اور ہر چیز کھول کر تم سے بیان کر دے گا"۔

ایسے ہی جب آپ حضرت مسیح کے اس ارشاد:

"ویخبر کم به کل شئی أعده الله لکم"

"وہ تمہیں ان تمام چیزوں کی خبر دے گا جو اللہ نے تمہارے لیے تیار کر رکھی ہیں"۔

پر غور کریں گے اور حضور ﷺ کی ان تفصیلی خبروں پر جو آپ ﷺ نے جنت، دوزخ، ثواب اور عقاب وغیرہ کی بابت بیان کی ہیں، تو آپ کو دونوں معزز رسولوں کی صداقت کا یقین کامل ہو جائے گا اور یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ: حضور ﷺ کی بیان کردہ تفصیلی خبریں آپ کے بھائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بیان کردہ اجمالی خبروں کے عین مطابق ہیں۔

نیز فارقلیط کی بشارت کی بابت آپ علیہ السلام کے اس قول پر بھی توجہ فرمائیے:

"وهو یشهد لی کماشهدت له"

"وہ میری شہادت دیں گے جیسا کہ میں نے ان کی شہادت دی"

کہ یہ کتنی منطبق ہے، حضرت محمد بن عبداللہ ﷺ پر اور کیسی کھلی شہادت ہے دونوں رسولوں کی صداقت کی، نیز کتنی صریح ہے ایک ایسے رسول کی بابت جو حضرت مسیح کے بعد آئیں گے اور حضرت مسیح کی بابت اس بات کی گواہی دیں گے کہ: وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول تھے، جیسا کہ حضرت مسیح نے اس آنے والے رسول کی بابت دی ہے (کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہوں گے) جس واضح انداز میں حضرت مسیح ابن مریم نے محمد بن عبداللہ- صلوات اللہ وسلامه علیهما- کی نبوت ورسالت کا اعلان کیا، اس سے پہلے کسی نبی نے نہیں کیا تھا، نیز آپ علیہ السلام نے اللہ رب العزت کے شریک و ساجھی یا صاحب اولاد ہونے

سے بھی اس کی پاکی و کبریائی کا اعلان کیا۔ پھر بانگ دہل یہ اعلان کیا اور شہادت دی کہ:

''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، بے نیاز ہے، نہ اس نے کسی کو جنا، نہ اس کو کسی نے جنا اور نہ ہی اس کا کوئی ہمسر ہے''۔

نیز اس بات کی بھی گواہی دی کہ:

''محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، میری (حضرت عیسیٰ کی) نبوت کے مصدق ہیں، اس روح حق سے مؤید ہیں، جو اپنی جانب سے کچھ نہیں کہتے ہیں، بلکہ جو کچھ وحی کی جاتی ہے، وہی کہتے ہیں، اپنی امت کو ہر چیز بتائیں گے اور ان چیزوں کی خبر دیں گے، جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے تیار کر رکھی ہیں''۔

پھر با آواز بلند یہ اعلان کیا کہ:

''میری اتباع، مجھ پر ایمان لانے اور میری تصدیق کے ذریعہ کامیابی کی طرف آؤ اور یہ کہ مجھے کوئی اختیار نہیں ہے''۔

آپ علیہ السلام کا یہ اعلان اس بات پر ختم ہوا کہ:

''اللہ تعالیٰ کی بادشاہی عنقریب جھوٹوں سے لے لی جائے گی اور میرے متبعین و مومنین کو دی دی جائے گی''۔

پس جو لوگ ہلاک ہوئے وہ بھی دلیل و بینہ ہی سے اور جو لوگ بچے، وہ بھی دلیل و بینہ ہی سے۔

الحاصل حضرت مسیح کے سچے پیروکاروں نے آپ علیہ السلام کے اس اعلان کو قبول کیا اور کافروں و منکروں نے انکار کیا، اسی کی بابت اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

''اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَهِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ ج ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ فَاَحْکُمُ بَیْنَکُمْ فِیْمَا کُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ٥'' (ال عمران :۵۵)

''میں لے لوں گا تجھ کو اور اٹھا لوں گا اپنی طرف اور پاک کر دوں گا تجھ کو کافروں سے اور رکھوں گا ان کو جو تیرے تابع ہیں، غالب ان لوگوں سے جو انکار کرتے ہیں، قیامت کے دن تک، پھر میری طرف ہے تم سب کو پھر آنا، پھر فیصلہ کر دوں گا تم میں جس بات میں تم جھگڑتے تھے''۔

یہ اس بات کی بشارت ہے کہ قیامت تک مسلمان، نصاریٰ پر غالب رہیں گے۔ اس لیے کہ مسلمان ہی حقیقتاً حضرت مسیح؛ بلکہ تمام ہی انبیاء کے صحیح پیروکار ہیں، نہ کہ ان کے مخالف اور دشمن۔ حضرت مسیح کے دشمن تو صلیب کے پرستار ہیں، جو اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ ان کا معبود بنایا ہوا اور بذریعہ سولی قتل کیا ہوا ہو، وہ

اس پر راضی نہیں کہ ان کا نبی اللہ کا بندہ اور اس کے نزدیک وجیہ ومقرب ہو، پس حقیقتاً یہی لوگ حضرت عیسیٰ کے دشمن ہیں اور مسلمان پیرو کار ومتبع۔

الحاصل حضور ﷺ کی آمد کی بابت حضرت مسیح کی بشارت دیگر تمام انبیاء کرام کی بشارت سے بڑھی ہوئی اور واضح ہے، اس لیے کہ انبیاء میں باعتبار زمانہ حضرت عیسیٰ ہی حضور ﷺ سے سب سے زیادہ قریب و اولیٰ ہیں، کیوں کہ آپ علیہ السلام اور حضور ﷺ کے درمیان کوئی دوسرا نبی نہیں۔ (ہدایۃ الحیاری:۳۸۱)

ان تصریحات سے ''حیات عیسیٰ'' کی بابت ان دونوں فرقوں (اہل اسلام اور نصاریٰ) کا کیا موقف ہے، واضح طور سے سمجھ میں آجاتا ہے، اہل اسلام کا تو ہمیشہ سے اس پر اجماع رہا ہے کہ حضرت عیسیٰ مسیح بہ قید حیات ہیں؛ جب کہ قادیانی افتراء پرداز [جس نے دوسرے سے ''سر الخلافه'' نامی کتاب لکھوا کر اپنی جانب منسوب کرلیا، جیسا کہ تحریر کے فرق سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ اس میں] لکھتا ہے کہ ان دونوں فرقوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ مسیح کی وفات ہوچکی ہے۔ اس کی فتنہ پردازی کا قلع قمع تو بس آیت ذیل: ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ'' (آل عمران:٦١) کی رو سے صرف مباہلہ سے ہوسکتا ہے۔

''مدارج السالکین'' کی عبارت ''لو کان موسیٰ و عیسیٰ ...'' کا مفہوم

ابن قیم ''مدارج السالکین'': ۲/۲۴۳، میں لکھتے ہیں:

''ومحمد- ﷺ- مبعوث الى جميع الثقلين، فرسالته عامة للجن والانس فى كل زمان، ولو كان موسىٰ وعيسىٰ عليهما السلام حيين لكانا من اتباعه، واذا نزل عيسىٰ ابن مريم عليه السلام فانما يحكم بشريعة محمد ﷺ فمن ادعى أنه محمد ﷺ كالخضر مع موسىٰ اوجوز ذلك لا حد من الامة فليجدد اسلامه، وليتشهد شهادة الحق، فانه مفارق لدين الاسلام بالكلية، فضلا عن أن يكون من خاصة اولياء اللّٰه، وانما هو من اولياء الشيطان و خلفائه ونوابه، وهذا الموضع مقطع ومفرق بين زنادقة القوم وبين اهل الاستقامة منهم''۔

''محمد ﷺ جمیع ثقلین کی طرف مبعوث ہیں، پس آپ کی رسالت تمام جن وانس کے لیے ہر زمانے میں عام ہے، بلکہ اگر موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام زندہ ہوتے تو وہ بھی آپ ﷺ کے متبعین میں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عیسیٰ آسمان سے اتریں گے، تو شریعت محمدیہ ہی کے مطابق فیصلہ کریں گے۔ پس جو شخص



دعویٰ کرے کہ حضرت عیسیٰ، محمد ﷺ کے ساتھ ایسے ہوں گے جیسے حضرت خضر حضرت موسیٰ کے ساتھ (کہ حضرت خضر پر، حضرت موسی کی جلیل القدر پیغمبر ورسول ہونے کے باوجود، اتباع لازم نہیں تھی، اسی طرح بعد نزول حضرت عیسیٰ پر بھی محمد ﷺ کی اتباع لازم نہ ہوگی) یا امت میں سے کسی بھی فرد کے لیے یہ جائز سمجھے، تو اس پر لازم ہے کہ تجدید اسلام کرے، کلمہ شہادت پھر سے دہرائے، ایسا شخص دین اسلام سے خارج اور مرتد ہے، چہ جائے کہ اولیاء اللہ میں سے ہو، بلکہ وہ شیطان کا دوست، اس کا خلیفہ اور نائب ہے، یہی وہ نازک مقام ہے جہاں زندیق اور صادق العقیدہ مسلمان، ایک دوسرے سے الگ ہوجاتے ہیں''۔

ابن قیم کی یہ بات حدیث نہیں ہے، بلکہ ان کی اپنی عبارت ہے اور اس میں حضرت عیسیٰ کا اضافہ (غالبًا) انھوں نے خدا کی جانب سے عطا کردہ علم لدنی [جو علم کے مختلف درجات میں سے ایک ہے] کی بنیاد پر کیا ہے۔ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ حضرت موسیٰ زندہ ہوتے اور حضرت عیسیٰ زمین پر موجود ہوتے، تو وہ بھی شریعت محمدیہ ہی کے پیروکار ہوتے، ان دونوں کو ''حیین'' کے لفظ سے اختصار کے پیش نظر تغلیباً تعبیر کردیا ہے، جیسے ''عمرین'' سے حضرت ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کو اور ''قمرین'' سے چاند وسورج کو تغلیباً تعبیر کردیا جاتا ہے۔ ابن قیم نے اس تعبیر میں قرآنی اسلوب اختیار کیا ہے، قرآن میں ہے:

''قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْئاً اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعاً'' (مائدہ :۱۷)

''آپ ان سے یوں پوچھئے کہ اگر ایسا ہے تو بتلاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ عیسیٰ بن مریم اور ان کی والدہ (مریمؑ) کو اور جتنے زمین مین آباد ہیں، ان سب کو (موت سے) ہلاک کرنا چاہیں، (تو) کیا کوئی شخص ایسا ہے کہ جو خدا تعالیٰ سے ذرا بھی ان کو بچا سکے''۔

مراد یہ ہے کہ جس طرح حضرت عیسیٰ کی والدہ مریم پر ہم موت طاری کرچکے ہیں، اسی طرح عیسیٰ مسیح اور دوسری مخلوق پر بھی موت مسلط کردینا ہمارے قبضے میں ہے۔ پس یہاں ''اُمّہ'' کا ذکر تغلیباً ہے، اس لیے کہ آیت بالا کے نزول سے بہت پہلے حضرت مریم کی وفات ہوچکی تھی۔ کما ذکرہ ابو السعود فی تفسیرہ۔ یا بہ طور استطراد، اختصار کے پیش نظر، کما فی ''جامع البیان''۔ اور اس کی مثالیں قرآن کریم میں بہت ہیں، مثلا: ارشاد باری ہے:

''وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْ م بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ'' (احقاف : ۲۱)

''اور ان (ہود علیہ السلام) سے پہلے اور ان کے پیچھے بہت سے ڈرانے والے (پیغمبر) گزر چکے ہیں''۔

آیت میں ''وَمِنْ خَلْفِهٖ'' کا تذکرہ بھی ازراہ اختصار استطراداً کیا گیا ہے، مراد یہ ہے کہ ان کے بعد بھی منذرین گذرتے رہیں گے۔ الغرض یہ آیت حضرت مسیح کے عدم وفات کی بابت نص صریح ہے، عطف اختصار کی وجہ سے کیا گیا اور متعلق کی تفصیل بیان نہ کی گئی، اس طرح معطوف میں عموماً ہوتا ہے، جب کہ معطوف علیہ میں ایسا نہیں ہوتا؛ کیوں کہ فعل مذکور کا وقوع قطعی اور یقینی ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حضرات نحات نے عطف کی دو قسمیں کی ہیں: ''عطف علی اللفظ'' اور ''عطف علی المعنی'' یہاں عطف، ''عطف علی المعنی'' ہی کے قبیل سے ہے۔

ابن قیم نے ''قصیدہ نونیہ'' میں صراحتاً لکھا ہے:

والیه قد رفع المسیح حقیقة

''حضرت عیسیٰ مسیح حقیقتاً اللہ تعالیٰ کی جانب اٹھا لیے گئے ہیں''۔

یہ شعر بھی انہیں کا ہے:

وکذاک رفع الروح عیسیٰ المرتضی ☆ حقا إلیه جاء فی القرآن

''اسی طرح سے روح اللہ یعنی عیسیٰ مرتضیٰ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف اٹھا لیے گئے ہیں، جس کا تذکرہ قرآن میں آیا ہے''۔

نیز ''اقسام القرآن'' میں لکھا ہے کہ: ''یہ مسیح ابن مریم ہیں، جو زندہ ہیں، ابھی ان کی وفات نہیں ہوئی، ان کی غذا فرشتوں کی غذا کی مانند ہے''۔ اس سے پہلے لکھا ہے کہ: ''حضور ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا، جس کی صحت پر محدثین کا اتفاق ہے:

''انی أظل عند ربی یطعمنی ویسقینی''

''میں اپنے پروردگار کے سایے میں رہتا ہوں، وہی مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے''۔

''صدق رسوله النبی الکریم.''

ابن قیم حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کا قصہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کو، اللہ تعالیٰ کی جانب سے آنے والی کسی قطعی وحی سے ہی چھوڑا جا سکتا ہے، ظاہر شریعت کو باطن شریعت کے مقابلے میں بغیر کسی وحی کے ترک نہیں کیا جائے گا؛ بلکہ شریعت کے حکم اور اس کے قاعدے کے مطابق ہی عمل پیرا رہنا ہوگا؛ تا آں کہ کسی واقعے کے سلسلے میں کوئی جزئی وحی آ جائے۔ جالینوس نے لکھا ہے کہ: ہم کچھ ایسے لوگوں کو دیکھ رہے ہیں، جو تمثیلات میں حکمت کی باتیں بتاتے ہیں، اس سے اس کی مراد حضرات انبیاء کرام

کے متبعین ہیں۔ علاوہ ازیں حافظ ابن کثیر نے بھی حضرت خضر کے تذکرے میں ابن قیم کا یہ قول: ''لو کان موسیٰ و عیسیٰ حیین'' حضرت عیسیٰ کے اضافہ کے ساتھ نقل کیا ہے، یہ عبارت ابن جوزی وغیرہ کی عبارت سے ماخوذ ہے، اس کی وجہ اشتراک فی اللفظ ہے، جیسا کہ ''روح المعانی'' میں مذکور ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ان کی عبارتوں میں ''عیسیٰ'' کا اضافہ بالقصد نہیں ہے، بلکہ یہ لازمی طور پر سبقت لسانی اور سبقت قلمی ہے۔

''ھدایۃ الحیاری'' سے ایک اور اقتباس

''مسلمان، یہود اور نصاریٰ تینوں ایک ایسے مسیح کے منتظر ہیں، جو آخری زمانے میں آئے گا، یہود کا مسیح تو دجال ہے اور نصاریٰ کے مسیح کی کوئی حقیقت نہیں، اس لیے کہ ان کے عقیدہ کے مطابق حضرت عیسیٰ کی حقیقت معبود، ابن معبود، خالق، محی (زندہ کرنے والا) اور ممیت (مارنے والا ہے) ہے، انھیں جس مسیح کا انتظار ہے، یہ وہی ہے جسے سولی پر چڑھایا گیا، ہاتھ پیر میں میخیں ٹھونکی گئیں، بدن پر کانٹے چبھوئے گئے، اور تھپڑ مارے گئے۔ ان کے عقیدہ کے مطابق، مسیح دونوں جہاں کا پالنہار اور آسمان وزمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ رہے وہ مسیح جن کے مسلمان منتظر ہیں، تو وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں، جسے اللہ رب العزت نے کنواری مریم تک پہنچایا تھا یعنی عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام جو محمد بن عبداللہ (ﷺ) کے دینی بھائی ہیں، وہ نازل ہو کر دین اسلام اور توحید الٰہی کو غالب کریں گے اللہ کے دشمن صلیب پرستوں کو قتل کریں گے، جنھوں نے ان کو اور ان کی والدہ محترمہ کو اللہ کے سوا معبود بنایا، نیز ان یہودیوں کو بھی قتل کریں گے جنھوں نے ان پر اور ان کی والدہ محترمہ پر سنگین بہتان تراشیاں کیں۔ یہ ہیں اس مسیح کی صفات جس کے مسلمان منتظر ہیں، وہ دمشق میں مشرقی منارہ پر، دو فرشتوں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے، آسمان سے اتریں گے، لوگ آسمان سے اترتے ہوئے کھلم کھلا آنکھوں سے دیکھیں گے، بعد نزول، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے مطابق فیصلہ کریں گے، ان احکام کو نافذ کریں گے، جنھیں ظالموں، فاجروں، اور خائنوں نے دین محمدی۔ ﷺ۔ میں سے ترک کر دیا ہوگا اور دین اسلام کی ان چیزوں کو زندہ فرمائیں گے جنھیں انھوں نے مٹا دیا ہوگا، آپ علیہ السلام کے زمانے میں تمام ملتیں مٹ جائیں گی، صرف ایک ہی ملت رہ جائے گی اور وہ ہے ملت اسلام، جو سب کے باپ حضرت ابراہیم اور تمام انبیاء۔ علیہم السلام۔ کی ملت ہے۔ جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین وملت کو طلب کرے گا تو وہ دین اس شخص سے خدا تعالیٰ کے نزدیک مقبول ومنظور نہ ہوگا اور وہ شخص آخرت میں تباہ کاروں میں ہوگا یعنی نجات نہ پاوے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو اس بات کی ترغیب دی کہ، جس کسی کی حضرت عیسیٰ سے، بعد نزول ملاقات ہو، وہ خود بھی ان سے سلام کرے اور میرا بھی سلام ان سے کہے۔ نیز آپ ﷺ نے ان کے نزول کی جگہ کی بابت بھی اطلاع دی کہ کس شہر، کس جگہ اور کس وقت نزول فرمائیں گے؟ پہنے ہوئے لباس کی بھی اطلاع دی کہ دو گیروے رنگ کی چادر میں ملبوس ہوں گے اور یہ کہ نزول کے بعد کیا کیا کارنامے انجام دیں گے، ان سب کی ایسی تفصیلی خبر دی کہ مسلمان گویا آپ علیہ السلام کو دیکھنے سے پہلے کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ حضور ﷺ کی یہ باتیں من جملہ غیب کی ان خبروں میں سے ہیں جن کی آپ نے خبر دی اور وہ آپ کی خبر کے عین مطابق واقع ہوئیں، جیسا کہ تیر کا ایک پر دوسرے سے بالکل مطابق ہوتا ہے۔ یہ ہیں مسلمانوں کے مسیح منتظر، نہ کہ ان لوگوں کے جن پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا یعنی یہود اور ان کے جو صراط مستقیم سے بھٹک گئے ہیں یعنی نصاریٰ اور نہ ہی ان کے بھائی روافض کے جو مرتد وملحد ہیں۔ جب مسلمانوں کے منتظر مسیح آجائیں گے تو یہود بے بہود اس بات کو بہ خوبی جان جائیں گے کہ حضرت عیسیٰ نہ تو یوسف نجار کے بیٹے ہیں اور نہ ولد الزنا (العیاذ باللہ) اور نہ ہی ماہر طبیب حاذق یا کرشمہ باز، کرتب ساز، جادوگر کہ اپنے فن کی وجہ سے لوگوں کی عقلوں پر چھا گئے اور اس بات کو بھی جان جائیں گے کہ وہ آپ علیہ السلام کو سولی دینے، مغلوب کرنے، تھپڑ مارنے اور قتل کرنے پر قادر نہیں ہو سکے تھے، بلکہ ان کی حیثیت تو خدا کے یہاں اس سے بھی گئی گزری تھی، نیز نصاریٰ بھی اس بات کو جان جائیں گے کہ حضرت عیسیٰ انسان کی اولاد ہیں اور یہ کہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، نہ کہ معبود اور ابن معبود۔ پہلی آمد کے موقعہ پر حضرت عیسیٰ نے اپنے بھائی محمد ﷺ کی نبوت کی بشارت دی اور دوبارہ نزول کے وقت محمد ﷺ کی شریعت و دین کے مطابق خود فیصلہ بھی کریں گے، آپ کے دشمن تو یہود و نصاریٰ ہیں؛ جب کہ آپ کے دوست اللہ کے رسول حضرت محمد ﷺ اور ان کے پیروکار مومنین ہیں، آپ کے دوست گندے و ناپاک صلیب پرست نہیں ہو سکتے۔ آپ کے سچے دوست تو رحمٰن کے موحد بندے: اہل اسلام و ایمان ہیں، جنہوں نے آپ کی اور آپ کی والدہ مطہرہ کی ان الزامات سے برأت کی جو دشمنوں نے لگائے تھے؛ چنانچہ اللہ رب العزت نے حضرت محمد ﷺ کو ان واضح دلائل و بینات کے ساتھ مبعوث فرمایا، جن سے شبہات رفع ہو جائیں اور بادل چھٹ جائیں، نیز حضرت عیسیٰ اور آپ کی والدہ محترمہ کو ان الزامات و جھوٹ سے بری کر دیں، جو یہود بے بہود باندھ رکھے تھے۔

پس خالقِ عیسیٰ و مریم رب دو جہاں جل جلالہ نے ان دونوں کی ان تمام الزامات سے براءت کا اعلان کیا، جو صلیب پرستوں نے لگا رکھے تھے اور انتہائی نازیبا و گستاخانہ باتیں کہی تھیں؛ لہذا حضرت مسیح کے

بھائی محمد مصطفیٰ ﷺ نے آپ علیہ السلام کو اسی مقام و مرتبے پر رکھا، جس پر آپ کو مبعوث کیا گیا تھا اور وہ انتہائی اعلیٰ مقام و مرتبہ ہے (یعنی نبوت و رسالت اور عبودیت کا مرتبہ) چناں چہ حضور ﷺ نے حضرت عیسیٰ کی تصدیق و تائید کی اور اس بات کی گواہی دی کہ: وہ اللہ کے بندے، اس کے رسول، اس کی روح و کلمہ ہیں جسے اس نے طاہرہ، صدیقہ، اپنے زمانے کی تمام عورتوں کی سردار، کنواری مریم بتول کے گریبان میں پھونکا تھا۔ نیز حضور ﷺ نے حضرت عیسیٰ کے معجزات و بینات کو ثابت فرمایا اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس بات کی خبر دی کہ جن لوگوں نے حضرت عیسیٰ کا انکار کیا وہ ہمیشہ ہمیش جہنم میں رہیں گے، نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس بندے و رسول کا اعزاز و اکرام کیا اور بندروں کے بھائی یہود کی ایذا رسانی سے محفوظ رکھا۔ نہ کہ جیسا نصاریٰ کا خیال ہے کہ یہودیوں نے آپ کو تکلیف پہنچائی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مؤید و منصور اپنی طرف اٹھالیا، دشمن ایک کانٹا بھی نہ چبھو سکے اور نہ ہی کوئی اور گزند پہنچا سکے۔ بلکہ اللہ رب العزت نے آپ کو اپنی طرف اٹھالیا ہے اور آسمان پر رکھا ہے، قیامت کے قریب زمین کی طرف لوٹائے گا اور آپ کے ذریعہ مسیح ضلالت، کانا دجال اور اس کے پیروکاروں کو ہلاک کرے گا، نزول کے بعد آپ صلیب توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، اسلام کو غلبہ و شوکت عطا فرمائیں گے اور اپنے بھائی محمد مصطفیٰ ﷺ کی ملت "ملت اسلام" کی مدد کریں گے۔ اس لیے کہ (بہ فحوائے حدیث: "انا اولی الناس بابن مریم والانبیاء اولاد علات لیس بینی وبینه نبی". بخاری: ۱: ۴۸۹) حضرت عیسیٰ اور حضور علیہما الصلاۃ والسلام میں بہت زیادہ قربت ہے۔

مفسرین نے ارشاد باری: "وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ" میں "هم" ضمیر کی بابت اختلاف کیا ہے، چناں چہ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ: اس سے مراد نصاریٰ ہیں، یعنی اس واقعے کی بابت نصاریٰ مبتلائے شبہ ہوئے، ان کے پاس حضرت عیسیٰ کے قتل کیے جانے اور سولی پر لٹکائے جانے کی بابت کوئی صحیح علم نہیں تھا، لیکن جب دشمنوں نے کہا کہ: ہم نے قتل کر دیا ہے اور سولی دیدی ہے، نیز آپ کو زمین سے اٹھالے جانے کا اتفاق بھی پڑ گیا، تو وہ شبہ میں پڑ گئے اور انھوں نے سولی دیے جانے کی بابت یہود کی تصدیق کی، اس طرح بھرپور شناعت و قباحت ان پر مسلط ہوگئی؛ حالاں کہ یہ کیوں کر ممکن تھا اس لیے کہ حضرت عیسیٰ مسیح کو نہ تو قتل کیا گیا اور نہ ہی انھیں سولی دی جاسکی، اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔



سورۂ نساء اور موضوعِ زیرِ بحث

فصل اول

سورۂ نساء کی بعض آیتوں سے متعلق مفسرین کے کچھ اقوال

ذیل میں سورہ نساء کی بعض آیتوں کے سلسلے میں مفسرین کے اقوال اور کچھ عبارتیں درج کی جا رہی ہیں۔ صاحب کشاف فرماتے ہیں کہ: آیت کریمہ ''فَبِمَا نَقْضِهِمْ'' (النساء:۱۵۵) میں ''ما'' زائدہ برائے تاکید ہے اور مراد ''فبنقضھم'' ہے، اگر آپ سوال کریں کہ ''با'' کس کے متعلق ہے اور ''ما'' تاکید سے کیا مراد ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ ''با'' کا متعلق یا تو محذوف ہے، اس صورت میں عبارت یوں ہوگی ''فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيْثَاقَهُمْ فَعَلْنَا بهم مَا فَعَلْنَا'' یا پھر اس کا تعلق ''حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ'' سے ہوگا، لیکن اس صورت میں یہ شرط ہے کہ ''فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْ ا'' ، ''فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيْثَاقَهُمْ'' سے بدل واقع ہو۔ ''ما'' کے برائے تاکید ہونے سے مراد اس بات کو ثابت کرنا ہے کہ بنی اسرائیل کو دی گئی سزا یا ان پر حلال چیزوں کے حرام ہونے کا باعث، ان کی عہد شکنی، قتل انبیاء اور کفر جیسی حرکتیں ہیں۔ اگر آپ یہ اعتراض کریں کہ یہ کیوں نہیں ہوسکتا کہ ''با'' کا متعلق وہ محذوف ہو، جس پر'' بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا'' دلالت کرتا ہے، اس صورت میں تقدیر یہ ہوگی ''فبما نقضھم میثاقھم طبع اللّٰہ علٰی قلوبھم، بل طبع اللّٰہ علیھابکفرھم'' تو اس کا جواب یہ ہے کہ عبارت کی یہ تقدیر درست نہیں، کیوں کہ ''بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ'' کفار کے قول: ''قُلُوْبُنَا غُلْفٌ'' کا جواب ہے، لہٰذا اس کا تعلق بھی اسی سے ہوگا۔

ابن منیر ''الا نتصاف علی الکشاف'' میں فرماتے ہیں کہ: مذکورہ بدل لانے کا ایک راز ہے اور وہ یہ ہے کہ ''فَبِمَا نَقْضِهِمْ '' کے بعد بات طویل ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ ''با'' اپنے متعلق ''حَرَّمْنَا'' سے دور ہوگیا، لہذا ''فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْ ا'' میں ''با'' کو ذکر کرنا ضروری ہوا؛ تا کہ وہ اپنے متعلق سے قریب ہو جائے، یہاں عبارت اس اجمال کے تناظر میں، جس کی تفصیل گذر چکی ہے، ایک

طرح سے مختصر لائی گئی ہے؛ کیوں کہ پہلے جو کچھ عیوب مذکور ہوئے: عہد شکنی، قتل، کفر یہ تمسخر کہ ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں، حضرت مریم پر الزام تراشی اور حضرت عیسیٰ کے قتل کا دعویٰ؛ آخر میں آنے والے اس اجمال ''فبظلم'' نے مکمل طور پر تمام تفاصیل کو اپنے اندر سمولیا، نیز بدل لانے کا دوسرا مقصد یہ واضح کرنا بھی ہے کہ ان کی یہ تمام حرکتیں ظلم ہیں اور یاد رہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، اس سے پہلے بھی اس طرح کی عبارتیں محذوف مانی گئی ہیں۔ واللہ الموفق والیه الماب.

راقم الحروف کہتا ہے کہ: ابتداء میں بہ طور شمار ان کی بہت ساری غلطیوں کا تذکرہ ہے، لیکن ان غلطیوں پر مرتب ہونے والے انجام و سزا کا ذکر نہیں کیا گیا، تا کہ بیان کا تسلسل متاثر نہ ہو اور سننے والے کا دماغ تمام ممکنہ خطوط پر سوچ سکے، پھر ان کی جنایتوں کو مفصل بیان کرنے کے بعد شروع والی بات کو ''بدل'' کے ذریعہ از سر نو ذکر کرنے کے بعد دنیوی اور اخروی سزا کی طرف اشارہ فرمایا، لہٰذا اگر ''حَرَّمْنَا'' ''با'' کا متعلق نہ ہو، تب بھی یہ اس بات کی رہنمائی کرے گا کہ ''بدل'' کس جنس سے ہونا چاہئے؟

صاحب کشاف آگے فرماتے ہیں کہ: اگر آپ یہ کہیں کہ ارشاد باری: ''وَبِكُفْرِهِمْ'' کا معطوف علیہ کیا ہے؟ تو میں کہوں گا کہ: اس کا عطف ''فَبِمَا نَقْضِهِمْ'' پر ہے اور ''وَقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ'' کے بعد ''بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ'' کا ذکر بہ طور استطراد ضمناً آیا ہے۔ نیز ''بِكُفْرِهِمْ'' کا عطف اس سے متصل ''بِكُفْرِهِم'' پر بھی جائز ہے۔ پھر اگر یہ اعتراض ہو کہ ''کفر'' کا ایسے کلمہ پر عطف کرنے کا کیا مطلب ہے، جس میں خود ''کفر'' کا ذکر ہے، خواہ اس کا عطف حرف اضراب (''بل'') سے پہلے والے کلمہ ''وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ''، پر ہو یا بعد والے ''بِكُفْرِهِمْ'' پر۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان سے کفر بار بار ہوا، اولاً تو انھوں نے حضرت موسیٰ کے ساتھ کفر کیا، پھر حضرت عیسیٰ کے ساتھ اور آخر میں حضرت محمد ﷺ کے ساتھ، لہٰذا ان کے ایک کفر کا دوسرے کفر پر عطف ہے، یا معطوف کے مجموعے کا، معطوف علیہ کے مجموعے پر۔ گویا عبارت یوں ہے: ''فبجمعهم بين نقض الميثاق، والكفر بآيات الله، وقتل الا نبياء، وقولهم: قلوبنا غلف، وجمعهم بين كفرهم وبهتهم مريم، وافتخارهم بقتل عيسى، عاقبنا هم او بل طبع الله عليها بكفرهم، وجمعهم بين كفرهم كذا كذا''.

مِیثاق خداوندی اور یہود کی عہد شکنی

صاحب ''البحر المحیط'' (ج:۳، ص:۴۰۳) آیت کریمہ:

"فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ" (النساء : ۱۵۵)

"ان کو جو سزا ملی ان کی عہد شکنی پر اور منکر ہونے پر اللہ کی آیتوں سے اور خون کرنے پر پیغمبروں کا ناحق اور اس کہنے پر کہ: ہمارے دل پر غلاف ہے"۔

کے تحت علامہ ابن عطیہ کے کلام کا خلاصہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

اس آیت میں چند ایسی چیزوں کی خبر ہے، جو انھوں نے عہد کے خلاف کیں:

۱: اس عہد کو توڑا جو جبل طور کو ان کے سر پر اٹھا کر لیا گیا تھا۔

۲: ایمان کے بدلے کفر کیا۔

۳: "اُدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا" کی خلاف ورزی کی۔

۴: فرماں برداری کے بجائے نافرمانی کی۔

۵: یوم السبت کی حرمت و تقدیس کو پامال کیا۔

۶: سب سے بڑی حرمت یعنی انبیاء کرام کو قتل کیا۔

۷: اور اپنے وعدے سے یہ کہہ کر مکر گئے کہ: ہمارے دلوں پر پردے ہیں، لہٰذا ہم سمجھنے سے قاصر ہیں۔

اللہ رب العزت ان کے اس جھوٹ سے اعراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: (بات یہ نہیں ہے، جو یہ کہہ رہے ہیں) بلکہ ان کے دلوں پر ان کے کفر کے سبب مہر لگ گئی ہے (اس لئے اب کوئی بھی حق بات ان کے دل میں جاں گزیں نہیں ہو سکتی)

ابن عطیہ آگے فرماتے ہیں کہ ارشاد باری ہے:

"وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ" (نساء : ۱۵۷)

"اور ان کے اس کہنے پر کہ: ہم نے قتل کیا مسیح عیسیٰ مریم کے بیٹے کو، جو رسول تھا، اللہ کا"۔

میں اللہ تعالی کی طرف سے، قتل عیسیٰ کی بات کرنے والوں کے گناہ کے اظہار کے ساتھ ساتھ حضرت عیسیٰ کی صفت رسالت کی بھی خبر ہے۔

قتل عیسیٰ نہ کر سکنے کے باوجود یہود پر قتل کا گناہ

ایک اہم بات یہ ہے کہ یہود حضرت عیسیٰ کو قتل نہ کر سکنے کے باوجود، قتل عیسیٰ کے گنہ گار ہیں، کیوں

کہ انھوں نے اس شخص کو (جو آپ کے مشابہ ہو گیا تھا) عیسیٰ ہی سمجھ کر سولی دی تھی، نیز یہ کہ آپ کو نبی ماننے کے بجائے کذاب گردانا اور تیسری وجہ یہ ہے کہ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ: ''قتل حضرت عیسیٰؑ ہی کا ہوا'' تو گویا ایک طرح سے انھوں نے حضرت عیسیٰؑ ہی کو قتل کیا ہے۔ اب رہا ان کا یہ اعتقاد کہ حضرت عیسیٰؑ واقعی نبی نہیں ہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، وہ قاتل بنی ہی رہیں گے۔

سولی دیئے جانے کا شبہ کیسے؟

ارشاد باری:

''وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَاصَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ'' (نساء: ۱۵۷)

''انھوں نے (یعنی یہود نے) نہ ان کو (یعنی عیسیٰ کو) قتل کیا اور نہ ان کو سولی پر چڑھایا، کیوں کہ ان کو (یعنی یہود کو) اشتباہ ہو گیا''۔

کے تحت لکھتے ہیں کہ: اللہ رب العزت اس آیت میں اس بات کی خبر دے رہے ہیں کہ ان لوگوں نے نہ تو حضرت عیسیٰ کو قتل کیا اور نہ ہی سولی دی۔ قتل اور سولی کی کیفیت میں روایات مختلف ہیں اور اس سلسلے میں کوئی حدیث نہیں ہے، جو کچھ ہے وہ قرآن کریم ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ جو ہوا، اس کا حاصل یہ ہے کہ جب یہود آپ کی تلاش میں نکلے، تو آپ اپنے ساتھیوں سمیت ایک گھر میں چھپ گئے، لیکن آپ کی مخبری ہو گئی، چناں چہ آپ کے حواری جو کہ تیرہ یا اٹھارہ تھے، رات کو آپ کی خدمت میں آئے، آپ نے ان سب کو (دعوت و تبلیغ کے لئے) آفاق عالم میں (اپنا قاصد بنا کر) بھیج دیا، اب آپ اور ایک حواری فقط دو آدمی مکان میں رہ گئے، ان دو میں سے حضرت عیسیٰؑ کو اللہ رب العزت نے آسمان پر اٹھالیا اور دوسرے شخص پر آپ کی شبیہ ڈال دی گئی۔ (جس کی وجہ سے دشمن یہ سمجھے کہ یہی عیسیٰؑ ہیں، اس کو قید کر لیا اور لے جا کر سولی دیدی)

ایک قول یہ بھی ہے کہ آپؑ کی شبیہ کسی پر نہیں ڈالی گئی اور ''وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ'' کے معنی شبہ ڈالنے کے نہیں، بلکہ معاملہ مشتبہ کرنے کے ہیں۔ یہ اس طرح ہوا کہ لوگوں کی نظروں سے دور ایک شخص کو سولی دی گئی اور یہ کہہ دیا گیا کہ یہ عیسیٰ ہیں۔ ارشاد باری ''وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ'' کی تفسیر کے سلسلے میں یہی دوسرا قول زیادہ راجح معلوم ہوتا ہے؛ کیوں کہ شبیہ ڈالے جانے کے حوالے سے آپ ﷺ سے کچھ مروی نہیں کہ اس پر اعتماد کیا جائے۔

''وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ط مَالَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ'' (نساء: ۱۵۷)

''اور جو لوگ (اہل کتاب میں سے) ان کے (یعنی عیسیٰؑ کے) بارے میں اختلاف کرتے ہیں، وہ غلط خیال میں (مبتلا) ہیں، ان کے پاس اس پر کوئی (صحیح) دلیل (موجود) نہیں بجز تخمینی باتوں پر عمل کرنے کے''۔

کے تحت لکھتے ہیں کہ ابن عطیہ فرماتے ہیں کہ: اتنی بات تو یقینی طور پر ثابت ہے کہ ایک شخص کو سولی دی گئی، جسے لوگوں نے حواس سے دیکھ کر نقل کیا ہے، اب رہی یہ بات کہ وہ شخص حضرت عیسیٰ ہی تھے یا کوئی دوسرا؟ تو چوں کہ فقط علم حواس سے اس کا تعلق نہیں ہے، اس لئے تمام لوگوں سے بالاتفاق کوئی بات منقول نہیں ہے۔ مزید فرماتے ہیں کہ ارشاد باری: '' وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ'' میں ''فیه'' کی ضمیر کا مرجع قتل ہے اور اس کے معنی ''فی قتله'' ہیں (یعنی آپ کے قتل کے بارے میں جن لوگوں نے اختلاف کیا) سیاق وسباق سے یہی بات راجح معلوم ہوتی ہے (انتہی) میرا خیال یہ ہے کہ علم ویقین واقع کے تابع ہوتا ہے اور اسی کی وجہ سے ہوتا ہے، اسی طرح شک وشبہ بھی واقعہ کی بابت ہوتا ہے جب کہ کسی ایک جانب کوئی دلیل نہ ہو، ظن وگمان اور خیال کرنے والے کی جانب سے ہوتا ہے اور اس شخص کی جانب سے ہوتا ہے جو کوئی کام اپنے اندازے اور تصور سے کرے۔

حضرت عیسیٰ کی آمد پر ملتوں کا اتحاد

اسی طرح ارشاد باری:

''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۝ (نساء : ۱۵۹)

''اور جتنے فرقے ہیں اہل کتاب کے، سو عیسیٰ پر یقین لاویں گے اس کی موت سے پہلے''۔

کے تحت فرماتے ہیں کہ: ''به'' اور ''موته'' کی ضمیر کا مرجع لفظ ''عیسیٰ'' ہے، جو سیاق کلام میں مذکور ہے اور مطلب یہ ہے کہ: حضرت عیسیٰؑ کے نزول کے وقت جو بھی اہل کتاب ہوں گے ان پر ایمان لائے بغیر نہ رہیں گے، جیسا کہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے فرمایا:

''انه ينزل من السماء فی آخر الزمان، فلا يبقى اهل من اهل الكتٰب الا يومن به، حتى تكون الملة واحدة، وهی ملة الاسلام'' (بحر المحيط: ۳/۴۰۸)

''کہ حضرت عیسیٰ آخری زمانے میں آسمان سے اتریں گے۔ اس وقت تمام اہل کتاب آپ پر ایمان لائیں گے، چناں چہ تمام ملتیں ایک ملت اسلام پر ہو جائیں گی۔

نقضِ عہد، قتلِ انبیاء وغیرہ اور نزول قرآن کے وقت موجود یہود

نیز ارشاد باری:

"وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا" (نساء : ۱۵۹)

"اور قیامت کے روز وہ (یعنی عیسیٰ) ان (منکرین کے انکار) پر گواہی دیں گے"۔

کے بعد فرماتے ہیں: کہ ان آیتوں کی فصاحت کے سلسلے میں یہ واضح رہے کہ جس طرح "فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ" اور "جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ" (نساء:۱۵۳) میں فعل کی نسبت غیر فاعل حقیقی (یعنی صاعقہ اور بینات) کی طرف ہے، اسی طرح "وَقَتْلِهِمُ الْاَنْبِيَآءَ" (نساء:۱۵۵) "وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا" (نساء:۱۵۶) اور "وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ" (نساء:۱۵۷) میں ان افعال (یعنی قتل و بہتان وغیرہ) پر راضی رہنے والوں کی طرف ہے (نہ کہ فاعل حقیقی کی طرف، اس لئے کہ قتل وغیرہ تو نزول قرآن کے وقت موجود یہودیوں کے آباء واجداد نے کیا تھا، جب کہ خطاب عہد رسالت کے یہودیوں سے ہوا، پس معلوم ہوا کہ یہاں نسبت غیر فاعل کی طرف ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جو فاعل کے فعل پر راضی ہیں)۔

نیز "فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ..." (نساء:۱۵۵) کے اندر عطف اور معطوف علیہ کے حسن کو بھی ان آیات کی فصاحت میں دخل ہے؛ چناں چہ عطف کے لئے حرف واؤ لایا گیا جو صرف جمع پر دلالت کرتا ہے (نہ کہ ترتیب پر، لہذا وقوع حوادث کا بالترتیب ہونا ضروری نہیں) ان تمام واقعات میں وقوع کے اعتبار سے زمانے کا بہت بڑا فاصلہ ہے، خلاصہ یہ کہ شروع سے آخر تک تمام یہود ان افعال قبیحہ (نقض عہد اور قتل وغیرہ) میں شریک ہیں، ان کے آباء واجداد تو براہ راست، مرتکب ہونے کی وجہ سے اور یہ لوگ ان کے افعال پر راضی ہونے کی وجہ سے۔



فصل دوم

مذکورہ بالا آیات نساء کے مضمون میں راقم السطور کا موقف

واضح رہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ کو آسمان پر اٹھالیا گیا اور آپ نظروں سے اوجھل ہو گئے، نیز یہودیوں کو یقین ہو گیا کہ آپ قتل کر دئے گئے اور سولی پر چڑھادئے گئے، علاوہ ازیں عیسائیوں نے بھی قتل و سولی کی بات مان لی، تو یہ باطل عقیدہ ان میں مشترک ہو گیا؛ البتہ اس قتل کے سلسلے میں ان کے درمیان اعتباری فرق ہے اور وہ یہ کہ یہود تورات کی اس عبارت: ''جھوٹا نبی قتل کر دیا جائے گا'' سے استدلال کرتے ہوئے اس قتل کو سزا سمجھتے ہیں، نہ کہ اس عقیدہ سے استدلال کرتے ہوئے کہ جو بھی صلیب سے لٹکے وہ بہ طریق اِنّی ملعون ہے، اس لئے کہ یہ بات تورات میں نہیں ہے اور ہو بھی کیسے سکتی ہے؛ جب کہ انھوں نے بیلاطس بادشاہ کے سامنے یہ الزام قبول کیا کہ حضرت عیسیٰؑ کے قتل کا مواخذہ اور اس کا گناہ خود ان پر اور ان کی ذریت کے اوپر ہے پس اس میں قتل کے لازم یعنی لعنت، کے صلب سے جدا ہونے کا التزام ہے، اس طریقے پر کہ صلب تو کسی ایک شخص پر حساً واقع ہوا اور اس کا لازم یعنی ملعون دوسرا ہوا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ کسی کا مصلوب ہونا اس کے ملعون ہونے کی دلیل انی نہیں ہے اور اگر حضرت عیسیٰؑ کو سولی دینے کی بنیاد آپؑ کا ان کے نزدیک مجرم ہونا مان لیا جائے (نعوذ باللہ) تو یہ مقدمہ ''ان کل من تعلق بالصلیب فھو ملعون لزوماً'' (کہ جو بھی سولی پر لٹک گیا وہ بالیقین ملعون ہے) بہ طریق دلیل انّی باطل ٹھہرا۔

یہ بھی قابل ذکر ہے کہ یہودیوں کا مقصد حضرت عیسیٰؑ کو سولی دینے سے فقط اپنے حسد کی آگ بجھانا تھا، ورنہ ان کو خود اس بات کا اقرار ہے کہ ملعون وہ خود ہیں، جیسا کہ ''عہد قدیم ملا کی دوم وسوم، سفر آخر'' میں ہے۔ نیز ارشاد باری ہے:

''لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ۝'' (مائدہ: ۷۸)

''بنی اسرائیل میں جو لوگ کافر تھے ان پر (اللہ کی طرف سے سخت) لعنت کی گئی تھی (زبور اور انجیل میں،

جس کا ظہور حضرت) داؤد اور (حضرت) عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے ہوا اور یہ لعنت اس سبب سے ہوئی کہ انھوں نے حکم کی مخالفت کی اور حد سے نکل گئے"۔

"مسالک النظر فی نبوۃ سید البشر" میں توریت کی ایک عبرانی عبارت مذکور ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ: "ملعون ہے وہ شخص جس نے صلیب اور تصویر بنائی، ملعون ہے وہ شخص جس نے ان کی عبادت کی، ملعون ہے وہ شخص جس نے یہ چیزیں رائج کیں" نیز ان کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ "جس نے ایسا کیا، اس نے دوسروں کے گناہوں کا بھی بوجھ اپنے سر لیا" جیسا کہ ابن حزم نے "الملل والنحل، ج:۱ص:۲۲۱" میں ذکر کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ: "مومن بادشاہ "یوشیا" نے صلیبوں کو توڑ کر جلا دیا تھا"۔ [الملل والنحل ۱/۱۹۲]۔

نصاریٰ اس قتل کو یہودیوں کے برعکس کفارہ قرار دیتے ہیں، خلاصہ یہ نکلا کہ دونوں فریق (یہود و نصاریٰ) دو الگ الگ ساحلوں پر ہیں اور ان کی ہدایت کے لئے کوئی بات قدر مشترک نہیں رہ گئی، سوائے اس کے کہ حقیقت کو واشگاف کیا جائے؛ کیوں کہ اگر ہم مان لیں کہ آپ علیہ السلام کو سولی دی گئی، مگر اس وقت موت نہیں آئی، بلکہ آپ مردہ بن گئے جیسا کہ بدبخت قادیانی کہتا ہے کہ آپؑ کو پکڑا گیا، نہایت ذلیل کیا گیا اور سخت تکالیف دی گئیں، مگر آپ مرے نہیں۔ تو یہود و نصاریٰ دونوں ہی یہ مفروضہ گھڑ سکتے ہیں، کیونکہ باطل مفروضوں سے تو کوئی بھی گمراہ عاجز اور درماندہ نہیں ہے۔

لہٰذا ان دونوں فریقوں سے ان کے درمیان قدر مشترک بات -قتل اور سولی- میں ہی بات کی جاسکتی ہے۔ نہ کہ گھڑے ہوئے یا آئندہ گھڑے جانے والے مفروضات میں، فتنے کے سدّباب کا یہی طریقہ ہے کہ واقعہ کو بعینہ بیان کر دیا جائے، جیسا کہ اگر کسی مسئلے میں اقوال مختلف و متضاد ہوں اور ہر قول میں مسئلہ ملحوظ خاطر ہو، تو بیان واقعہ ہی واحد راستہ ہوتا ہے اور یہی انصاف کا راستہ ہے۔

چناں چہ اسی طریق پر چلتے ہوئے سورہ نساء میں اللہ رب العزت، واقعہ اور حقیقت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ط وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ" (نساء: ۱۵۷ / ۱۵۸)

"حالانکہ انھوں نے (یعنی یہود نے) نہ ان کو (یعنی عیسیٰ کو) قتل کیا اور نہ ان کو سولی پر چڑھایا، لیکن ان کو (یعنی یہود کو) اشتباہ ہوگیا اور جو لوگ (اہل کتاب میں سے) ان کے (یعنی عیسیٰ کے) بارے میں اختلاف کرتے ہیں، وہ غلط خیال میں (مبتلا) ہیں، ان کے پاس اس پر کوئی (صحیح) دلیل (موجود) نہیں، بجز تخمینی باتوں

پر عمل کرنے کے اور انھوں نے (یعنی یہود نے) ان کو (یعنی عیسیٰ کو) یقینی بات ہے کہ قتل نہیں کیا، (جس کا وہ دعوی کرتے ہیں) بلکہ ان کو خدا تعالی نے اپنی طرف (یعنی آسمان پر) اٹھالیا''۔

اس میں قتل اور سولی — قدر مشترک بین الیہود والنصاریٰ — کی سرے سے نفی کی گئی کہ نہ تو حضرت عیسیٰ قتل کیے گئے اور نہ سولی دی گئی اور نہ ہی قتل کے مقدمات یعنی پکڑ، دھکڑ اور مار پیٹ ہوئی، البتہ ان لوگوں پر معاملہ مشتبہ کردیا گیا۔ اس آیت کے اندر رفع سماوی کا اثبات ہے، جسے نصاری بھی تسلیم کرتے ہیں، اسی میں یہود و نصاری کا اختلاف ہے، یہود اس کے وقوع کا انکار کرتے ہیں، جب کہ نصاری اثبات۔ بہر حال رفع سماوی ایک قدر مشترک بات ہے اگر چہ بعض اس کا اثبات کرتے ہیں اور بعض انکار۔ قرآن کریم نے بعینہٖ اس لفظ کو ذکر کیا ہے، نصاری جس کے قائل ہیں اور یہود منکر۔ لہذا اس معنی کے علاوہ رفع کے دوسرے معنی (رفع درجات وغیرہ) مراد لینا ممکن نہیں۔ یہاں یہ بات ثابت ہوگئی اور درجۂ یقین کو پہنچ گئی کہ قرآن پاک نے اس مقدمے میں نصاری کے عقیدۂ رفع جسمانی کی تائید کی ہے اور قتل وسولی میں دونوں — یہود و نصاری — کی تردید، نیز اسی تردید سے نصاری کا عقیدۂ کفارہ بھی لغو اور مہمل ہوگیا۔

صاحب عقل و ہوش سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اوہامات و مفروضات اندھیرے میں تیر چلانے کے مانند ہیں اور بات کہیں پر ختم نہیں ہوتی، بلکہ نئے نئے مفروضات جنم لیتے رہتے ہیں، خاص طور پر جبکہ گھڑنے والا کسی ایک بات پر نہ جمتا ہو، ایسی صورت میں ضروری ہوتا ہے کہ بیان حقیقت اور کشف واقعہ کی جانب رجوع کیا جائے، اس کے علاوہ اور کوئی سبیل نہیں۔

دوسری بات یہ کہ جب کسی باطل بنیاد سے باطل چیزیں پیدا ہو جائیں، یا کسی فاسد اصل سے منفی نتائج ظاہر ہو جائیں اور بے بنیاد شاخیں نکل آئیں [جس کی جانب ارشاد باری: ''وَلٰکِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۝ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ لَفِیْ شَکٍّ مِّنْهُ مَالَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۝ سے اشارہ ہے کہ یہ سب گھڑے ہوئے اوہامات ہیں (کہ عیسیٰ کو قتل کر دیا گیا اور سولی دے دی گئی) حقیقت واقعہ یہ ہے کہ یہود نے نہ تو حضرت عیسیٰ کو قتل کیا اور نہ ہی سولی دی، بلکہ اللہ رب العزت نے آسمان پر اٹھالیا (ان آیات کی یہی مراد ہے) خواہ ''وَمَا قَتَلُوْهُ یَقِیْنًا'' کو جملہ مستانفہ ماستونف عنہ کے اعادہ کے ساتھ مانیں، جیسا کہ ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ط صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ '' (فاتحہ: ۵-۶) میں ہے، استیناف پر ''یَقِیْنًا'' کی زیادتی کے ساتھ یا ''وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ'' سے متعلق کر کے، گویا یہ جملہ ''وَلٰکِنْ شُبِّهَ'' کے مقابل ہے اور اس کو اسی وجہ سے لایا گیا ہے۔ نیز اس کو، اس کے بعد لائے تاکہ طرداً وعکساً مراد واضح

ہو جائے] تو ان باطل مفروضات کے رد کا طریقہ یہی ہے کہ ان کی جڑ اور بنیاد ہی کاٹ دی جائے اور اکھاڑ کر پھینک دیا جائے، نہ کہ ان سے نکلے ہوئے مفروضات میں الجھا جائے اور انکے رد میں لگا جائے؛ اس لئے کہ ان میں سے ایک اگر ختم ہوگا، تو دوسری طرف دوسرا نکل آئے گا، اسی وجہ سے اللہ رب العزت نے ان کی تردید فرمائی اور صحیح صحیح واقعہ ان کے سامنے پیش کیا۔

الحاصل یہ مناسب نہیں ہے کہ ان کے مفروضات کی بہ طریق استرسال تردید کی جائے، اس لیے کہ جب بھی کسی ایک مفروضے کی تردید کی جائے گی، دوسرا اگ‍ر ھ اٹھے گا مثلاً: نصاری صلیب کو ایک بابرکت شئی قرار دیتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں، تو پھر اس پر لٹکائے جانے میں ذلت اور رسوائی کے کیا معنی؟ (جیسا کہ قادیانی کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰ کو سولی پر لٹکا کر ذلیل اور رسوا کیا گیا؛ حالانکہ خود نصاری کے نزدیک یہ کوئی ذلت اور رسوائی ہی نہیں ہے، بلکہ یہ تو ایک مبارک چیز ہے) چناں چہ پطرس سے منقول ہے کہ: اس نے صلیب کی موت پسند کی تھی، نیز پولس سے بھی یہی منقول ہے، کمافی ''مختصر الدول''، بلکہ ''دائرۃ المعارف'' میں ہے کہ بعض سابقہ اقوام بھی صلیب کو مبارک سمجھتی تھیں، اسی میں یہ بھی ہے کہ عرب میں صلیب کے معنی سولی دینا اور لٹکانا ہے (جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ سولی کی موت کو مبارک سمجھتے ہوئے پسند کرتے تھے)۔

ابن حزم لکھتے ہیں کہ: یہود اس کے معترف ہیں کہ پولس نے یہودیوں کے اشارے پر دین نصاری میں تحریف کی تھی اور یہ پولس یہودیوں کا خاص آدمی تھا، اس نے سولی محض یہودیت کے تحفظ اور حمایت کے لیے اختیار کی تھی، اسی وجہ سے یہ یہودیوں میں مقبول تھا۔ مگر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اس کو سولی دیدی گئی، تو یہودیوں میں اس کی مقبولیت کا کیا مطلب؟ (بزعم یہود سولی کی موت تو موت لعنت ہے، پس یہودیوں کے نزدیک اسے ملعون و مردود ہونا چاہئے تھا نہ کہ مقبول ومحبوب) یہ ان کے مفروضات ومخترعات کا ایک نمونہ ہے، جو تضادات سے بھرا پڑا ہے، لہذا ان کو چھوڑ کر حقیقت امر اور اصل بنیاد کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

پھر یہ کہ جب اللہ تعالی نے اپنے قول: '' وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۝ (نساء: ۱۵۷) سے اس بات کی تصریح فرمادی کہ معاملہ ان پر مشتبہ ہو گیا ہے۔ یعنی صحیح بات یہ ہے کہ حقیقت واقعیہ سے یہ بالکل بے خبر ہیں، سوائے وہم وگمان کے، اس بابت ان کے پاس کوئی صحیح علم نہیں ہے۔ نیز اس کی بھی تصریح ہوگئی کہ ان سے غلطی یا دھوکہ اصل واقعہ ہی کی بابت ہوا، اسی لئے اللہ تعالی نے اصل واقعہ ہی سے تعرض کیا اور ان کے قول کی تردید فرما کر صحیح صورت واقعہ کو بیان فرمایا؛ نہ کہ ان کے گھڑے

ہوئے مفروضات کو۔ چناں چہ ان کے اسی قول کو نقل کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۝'' (نساء:۱۵۷) یعنی ان کا یہ کہنا کہ ہم نے اللہ کے رسول عیسیٰ ابن مریم کو قتل کیا، بالکل جھوٹ اور غلط ہے، نہ تو یہ ان کو مار سکے اور نہ ہی سولی پر چڑھا سکے، بلکہ اس بابت وہ دھوکہ میں مبتلا ہیں اور اصل واقعہ ان سے پوشیدہ ہے۔ پس اس سے یہ بات متعین ہوگئی کہ ان آیتوں میں آگے اصل صورت حال اور واقعہ کا بیان ہے، نہ کہ ان کے باطل مفروضات کا۔

لہٰذا جس بات کی نظم قرآنی میں تصریح ہو، اس کو لغو قرار دینا، بے کار گردانا اور اپنی جانب سے دوسری بات ایجاد کرنا اور اسی کو اصل مقصد، نصب العین اور مطمح فائدہ قرار دینا، کیا آیات قرآنی کا انکار والحاد نہیں ہے؟ کہ جس بات کا بہ صراحت تذکرہ ہو، اسے لغو اور باطل محض بتایا جائے اور جو بات محض ظن وتخمین اور اندھیرے میں لاٹھی چلانے کے درجے میں ہو، اسے مقصد اور منشا قرار دیا جائے۔ کیونکہ ارشاد باری: وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ'' میں یہود کے اس نظریے کا اثبات ہے کہ انھوں نے بزعم خود حضرت عیسیٰؑ کو قتل کیا ہے۔ جب کہ ارشاد باری '' وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ'' میں نصاری کا آپسی اختلاف مراد ہے، اس لئے کہ نصاری کا ایک گروہ، قتل کی تردید کرتا ہے اور اس بات کا قائل ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا رفع بلا قتل ہوا، جب کہ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ: قتل ناسوت کا ہوا اور رفع لاہوت کا، نیز بعض اس بات کے قائل ہیں کہ قتل لاہوت وناسوت دونوں کا ہوا، پھر زندہ کر کے اٹھالیے گئے۔

چونکہ یہ ان کا آپسی اختلاف تھا اسی وجہ سے ''وان الذين خالفوا فيه'' نہیں فرمایا گیا۔ پس جب ثابت ہوگیا کہ اختلاف سے ان کا آپسی اختلاف مراد ہے، تو یہ بات بھی یقینی ہے کہ ان کا یہ اختلاف نفس قتل ہی کی بابت تھا، نہ کہ لازم قتل کی بابت۔ الحاصل آیت کریمہ میں موضع اختلاف قتل ہی ہے اور وہی مبحث ہے نہ کہ اس کے سوا اور کوئی چیز۔ اور آیت: ''وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ'' سے پہلے جو مذکور ہے، وہی ''فِيهِ'' کی ضمیر کا مرجع ہے اور ظاہر ہے کہ وہ قتل ہی ہے نہ کہ لازم قتل۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جب کوئی قوم کسی جھوٹے واقعہ کو لے کر من گھڑت باتیں بناتی ہے تو اصل واقعہ ہی میں فطرت سلیمہ ان کی تکذیب کرتی ہے۔ اسی کو علامہ سکا کی اپنی کتابوں میں ''اصابة للمخر و تطبيق للمفصل'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس میں گندے درخت کو اس طرح جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہے کہ زمین پر اس کا نام ونشان ہی باقی نہ رہ جائے، اس کے برخلاف اگر اصل کی ابطال کے بغیر مخترعات ومنتزعات میں الجھا جائے، تو اس سے اصل اور بنیاد کو تسلیم کرنے اور باقی رکھنے کا شبہ پیدا ہوتا ہے، مثلاً ایک شخص نے کسی

پرالزام لگایا، پھراس بنیادی الزام سے بہت سے ذیلی الزامات تراشے۔ اب اگر مبتلا بہ ان ذیلی الزامات کی تو تردید کرے اور اصل الزام پر خاموش رہے، تو یہ اس کی بے بسی اور کمزوری ہوگی، کیوں کہ اصل مقصد تو اس کے ہاتھ سے جاتا رہا، اسی طرح اگر کسی نے کسی مناظر کو دیکھا کہ وہ گھڑے ہوئے مفروضات ہی کی تردید میں اپنی پوری قوت صرف کر رہا ہے اور اصل جڑ و بنیاد کو اکھاڑ پھینکنے اور اس کی تردید وانکار سے خاموش ہے، تو یہ اس کی لاپرواہی، عاجزی اور سیدھے راستے کو چھوڑنا سمجھا جائے گا، نیز فطری ترتیب کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ بنیاد اور جڑ ہی سے دفاع کیا جائے؛ کیوں کہ نتائج اسی سے نکلتے اور پیدا ہوتے ہیں، فطرت وطبیعت تو اصل واقعہ پر رکتی ہے کہ وہ کس طرح وقوع پذیر ہوا؟ جیسے مدعی اور مدعا علیہ اپنے اپنے دعووں کی بابت ادھرادھر کی باتیں بیان کرتے ہیں، مگر حاکم اصل واقعہ کی تحقیق اور اسے اجاگر کرنے کے درپے ہوتا ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ کیا ایک صاحب عقل و دانش کسی قوم سے خطاب کرتے وقت، کسی سابقہ وضاحت کے بغیر ایک دوسری قوم کی ایسی تلبیسات وتحریفات بیان کریگا، جن سے مخاطب قوم بالکل ناآشنا ہو، جیسے اہل عرب واہل اسلام (جو قرآن کے اول مخاطب ہیں) یہود کی تحریفات وتلبیسات سے بالکل ناواقف تھے (اصل واقعہ کی اطلاع دیئے بغیر قرآن ان کی کیسے تردید کرسکتا تھا)؟ ورنہ ایسا ہی ہوگا، جیسے مخاطب سے کسی ایسی اصطلاح میں بات کی جائے، جسے وہ بالکل نہ جانتا ہو، اسے میں مجہول مطلق کی ایک قسم ہی سمجھتا ہوں اور آیت کریمہ کو اس پر محمول کرنے کو، بدیہی کو نظری ٹھہرانے اور مغالطہ دینے کی کوشش تصور کرتا ہوں۔

تنبیہ

واضح رہے کہ آیت نساء میں چوں کہ اہل کتاب کے دعووں کی تردید مقصود تھی، اس لئے اس میں قتل اور سولی کی نفی، رفع اور اہل کتاب کے حضرت عیسیٰؑ پر وفات سے پہلے ایمان لانے کا اثبات، بھرپور انداز میں کیا گیا۔ برخلاف آیات آل عمران کے یہاں حضرت عیسیٰ کے ساتھ وعدے کئے جارہے ہیں، اس لئے ان میں بالتفصیل ان چیزوں کو بیان کیا گیا جو آپؑ کے لئے باعث تسلی ہوں، مثلاً: توفی، تطہیر، متبعین کا منکرین پر غلبہ وغیرہ۔ اسی وجہ سے یہاں ان چیزوں کو ذکر کیا، جو آپ کی زندگی کے لئے نفع بخش ومسرت آمیز ہوں، ورنہ فقط وفات کا ذکر کافی تھا۔ (اگر "توفی" سے موت مراد ہو۔ اس لئے کہ موت سے جنت کی نعمتیں وخوشیاں خود بخود میسر ہوجائیں گی، دنیاوی نعمتوں کے ذکر کی کوئی ضرورت نہ رہی)

❁ ❁ ❁

فصل سوم

مندرجہ ذیل آیاتِ نساء کی بعض خصوصیات

"وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ..."

ارشاد باری:

"وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللهِ"(نساء :۱۵۷)

"اوران کے اس کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم کو جوکہ رسول ہیں اللہ تعالیٰ کے قتل کر دیا"۔

میں تین امور مذکور ہیں:

۱- ان کی جہالت پر نکیر۔

۲- قتل عیسی - جو کہ درحقیقت واقع نہیں ہوا۔

۳- یہود کا دعوائے قتل۔

اللہ رب العزت نے پہلی بات پر تغلیظ نہیں کی، بلکہ نرمی کے ساتھ غلطی کی بنیاد کو واضح کیا، لہذا یہود پر لعنت کی وجہ سوائے ان کے دعوی: "إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ" (ہم نے عیسی کو قتل کیا) کے اور کچھ نہ رہی، کیوں کہ قتل ہی کی طرح دعوائے قتل بھی کفر اور باعث لعنت ہے۔ اسی وجہ سے پہلی بات کی بھرپور انداز میں تردید کی اور دوسری پر لعنت بھیجی۔ یہ واضح رہے کہ محض طریقۂ قتل باعث لعنت نہیں، بلکہ نفس قتل ہی باعث لعنت ہے، خواہ وہ کسی بھی طریقہ سے ہوا ہو۔ اسی لیے قتل کو مستقلاً ذکر کیا، پہلے بھی اور بعد میں بھی، جس سے معلوم ہوا کہ یہاں مقصود، مطلق قتل کی نفی ہے نہ کہ کسی خاص طریقے سے قتل کی، ورنہ اگر مقصود موت لعنت یعنی سولی کی نفی ہوتی (یہود سولی کی موت کو باعث لعنت تصور کرتے ہیں) تو اللہ تعالیٰ اپنے ارشاد "وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ" میں اس کا بھی تذکرہ کرتے۔

الحاصل اللہ رب العزت نے خود مقصود کی تصریح کر دی ہے (اور وہ ہے حضرت عیسیٰ کو قتل کرنے کا

دعوی اور حضرت عیسی کے مقتول ہونے کی نفی۔) چوں کہ: "وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُنِ ابْنُ اللهِ" (توبہ:۳۰) میں "عُزَيْرُ بنُ اللهِ" بلا تنوین کی قرآت، موجب اشکال تھی کہ اس مبتداء کی کوئی خبر مذکور نہیں، اب اگر خبر "معبودنا" مقدر مانی جائے تو اس صورت میں اللہ رب العزت کا انکار ورد فقط خبر پر واقع ہوگا، یعنی حضرت عزیر کے معبود ہونے کا تو انکار ہوگا، مگر مبتداء یعنی عزیر کی صفت ابنیت کا رد نہ ہوگا۔ اس لیے علماء نے فرمایا کہ مبتداء کی کوئی خبر مقدر نہ مانی جائے اور یہ سمجھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے قول میں سے یہاں صرف اتنی ہی بات نقل کی ہے جس پر نکیر مقصود تھی۔ کما ذکرہ فی "الایضاح" مجیباً عن کلام الشیخ فی "دلائل الاعجاز"۔

پھر اگر: "اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ" سے ان کی مراد یہ ہو کہ خود مشیت ایزدی نے حضرت عیسی کی موت مقدر کر دی تھی، تو یہ بات ہوگی کہ۔ العیاذ باللہ۔ اللہ تعالیٰ جھوٹے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو یہود: "اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ" نہ کہتے، بلکہ قتل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے ہوئے "قتلهُ الله" (اللہ نے عیسیٰ کو قتل کیا) کہتے؛ اس لیے کہ قتل کی نسبت اپنی طرف کرنے سے تو ان کا یہ دعوی (کہ حضرت عیسیٰ کی موت اللہ تعالیٰ کے مقدر کرنے سے ہوئی ہے) اہل عقل کے نزدیک ھباءً منثوراً ہوتا جا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ اصلاً ان کی گفتگو لازم اور نتیجہ کی بابت نہیں ہے؛ بلکہ ان کی گفتگو اس واقعہ کی بابت ہے جو ان کے بہ قول پیش آیا تھا (یعنی قتل عیسیٰ) اس لیے کہ اگر وہ اس کے بجائے اپنے مفروضات بیان کرتے اور جواباً اللہ رب العزت اصل واقعہ بیان کرتا، تو اس صورت میں معاملے کو غیب کی جانب منتقل کرنا لازم آتا اور اصل واقعہ کبھی بھی واضح نہ ہوتا۔

الحاصل جو کچھ پیش آیا، یہاں اسی کا بیان ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ لوگ حضرت عیسیٰ کو کسی بھی قسم کی کوئی گزند نہیں پہنچا سکے اور جو کچھ کہتے ہیں کہ: ہم نے یہ کیا، وہ کیا، یہ سب محض بکواس ہے اور اسی بکواس کی وجہ سے یہ مستحق لعنت ہوئے (جیسا مذکور ہو چکا کہ قتل ہی کی طرح دعوائے قتل بھی کفر اور باعث لعنت ہے)

"وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَاصَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ"

علامہ زجاج نے صراحت کی ہے کہ جب "قد فعل فلان" کہا جائے تو اس کا جواب "لما یفعل؟" آئے گا اور جب صرف "فعل" کہا جائے، تو اس کا جواب "لم یفعل" ہوگا اور "لقد فعل" کے جواب میں "مافعل" کہا جائے گا۔ گویا کہ قائل نے "والله لقد فعل" کہا اور مجیب نے "والله مافعل"۔ نیز "ھو یفعل" بہ صیغۂ مستقبل، کا جواب "لا یفعل" اور "سیفعل" کا جواب "لن یفعل" ہوگا۔ اس تمہید کے بعد واضح ہو کہ اگر اللہ تعالیٰ صرف "وَمَا صَلَبُوْهُ" فرماتے تو قتل بذریعہ سولی کی تو نفی ہوتی، لیکن قتل بلا سولی کی

نفی نہ ہو پاتی اور اگر صرف ''وَمَا قَتَلُوْهُ'' فرماتے، تو قتل بذریعہ سولی کی نفی لازم نہ ہوتی، اس لیے کہ بہت سے قتل بغیر سولی کے ہوتے ہیں (لہذا اللہ رب العزت نے ''وَمَاقَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ'' فرما کر ہر طرح کے قتل کی نفی کردی اور ان کے دعوائے قتل کو جڑ ہی سے ختم کردیا)

خلاصہ یہ کہ قتل کبھی تو سولی کے ساتھ ہوتا ہے اور کبھی بغیر سولی کے اور کبھی اس کے برعکس، اس لیے اللہ رب العزت نے رد کرتے ہوئے نفی میں دونوں صورتوں کو جمع کردیا اور حرف نفی ''ما'' مکرر لائے، تاکہ ہر ایک کی مکمل طور پر نفی ہو جائے، نہ کہ صرف مجموعہ (قتل بذریعہ سولی) کی۔

علاوہ ازیں چوں کہ ان کا مقصد اصلی حضرت عیسیٰ کو ہلاک کرنا تھا۔العیاذ باللہ— نہ کہ فقط بذریعہ سولی قتل کرنا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قتل کو مستقلاً پہلے اور آخر میں ذکر کیا۔ نیز بہ موجب عقیدۂ یہود جھوٹے نبی کا قتل لازم ہے؛ اس لیے ضروری تھا کہ قتل بلا سولی کی بھی نفی کی جاتی۔ ایک قول یہ ہے کہ یہود کی عادت یہ تھی کہ پہلے وہ قتل کرتے، پھر سولی دیتے تھے، جیسا کہ تورات کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے عبارت قرآنی ایسی آئی جو دونوں فریقوں کے رد کو شامل ہے، صلیب کو باعث لعنت و ذلت سمجھنے والوں کو بھی اور معبود والہہ سمجھنے والوں کو بھی۔ یا یہ کہ بیچ میں تنہا سولی کا ذکر نصاریٰ پر رد کرنے کے لیے کیا گیا اور پھر دوبارہ ''وَمَاقَتَلُوْهُ يَقِيناً'' سے یہود پر رد کیا گیا۔

ارشاد باری: ''وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ'' میں بہ ظاہر شبہ کی اسناد جار مجرور کی طرف ہے (جس سے مراد یہود ہیں) اور اگر یہ آیت شبہ ڈالنے کے معنی میں ہو تو بھی ادنی شبہ ہی سے آیت کے مفہوم کی مطابقت ہو جائے گی، مکمل طور پر مشابہت ضروری نہیں۔ جیسا کہ حدیث میں حضرت موسیٰ کی بابت آیا ہے:

''كانه من رجال شنوء ة'' (مسلم: ۹۴/۱)

''(یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شب معراج میں حضرت موسیٰ کو میں نے دیکھا تو ان کی شکل وصورت ایسی تھی) جیسا کہ کوئی قبیلہ بنوشنوءہ کا آدمی ہو''۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''كانه من رجال الزط'' (بخاری: ۴۸۹/۱)

''جیسا کہ زط کے لوگوں میں سے کوئی ہو''۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بابت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''كانه عروة بن مسعود الثقفي'' (مسلم: ۴۰۳/۲)

''گویا کہ عروہ ابن مسعود ثقفی ہیں (یعنی عروہ ابن مسعود کے مشابہ ہیں)''۔

اس روایت کو امام احمد و مسلم نے حضرت ابنؓ سے روایت کیا ہے۔ جب کہ مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب والی حدیث میں، حضرت عیسیٰ کی صورت مذکورہ صورت و ہیئت کے علاوہ مذکور ہے۔تو کیا کسی شخص کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ قرار دینا زیادہ مشکل ہے بہ مقابلہ آپؑ کو مقتول و مصلوب کے مشابہ قرار دینے کے؟ یا آپؑ کو کسی آدمی کے مشابہ قرار دینا زیادہ آسان ہے، بہ مقابلہ آپ کو مصلوب و مقتول کے مشابہ قرار دینے کے-العیاذ باللہ من الإلحاد وسوء الفهم۔

تاریخ ''دینان'' کے حوالے سے چراغ علی نے نقل کیا ہے کہ: اس وقت جس مجرم کو سولی دینے کے لیے پکڑا گیا تھا، اتفاقاً اس کا نام بھی یسوع ہی تھا[طبری نے بھی اپنی تاریخ میں اسے ذکر کیا ہے] اور اس کا لقب ''باربان'' تھا۔تو گویا یہ بھی ایک طرح کا وجہ اشتباہ ہوا، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ توریت میں جگہ جگہ یہ بات مذکور ہے کہ ''برے لوگ نیک لوگوں کا فدیہ بن جاتے ہیں''۔

ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ''وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ'' فرمایا، نہ کہ ''ولکن شبه علیهم'' جس سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اشتباہ کا واقع ہونا کوئی اتفاقی امر نہ تھا، جیسا کہ بہت سے امور اتفاقاً واقع ہوجاتے ہیں، بلکہ اللہ رب العزت نے حضرت عیسیٰ کی حفاظت وصیانت کے لیے باقاعدہ یہ تدبیر کی تھی۔

صاحب ''موضح'' لکھتے ہیں کہ: ''ان کے سامنے صورت حال ویسی ہی بنادی گئی تھی، جیسا ان کا اعتقاد تھا''۔رہا یہ اعتراض کہ ''وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ'' کے بجائے ''ولکن شبه علیهم'' زیادہ مناسب تھا، کیوں کہ ''لهم'' سے مذکورہ بالا نکتے کا فائدہ نہیں ہورہا ہے؟ تو اس کے جواب کے لیے ابن حزم کی وہ بحث دیکھنی چاہیے، جس میں انہوں نے تواتر کے یقین کا فائدہ دینے پر گفتگو کی ہے، یہ اشکال خود بہ خود حل ہوجائے گا؛ اگرچہ مذکورہ معنی میں ''علی'' صلے کے ساتھ ''شبه'' کا استعمال معروف ومشہور ہے، چناں چہ مسلم شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

''كفن رسول الله صلى الله عليه وسلم في ثلاثة أثواب، بيض سحولية من كرسف، ليس فيها قميص، ولا عمامة، أما الحلة فانما شبه على الناس فيها أنها اشتريت له ليكفن فيها، فتركت الحلة، وكفن في ثلاثة اثواب بيض سحوليه''۔(مسلم: ۱/۳۰۶)

''کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین کپڑوں میں کفنائے گئے تھے، جو سحول یمن کی سفید کچی روئی سے بنائے ہوئے تھے، نہ ان میں (سیاہوا) کرتا تھا نہ پگڑی تھی، ہاں حلہ تھا، مگر اس کا معاملہ لوگوں پر مشتبہ

ہوگیا کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کفن کے لیے خریدا گیا ہے؟ لہٰذا حلّہ کو چھوڑ دیا گیا اور سحول یمن کی پکی روئی سے بنے ہوئے تین سفید کپڑوں میں کفنا دیا گیا"۔

اسی طرح "کنز العمال: ۲۶۴/۷" میں، کانا دجال کی بابت ہے:

"فما شُبِّه عليكم من شانه فاعلموا ان الله ليس باعور"۔

"اس کی جو کیفیت تمہارے لیے شبہ کا باعث ہو تو اتنا ضرور جان لو کہ حق تعالیٰ یک چشم نہیں"۔

اسی طرح "نہایة" میں حضرت حذیفہ کی ایک حدیث ہے، جس کی تخریج صاحب "مستدرک" نے صحیح سند کے ساتھ "کتاب الفتن" (ج:۴، ص:۴۹۵، رقم ۸۳۸۵) میں کی ہے۔

"انها تشبه مقبلة وتبين مدبرة"

"(یہ فتنہ) آتے ہوئے سامنے سے تو شبہ میں ڈالنے والا ہے؛ لیکن پیچھے سے (جاتے ہوئے) ظاہر ہو جاتا ہے"۔

یہاں "علی" حذف کر دیا گیا ہے، نیز صحیح بخاری میں ہے

"فمن ترک ماشبه عليه من الاثم كان لما استبان أترک" (بخاری: ۲۷۵/۱)

"جس نے مشتبہ گناہ چھوڑ دیا، تو وہ بدرجہ اولیٰ واضح گناہ چھوڑ دے گا"۔

اور اگر "شبہ" کی ضمیر کا مرجع کوئی دوسرا مقتول ہو، جیسا کہ حضرت ابن عباس اور ان کے بہت سے متبعین کی رائے ہے، تو اس صورت میں مشبہ بہ کا تذکرہ نہ کرنا، حضرت عیسیٰ کو اس سے بچانے کے لیے ہے کہ آپ کے ساتھ کسی کو کامل مشابہت دی جائے، اس لیے کہ مقصود تو فقط یہود کو شک میں مبتلا کرنا ہے (نہ کہ کسی کو حضرت عیسیٰ کے مشابہ قرار دینا)۔

"تفسیر ابن کثیر" میں ہے کہ: یہ سب باتیں دراصل خدا تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کا امتحان ہیں، جو اس کی حکمت بالغہ کا تقاضہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس پورے معاملے کو، معجزات، بینات اور واضح دلائل سے مؤیدا پنے معزز رسول پر نازل شدہ کتاب مبین میں بالکل صاف، واضح اور روشن کر دیا ہے، چناں چہ اس ذات عالی کا ارشاد ہے، جو سب سے زیادہ سچا، دونوں عالم کا پالنہار، رازوں اور بھیدوں پر مطلع، آسمان و زمین کی پوشیدہ چیزوں پر واقف، جو کچھ ہو چکا، یا ہوگا، ہوا نہیں لیکن اگر ہوتا تو کیسے ہوتا؛ کا عالم ہے:

"وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ"

"یعنی حقیقتاً نہ تو کسی نے حضرت عیسیٰ کو قتل کیا اور نہ سولی دی، بلکہ معاملہ ان پر مشتبہ ہو گیا"۔

بایں طور کہ جس شخص پر حضرت عیسیٰ کی شبیہ ڈالی گئی تھی، جب اسے دیکھے تو، اسے ہی حضرت عیسیٰ سمجھ بیٹھے۔ (اور

سولی دے کر یہ خیال کرلیا کہ عیسیٰ کو سولی دیدی، حالاں کہ ایسا نہیں ہوا) اسی وجہ سے مزید ارشاد باری ہوا:

"وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ لَفِیْ شَکٍّ مِّنْهُ مَالَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ"

"کہ اہل کتاب میں سے جو لوگ حضرت عیسیٰ کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں، وہ غلط خیال میں مبتلا ہیں، ان کے پاس اس پر کوئی صحیح دلیل موجود نہیں، بجز تخمینی باتوں پر عمل کرنے کے"۔

مطلب یہ ہے کہ قتل کا دعویٰ کرنے والے یہود اور ان کی تصدیق کرنے والے عیسائی، سب کے سب اس بابت شکوک وشبہات، نیز ضلالت وگمراہی اور حیرت میں مبتلا ہیں، جب کہ حق بات یہ ہے: "وَمَا قَتَلُوْهُ یَقِیْناً" کہ ان لوگوں نے اس یقین کے ساتھ قتل نہیں کیا کہ یہ عیسیٰ ہی ہیں، بلکہ شک اور وہم میں مبتلا رہے (کہ نہ جانے کون ہے عیسیٰ ہی ہیں یا کوئی دوسرا؟) صحیح ویقینی بات یہ ہے: "بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ وَکَانَ اللّٰهُ عَزِیْزاً" (کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف یعنی آسمان پر اٹھالیا اور اللہ تعالیٰ بڑے زبردست ہیں) یعنی اللہ تعالیٰ انتہائی زبردست شان و دبدبے والے ہیں، اس کے قریب پھٹکنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اور وہ جس کا حامی ومددگار ہو، اس تک ظلم کی رسائی نہیں ہوسکتی، "حَکِیْماً" (حکمت والے ہیں) یعنی اپنے تمام فیصلوں اور پیدا کردہ چیزوں میں حکمت سے کام لیتے ہیں، حکمت بالغہ، حجت دامغہ، سلطنت عظیمہ اور امر قدیم اسی کے لیے ہے۔

ابن ابی حاتم فرماتے ہیں کہ: بیان کیا مجھ سے احمد بن سنان نے بہ واسطہ ابو معاویہ عن الاعمش عن المنہال بن عمرو، عن سعید بن جبیر کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

"لما اراد الله ان يرفع عيسى الى السماء خرج الى اصحابه وفى البيت اثنا عشر رجلاً من الحواريين ،يعنى فخرج عليهم من عين فى البيت وراسه يقطر ماء، فقال: ان منكم من يكفر بى اثنى عشرمرة بعد أن آمن بى، قال: ثم قال: ايكمْ يلقى عليه شبهى فيقتل مكانى، ويكون معى فى درجتى؟ فقام شاب من أحد ثهم سناً، فقال له: اجلس ، ثم عاد عليهم، فقام ذلك الشاب، فقال: اجلس، ثم عاد عليهم، فقام الشاب، فقال: أنا، فقال: هو انت ذاك، فالقى عليه شبه عيسى ،ورفع عيسى من روزنة فى البيت الى السماء، قال: وجاء الطلب من اليهود، فاخذوا الشبه، فقتلوه ثم صلبوه، فكفربه بعضهم اثنى عشرمرة بعد أن آمن به، وافترقوا ثلاث فرق: فقالت فرقة: كان الله فينا ماشاء ثم صعد الى السماء، وهؤلاء اليعقوبية، وقالت فرقة :كان فينا ابن الله ماشاء ثم رفعه الله اليه، وهؤلآء النسطورية، وقالت فرقة: كان فيناعبدالله ورسوله ماشاء الله ثم رفعه الله اليه

وهؤلاء المسلمون، فتظاهرت الكافرتان على المسلمة، فقتلوها، فلم يزل الاسلام طامساً حتى بعث الله محمداً صلی الله علیه وسلم".

وهذا اسناد صحیح الی ابن عباس، ورواه النسائی عن ابی کریب عن ابی معاوية بنحوه. (تفسير القرآن العظيم لابن كثير ج: ۱، ص: ۵۴۴، سورة النساء: ۱۵۸)

"کہ جب اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان کی طرف اٹھانے کا ارادہ کیا، تو عیسیٰ علیہ السلام اپنے اصحاب (حواریین) کے پاس آئے، اس وقت گھر کے اندر بارہ حواری تھے۔ حواریوں کے پاس آنے کا مطلب یہ ہے کہ گھر میں جو چشمہ تھا، اس سے غسل کر کے حواریوں کے پاس آئے، دراں حالے کہ سر سے پانی ٹپک رہا تھا۔ اور آکر آپ نے فرمایا: تم میں سے بعض ایسے بھی ہیں کہ مجھ پر ایمان لانے کے بعد بارہ مرتبہ کفر کریں گے۔ پھر فرمایا: تم میں سے کون اسے پسند کرتا ہے کہ میری شبیہ اس پر ڈال دی جائے، پھر میری جگہ قتل کیا جائے (اور اس کے بدلے) وہ جنت میں میرا رفیق بنے؟ (یہ سن کر) ایک نوجوان، جو ان میں سب سے کم عمر تھا، کھڑا ہوا اور اپنے آپ کو اس کے لیے پیش کیا۔ آپ نے اس سے کہا: تم بیٹھ جاؤ۔ پھر دوبارہ آپ نے یہی اعلان کیا۔ تو وہی نوجوان پھر کھڑا ہوا، آپ نے پھر اس سے بیٹھ جانے کو کہا۔ تیسری مرتبہ پھر جب آپ نے اعلان کیا تو پھر وہی نوجوان کھڑا ہوا اور کہا کہ میں ہوں (یعنی میں اس کے لیے تیار ہوں) آپ نے فرمایا: کہ بیشک تو ہی اس کا مستحق ہے، چناں چہ اس پر حضرت عیسیٰ کی شبیہ ڈال دی گئی اور حضرت عیسی گھر کے روشن دان سے آسمان کی طرف اٹھا لیے گئے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ: یہود آپ کو ڈھونڈتے ہوئے آئے اور آپ کے ہم شکل حواری کو پکڑ کر قتل کیا، پھر سولی دی اور آپ کی پیشین گوئی کے مطابق بعض حواریوں نے آپ پر ایمان لانے کے بعد بارہ مرتبہ کفر کیا۔ پھر لوگ تین گروہوں میں بٹ گئے: یعقوبیہ، نسطوریہ، اور مسلمان (یعنی اہل حق)۔ یعقوبیہ تو کہنے لگے کہ خود خدا ہی ہم میں تھا، جب تک چاہا رہا، پھر آسمان پر چڑھ گیا۔ جب کہ نسطوریہ کا کہنا تھا کہ خدا کا بیٹا ہم میں تھا، جب تک چاہا رہا، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس اٹھا لیا اور مسلمانوں (یعنی حق پرستوں) کا عقیدہ یہ رہا کہ: اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہم میں تھا، جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا، وہ ہم میں رہا، پھر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا۔ دونوں گمراہ و کافر فرقوں کا تیسرے مومن فرقے پر غلبہ ہو گیا، چنانچہ انہوں نے اس جماعت کو ختم کر دیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر اسلام کو غلبہ عنایت فرمایا"۔

اس روایت کی اسناد حضرت ابن عباس تک بالکل صحیح ہے، نیز امام نسائی نے بواسطہ ابو کریب حضرت ابو معاویہ

سے بھی اسی طرح روایت کیا ہے (تفسیر ابن کثیر، سورہ نساء: ۱۵۸)

نیز اسی طرح بہت سے سلف سے بھی منقول ہے کہ حضرت عیسیٰ نے حواریوں سے کہا:

"أيكم يلقى عليه شبهي، فيقتل مكاني، وهو رفيقي في الجنة؟"

"تم میں سے کون اس بات کو پسند کرے گا کہ اس پر میری شبیہ ڈال دی جائے اور پھر وہ میری جگہ قتل کیا جائے - اور اس کے بدلے - جنت میں وہ میرا رفیق بنے"۔

پس جب معاملہ مشتبہ ہونے اور مشتبہ کرنے کے درمیان ہے تو مشبہ کو ذکر نہ کرنا ہی مناسب ہوا، علاوہ ازیں چوں کہ یہ تشبیہ حضرت عیسیٰ کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھی [نہ کہ یہودیوں کے انہیں سولی پر چڑھانے کی وجہ سے] اس لیے "شبہ" کو مجہول لایا گیا۔ ورنہ اگر ان کے فعل کی وجہ سے ہوتی تو عبارت یہ ہوتی: "وَلٰكِنْ شابه لهم"۔

نیز اس جگہ "تشبیہ" اور "مشابہت" کے فرق کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے، اس لیے کہ "تشبیہ" دو چیزوں کی جانب سے نہیں، بلکہ کسی تیسری چیز کی طرف سے ہوتی ہے، برخلاف "مشابہت" کے (کہ یہ جانبین سے ہوتی ہے)۔

ابن حزم "الملل اولنحل" میں لکھتے ہیں کہ: ارشاد باری: "وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ" میں ان لوگوں کے شبہ میں پڑنے کی خبر ہے، جو اپنے پیش رو یہود و نصاریٰ کی تقلید میں کہتے تھے کہ: "حضرت عیسیٰ کو قتل کیا گیا اور سولی دی گئی"۔ پس یہی وہ لوگ ہیں، جنہیں ان کے بڑوں نے شبہ میں ڈال دیا، چوں کہ وہ قسمیں کھا کھا کر ان سے کہتے تھے کہ: انہوں نے حضرت عیسیٰ کو (نعوذ باللہ) قتل کر دیا اور سولی دے دی، حالاں کہ یہ مدعیان دل سے جانتے تھے کہ انہوں نے نہ تو حضرت عیسیٰ کو قتل کیا ہے اور نہ سولی دی ہے، بلکہ حضرت عیسیٰ کی قیام گاہ سے ایک آدمی کو [اس بات کو جانتے ہوئے کہ یہ عیسیٰ نہیں ہے] پکڑا اور چپکے سے لے جا کر قتل کیا، پھر سولی پر لٹکا دیا۔ دوسرے لوگوں کو وہاں آنے نہیں دیا، پھر سولی سے اتار کر دفن کر دیا؛ تا کہ جن لوگوں پر یہ خبر مشتبہ ہو گئی تھی انہیں دھوکہ دیا جا سکے"۔ انتہی۔

اس صورت میں "وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ" میں "عليهم" کے بجائے "لهم" لانے کا یہ ایک دوسرا نکتہ ہوا۔ اور اس میں اس شخص کی تعیین ہے، جس نے شبہ ڈالنے کا کام اپنے غیر پر کیا، اسی بات کو صاحب "کشف الاسرار" نے بھی بیان کیا ہے، چناں چہ وہ لکھتے ہیں کہ ارشاد باری: "وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ" کا مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ یہ دعویٰ ان کے یہاں مشہور ہے، (جو خلاف واقعہ ہے، حق بات یہ ہے) "وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ" (کہ یہود نے نہ تو حضرت عیسیٰ کو قتل کیا اور نہ

ان کو سولی پر چڑھایا، بلکہ ان کو اشتباہ ہو گیا) اس عبارت میں غور کرو اور دیکھو کہ "وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَہُمْ" اور " ولکن شبہ اللہ لھم " یا "اشتبہ علیھم " (اگر فرماتے) میں کتنا فرق ہے؛ کیوں کہ اگر "شبہ اللہ" ہوتا تو اس میں ان کی عزت ہوتی کہ ان کی خوشنودی کے لیے حضرت عیسی کے مشابہ ایک ایسے شخص کو کر دیا گیا، جس کے قتل سے یہود خوش ہو جائیں خواہ وہ عیسیٰ نہ ہو۔ اگر چہ اللہ قادر مطلق اس پر قادر تھا کہ ایسا کیے بغیر ہی حضرت عیسیٰ کو باعزت ان سے نجات دے دیتا۔

اسی طرح اگر "اشتبہ علیھم " فرماتے تو یہ اس پر دلالت کرتا کہ معاملہ ان سب پر مشتبہ ہو گیا (حالاں کہ فقط عوام پر مشتبہ ہوا، خواص یعنی قاتلین کو حقیقت کا علم تھا کہ مقتول حضرت عیسیٰ نہیں ہیں، بلکہ دوسر شخص ہے)۔ جب کوئی چیز مشتبہ ہو جاتی ہے تو یہ بھی جائز ہے کہ نفس الامر میں مشارٌ الیہ وہی ہو، اس لیے کہ اصل مشتبہ وہی ہے، جیسا کہ یہ بھی جائز ہے کہ دوسری چیز ہو کہ وہ بھی تو مشتبہ ہی ہے۔ نیز یہاں ضمیر حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب ہے یعنی مشار الیہ آپ ہی ہیں، اس لیے بھی ضروری ہوا کہ "شُبِّہَ لَہُمْ" ہی کہا جائے۔ ارشاد باری "شُبِّہَ " اور اس کے بعد کی آیات سے اس قول کی تائید ہوتی ہے، جسے جبائی نے نقل کیا ہے کہ: "جب حضرت عیسی کو آسمان پر اٹھا لیا گیا، تو سرداران یہود کو اندیشہ ہوا کہ کہیں یہود بھی حضرت عیسی پر ایمان نہ لے آئیں اور حواریوں کی طرح یہ بھی ان کی اتباع کر بیٹھیں؛ لہذا انہوں نے جان بوجھ کر ایک آدمی کو پکڑ کر قتل کیا، پھر ایک بلند مقام پر لے جا کر سولی پر لٹکا دیا اور کسی کو دیکھنے کے لیے قریب نہ آنے دیا (کہ کہیں کوئی پہچان لے اور لوگوں کو بتلا دے کہ یہ عیسی نہیں ہیں بلکہ دوسرا آدمی ہے) دوسری طرف یہ ہوا کہ من جانب اللہ اس مقتول کی صورت عجیب وغریب انداز میں بدل دی گئی؛ چناں چہ انہوں نے یہ دعوی کر دیا کہ ہم نے عیسی کو قتل کر دیا اور ساری قوم کو دھوکہ میں مبتلا کر دیا اس پر قوم میں اختلاف ہو گیا، اسی کی جانب آیت کریمہ: "وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْہِ لَفِیْ شَکٍّ مِّنْہُ" میں اشارہ ہے کہ جو لوگ حضرت عیسی کے قتل کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں، وہ شک میں مبتلا ہیں "مَالَہُمْ بِہٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْہُ" قتل کی بابت ان کے پاس کوئی صحیح دلیل موجود نہیں، سوائے تخمینی باتوں پر عمل کرنے کے، صحیح بات یہ ہے کہ یہود نے حضرت عیسیٰ کو قتل نہیں کیا۔ "یَقِیْنًا" نیز جو لوگ قتل کرنے کا دعوی کر رہے ہیں، انہیں خود بھی اس بات پر یقین ہے کہ انہوں نے حضرت عیسی کو قتل نہیں کیا۔ (سوال یہ ہے کہ پھر لوگوں کو شبہ کیوں کر ہوا؟ تو اس کا سبب یہ ہوا کہ) مدعیان قتل نے ان بقیہ لوگوں پر معاملے کو مشتبہ کر دیا، جن کے سامنے ایک ایسے شخص کو حضرت عیسی کے مشابہ کر دیا گیا، جو کسی قدر پہلے سے حضرت عیسی کے مشابہ تھا۔

لہٰذا اس عبارت قرآنی میں صورت واقعہ کی وضاحت کی گئی اور اگر اللہ تعالیٰ ان کی وجہ سے کسی شخص کو حضرت عیسیٰ کے مشابہ کرتا اور پھر وہ اس کو قتل کرتے، تو ان کا یہ کہنا: ''اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ'' (کہ ہم نے مسیح کو قتل کیا) نہ ہی کوئی عجیب بات ہوئی اور نہ ہی جھوٹ ہوا۔ اصول فقہ کے اس جزئیہ پر قیاس کرتے ہوئے کہ اگر کسی نے اپنی بیوی سمجھ کر، کسی ایسی عورت سے جماع کر لیا، جو اس کی بیوی کے مشابہ تھی، تو اس کو زانی نہیں کہا جائے گا۔ (اس لیے کہ نفس الامر میں بھی وہ اس کو اپنی بیوی ہی سمجھ رہا تھا) علاوہ ازیں ارشاد باری: ''وَمَاقَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ'' اس پر دلالت کرتا ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو پہلے قتل کیا، پھر سولی پر لٹکایا، نیز انہوں نے یہ سب کچھ جان بوجھ کر کیا اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ''اشتبہ'' نہیں فرمایا (کہ ان پر مشتبہ ہو گیا) کیوں کہ قاتلین کو اشتباہ نہیں ہوا تھا؛ بلکہ سرداران یہود نے شبہ میں ڈال دیا تھا، جس سے دوسرے لوگ شبہ میں پڑ گئے۔ نیز جیسا کہ مذکور ہو چکا کہ اللہ تعالیٰ نے ''شبہ اللہ'' بھی اسی وجہ سے نہیں فرمایا۔

وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ...

واضح رہے کہ جن لوگوں نے اس معاملے میں اختلاف کیا، وہ سرداران قوم کے علاوہ دیگر لوگ تھے، کیوں کہ یہ سب کے سب یہودی تھے، ہاں یہ ضرور ہوا کہ حضرت عیسیٰ پر ایمان لانے کے بارے میں بعض یہودیوں نے بعض کی مخالفت کی، چناں چہ انہی بقیہ یہودیوں و نصرانیوں کی بابت خبر دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ'' کہ جن لوگوں نے حضرت عیسیٰ پر ایمان لانے کے بارے میں اختلاف کیا [نہ کہ قتل کی بابت، یعنی ''فیہ'' کی ضمیر کا مرجع ''الایمان بعیسی'' ہے، نہ کہ قتل عیسیٰ] ''لَفِیْ شَکٍّ مِّنْهُ'' (وہ شک میں مبتلا ہیں) اس کے بعد پھر گفتگو کا رخ سرداران قوم اور اصل صورت حال سے واقف لوگوں کی طرف پھیرتے ہوئے ارشاد ہوا: ''وَمَاقَتَلُوْهُ یَقِیْنًا'' یعنی ان لوگوں کو یقین تھا کہ ہم نے عیسیٰ کو قتل نہیں کیا ہے، بلکہ یہ کہہ کر کہ: ہم نے عیسیٰ کو قتل کیا، لوگوں کو شبہ میں ڈال دیا۔

الحاصل ''وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا'' سے یہود و نصاریٰ دونوں مراد ہیں (یعنی ''اِخْتَلَفُوْا'' کا فاعل دونوں ہیں) اسی وجہ سے ''اختلفوا فی قتلہ'' نہیں فرمایا گیا (ورنہ پھر فقط یہود ہی مخاطب ہوتے) جب کہ ''مَالَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ'' میں ''ھم'' ضمیر سرداران یہود کے علاوہ باقی یہود و نصاریٰ کی طرف لوٹ رہی ہے (کیوں کہ سرداروں کو اصل حقیقت کا علم تھا) اور حرف ''من'' یہاں پر استغراق جنس کے لیے ہے (جس کا مطلب یہ ہوا کہ عام یہود و نصاریٰ کو حقیقت حال کا بالکل کوئی علم نہیں تھا) اور ''اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ'' سے مراد یہ ہے کہ ان عام لوگوں کا اپنے

سرداروں کے عمل وقول کی اتباع کرنا محض اتباع ظن وگمان ہے۔ علاوہ ازیں اللہ رب العزت نے جیسے ہی تبعین کے وہم وگمان کا تذکرہ کیا، فوراً مشابہت کی بات کہنے والوں کے یقین کا بھی ذکر کیا اور ساتھ ہی ساتھ حضرت عیسیٰ کے قتل کی نفی بھی کردی، چناں چہ ارشاد فرمایا: ''وَمَا قَتَلُوْهُ'' یعنی ہماری یہ خبر کہ انھوں نے حضرت عیسیٰ کو قتل نہیں کیا، ان کو بھی اس پر یقین ہے کہ ہم نے عیسیٰ کو قتل نہیں کیا، اس لیے اس سے نہ سمجھا جائے کہ انھوں نے حضرت عیسیٰ کو شک کے ساتھ قتل کیا۔ اصل واقعہ یہ پیش آیا: ''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزاً حَكِيْماً'' (کہ اللہ رب العزت نے حضرت عیسیٰ کو آسمان پر اٹھالیا اور اللہ زبردست ہے اور حکمت والا ہے)

صاحب ''کشف الاسرار'' کی مندرجہ بالا عبارت کا خلاصہ یہ ہوا کہ: آیت کریمہ میں یقین کی بات اگرچہ اللہ تعالیٰ کے خبر دینے سے ہے، لیکن اس کا تعلق ان کے فعل سے ہے اور لفظ ''يَقِيْناً'' منصوب بنزع الخافض ہے، اس کا خافض حرف ''عن'' محذوف ہے، گویا عبارت ''عن یقین'' تھی پس ''یقیناً'' نفس حکم کی قید نہیں، بلکہ اخبار حکم کی قید ہے، اسی بات کو ابن حاجب نے ''شرح مفصل'' میں یوں بیان کیا ہے: ''کہ آیت کریمہ ''وما قَتَلُوْهُ يَقِيْناً'' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انھوں نے حضرت عیسیٰ کو یقین کے ساتھ قتل نہیں کیا، جس کا مفہوم یہ نکلے کہ شک کے ساتھ قتل کیا''۔ العیاذ باللہ۔

نیز صاحب ''کشف'' کا یہ کہنا: ''وھم الذِینَ شبھو البقیۃالناس منھم'' کہ ان سرداروں نے ہی باقی لوگوں پر معاملہ کو مشتبہ کردیا، جس کا مطلب یہ ہوا کہ: ''یہ لوگ قتل کا یقین کس طرح کر سکتے ہیں، جب کہ انھوں نے ہی دوسرے لوگوں کو مبتلائے شبہ کیا'' اس تقدیر پر ''وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ'' میں ''علیہم'' کے بجائے ''لھم'' لانے کا نکتہ بھی ملحوظ ہے، نیز اس تقدیر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ''لام'' ہی اس مقام کے زیادہ مناسب ولائق ہے۔ پھر ان کا یہ قول: ان الاختلاف فی الایمان به لا فی القتل'' کہ اختلاف حضرت عیسیٰ پر ایمان لانے کے بارے میں ہے، نہ کہ قتل عیسیٰ کی بابت، اس قول کی بنیاد اس پر ہے کہ انھوں نے قتل عیسیٰ کی بابت اختلاف نہیں کیا، بلکہ محل اختلاف ایمان بہ عیسیٰ ہے، جب کہ شک، نفیٔ علم اور اتباع ظن کا تعلق حضرت عیسیٰ پر ایمان لانے سے ہے، یعنی یہ لوگ حضرت عیسیٰ کے بارے میں مبتلائے شک ہیں، ان کو کوئی صحیح علم نہیں ہے۔

بعض کج فہموں نے یہ عبارت نقل کر کے کچھ اس طرح ظاہر کیا کہ گویا یہ خود انہی کی تحقیق ہے۔ چنانچہ لوگوں نے مخالفت کی، یہاں تک کہ اس نقل کے پانے میں کامیاب ہوگئے، یہ انتہائی نادانی کی بات ہے، کیوں کہ یہ قول تو تفاسیر متداولہ میں بھی موجود ہے پھر یہ کون سے فخر اور کامیابی کی بات ہوئی۔ نیز علماء



کرام کا اس بد بخت قادیانی کے ساتھ اختلاف اس وجہ سے ہے ہی نہیں، دوسری بات یہ ہے کہ ناقل کج فہم؛ رفع سے متعلق ان کے بقیہ کلام کو سمجھ ہی نہ سکا، کیوں کہ یہ مد مقابل کے ساتھ اس حد تک اترنا ہے کہ: "بلْ رَّفَعَهُ اللهُ اِلَيه" کو

"وَ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا" (مریم: ۵۷)

"اور اٹھالیا ہم نے اس کو ایک اونچے مکان پر"۔

یا

"اِنِّی ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّی" (صٰفٰت: ۹۹)

"اور ابراہیم (علیہ السلام) جب ان لوگوں کے ایمان سے مایوس ہو گئے تو کہنے لگے کہ): میں تو" تم سے ہجرت کر کے اپنے رب کی (راہ میں کسی) طرف چلا جاتا ہوں"

جیسے معنی پر محمول کر کے بھی حریف مقابل کوئی اعتراض نہ کر سکے، اسی طرح آیت مذکورہ کو، شب معراج میں انبیاء کرام کی موجودگی اور وہاں بیان ملاقات کے ضمن میں جن انبیاء کرام کے نام مذکور ہیں، کے معنی پر محمول کرتے ہوئے بھی کوئی اعتراض نہ کر سکے، پس انھوں نے اسی مقدار پر اکتفا کیا، اس لیے کہ جس طرح دنیا میں خضر کے لیے بقا ہے، اسی طرح آسمان میں بھی بقا ہے۔

شیخ اکبر ابن عربی اور عقیدۂ حیات عیسیٰ

"کبریت احمر" کے تہترویں باب میں ہے کہ ابن سید الناس نے اپنی سیرت میں حضرت سلمان فارسی کے اسلام لانے کے واقعہ کے تحت جو کچھ لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اس بات کے قائل تھے کہ حضرت عیسی، قیامت سے پہلے، رفع کے بعد، زمین پر اتریں گے، چناں چہ لکھتے ہیں" کہ جب رفع کے بعد ایک مرتبہ اترنا ممکن ہے، تو کئی بار اترنے میں کیا استعجاب ہے"؟ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ نظروں سے چھپا رکھا ہو، پس جسم کو آسمان پر اٹھالینا، ایک دوسری چیز ہے اور بغیر اٹھائے زندگی کو لمبی کر دینا ایک دوسری چیز۔ الحاصل انھوں نے موت عیسی کی بابت ایک حرف بھی نہیں کہا اور نہ ہی اس بابت کچھ کہا کہ رفع موت سے پہلے ہے [جیسا کہ جبائی کے کلام میں ہے] یا موت کے بعد۔ علاوہ ازیں موصوف نے رفع بغیر جسم کی بہت سی مثالیں بھی ذکر کیں اور رفع مع الجسم کے امکان کی بھی تصریح کی اور حریف مقابل کو مجبور کیا کہ وہ مسمی رفع پر اجمالاً ایمان

لائے، اگر اس کو مسمی رفع کے علاوہ اور کچھ سمجھ میں نہ آتا ہو، لیکن موت عیسی کی بابت انھوں نے کچھ بھی نہیں کہا۔

رہی وہ بات جو موصوف نے اسراء کی بابت ذکر کی ہے کہ شب معراج حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا جو کچھ دیکھا اور اللہ رب العزت نے اس کی تصدیق بھی کی، تو اب اس کے بعد رفع جسمانی میں کوئی اعزاز نہیں، اور اسرائے روحانی میں کوئی عیب نہیں۔ اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ اعزاز کا انحصار اسرائے جسمانی پر نہیں ہے، کیوں کہ اگر بالفرض اللہ تعالی اسراء ہی مقدر نہ کرتا، نہ جسمانی نہ روحانی، تب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ومنزلت میں کوئی کمی نہ ہوتی، اس لیے کہ معراج، خواہ کسی بھی طرح ہو، ایک زائد فضیلت ہے، لہٰذا اگر حریف کو معراج پر اجمالا ایمان لانے کے لیے کہا جائے اور جن باتوں ونکتوں کو وہ نہ سمجھ پا رہا ہو، اس کے سمجھنے کا اسے مکلف نہ بنایا جائے اور وہ مسمی اسراء پر اجمالا ایمان لے بھی آئے اور کیفیت میں نہ الجھے، تو اس کے ذمہ اس سے زائد کچھ بھی واجب نہ ہوگا۔ جیسا کہ ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں لکھا ہے کہ: ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر معراج میں جسم دنیوی ومثالی کے بیچ بیچ تھے''۔ یہ ایک ایسی بات ہے، جس کا مفہوم تو سمجھ میں آتا ہے، مگر حقیقت صرف وہی سمجھ سکتا ہے، جسے معراج ہوئی ہے۔ اسی طرح حضرت عیسی کے رفع کی کیفیت ایک ایسی مشکل چیز ہے، جس کی حقیقت صرف اللہ تعالی ہی جانتا ہے اور وہ شخص جانتا ہے، جسے رفع ہو [کما فی الیواقیت] اس رفع پر کیفیت سمجھے بغیر ایمان لانا کافی ہوگا۔ یہ تفصیل درحقیقت موصوف کی جانب سے تنزل سے کام لینا ہے، ورنہ حق یہ ہے کہ حضرت عیسی کا رفع اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسراء جسم خاکی ہی کے ساتھ ہوا۔ یہ بات نہیں ہے کہ موصوف کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسی وفات پا گئے ہیں، بلکہ انھوں نے تو رفع روح کی تعبیر بھی اختیار نہیں کی، صرف رفع پر اکتفا کیا، وہ جس طرح بھی ہو (جسم کے ساتھ، یا فقط روح کے ساتھ) ہاں بیان اسراء کے موقعہ پر قول غیر صحیح کو نقل کرتے ہوئے لفظ ''روح'' ذکر کیا ہے۔ لہٰذا ناقل کو حق عبارت کی رعایت کرنی چاہیے اور جہالت سے گریز کرنا چاہیے۔

الحاصل مسلمانوں میں سے کسی کی جانب موت عیسی کے عقیدے کو منسوب کرنا نقل عبارت میں خیانت اور غباوت کے سوا کچھ نہیں، خصوصا شیخ اکبر کہ جن کی جانب اس عقیدے کو اس نے منسوب کیا ہے، انہوں نے اس طرح کا ایک حرف بھی منہ سے نہیں نکالا، بلکہ ناقل جاہل ہی نے اپنی خواہش وطبیعت کے موافق اس میں تحریف کر ڈالی اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ (یعنی ان کی عبارت کا یہ مفہوم نکالنا کہ وہ موت عیسی کا عقیدہ رکھتے تھے کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟) اس لئے کہ انہوں نے تو مثال میں حضرت ابراہیم کے اس قول: ''اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ'' کو پیش کیا ہے یہ بات حضرت ابراہیم نے ابتدائے عمر ہی میں، ہجرت کے وقت کہی تھی اس کا موت سے

بالکل کوئی تعلق نہیں ہے۔ نیز کلمہ ''اِلی'' پر بھی انکی نظر ہے، کہ کہیں اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ حضرت عیسیٰ کو یہاں تک اٹھایا گیا کہ آپ کا جسم اطہر ذات باری جل جلالہ سے جاملا، چناں چہ موصوف نے اس وہم کو دور کیا اور ''بَلْ رَّفَعَهُ اللهُ اِلَيْهِ'' کو حضرت ابراہیم کے مذکورہ قول: ''اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلیٰ رَبِّی'' کے مشابہ قرار دیا، تا کہ رفع کو اس مقدار تک نہ لے جایا جائے کہ اس کا منتہی ذات باری ہو، نہ کہ آسمان، مگر یہ کہ رفع سے رفع معنوی مراد ہو۔

پس موصوف کا مقصد اسی قسم کی باتوں کو بیان کرنا تھا، نہ کہ اس کے علاوہ کچھ اور، نیز اپنی ان باتوں سے وہ مدِ مقابل کو اس بات پر مجبور کرنا چاہتے ہیں کہ وہ رفع عیسیٰ کی بابت اس طرح ایمان لائے کہ اسے ''رفع اِلی اللّٰہ'' کہا جاسکے بس، اسے کیفیت کی معرفت کا مکلف نہیں کرتے۔

میری ذکر کردہ باتیں ہر وہ شخص سمجھ سکتا ہے، جسے مصنفین کی عبارتوں اور قیود وشرائط کی فہم کا سلیقہ ہو، نیز عبارتوں میں ان کے تصرفات اور طرز ادا سے باخبر ہو اور اس نکتے پر بھی مطلع ہو کہ مصنف نے یہ تعبیر کیوں اختیار کی؟ فلاں لفظ کیوں ذکر کیا؟ اور فلاں لفظ کو نظر انداز کیوں کیا؟ مصنف کا مطمح نظر کیا ہے؟ نیز الفاظ واغراض میں کیا فرق ہے؟ اس بات کو سمجھنا اہل علم کی شان ہے۔ ان قادیانیوں کی رسائی ان علوم تک کیسے ہوسکتی ہے، جب کہ ان میں اکثر احمق ہیں؛ لہٰذا اگر رفع سے مراد رفع آسمانی ہے، تو وہ جسمانی ہی ہے، جس میں آپ بہ نفس نفیس اللہ تعالیٰ کی طرف اٹھا لیے گئے، ''اللہ کی طرف'' سے مراد طرف معنوی ہے، جب کہ بقیہ مفسرین نے یہاں ''بَلْ رَّفَعَهُ اللهُ اِلَيْهِ'' میں لفظ ''سماء'' مضاف مقدر مانا ہے، یعنی ''الی سمائه'' جیسا کہ ''البحر المحیط'' وغیرہ میں ہے۔ لہٰذا یہ بھی صاحب عبارت پر ایک اعتراض ہوا کہ انھوں نے دوسرے مفسرین کی طرح مضاف مقدر نہیں مانا، فقط اس حقیقت پر اکتفا کیا، جس کو ''رفع اِلی اللّٰہ فی السماء'' کہا جائے اور اعتقاد عدم موتِ عیسیٰ کے باوجود مزید کوئی توضیح وتشریح نہیں کی، اس بات کو خوب اچھی طرح سمجھ لو اور جان لو۔ نیز انبیاء کرام علیہم السلام کی موجودگی کے سلسلے میں، مصنف ''رفع بالروح'' کا لفظ نہیں لائے، بلکہ صرف رفع بالجسم کی نفی کی، پھر یہاں بیان کیفیت سے قطع نظر کرتے ہوئے مطلق رفع کو ذکر کیا اور مطلق رفع ہی پر ایمان لانے کا مکلف کیا، کیفیت کی معرفت کو ذات علیم وخبیر کے سپرد کیا۔

وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰهِ اِن اللهَ بصیرٌ بالعباد

واضح رہے کہ یہ جو کچھ میں نے بیان کیا، مذکورہ عبارت کی اپنی طرف سے ایک تشریح ہے، ورنہ آیت کی مراد تو بیان ہو چکی اور مزید کچھ بحثیں ابھی آگے آئیں گی، پس اگر کوئی رفع جسمانی وغیرہ کو محال تصور کرتا ہے، تو اس کے لیے اللہ رب العزت کا یہ ارشاد کافی ہے:

اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ج اَلْقٰهَا اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ج وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ" (نساء: ۱۷۱)

"مسیح عیسیٰ بن مریم تو اور کچھ نہیں، البتہ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ایک کلمہ ہیں، جس کو اللہ تعالیٰ نے مریم تک پہنچایا تھا اور اللہ کی طرف سے ایک جان (دار چیز) ہیں (باقی نہ وہ ابن اللہ ہیں، نہ تین میں ایک ہیں) سو (جب یہ سب باتیں غلط ہیں تو سب سے توبہ کرو اور) اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر (ان کی تعلیم کے مطابق) ایمان لاؤ (اور وہ موقوف ہے توحید پر، پس توحید کا عقیدہ رکھو) اور یوں مت کہو کہ: (خدا) تین ہیں"۔

حضرت عیسیٰ کی بابت یہود و نصاریٰ کی افراط و تفریط اور اسلام کی راہ اعتدال

مذکورہ بالا ارشاد باری کے مطابق حضرت عیسیٰ کی ذات کو رُوح سمجھو اور اگر آپ اہل وجدان و باطن میں سے ہیں تو "تفسیر روح المعانی، باب الاشارہ" کی یہ عبارت ملاحظہ کریں کہ: "اللہ رب العزت نے اپنے ارشاد:

"یٰاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ" (نساء: ۱۷۱.)

"اے اہل کتاب! تم اپنے دین میں حد سے مت نکلو"۔

کے ذریعہ دونوں کو غلو فی الدین سے منع فرمایا— جیسا کہ ہمارے بہت سے اکابر کی یہی رائے ہے— (کہ اہل کتاب سے خطاب یہود و نصاریٰ دونوں کو ہے نہ کہ فقط نصاریٰ کو) اس لیے کہ دونوں فریق غلو میں مبتلا تھے: چنانچہ یہود ظاہری امور کی گہرائیوں میں گھس گئے تھے اور امور باطنیہ کی نفی کر دی تھی، اسی وجہ سے انھوں نے حضرت عیسیٰ کو درجۂ نبوت اور تخلق باخلاق اللہ سے گرا دیا؛ جب کہ نصاریٰ باطنی امور کی گہرائیوں میں الجھ گئے اور امور ظاہریہ کی نفی کر بیٹھے، جس کے نتیجے میں انھوں نے حضرت عیسیٰ کو درجۂ الوہیت تک پہنچا دیا، چناں چہ آگے ارشاد ہوا:

"وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ" (نساء: ۱۷۱)

"اور خدا کی شان میں غلط بات مت کہو"۔

یعنی ظاہری اور باطنی نیز جمع و تفصیل کے بیچ کی راہ اختیار کرو، جیسا کہ امت محمدیہ کا توحید کی بابت عقیدہ ہے (کیوں کہ حضرت عیسیٰ خدا، خدا کے بیٹے، یا تین خداؤں میں سے ایک؛ نہیں ہیں، نیز بہ قول یہود ولد الزنا، کذاب اور مفتری بھی نہیں، بلکہ):

"اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ" (نساء: ۱۷۱)

"مسیح عیسیٰ بن مریم تو اور کچھ نہیں، البتہ اللہ کے (ایک سچے) رسول ہیں"۔

یعنی اللہ رب العزت کی اتباع و پیروی کی طرف بلانے والے ہیں:

"وَكَلِمَتُهُ اَلْقٰهَا اِلٰى مَرْيَمَ" (نساء: ۱۷۱)

''اور اللہ تعالیٰ کے ایک کلمہ ہیں، جس کو اللہ تعالیٰ نے مریم تک پہنچایا تھا''۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے حقائق میں سے ایک حقیقت ہیں، جو اس کے وجود پر دلالت کرتی ہے۔

"وَرُوْحٌ مِّنْهُ" (نساء: ۱۷۱)

''اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک جان (دار چیز) ہیں''۔

یعنی ایک ایسی قدسی ذات ہے جو سارے نقائص سے پاک ہے (لہٰذا نصاریٰ کا یہ کہنا کہ: خدا، ابن خدا، یا تین خداؤں میں سے ایک ہیں، اسی طرح یہود کا یہ کہنا کہ: ولد الزنا، کذاب ہیں۔ العیاذ باللہ۔ بالکل باطل اور من گھڑت بات ہے)

''رُوح اللہ'' کی وجہ تسمیہ بہ زبان شیخ اکبر

شیخ اکبر قدس سرہ فرماتے ہیں کہ: ''حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس وصف کے ساتھ خاص ہونے کی وجہ یہ ہے کہ صورت جبرئیلیہ میں آپ علیہ السلام کی روح پھونکنے والا خود اللہ تعالیٰ ہی تھا، نہ کہ کوئی اور، پس اس اعتبار سے آپ ایک ایسی روح کامل ہوئے، جو اس اسم ذات باری کا مظہر ہے، جس کا صدور اسم ذاتی سے ہے، دوسروں کی طرح اسمائے فرعیہ آپ کا مصدر اور سرچشمہ نہ تھا، نیز آپ اور ذات باری کے درمیان واسطے بھی نہ تھے، جس طرح کہ آپکے علاوہ دیگر انبیاء کرام کی ارواح کے درمیان تھے، کیوں کہ دیگر انبیائے کرام کی روحیں بھی اگر چہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے صادر ہوئی تھیں، لیکن ان کی روحوں اور ذات باری کے درمیان بہت سی تجلیات کے واسطے تھے۔ حضرت عیسیٰ کا نام ''روح اللہ'' اسی لیے ہوا کہ وہ وحدیت کے اس باطن سے وجود پذیر ہوئے، جو ذات الٰہی کو جامع ہے، اسی بنا پر حضرت عیسیٰ سے ایسے افعال صادر ہوئے جو ذات باری کے ساتھ مخصوص ہیں، مثلاً: مردوں کو زندہ کرنا، پرندوں کو پیدا کرنا، انسانی صورتوں میں قبروں سے مردوں کو زندہ کر کے جنس عالی میں آپ کا اثر انداز ہونا، اسی طرح مٹی سے چمگادڑ بنا کر کے جنس ادنی میں اثر انداز ہونا وغیر ذلک۔ پھر یہ کہ آپ علیہ السلام کی دعوت، باطن اور عالم قدسی کی طرف تھی، کیوں کہ کلمہ اسم باری کے باطن سے ہے اور اس کی مخفی ہُوِیَّت ہے، اسی لیے اللہ رب العزت نے آپ کے جسم کو فطری گندگیوں سے پاک رکھا؛ کیوں کہ آپ مثالی اور روحانی بدن میں ایک روح مجسم ہیں... الخ [''الجواہر والدرر للشعرانی'']

نیز اسی ''الجواہر والدرر'' میں یہ بھی ہے کہ: احیاء (زندہ کرنا) اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا اور پھونک مارنا حضرت عیسیٰ کی طرف سے، جیسا کہ (حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے وقت) پھونک مارنا حضرت جبرئیل کی جانب سے تھا اور کلمہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے'' (انتہی) واللہ اعلم۔

''اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ'' کی غلط تاویل

حکیم محمد حسن امروہی اور سرسید احمد خاں کی پیروی کرتے ہوئے اس ملحدِ قادیان نے جو یہ کہا ہے کہ:

''آیت کریمہ: وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۚ'' کا مطلب یہ ہے کہ: حضرت عیسیٰ کو سولی دی گئی اور آپ بے جان مردہ جیسے ہو گئے، لیکن اس وقت آپ کی موت واقع نہیں ہوئی۔ بالکل غلط، نص قرآنی کے خلاف اور نظم قرآنی کے خلاف ہے، نیز اس بات کو تسلیم کر لینا نصف نصرانیت قبول کر لینا ہے۔ ایسے لوگوں کو اللہ رب العزت کا یہ فرمان مدنظر رکھنا چاہیے:

فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ'' (کہف: ۲۹)

''جس کا جی چاہے ایمان لاوے اور جس کا جی چاہے کافر ہے''۔

ارشاد باری: ''وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا'' کا مطلب یہ ہے کہ ان کو اس بابت کوئی صحیح علم نہیں ہے، بلکہ صحیح علم اللہ تعالیٰ کو ہے، جو یہ ہے ''وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ، بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ'' نیز یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ آیت کریمہ: ''وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ'' اس بات پر دال ہے کہ باعث لعنت ان کا یہ قول ہے کہ (ہم نے عیسیٰ بن مریم کو قتل کیا) نہ کہ حضرت عیسیٰ کو تکلیف وایذا دینا، کیوں کہ تکلیف وایذاء تو وہ پہنچا ہی نہیں سکے اور یہ بات بھی معلوم ہو چکی ہے کہ ان کا اصل مقصد آپ علیہ السلام کو نعوذ باللہ قتل کرنا تھا، نہ کہ محض سولی پر چڑھانا، اسی وجہ سے نفی قتل کو مکرر ذکر کیا (چناں چہ فرمایا: ''وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ'' اور ''وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا'')۔ سولی کا تذکرہ تو محض اس لیے آ گیا کہ وہیں اسی وقت مشتبہ شخص کے ساتھ ایک اور شخص کو بھی اس کے کسی جرم کی وجہ سے سولی دی گئی تھی۔ یا ایک قول کے مطابق مشابہ شخص کو سولی دی ہی نہیں گئی بلکہ فقط اسی مجرم کو دی گئی۔ پس جب سولی ایسے مجرم کو دی گئی (جو اپنے جرم کی وجہ سے) مستحق لعنت تھا، تو اب لازم اور نتیجہ میں بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہی، بلکہ سیدھا جواب ہوگا کہ حضرت عیسیٰ کو سولی نہیں دی گئی۔ کیوں کہ لازم اور نتیجہ میں بحث کرنے سے یہ وہم پیدا ہوتا کہ ان کے اس قول باطل کو تسلیم کر لیا گیا کہ سولی علی الاطلاق موجب لعنت ہے اور کلام کی بنیاد ان کے فاسد دعوے پر ہے، جب کہ ان کا دعوی انتہائی قبیح ہے، جیسا کہ آپ

دیکھ رہے ہیں، خلاصہ یہ کہ جب قتل اور سولی ایک دوسرے شخص پر واقع ہوئی، نہ کہ حضرت عیسیٰ پر، تو نفی وقوع فعل میں بحث سرے سے ہوگی ہی نہیں، بلکہ مفعول بہ (یعنی کس پر واقع ہوئی) میں ہوگی۔

حرف ''بل'' ایک نحوی نکتہ

ایک بات یہ بھی یاد رہے کہ حرف ''بل'' معنی استدراک سے خالی نہیں ہوتا، چناں چہ صبان کہتے ہیں [نیز شرح قاموس میں مبرد وغیرہ سے بھی منقول ہے]: کہ ''بل'' کے اندر معنی استدراک کے ہونے کو ''مغنی'' میں ان باتوں میں شمار کیا گیا ہے، جو نحویوں کے یہاں مشہور ہیں؛ حالانکہ صحیح اس کے خلاف ہے، نحوی کہتے ہیں کہ ''بل'' حرف ''اضراب'' ہے، میں کہتا ہوں کہ: حرف استدراک و اضراب دونوں ہے، کیوں کہ ''بل'' نفی و نہی کے بعد ''لکن'' کے درجے میں ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اسی وقت ہوگا، جب کہ کوئی جملہ اس سے متصل ہو، ''مغنی'' کی عبارت اس کو بھی شامل ہے، جیسا کہ ابن قیمؒ نے ''بدائع الفوائد'' میں ذکر کیا ہے کہ رف ''ام'' اتصال کے معنی سے خالی نہیں ہوتا ہے، اگر چہ اس سے متصل کوئی جملہ ہو۔ نیز نحویوں نے جملہ میں فقط ''اضراب'' ذکر کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جملہ کے مستقل ہونے کی وجہ سے استدراک کچھ اس طرح اس میں مخفی ہو گیا کہ گویا وہ کسی نئی چیز سے الجھ گیا، ورنہ اس کے لیے استدراک لازم ہے۔

''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ''

اس تفصیل کے مطابق ''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ'' منشأ فساد کا بیان اور صحیح واقعہ کی تحقیق ہے اور منشاء فساد رفع جسمانی ہی ہے، نہ کہ موت طبعی، اس لیے کہ اگر یہ مراد ہوتا تو غلطی کا سبب ضرور مذکور ہوتا اور وہ حضرت عیسیٰ کا اس وقت ان کی نظروں سے غائب ہونا ہے، نہ کہ موت اور اگر ''وَمَا صَلَبُوْهُ'' میں صلب لعنت کی نفی مراد ہو تو ''وَمَا قَتَلُوْهُ'' میں یہ احتمال باقی رہے گا کہ آپ ذلت اور لعنت کی موت نہیں مارے گئے، بل کہ رفعت کی موت مارے گئے۔

اگر یہ کہا جائے کہ آیت: ''وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ'' سے مراد یہ ہے کہ: ''نہ تو انھوں نے قتل کیا، اور نہ ہی سولی دی، کہ آپ ملعون ہوتے''، یعنی پہلی بات (قتل و سولی) کی نفی صراحتاً ہو، جو سبب ہو دوسری بات (لعنت) کی نفی کا۔ جیسا کہ علماء نے ''ماتأتینا فتحدثنا''، جیسی مثالوں کے تحت اس نکتے کو بیان کیا ہے (یعنی تو ہمارے پاس نہیں آیا کہ ہم سے گفتگو کرتا۔ اس مثال میں پہلی بات کی صراحتاً نفی سے، بہ طور سبب دوسری بات

کی بھی نفی ہوگئی، کہ جب وہ آیا ہی نہیں، تو گفتگو بھی نہیں ہوئی)۔اس صورت میں تقدیر عبارت یہ ہوگی: ''وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَاصَلَبُوْهُ حتی یکن ملعونا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ '' (کہ نہ تو انھوں نے حضرت عیسی کو قتل کیا اور نہ ہی سولی دی، کہ آپ ملعون ہوں، بل کہ اللہ تعالی نے آپ کو اپنے پاس اٹھالیا) اس کا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں ''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ''، ''وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَاصَلَبُوْهُ'' کے موافق نہ رہے گا، جب کہ سیاق یہی چاہتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ جب لازم کی نفی سے ملزوم کی نفی کی طرف انتقال ہو، کسی بھی قابل لحاظ وجہ سے، تو ضروری ہے کہ دونوں کے درمیان برابری پائی جائے، نہ کہ مذکور اور متروک کے درمیان پیچیدگی پیدا کی جائے؛ لہٰذا اس کو مناسب اعتبار کے ساتھ سمجھنا چاہیے۔اس سلسلے میں یقینی دلیل یہ ہے کہ مختلف آیتوں میں اس قصہ کی صورت ایک ہی ہے، خواہ '' وَقَتْلِهِمُ الاَنْبِیَاءَ بِغَیْرِ حَقٍّ '' ہو، یا ''وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ''۔اللہ تعالیٰ نے ان سے ایک ہی سیاق میں واقعے کو بیان کیا، اس کا بعض بعض سے مربوط ہے اور وہ سیاق صرف اور صرف ان کا دعوائے قتل ہے، جیسا کہ شروع میں صرف قتل کو ذکر کیا۔اب اگر یہاں لزوم معنوی کا اعتبار کیا جائے، تو اللہ تعالی کی جانب سے ان کی اس بات کو تسلیم وتصدیق کرنے کا وہم ہوسکتا ہے، کہ وہ انبیاء کرام جن کو قتل کیا گیا ملعون تھے۔ العیاذ باللہ من ذلک ۔باری تعالیٰ نے آیت بالا میں اپنی جانب سے حضرت عیسی کی بابت ''رسول اللہ'' فرمایا، اس طرح خود ہی مدار معاملہ کی تصریح کردی کہ وہ اللہ کے ایک رسول کو قتل کرنے کے تئیں، ان کی جسارت ہے، نہ کہ کچھ اور۔

اسی طرح جب نظم قرآنی میں صراحتاً لازم کی نفی سے ملزوم کی نفی کی طرف انتقال کیا گیا، تو بہ طور سبب خود بہ خود اس سے لازم منتفی ہوگیا، نہ کہ اس کی نفی کے لیے کوئی عبارت لائی گئی ہے، بلکہ عبارت اس سے ساکت ہے، جب کسی چیز کو اس پر مبنی نہیں کیا گیا، تو نتیجتاً ملزوم کی نفی ہوگئی اور وہی مقصود کلام ہوگیا۔یعنی بات تو سرے سے قتل کی نفی کی تھی، رفع اِلی السماء خود قتل کی جگہ ہوگیا اور قتل سے نجات کا ذریعہ بن گیا۔حاصل کلام یہ کہ لازم کی نفی کو نظر انداز کرکے، پوری توجہ نفی قتل پر مرکوز کردیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جب سرے سے قتل ہوا ہی نہیں، بلکہ اس کی جگہ رفع ہوا، تو پھر یہ لوگ ایسی من گھڑت باتیں کیوں کہتے ہیں؟ گویا انھوں نے کہا: ''کان القتل لکذا'' (کہ قتل عیسی اس لیے ہوا) جواب دیا گیا ''لم یکن القتل نفسه راساً فکیف لکذا؟'' (کہ سرے سے قتل ہی نہیں ہوا، لہٰذا ''اس لیے ہوا'' کی بات ہی پیدا نہیں ہوتی) میں نے جو ''فکیف'' کہا، وہ منوی نہیں بلکہ مطروح ہے، جسے منظر کشی کے لیے ذکر کیا ہے، تقدیر عبارت کے طور پر نہیں، مگر اس جاہل نے یہ سمجھا کہ لازم کی نفی کے مقصد سے، ملزوم کی نفی کی گئی ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس نفی سے تمام لوازم از خود ختم ہوجاتے

ہیں، یعنی عبارت سے مقصود لوازم کی نفی نہیں ہے، بلکہ لوازم کو کوئی حیثیت ہی نہ دی، تمام لوازمات کو لغو قرار دیتے ہوئے ترک کر دیا۔ دونوں کے درمیان فرق کو سمجھو، یہ ایسا ہی ہے، جیسا کہ ہم کہیں۔ ے

اذ صح أن ليس الدعی بمؤمن ۞ فكيف نبياً او مسيحاً مباركاً

''جب یہ بات صحیح ہے کہ مدعی مومن ہی نہیں، تو پھر وہ کیسے کوئی نبی یا مبارک مسیح ہوسکتا ہے''۔

نیز ہم پوچھتے ہیں کہ اس منوی اور اہتمام کی دلیل کیا ہے؟ اور کیا یہ اندھیرے میں اٹکل پچو تیر چلانا نہیں؟ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ یہود اس کے قائل تھے اور آج بھی قائل ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لوگ تو ہزاروں کفریات ولغویات کے قائل ہیں، تو کیا یہ سب قرآن کریم کی تفسیر میں داخل ہو جائیں گی؟ العياذ بالله من الزيغ. پھر اگر بات انہی امور میں منحصر ہو جائے تو چاہیے کہ یہ ان کی اس بات کا رد ہو کہ: ''حضرت عیسیٰ جھوٹے ہیں اور جھوٹا نبی قتل کیا جاتا ہے''۔ جس کے جواب میں اللہ رب العزت نے کہا کہ ''وہ قتل نہیں کیے گئے'' لہٰذا وہ صادق ومصدوق ہیں۔ پس بحث نفس قتل میں ہوئی نہ کہ لازم قتل میں۔ جیسا کہ: ارشاد باری ہے: ''وَقَتْلِهِمُ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ'' اگر لازم قتل سے تعرض کیا جاتا اور سولی کے مطلقاً موجب لعن ہونے کا رد کیا جاتا، تو یہ احتمال باقی رہ جاتا کہ آپ کو سولی دی گئی اور رجم کیا گیا۔ اسی وجہ سے اللہ رب العزت نے لازم سے تعرض نہیں کیا، بلکہ اصل جڑ و بنیاد یعنی قتل ہی کی نفی کر دی۔

علاوہ ازیں کیا اللہ رب العزت نے آپ کو مصلوب مشبہ بالمقتول بنا کر اپنی تدبیر لطیف کی؟ اور کیا یہ اتحاد مصداق کے ساتھ نظریہ کا معمولی اختلاف نہیں؟ اس لیے ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا، بلکہ رفع تو قتل سے بچانے کے لیے ہوا، اس لیے ضروری طور پر یہ ماننا پڑے گا کہ رفع قتل کی جگہ، اس کے بدلے میں واقع ہوا، پس جب رفع قتل کے مقابل ٹھہرا، تو سورہ نساء میں صرف رفع پر اکتفاء کیا گیا اور توفی سے تعرض نہیں کیا گیا، کیوں کہ توفی بہ معنی ''اخذ''، قتل کے مقابل نہیں آتی اور سورہ مائدہ میں فقط ذکر توفی پر اکتفا کیا گیا، کیوں کہ وہ مانع شہادت (گواہی) ہے، جب کہ سورہ آل عمران میں دونوں کو جمع کیا گیا، اس واقعے کی پوری تفصیل بتانے کے لیے جو حضرت عیسیٰ کے ساتھ کیا جاتا۔ نیز ''وما قتلوه يقينا بل أماته الله'' (یقیناً انھوں نے حضرت عیسیٰ کو قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں موت دے دی) نہیں کہا گیا، حالاں کہ اگر مقصود یہ ہوتا تو مناسب تھا کہ عبارت یہی ہوتی۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ مقصود باری ہی نہیں اور اگر سورہ آل عمران میں توفی سے مراد اماتت ہوتی تو مناسب تھا کہ یہاں یہ عبارت ہوتی ''بل توفاه الله'' (بلکہ اللہ نے انہیں یعنی حضرت عیسیٰ کو موت دے دی) اسی طرح ''وماصلبوه يقينا'' بھی نہیں فرمایا، حالاں کہ اگر یہود کے مفروضات کا

رد مقصود ہوتا تو عبارت یہی ہوتی، نہ کہ وہ جو قرآن کریم میں ہے۔

ارشاد باری ''اِلَیْہِ'' سے مراد ایسی جگہ ہے، جہاں مجازاً بھی اللہ تعالی کے علاوہ کسی کو کوئی اختیار نہیں اور آرزوئیں جس کے احصاء سے قاصر ہیں: ؎

صفقت بین جناحیھا قبول ❁ واذ ماسطعت آیاتہ

''جب اللہ کی آیتیں چمکتی ہیں، تو اس کے دونوں کناروں میں قبولیت کی ہوا چلنے لگتی ہے''۔

الحاصل رفع سے مراد جسمانی رفع ہے، جس کا مقصد یہودیوں کو قتل سے عاجز کرنا تھا، نہ کہ رفع بہ معنی موت ہے، جو فقط قتل کا بدل ہو۔ نیز حضرت عیسیٰ جو کہ بنی اسرائیل کی طرف مبعوث تھے اور انکی تعلیم و تبلیغ پر مامور، اگر سولی کے بعد ان سے غائب ہو جائیں، تو پھر کار نبوت کیا انجام دیں گے۔ علاوہ ازیں توفی اگر بہ معنی ''اماتۃ'' ہو اور رفع بہ معنی ''موت، کے ذریعے چھپا دینا'' تو اس میں خدا کی طرف سے کیا خاص مکر و تدبیر ہوئی، یہ تو ہر زندہ انسان کے لیے عام ہے اور اگر رفع بہ معنی رفع درجات ہو، تو سورہ نساء کی عبارت کے اعتبار سے، آپ کا زمین پر زندہ رہنا ممکن ہوگا اور ارشاد باری: ''وَمَا قَتَلُوْہُ یَقِیْناً بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ'' آپ کی موت کو مستلزم نہ ہوگا۔ نیز مکر و تدبیر والی بھی کوئی بات نہ ہوگی۔ اور نہ ہی قتل سے نجات کی جب کہ سیاق یہی ہے۔ رہی آیت ال عمران تو ظاہر ہے اس میں مستقبل کے چند وعدے ہیں اور سورہ مائدہ کی آیت کا تعلق واضح طور پر قیامت سے ہے۔

جب قرآن کریم نے حضرت عیسیٰ کی نبوت و رسالت کا اعلان کر دیا اور اس بات کا بھی اعلان کر دیا کہ آپ صاحب عزم ہیں، دنیا و آخرت میں وجیہ و باوقار ہیں، مقرب و صالح ہیں، من جانب اللہ کلمہ اور روح ہیں وغیرذلک تو پھر اب کیا ضرورت ہے کہ یہود کے قتل لعنت کے دعوے کا رد کیا جائے؟ جب آپ علیہ السلام کی بابت قرآن پاک کا مذکورہ عقیدہ مشہور ہے، تو اس کے بعد ان کے باطل دعووں کو رد کرنے کی کیا ضرورت؟ اگر مقصود یہ ہے کہ اس کی صراحت کر دی جائے اور یہودیوں کا مقابلہ کیا جائے، تو بہ صراحت نفی قتل سے اس چیز کی جانب عدول کیوں کیا گیا، جو اس مفہوم کا فائدہ بہ تکلف ہی دیتی ہے، جسے قبول نہیں کیا جا سکتا، جیسے یہ کوئی چیستاں ہو۔ پھر حضرت عیسیٰ کے قتل کی نفی کی بابت لفظ رفع کو کیوں خاص کیا گیا اور اسے نفی قتل کے ساتھ کیوں جمع کیا گیا۔ جب کہ دیگر انبیاء کرام جو در حقیقت شہید کر دیے گئے، وہ اس کے زیادہ مستحق تھے، کیوں کہ وہاں غلط خیال کچھ زیادہ ہی تھا۔

علاوہ ازیں سورہ نساء کی آیت، آل عمران کی آیت پر متفرع ہے، آل عمران کی آیت کا مقصد یہود کا رد نہیں ہے، بلکہ وہ تو حضرت عیسیٰ کے ساتھ اللہ تعالی کا وعدہ ہے، جو فقط آپ علیہ السلام ہی کو معلوم تھا، یہود

نے اسے سنا تک بھی نہیں، نیز رفع درجات کا ذکر نہیں کیا، کیوں کہ وہ تو قبل از وعدہ ہی، معلوم بھی تھا اور حاصل بھی، کیوں کہ: یہ رفع مطلق نہیں، بلکہ مقید بالموت ہے، جو ہر مقرب بندے کو حاصل ہے۔ الغرض جب حضرت عیسیٰ پر یہ آیات تلاوت کی گئیں، تو وہ مخفی وعدے تھے، یہودیوں کو ان کا علم نہیں تھا، پھر جب ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ رسالت میں یہ قصۂ قرآن کریم میں بیان کیا گیا، تو اس میں بیان حکایت کی رعایت نہیں کی گئی، بلکہ اس میں سب سے پہلے وعدے اور وقوع کی حالت کی رعایت کی گئی۔

خاتمۂ بحث

قتل اور سولی ہماری شریعت میں بھی بعض حالات میں اہانت اور سبب لعنت ہے جیسے اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے والے کا قتل اور سولی دیا جانا، جب کہ بعض صورتوں میں قابلِ عزت وشرافت اور سبب رحمت ہے جیسے اللہ رب العزت کے راستے میں قتل ہونا، چنانچہ ایسے لوگوں کی بابت ارشاد باری ہے:

"بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ" (آل عمران: ۱۶۹)

"بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس"۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ قتل وسولی کا باعث ذلت ہونا فقط یہودیوں ہی کے عقیدے کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ قتل وسولی کا خیر وشر کی قسموں میں منقسم ہونا تمام قوموں کے یہاں مشہور ہے؛ اس لیے بہ طور خاص دعوائے یہود کو رد کرنے کی ضرورت نہ رہی، بلکہ قرآن کا مقصد یہ بتانا ہے کہ حضرت عیسیٰ کے ان کے درمیان سے گم ہوجانے کی وجہ قتل یا سولی نہیں ہے "بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ" (بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے پاس اٹھالیا) چوں کہ ان لوگوں کو واقعہ کی صحیح تحقیق نہ ہوسکی، اس لیے وہ آپ علیہ السلام کے غائب ہونے کی وجہ قتل ہی کو سمجھتے رہے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے دوبارہ بہ طور خاص قتل کی نفی کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: "وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ" یعنی حضرت عیسیٰ کے غائب ہونے کی وجہ قتل نہیں ہے، اس لیے کہ یہود آپ کو قتل ہی نہیں کرسکے؛ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے پاس اٹھالیا۔ چوں کہ غائب ہونے میں ان کے گمان کے مطابق اصالتاً قتل ہی کو دخل تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے نفی قتل کو بہ تاکید دوبارہ ذکر فرمایا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قتل ہی رفع کا مقابل ہے، نہ کہ سولی، خصوصاً جب کہ قتل کے بعد سولی دینے کا اعتقاد ہو۔ پس نص قرآنی نے اس بدبخت قادیانی کے دعوے اور اس پر کی گئی تعمیر منہدم کردی، چوں کہ ان لوگوں کو قتل اور سولی دونوں میں شبہ ہوا تھا، اس لیے پہلے دونوں کو جمع کرکے ایک ساتھ نفی کی گئی، چناں چہ فرمایا گیا:

"وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَاصَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ" (نساء :۱۵۷)

''انہوں نے (یعنی یہود نے) نہ ان کو (یعنی عیسی علیہ السلام کو) قتل کیا اور نہ ان کو سولی پر چڑھایا، لیکن ان کو (یعنی یہود کو) اشتباہ ہو گیا''۔

نیز پہلے اصل واقعہ کو بھی بیان نہیں کیا گیا، بلکہ بعد میں بیان کیا گیا اور قاعدہ ہے کہ جب مضمون میں اولاً غلطی کی وجہ کا بیان ہو، پھر تحقیق کا بیان؛ تو اس میں واقعہ کی تحقیق کے بیان کو مکرر لایا جاتا ہے۔

الحاصل ان کے درمیان سے حضرت عیسی کے غائب ہونے کی وجہ رفع ہے، نہ کہ قتل اور یہ رفع آپ کو قتل کرنے کی کوشش کے وقت ہوا، چناں چہ جب انہوں نے قتل کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا اور قتل کرنے کے لیے ڈھونڈنے لگے، اسی دوران اللہ تعالیٰ نے آپ کو اٹھالیا، ارشاد باری: ''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ '' میں فعل ماضی، جو کہ حدوث پر دلالت کرتا ہے وہ اس بات پر دلیل ہے ایسا نہیں کہ اس واقعے (ارادۂ قتل، تلاش وجستجو، نیز سولی وغیرہ دینے) کے بعد حضرت عیسی تقریباً ستاسی سال دنیا میں زندہ رہے پھر موت کے وقت اللہ تعالیٰ نے اٹھالیا (جیسا کہ بد بخت قادیانی کا دعویٰ ہے) رفع کے معنی موت کے نہیں ہیں، کیوں کہ اس آیت کے بعد متصلاً آپ علیہ السلام کی بابت ارشاد باری ہے: ''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۝ (النساء ۱۵۹) (جس میں لفظ ''موت'' بہ صراحت مذکور ہے) علاوہ ازیں اگر رفع سے موت مراد ہو اور توفی سے بھی موت تو ''اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ'' میں تکرار لغو ہوگا (اور ظاہر ہے کہ کلام باری لغو نہیں ہوسکتا) اسی طرح یہاں نہ تو فقط رفع روح مراد لیا جاسکتا ہے اور نہ رَفعِ درجات، شاید اسی لیے لفظ قتل کو دوبارہ تنہا لایا گیا، تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ مراد یہ ہے کہ سولی اس لیے نہیں ہوئی تاکہ یہودیوں کے گمان کے مطابق آپ ملعون نہ ٹھہریں اور اس کی جگہ آپ کے درجات مزید بلند کر دیئے گئے لہذا فقط قتل کو مکرر لایا گیا؛ جس میں یہ گمان جگہ نہیں پاتا۔

پھر یہ کہ رحمت اور لعنت دونوں باہم مقابل الفاظ ہیں جیسا کہ قتل اور رفع دونوں باہم مقابل ہیں؛ لہٰذا دو ایسی چیزوں کے درمیان تقابل کرنا، جو اصل میں مقابل نہیں ہیں، مراد کو بدلنا، اس میں تحریف کرنا اور مقصود کو چھوڑ کر غیر مقصود کو ذکر کرنا ہے۔ نیز عبارات قرآنی میں تقدیری عبارت محذوف ماننا: جب کہ بلا محذوف مانے تفسیر صحیح ہو، تحریف لفظی کے مرادف ہوگا، علاوہ ازیں رفع رتبی تو دائمی ہے، نہ کہ صرف ارادۂ قتل کے وقت۔ پس معلوم ہوا کہ جب قتل و سولی کا ذکر ہوا، تو وہ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے ہوا کہ حقیقتاً یہ دونوں واقعے نہیں ہوئے، بلکہ ان پر معاملہ مشتبہ کر دیا گیا۔ نیز اس بات کا بیان ہے کہ قتل و سولی دونوں واقع ہوئے، یا دونوں واقع نہیں ہوئے، تاکہ واقعہ کی وضاحت ہو جائے نہ کہ یہود بے بہبود کے اس گمان کی تردید

مقصود ہے کہ: مصلوب ملعون ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ جب دوبارہ قتل کی نفی کی، تو اصل واقعہ یعنی رفع کی صراحت کردی، جس سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ بحث قتل، سولی اوران کے وجود خارجی کی بابت ہے اوراس بات میں ہے کہ یہ دونوں حقیقتاً واقع نہیں ہوئے، بلکہ ان لوگوں کوشبہ میں ڈال دیا گیا: ''وَلٰکِنْ شُبِّهَ لَهُم''، نہ کہ لازم صلب بہ زعم یہود موت لعنت میں۔ العیاذ باللہ العظیم۔

''وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزاً حَكِيْماً''

آخر میں ارشاد باری ہے ''وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزاً حَكِيْماً''، جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ رب العزت پر کوئی بھی کام مشکل نہیں، خواہ بنی اسرائیل کو، حضرت عیسیٰ تک پہنچنے سے روکنا ہو، حضرت عیسی کو مع جسم آسمان پر اٹھانا ہو، یا ان کے مکروفریب کو انہی کے منہ پر مارنا اوران کو لعنت کے پنجرے میں چھوڑنا ہو، نیز اللہ رب العزت ذوالجلال کا کوئی بھی قول اور فعل حکمت سے خالی نہیں، بلکہ حکمت نام ہی اللہ رب العزت کی کاری گری کا ہے۔

سبحانہ و تعالیٰ شأنہ، وعز برھانہ، و جل سلطانہ۔

تذکیر

مبحث سے متعلق مزید کچھ باتیں

''وَمَاقَتَلُوْهُ... الآیہ'' سے امت کیا سمجھتی ہے؟

اس بحث میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اصل فیصلہ جمہور مسلمانوں پر چھوڑ دیا جائے اوران کے سامنے بلاکسی کمی وزیادتی کے ایک ایک آیت کا ترجمہ کردیا جائے، پھر دیکھا جائے کہ کیا وہ اپنے ذوق وفطرت کے لحاظ سے اس مفہوم کے علاوہ اور کچھ سمجھتے ہیں، جونسلاً بعد نسل امت مسلمہ میں منقول ہوتا چلا آیا ہے، اور جو عقیدۂ اسلام ہے؟ کہ اللہ تعالیٰ کا مقصد اس آیت سے یہ بتلانا ہے کہ یہود حضرت عیسیٰ کو قتل کرنے اور سولی دینے میں کامیاب نہ ہوسکے، بلکہ اس مقام پر ان سے غلطی ہوئی، اس غلطی کا منشا خواہ کچھ بھی ہو، نیز قتل کے حوالے سے اختلاف کرنے والوں کو حقیقت حال کا کچھ علم نہیں تھا صحیح بات یہ ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ کو قتل نہیں کیا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بات یہی ہے کہ یہود آپ کو قتل نہیں کرسکے تو پھر حضرت عیسیٰ کہاں چلے گئے؟ اس کے جواب میں اللہ رب العزت نے فرمایا:

''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ج وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزاً حَكِيْماً''

''بلکہ اس کو اٹھالیا اللہ نے اپنی طرف اور اللہ ہے زبردست حکمت والا۔

پس رفع اسی چیز کا ہوا جو نظروں سے غائب ہوئی اور وہ ہے آپ علیہ السلام کا جسم اطہر (لہٰذا ثابت ہوا کہ آپ کا رفع جسمانی ہے نہ کہ فقط روحانی)

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِیْ مَنْ يَّشَاءُ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝

''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ ... الآیہ کی مراد''

آیت کریمہ:

"وَاِنْ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ"(النساء : ۱۵۰)

"اور جتنے فرقے ہیں اہل کتاب کے سو عیسیٰ پر یقین لاویں گے اس کی موت سے پہلے"۔

میں حضرت عیسیٰ پر ان کی وفات سے پہلے جس ایمان لانے کا ذکر ہے وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانے کا حکم ہے یعنی ان کی ذات پر ایمان لانا (کہ وہ نبی برحق اور من جانب اللہ مبعوث تھے) اور یہ مستلزم ہے ان کی اطاعت وفرمانبرداری کے وجوب کو، نہ کہ وہ ایمان جو خبر کی شکل میں ہو۔ یہاں اس آیت میں حضرت عیسیٰ کے زندہ ہونے پر ایمان لانا، مراد نہیں ہے، کیوں کہ یہاں یہ تقدیر عبارت مناسب نہیں۔ آپ علیہ السلام کی حیات کو "قَبْلَ مَوْتِهٖ" میں بیان کیا گیا ہے نہ کہ "لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ" میں۔

الحاصل اللہ رب العزت نے اپنے قول "قَبْلَ مَوْتِهٖ" میں اس ذات کی موت کا ذکر کیا ہے جس کی ابھی تک وفات نہیں ہوئی ہے، بلکہ اسے اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اٹھالیا ہے اور دشمنوں سے نجات دے دی ہے، ظاہر ہے کہ یہ نجات رفع ہی کے ذریعہ ہوسکتی ہے نہ کہ موت کے ذریعہ، گویا دل اس بات کو جاننے کے لیے بے قرار تھا کہ جب حضرت عیسیٰ کا رفع ہوچکا تو اب رفع کے بعد کیا ہوگا (کیا ہمیشہ ہمیش وہیں رہیں گے؟ یا دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے؟) تو اللہ رب العزت نے اپنے قول: "قَبْلَ مَوْتِهٖ" کے ذریعہ آپ کے دوبارہ نزول اور بعدِ نزول وقوعِ موت کی طرف اشارہ کردیا۔ آپ علیہ السلام کی موت کا ذکر صراحتاً صرف اسی مقام پر ہے، اس کے علاوہ قرآن میں اور کہیں نہیں۔

یہ کہنا کہ: "قَبْلَ مَوْتِهٖ" سے ہر کتابی کا اپنی موت سے پہلے جاں کنی کے وقت حضرت عیسیٰ پر ایمان لانا مراد ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ اس کی دلیل کیا ہے؟ کیا اہل کتاب کی موت کے وقت کی حالت مشاہد ہے؟ (بایں طور کہ جاں کنی کے وقت کتابی کو حضرت عیسیٰ پر ایمان لاتے ہوئے لوگوں نے دیکھا ہو؟) یا اس بابت کوئی حدیث مرفوع ہے؟ کیا غائب کی حالت کے سلسلے میں خبر صادق یا مشاہدہ کے علاوہ کوئی اور چیز مقبول ہے؟۔ صحیح بات یہ ہے کہ جب قائل کو کوئی دلیل نہ ملی تو اسنے اٹکل پچو باتیں بک دیں۔ نیز اس صورت میں کیا "وَاِنْ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ" کہنا مناسب تھا، یا "الا ليؤ من به"؟ اور کیا اس زمانے میں ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا زیادہ اہم ہے، یا تمام انبیاء علیہم السلام پر یا صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر؟ جس نے بھی "قَبْلَ مَوْتِهٖ" میں ضمیر کتابی کی طرف لوٹائی ہے اور جاں کنی کی حالت پر محمول کیا ہے، اس نے جمہور علماء کی مخالفت کی ہے اور شذوذ اختیار کیا ہے، غالباً اس نے یہ مفہوم سورہ انفال کی مندرجہ ذیل آیت:

"وَلَوْ تَرٰیٓ اِذْ یَتَوَفَّی الَّذِیْنَ کَفَرُوا الْمَلٰٓئِکَةُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ج وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ" (انفال: ۵۰)

"اور اگر تو دیکھے جس وقت جان قبض کرتے ہیں کافروں کی فرشتے، مارتے ہیں ان کے منہ پر اور ان کے پیچھے اور کہتے ہیں: چکھو عذاب جلنے کا"۔

سے اخذ کیا ہے، یا سورہ محمد کی اس آیت سے:

"فَکَیْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِکَةُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ" (سورۂ محمد: ۲۷)

"پھر کیسا ہوگا حال جب کہ فرشتے جان نکالیں گے ان کی، مارتے جاتے ہوں ان کے منہ پر اور پیٹھ پر"۔

چوں کہ مفسرین کی رائے یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں مذکور واقعہ (یعنی فرشتوں کا ان کے چہروں پر اور پیٹھوں پر مارنا) ان کی موت کے وقت ہوتا ہے جیسا کہ "درمنثور" وغیرہ میں ہے (اسی سے اس نے یہ مطلب بھی نکال لیا کہ جس وقت ان کی پٹائی ہوتی ہے اس وقت وہ حضرت عیسیٰ پر ایمان لاتے ہیں، اس لیے "موته" کی ضمیر کا مرجع یہی اہل کتاب ہیں، نہ کہ حضرت عیسیٰ۔ لیکن قادیانی کے اس قول کی حقیقت بیان ہو چکی کہ اس کی کوئی بھی صحیح دلیل و نص نہیں ہے، فقط اٹکل پچو کی بات ہے) نیز اگر مقصود یہی ہوتا تو لازمی طور پر "قَبْلَ مَوْتِهٖ" کے بجائے "عند موتهم" فرمایا جاتا۔

اگر یہ توجیہ کی جائے کہ یہ حالتِ غرغرہ اور اس سے پہلے کی حالت کو شامل کرنے کے لیے ہے تو سوال یہ ہے کہ حالتِ غرغرہ سے پہلے اس کا وقوع کہاں ہے؟ نیز اس صورت میں "اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِهٖ" میں صیغۂ استقبال کا مفہوم صادق نہ آئے گا، کیوں کہ اس صورت میں ایمان ہر زمانے کو عام ہو جائے گا۔ صحیح بات یہ ہے کہ اگر کتابوں میں بعض حضرات سے یہ تفسیر منقول نہ ہوتی تو اس کی جانب ذہن بھی نہ جاتا۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ بوقت موت بعض لوگوں سے ایمان سلب بھی ہو جاتا ہے۔ تو پھر ہر شخص کا بہ وقت غرغرہ ایمان لانے کا کلیہ کس طرح صادق آئے گا؟ اور ظاہر ہے کہ اعمال کا دارو مدار خاتمہ پر ہے چناں چہ بعض لوگ (منکر نکیر کے سوال و جواب کے وقت) کہتے ہیں "هاه هاه لا أدري" (ہاہ ہاہ مجھے کچھ خبر نہیں)

نیز اللہ رب العزت نے یہ مقدر کر دیا ہے کہ وہ قرب قیامت میں دونوں شریعتوں [یعنی بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل کی شریعتوں] کو ایک کر دے گا اور دونوں کو ایک ملت قرار دے کر دونوں کے درمیانی فرق کو ختم کر دے گا۔ یہی مفہوم ہے مندرجہ ذیل حدیث کا:

"انا اولی الناس بابن مریم والانبیاء اولاد علاّت (بخاری: ۱/ ۴۸۹)

''میں لوگوں میں عیسیٰ ابن مریم سے زیادہ قریب ہوں اور تمام انبیاء علاتی بھائی ہیں''۔

اور اس حدیث پاک کا:

''**کیف تهلک امة أنافی اولها وعیسی فی آخرها**''

''وہ امت کیسے ہلاک ہوسکتی ہے، جس کے دور اول میں، میں ہوں اور دور آخر میں عیسیٰ''۔

صاحب ''در منثور (۲/۲۴۲)'' نے کعب احبار کے اثر کے ضمن میں اسے ذکر کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے، جب کہ صاحب ''فتح الباری'' نے ''**باب من فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم**'' کے تحت ذکر کیا ہے اور ''حسن'' قرار دیا ہے، نیز ''**مشکوۃ، باب ثواب هذه الامة**'' میں رزین کے حوالے سے بہ سند سلسلۃ الذہب (۱) مذکور ہے اور ''التیسیر'' میں ہے کہ ''نسائی'' وغیرہ نے اسے روایت کیا ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ ارشاد باری ''إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ'' میں جس ایمان کا ذکر ہے، اس میں ''مومن بہ'' (جو کہ حضرت عیسیٰ ہیں) کا مشاہدہ خواہ کسی بھی طریقہ پر ہو، ضروری ہے، جیسا کہ ارشاد باری:

وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ''(ال عمران : ۸۱)

''اور جب لیا اللہ نے عہد نبیوں سے کہ جو کچھ میں نے تم کو دیا کتاب اور علم، پھر آوے تمہارے پاس کوئی رسول کہ سچا بتاوے تمہارے پاس والی کتاب کو، تو اس رسول پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے''۔

اس پر دلالت کر رہا ہے (کہ اس آیت میں ''لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ'' کے ذریعہ انبیاء کرام سے آنے والے رسول پر ایمان لانے کا جو عہد و میثاق ہے، وہ اس کے ظہور اور مشاہدہ سے مقید ہے، پس اسی طرح یہاں ''لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ'' میں بھی یہ شرط ملحوظ رہے گی) نیز اگر ''مومن بہ'' کا مشاہدہ مقصود نہ ہوتا تو ''قَبْلَ مَوْتِهِ'' کی قید نہ لگائی جاتی؛ لہٰذا ہماری طرف سے لفظوں میں نزول مسیح کی قید لگانے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ''قَبْلَ مَوْتِهِ'' کی قید خود کافی ہے۔

نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ عام نہیں ہے، جسے ہم نے اپنی رائے سے خاص کیا ہے، بلکہ متن میں خود یہ قید موجود ہے۔ علاوہ ازیں اس میں زمانہ مستقبل کی قید اور تخصیص بھی ہے۔ حاصل یہ کہ متن میں تین قیدیں ہیں:

۱- مومن بہ کا مشاہدہ۔

۲- قَبْلَ مَوْتِهِ۔

---

(۱) ''جعفر صادق زین العابدین علی بن حسین عن حسین بن علی عن علی بن ابی طالب'' کے طریق کو محدثین ''سلسلۃ الذہب'' کہتے ہیں چوں کہ مذکورہ روایت بھی اسی طریق سے مروی ہے اس لیے ''سلسلۃ الذہب'' فرمایا گیا۔ (محمد صغیر)

۳- زمانۂ استقبال۔

پس آیت کریمہ میں جو کلیہ ہے وہ ان تینوں قیدوں کا لحاظ کرنے کے بعد ہے، نہ کہ ان کو لغو قرار دے کر۔ نیز یہ کلیہ صادق بھی ہے۔ جس میں اس بدبخت قادیانی نے بلا تکلف اپنا ایمان اور اپنی عمر برباد کی۔

مندرجہ بالا آیت ''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ'' کی یہی تفسیر جو میں نے ''بہٖ'' اور ''مَوْتِہٖ'' کی دونوں ضمیروں کو حضرت عیسیٰ کی طرف لوٹا کر نقل کی ہے، ان احادیث متواترہ کا مضمون ہے، جو نزول مسیح اور وضع جزیہ کے بارے میں وارد ہوئی ہیں [واضح رہے کہ الفاظ حدیث کے مطابق ''وضع جزیہ'' ہی کا قول راجح ہے، نہ کہ ''وضع حرب'' (جنگ بندی) کا، یہ شاذ اور جمہور کے خلاف ہے، اگرچہ فی نفسہٖ صادق ہے اور ارشاد باری ''حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا'' (محمد:۴) سے ماخوذ ہے] اور ان احادیث کا مضمون ہے، جو اس سلسلے میں وارد ہیں کہ اس وقت دین مکمل طور پر خالصاً اللہ تعالیٰ کے لیے ہو جائے گا (یعنی فقط دین اسلام باقی رہے گا، بقیہ تمام ادیان ختم ہو جائیں گے) حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ: ''اس آیت کی تفسیر میں یہی قول حق ہے، جیسا کہ عنقریب ہم اسے مدلل بیان کریں گے، ان شاء اللہ وباللہ الثقة وعلیه التکلان''۔

اس کے بعد فرمایا کہ ابن جریر لکھتے ہیں کہ: ''ان اقوال میں صحیح تر پہلا قول ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کے نزول کے بعد اہل کتاب کا کوئی بھی فرد آپ علیہ السلام کی وفات سے پہلے آپ پر ایمان لائے بغیر نہ رہے گا''۔ بلاشبہ ابن جریر کا یہ قول صحیح ہے، کیوں کہ ان آیتوں کے لانے کا مقصد یہود کے اس دعوے کے بطلان کو ثابت کرنا ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ کو قتل کر دیا اور سولی دے دی، جسے جاہل نصاریٰ نے تسلیم بھی کر لیا؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بتلایا کہ معاملہ بالکل ایسا نہیں ہے اور ان کا یہ دعویٰ قطعاً غلط اور باطل ہے؛ بلکہ معاملہ یہ ہوا کہ یہ شبہ میں پڑ گئے اور حضرت عیسیٰ کے مشابہ ایک شخص کو قتل کر دیا، جس کی انہیں خبر بھی ہے کہ یہ عیسیٰ نہیں، بلکہ ان کے مشابہ ایک دوسرا شخص ہے۔ پھر اللہ رب العزت نے آپ کو اپنی طرف اٹھا لیا، چنانچہ حضرت عیسیٰ وہاں بہ قید حیات ہیں اور عنقریب قیامت سے پہلے نزول فرمائیں گے، جیسا کہ وہ احادیث متواترہ اس پر دال ہیں، جنہیں ہم ان شاء اللہ جلد ہی نقل کرنے والے ہیں۔ نزول کے بعد حضرت عیسیٰ، مسیح ضلالت (کانا دجال) کو قتل کریں گے، صلیب توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے اور جزیہ ختم کر دیں گے [یعنی کسی بھی مذہب کے ماننے والے سے جزیہ قبول نہ کریں گے؛ بلکہ ان کے لیے صرف دو ہی راستے ہوں گے: قبول اسلام، یا مقابلہ] پس اس آیت سے معلوم ہوا کہ تمام اہل کتاب اس وقت حضرت عیسیٰ پر ایمان لائیں گے، ان میں سے کوئی بھی فرد آپ پر ایمان لانے اور آپ کی تصدیق کرنے سے روگردانی نہیں کرے گا (اور جو روگردانی کرے گا اسے قتل

کر دیا جائے گا) اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ'' یعنی حضرت عیسیٰ کی موت سے پہلے تمام اہل کتاب حضرت عیسی پر ایمان لائیں گے، جن کی بابت یہود اور ان کے ہم خیال نصاریٰ کا خیال تھا کہ وہ مقتول و مصلوب ہو چکے ہیں۔ پھر ارشاد باری ہے: ''وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا'' (النساء:۱۵۹) یعنی حضرت عیسی ان کے ان اعمال کی بابت گواہی دیں گے، جن کا آپ نے آسمان پر اٹھائے جانے سے پہلے اور زمین پر اترنے کے بعد مشاہدہ کیا ہوگا''۔

اس آیت کریمہ کی مراد یہی ہے، جو ہم نے بیان کیا اور ثابت کیا کہ حضرت عیسیٰ موجود ہیں، آسمان پر زندہ ہیں اور قیامت سے پہلے زمین پر اتریں گے، تا کہ ان یہودیوں اور نصرانیوں کی تکذیب و تردید ہو جائے جن کے اقوال میں تناقض، و تضاد ہے، جو حق سے کوسوں دور اور افراط و تفریط میں مبتلا ہیں، چناں چہ یہودیوں نے سنگین جرائم کی بہتان تراشی کر کے تفریط و تنقیص سے کام لیا، جب کہ نصاریٰ نے اس درجہ مبالغہ آرائی کر کے افراط و غلو سے کام لیا کہ آپ کے بارے میں ان چیزوں کا دعوی کیا، جن سے آپ علیہ السلام پاک ہیں، چناں چہ انہوں نے یہودیوں کے بالمقابل آپ کو مقام نبوت سے آگے بڑھا کر مقام الوہیت تک پہنچا دیا۔ تعالیٰ اللہ عمایقول ھؤلاء وھؤلاء علواً کبیراً وتنزہ و تقدس لا الہ الا ھو۔

قرآن میں دوسروں کی بہ نسبت حضرت عیسیٰ کا تفصیلی تذکرہ

اللہ رب العزت نے قرآن عظیم میں اس جلیل القدر نبی: حضرت عیسی روح اللہ کی مکمل سوانح حیات از اول تا آخر جس طرح بیان کی ہے، کسی اور کی نہیں کی، چنانچہ سب سے پہلے آپ کی والدہ صدیقہ مریم عذراء کے احوال بیان فرمائے پھر فرشتوں نے آپ کی ولادت کے تعلق سے حضرت مریم کو جو بشارت دی تھی، اس کا تذکرہ کیا، چناں چہ ارشاد فرمایا:

'اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ٥ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ٥ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ط قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ط اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ٥ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ٥ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ'' (آل عمران: ۴۵-۴۹)

(اس وقت کو یاد کرو) جب کہ فرشتوں نے (حضرت مریم سے) کہا کہ: اے مریم! بیشک اللہ تعالیٰ تم کو

بشارت دیتے ہیں ایک کلمہ کی جو من جانب اللہ ہوگا (یعنی ایک بچہ پیدا ہونے کی جو بلا واسطہ باپ کے پیدا ہونے کے سبب کلمۃ اللہ کہلائے گا) اس کا نام (ولقب) مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا (ان کے یہ حالات ہوں گے کہ) باآبرو ہوں گے (خدا تعالیٰ کے نزدیک) دنیا میں بھی اور آخرت میں (بھی) اور منجملہ مقربین (عنداللہ) ہوں گے اور آدمیوں سے کلام کریں گے، گہوارہ میں (یعنی بالکل بچپن میں) اور بڑی عمر میں (بھی) اور (اعلیٰ درجہ کے) شائستہ لوگوں میں سے ہوں گے۔ مریم بولیں: اے میرے پروردگار! کس طرح ہوگا میرے بچہ؟ حالاں کہ مجھ کو کسی بشر نے (صحبت کے طور پر) ہاتھ نہیں لگایا۔ اللہ تعالیٰ نے (جواب میں) فرمایا: ایسے ہی (بلا مرد کے) ہوگا (کیوں کہ) اللہ تعالیٰ جو چاہیں پیدا کر دیتے ہیں (یعنی کسی چیز کے پیدا ہونے کے لیے صرف ان کا چاہنا کافی ہے، کسی واسطہ یا سبب خاص کی ان کو حاجت نہیں اور ان کے چاہنے کا طریقہ یہ ہے کہ) جب کسی چیز کو پورا کرنا چاہتے ہیں تو اس کو کہہ دیتے ہیں کہ (موجود) ہو جا، پس وہ چیز (موجود) ہو جاتی ہے (اور اے مریم! اس مولود مسعود کی یہ فضیلتیں ہوں گی کہ) اللہ ان کو تعلیم فرمادیں گے (آسمانی) کتابیں اور سمجھ کی باتیں اور (بالخصوص) توریت اور انجیل اور ان کو (تمام) بنی اسرائیل کی طرف (پیغمبر بنا کر) بھیجیں گے''۔

یہ ہیں وہ بشارتیں جو فرشتہ نے حضرت عیسیٰ کی بابت آپ کی والدہ صدیقہ کو دی تھیں، رہا حضرت مریم کے حاملہ ہونے، اس کے متعلقات اور اس کے بعد کی چیزوں کا تذکرہ، تو ان سب کو سورہ مریم میں جس بسط وتفصیل سے ذکر کیا گیا ہے وہ کسی اور کے حصہ میں نہیں آیا۔ یہ بسط وتفصیل اس وجہ سے ہے کہ آپ علیہ السلام کے احوال خلاف عادت ہیں، نیز چوں کہ آپ آسمان پر اٹھالئے گئے ہیں پھر دوبارہ نزول الی الارض مقدر ہے، اس لیے بھی آپ کے احوال کے بیان کا مزید اہتمام کیا گیا۔

پھر جب یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کو قتل کرنے کی ناپاک شازشیں کیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو بچانے کے لیے اپنی تدبیر لطیف فرمائی، تو اس کی اطلاع دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"يٰعِيْسٰىٓ اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ" (آل عمران: ۵۵)

''اے عیسیٰ! میں لے لوں گا تجھ کو اور اٹھالوں گا اپنی طرف اور پاک کردوں گا تجھ کو کافروں سے اور رکھوں گا ان کو جو تیرے تابع ہیں، غالب ان لوگوں سے جو انکار کرتے ہیں قیامت کے دن تک''

یہاں زمانۂ رفع تک کے حالات کو اصلاً بیان کیا اور ضمناً نزول اور مابعد النزول کے حالات کی طرف اشارہ کردیا، پھر اس واقع کو سورہ نساء میں واضح انداز میں بیان کیا اور فرمایا کہ جو اس وقت ایمان

نہیں لائے ہیں وہ عنقریب ایمان لانے پر مجبور ہوں گے۔ پھر اس کے بعد کے حالات کی طرف اپنے قول:

"وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا" (نساء: ۱۵۹)

"قیامت کے روز وہ (یعنی عیسیٰ علیہ السلام) ان (منکرین کے انکار) پر گواہی دیں گے"۔

سے اشارہ کیا اور تفصیلاً سورہ مائدہ میں بیان کیا، جہاں دنیا میں آپ پر ہونے والے خصوصی انعامات کی یاد دہانی بھی کرائی گئی ہے۔ اس طرح ولادت سے محشر تک کے آپ کے احوال انتہائی مربوط انداز میں بیان کیے گئے۔

"لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ" میں ضمیر کا مرجع حضرت عیسیٰ ہی ہیں

مذکورہ بالا تقریر سے یہ بھی معلوم ہوا کہ "وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ" میں "بہ" اور "موتہ" دونوں ضمیریں حضرت عیسیٰ کی طرف راجع ہیں اور یہ ضروری بھی ہے ورنہ درمیان سے احوال کے اتساق و ہم آہنگی میں خلل پڑ جائے گا، نیز "قبل موتہ" کی ضمیر حضرت عیسیٰ کی طرف لوٹانا ترجمان القرآن حبر الامۃ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے سند صحیح سے ثابت ہے، کسی اور جانب لوٹانا آپ رضی اللہ عنہ سے صحیح طور پر ثابت نہیں، کما فی "فتح الباری" اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر حضرت ابن عباس سے "مُتَوَفِّيْكَ" کی تفسیر "ممیتک" ثابت بھی ہو جائے تب بھی اس سے آپ رضی اللہ عنہ کی مراد موت قبل النزول نہیں ہو سکتی؛ جب کہ اس روایت کی سند میں محدثین کے نزدیک کلام بھی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں:

"ان المساجد لتجدد لخروج المسيح وانه سيخرج ، فيكسر الصليب، ويقتل الخنزير ، ويؤمن به من ادركه فمن أدركه منكم فليقرئه مني السلام."

(ش) ملتقى من المرفوع. (كنز العمال: ۱۴/ ۶۱۷، رقم: ۳۹۷۲۱)

"خروج مسیح کے لیے مسجدیں سجادی جائیں گی، عنقریب آپ خروج کریں گے اور صلیب توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، جو لوگ آپ کو پائیں گے آپ پر ایمان لائیں گے اور تم میں سے جو شخص آپ علیہ السلام کو پائے وہ میرا اسلام ان سے کہے"۔

اس روایت کو صاحب "کنز العمال" نے بہ حوالہ "مصنف ابن ابی شیبہ" مرفوعاً ذکر کیا ہے(۱)"۔

(۱) کنز العمال کے جدید نسخہ مطبوعہ "ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان، پاکستان" میں یہ روایت ج:۱۴، ص:۶۱۷، رقم:۳۹۷۲۱۔ پر ہے نیز اس میں "لتجدد" کے بجائے "لتحدر" اور "ويؤمن به من ادركه" کے بجائے فقط "ويومن به" ہے "عقیدۃ الاسلام عربی" میں اسی کے مطابق ہے لیکن "مصنف ابن ابی شیبہ" ج:۷، ص:۴۹۴۔ رقم:۳۷۴۸۶، مطبوعہ "بیروت" میں ذکر کردہ الفاظ کے ساتھ ہے، میں نے اسی کے مطابق ذکر کیا ہے (محمد صغیر)

اسی طرح حضرت ابو ہریرہ کی ایک دوسری حدیث ہے، جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"والذی نفسی بیده لیوشکن أن ینزل فیکم ابن مریم حکماً عدلاً فیکسر الصلیب ،ویقتل الخنزیر، ویضع الجزیة ، ویفیض المال، حتی لا یقبله احد ، حتی تکون السجدة الواحدة خیراً من الدنیا وما فیها" ثم یقول ابوهریرة: و اقرؤوا ان شئتم" وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۝"

(بخاری: ۱/۴۹۰-مسلم: ۱/۸۷)

''قسم ہے اس ذات کی، جس کے قبضے میں میری جان ہے، وہ وقت ضرور آئے گا جب تم میں (اے امت محمدیہ!) ابن مریم حاکم عادل کی حیثیت سے نازل ہو کر صلیب توڑیں گے (یعنی صلیب پرستی ختم کر دیں گے) خنزیر کو قتل کریں گے، جزیہ لینا بند کر دیں گے اور مال و دولت کی ایسی فراوانی ہو گی کہ اسے کوئی قبول نہ کرے گا اور (لوگ ایسے دیندار ہو جائیں گے کہ ان کے نزدیک) ایک سجدہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہو گا'' پھر ابو ہریرہ نے فرمایا کہ: اگر تم (نزول مسیح کی دلیل قرآن کریم میں دیکھنا) چاہو تو یہ آیت پڑھ لو: ''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ، وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا''۔

حدیث کا آخری ٹکڑا جو آیت کریمہ سے استشہاد کی بابت ہے، وہ بھی میرے نزدیک مرفوع ہی ہے، رہا اس کے موقوف ہونے کا وہم جو راوی کے اس قول ''ثم یقول ابو هریرة'' سے ہوا تو یہ بات راوی نے سیاق و اسلوب میں حدیث نبوی سے آیت کریمہ کی جانب انتقال کے سبب کہی، اسی وجہ سے دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت پڑی، یہ معنی نہیں کہ اصلاً ٹکڑا موقوف ہے۔ نیز ابن مردویہ کے حوالے سے ''در منثور'' میں پوری حدیث مرفوعاً مذکور ہے، مزید یہ کہ امام طحاوی نے ''باب فی سؤر الهره'' میں ابن سیرین سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ کی تمام احادیث مرفوع ہی ہیں (خواہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب نسبت کی ہو یا نہ کی ہو)۔

علاوہ ازیں ظاہر ہے کہ یہ قول ''ثم یقول ابو هریرة'' راوی ہی کا ہے، (نہ کہ حضرت ابو ہریرہ کا) پس جب یہ حضرت ابو ہریرہ کا قول نہیں ہے (حالاں کہ موقوف ہونے کے لیے ضروری تھا کہ خود انہیں کا قول ہو) تو اس کے موقوف ہونے کی کیا دلیل ہے؟۔

اسی طرح ایک روایت ''مسند احمد'' (۲/۲۹۰) میں بہ واسطہ حنظلہ بن علی اسلمی عن ابی ہریرۃ ہے (جس کے آخر میں ہے کہ یہ حدیث سنا کر) حضرت ابو ہریرہ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی: ''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ'' حنظلہ فرماتے ہیں کہ: حضرت ابو ہریرہ نے (اس آیت کی تفسیر

میں) فرمایا تھا: ''یؤمن به قبل موت عیسی —علیه السلام— '' (کہ تمام اہل کتاب حضرت عیسی کی موت سے پہلے ان پر ایمان لائیں گے) اب مجھے معلوم نہیں کہ یہ سب (تفسیر بھی) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمودہ ہے، یا حضرت ابو ہریرہ نے اپنی طرف سے کی ہے۔ اس مقام پر حنظلہ نے اس آخری جملے کے مرفوع وموقوف ہونے کی بابت اپنی لاعلمی کا اظہار کیا؛ حالاں کہ جب نزول مسیح، جزیہ کی منسوخی اور اس وقت پورا کا پورا دین خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو جانے کی بابت حدیثیں متواتر وارد ہیں، تو اس کے مرفوع ہونے میں کیا پس وپیش ہے؟ بلاشبہ یہ تمام حدیثیں اسی آیت سے ماخوذ ہیں۔

حضرت عیسیٰ کے صلیب توڑنے اور دجال کو قتل کرنے کی حکمت

''عمدة القاری، کتاب البیوع'' میں ہے کہ حضرت عیسیٰ کا صلیب توڑنا نصاری کے اس عقیدہ کی تردید وتکذیب کے لیے ہے کہ: صلیب معبود اور قابل پرستش ہے۔ میں کہتا ہوں کہ: یہودیوں کی بھی تکذیب کے لئے ہے جن کا خیال ہے کہ انھوں نے حضرت عیسی کو سولی دے دی ہے۔ العیاذ باللّٰہ۔ بایں طور صلیب دونوں جماعتوں کی گمراہی کا سبب بن گئی۔ شاید حضرت عیسی کا دجال کو خود قتل کرنے کی حکمت، جو الوہیت کا دعوے دار ہوگا، اس الزام کو رفع کرنا ہے، جو نصاری نے خود حضرت عیسی کو معبود بنا کر لگایا ہے، پس آپ دنیا ہی میں اس سے بری ہو جائیں گے، جس کا نفع قیامت میں آپ کو ملے گا، جب سچوں کو سچائی کا صلہ ملے گا۔

عود إلى المقصود

ماقبل میں مذکور ابو ہریرہ کی حدیث شریف کے جملہ ''ان ینزل فیکم ابن مریم'' میں لفظ ''فیکم'' ایسا ہی ہے، جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''أما ترضون أن یکون ابراهیم وعیسی فیکم یو م القیٰمة ؟ثم قال :انهما فی امتی یوم القیٰمة ،اما ابراهیم ،فیقول :انت دعوتی وذریتی، واما عیسیٰ فالانبیاء اخوة بنو علات وأمهاتهم شتی ، وأن عیسی أخی لیس بینی وبینه نبی ، وانا اولی الناس به''

''(اے امت محمد یہ!) کیا تم اس بات سے راضی نہیں ہو کہ قیامت کے دن حضرت ابراہیم وعیسی تمہارے ساتھ ہوں؟ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ دونوں قیامت کے دن میری امت میں شامل ہوں گے حضرت ابرہیم تو اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ: تو (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) میری دعا کا نتیجہ اور میری اولاد

اور حضرت عیسیٰ اس وجہ سے کہ تمام انبیاء کرام باپ شریک بھائیوں کی طرح ہیں (کہ ان سب کا باپ یعنی اصول دین وعقائد وغیرہ ایک) اور مائیں (شریعتیں یعنی فقہی وفروعی مسائل) جدا جدا ہیں اور چوں کہ میرے اور میرے بھائی عیسیٰ کے درمیان کوئی نبی نہیں ہوا، اس لیے میں ان سے سب سے زیادہ قریب ہوں''۔

اس روایت کو صاحب ''شفاء'' نے ''فصل: تفضیله -صلی الله علیه وسلم- فی القیمة بخصوص الکرامة'' میں ذکر کیا ہے۔

نزول کی تعبیر میں دو باتیں ملحوظ ہیں: ایک یہ کہ حضرت عیسیٰؑ کا نزول آسمان سے ہوگا، جیسا کہ سند صحیح کے ساتھ بہ روایت بیہقی ''کتاب الاسماء والصفات'' میں اس کی تصریح ہے۔ نیز اس پر امت کا اجماع بھی ہے۔ دوسرے یہ کہ: حضرت عیسیٰؑ ان ہی لوگوں میں (یعنی امت محمدیہ کے افراد میں) اتریں گے۔ یہی دونوں باتیں کلمہ ''فی'' کے استعمال میں بھی ملحوظ ہیں، ایک یہ کہ کلمہ ''فی'' ''نزیل'' کا صلہ ہے، دوسری بات وہی ہے، جو اس شعر میں لفظ ''فی'' کے استعمال میں ہے: ؎

لجودک فی قومی ید یعرفونها ☆ وأیدی الندی فی الصالحین قروض

''میری قوم میں آپ کی داد ودہش ایسا احسان ہے، جسے قوم کے لوگ بخوبی جانتے ہیں، نیکوں میں سخاوت واحسان معروف ہی ہوتے ہیں''۔

آیت کا صریح مفہوم یہ ہے کہ اس میں زمانۂ نزول کے اعتبار سے استقبال مراد ہے، نہ کہ زمانۂ ماضی؛ چناں چہ صاحب ''روح المعانی'' نے ''سورہ کہف'' میں بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ: ''افعال زمانۂ تکلم کے لیے وضع کیے گئے ہیں، جب کہ وہ مطلق ہوں، اور اگر ان صیغوں کو کسی ایسے لفظ سے مقید کردیں، جو کسی زمانے پر دلالت کرتا ہو، تو وہاں زمانۂ ماضی وغیرہ کا ہونا اس لفظ کے زمانہ کے لحاظ سے ہوگا''۔ (انتہی) یہی بات ''فتح الباری'' میں ابن الصدر سے بھی منقول ہے۔

یہاں آیت کریمہ میں تین قیود ہیں:

۱- زمانۂ استقبال۔ ۲- قبل الموت۔ ۳- مؤمن بہ کا مشاہدہ۔

پس معلوم ہوا کہ یہ آیت عام نہیں ہے اور جب موت زمانۂ نزول کے اعتبار سے مستقبل میں واقع ہوگی، تو معلوم ہوا کہ زمانۂ ماضی میں آپ کی وفات نہیں ہوئی۔ نیز آیت کریمہ اس بابت بھی صریح ہے کہ اہل کتاب کا آپ علیہ السلام پر ایمان لانا آپ کی وفات سے کچھ پہلے ہوگا۔ یعنی ''قبل موته'' سے مراد ''قبیل موته'' ہے، جیسا کہ احناف نے آیت کریمہ:

"وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا" (طٰہٰ: ۱۳۰)

"اور اپنے رب کی حمد (وثنا) کے ساتھ (اس کی) تسبیح (وتقدیس) کیجیے آفتاب نکلنے سے پہلے (مثلاً نماز فجر) اور اس کے غروب سے پہلے (مثلاً نماز ظہر اور عصر)"

کی تفسیر میں عصر کی تاخیر کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ یہاں 'قبل' سے مراد 'قبیل' ہے، یعنی غروب شمس سے کچھ پہلے، اس لیے کہ اگر یہ مفہوم مراد نہ ہوتا تو "غروب شمس" کی قید لائی ہی نہ جاتی۔ علاوہ ازیں اس جیسے مواقع پر فصحاء کا استعمال بھی یہی ہے، چناں چہ جب وہ کہتے ہیں "آتیک قبل الغروب" تو مراد یہی ہوتی ہے کہ: غروب شمس سے کچھ پہلے تمہارے پاس آؤں گا، ورنہ ظاہر ہے کہ غروب شمس کے ساتھ وقت کی یہ تحدید بے فائدہ ہے۔ نیز سیاق بھی اسی کا ہے، نہ کہ امتداد کا، جیسا کہ اس ارشاد باری:

"مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ ط وَمِنْ م بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ" (نور: ۵۸)

"اے ایمان والو! (تمہارے پاس آنے کے لیے) تمہارے مملوکوں کو اور جو تم میں حد بلوغ کو نہیں پہنچے ان کو تین وقتوں میں اجازت لینا چاہیے (ایک تو) نماز صبح سے پہلے اور (دوسرے) جب دوپہر کو (لیٹنے کے لیے) اپنے (زائد) کپڑے اتار دیا کرتے ہو اور (تیسرے) نماز عشاء کے بعد"۔

میں سلف نے "مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ" کی تفسیر کی ہے "صبح کو اس وقت جب لوگ چلنے پھرنے لگیں" اور "وَمِنْ م بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ" کی 'بعید العشاء' سے یعنی عشاء سے تھوڑی دیر بعد"۔ تاکہ "قبل صلوۃ الفجر" اور "بعد صلوۃ العشاء" کی تحدید وتوقیت کا فائدہ باقی رہے اور "ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ" (یہ تین وقت تمہارے پردے کے ہیں) سے کوئی اشکال وارد نہ ہو۔ اس لیے یہاں بھی خارج سے کسی قید کی ضرورت نہیں، بلکہ اپنے آپ یہ قید ملحوظ رہے گی۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ: حضرت ابوہریرہ نے جو فرمایا ہے کہ "قَبْلَ مَوْتِهٖ" سے مراد 'قبل موت عیسی - علیہ السلام -' ہے، یہ اس آیت کریمہ سے ماخوذ ہے:

"فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ط وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ" ۝ (مائدہ: ۱۱۷)

"پھر جب آپ نے مجھ کو اٹھا لیا تو (اس وقت صرف) آپ ان (کے احوال) پر مطلع رہے (اس وقت مجھ کو خبر نہیں کہ ان کی گمراہی کا سبب کیا ہوا اور کیوں کر ہوا) اور آپ ہر چیز کی پوری خبر رکھتے ہیں"۔

کیوں کہ اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عیسیٰ نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ زمانۂ رفع سے

زمانۂ نزول تک اہل کتاب یعنی یہود ونصاریٰ کے احوال کے نہ تو آپ نگراں تھے اور نہ ہی ان سے واقف، جس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ مذکورہ لوگوں کے آپ گواہ نہ ہوں، جب کہ سورہ نساء کی آیت یہ بتارہی ہے کہ جو بھی کتابی ایمان لائے گا، آپ اس کے گواہ ہوں گے، تو یہ بات متعین ہوگئی کہ یہاں مراد وہ اہل کتاب ہیں جو نزول کے بعد، وفات سے پہلے آپ پر ایمان لائیں گے، کیوں کہ انھیں لوگوں کی بابت آپ قیامت میں گواہی دیں گے۔

رہی حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قرأت ''وَاِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهِمۡ'' تو ممکن ہے کہ ہر دو قرأت کو الگ الگ معنی پر محمول کیا جائے جیسا کہ خفاجی نے ذکر کیا ہے اور جیسا کہ ''الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوۡمُ'' (روم:۱-۲) بہ صیغۂ معروف ومجہول، دو واقعات پر محمول ہے۔ نیز قراءتوں کا ایسا اختلاف بکثرت پایا جاتا ہے۔ ''در منثور'' میں محمد بن حنفیہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ: حضرت عیسیٰ کے نزول سے پہلے مرنے والے اہل کتاب اپنی موت سے پہلے حضرت عیسیٰ پر ایمان لائیں گے اور نزول کے وقت زندہ رہنے والے حضرت عیسیٰ کی موت سے پہلے حضرت عیسیٰ پر ایمان لائیں گے۔ پس کلیہ بلا کسی قید کے صادق رہا اور حضرت ابی کی قرأت حضرت عیسیٰ کے نزول سے پہلے مرنے والوں پر محمول ہے، جب کہ قرأت متواترہ نزول کے وقت زندہ رہنے والوں پر۔ جیسا کہ ان احادیث متواترہ میں یہ بات بہ صراحت ہے جو نزول مسیح اور اس وقت اللہ تعالیٰ کے لئے مکمل دین کے ہوجانے کی بابت وارد ہیں۔

''در منثور'' کے الفاظ یہ ہیں:

''واخرج ابن المنذر عن شهر بن حوشب قال: قال لی الحجاج: یا شهر! آیة من کتاب الله ما قرأتها الا اعترض فی نفسی منها شئی، قال الله: ''وَاِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ'' وأنی أوتی بالأساری فاضرب أعناقهم ولا اسمعهم یقولون شیئا، فقلت: رفعت الیک علی غیر وجهها، أن النصرانی اذا خرجت روحه ضربته الملٰئکة من قبله ومن دبره، وقالوا: أی خبیث! ان المسیح الذی زعمت انه الله، أو ابن الله، أو ثالث ثلاثة: عبد الله وروحه وکلمته، فیؤمن به حین لا ینفعه ایمانه، وان الیهودی اذا خرجت نفسه ضربته الملٰئکة من قبله ومن دبره، وقالوا: أی خبیث! ان المسیح الذی زعمت أنک قتلته: عبد الله وروحه، فیؤمن به حین لا ینفعه الایمان، فاذا کان عند نزول عیسی آمنت به أحیائهم کما آمنت به موتاهم، فقال: من أین أخذتها؟ فقلت: من محمد بن علی، قال: لقد أخذتها من معدنها، قال شهر: وأیم الله ما حدثتنیه الا أم سلمة،

ولكني أحببت أن أغيظه" (درمنثور: ۲/۷۴۲)

''ابن منذر روایت کرتے ہیں کہ شہرابن حوشب نے بیان کیا کہ: ایک بار حجاج (بن یوسف) نے مجھ سے کہا کہ: قرآن کریم کی ایک آیت جب بھی پڑھتا ہوں مجھے ایک شبہ پیش آتا ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ,,وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ،، (جس کا حاصل یہ ہے کہ ہر کتابی اپنی موت سے پہلے حضرت عیسیٰ پر ایمان لائے گا) حالاں کہ میرے پاس (یہودی اور نصرانی) قیدی لائے جاتے ہیں اور انہیں قتل کرتا ہوں، مگر قتل ہوتے ہوئے کچھ کہتے (یعنی کلمۂ ایمان پڑھتے ہوئے) نہیں سنتا؟ میں نے اسے جواب دیا کہ: اس آیت کا مطلب تمھیں صحیح نہیں، بتایا گیا۔ بات یہ ہے کہ جب کسی نصرانی کی روح نکلنے لگتی ہے، تو فرشتے اسے آگے اور پیچھے سے مارتے ہیں اور کہتے ہیں ''او خبیث! (حضرت) مسیح (علیہ السلام) جن کے بارے میں تیرا عقیدہ ہے کہ وہ خدا ہیں، یا خدا کے بیٹے ہیں، یا تین خداؤں میں کے ایک ہیں، وہ درحقیقت اللہ کے بندے، روح اللہ، اور کلمۃ اللہ ہیں'' یہ سن کر وہ ایمان لاتا ہے (یعنی مذکورہ بالا امور کا یقین کر لیتا ہے) مگر اس وقت کا ایمان اس کے لیے مفید نہیں ہوتا (کیوں کہ نزع کے وقت جب کہ موت کے فرشتے نظر آنے لگتے ہیں، توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے، اس وقت کا ایمان معتبر نہیں، نیز ایمان کے لئے زبان سے اقرار بھی ضروری ہے، جو وہ نہیں کرتا، خلاصہ یہ کہ اس کی موت حالتِ کفر ہی میں شمار ہوتی ہے) اور جب کسی یہودی کی روح نکلنے لگتی ہے، تو فرشتے اسے بھی آگے اور پیچھے سے مارتے ہیں اور کہتے ہیں ''او خبیث! (حضرت) مسیح (علیہ السلام) جن کے بارے میں تیرا عقیدہ ہے کہ تم (یہودیوں) نے انھیں قتل کر دیا تھا، وہ درحقیقت اللہ کے بندے اور روح اللہ ہیں''، یہ سن کر یہودی بھی ان پر ایمان لے آتا ہے (یعنی مذکورہ بالا امور کا یقین کر لیتا ہے کہ وہ اللہ کے نبی اور رسول تھے نہ کہ جھوٹے وغیرہ) مگر اس وقت کا ایمان مفید نہیں ہوتا (جیسا کہ مذکور ہو چکا) پس نزولِ عیسیٰ کے بعد (جب دجال قتل ہو جائے گا) جتنے یہودی اور نصرانی زندہ باقی ہوں گے، سب آپ علیہ السلام پر ایمان لے آئیں گے جس طرح کہ ان کے مردے ایمان لاتے رہے۔ (مگر دونوں میں بڑا فرق ہوگا کہ مردوں کا ایمان معتبر و مقبول نہیں تھا اور زندوں کا معتبر ہوگا)۔ یہ سن کر حجاج نے مجھ سے پوچھا کہ (اس تفصیل کے ساتھ آیت کی) یہ تفسیر تم نے کہاں سے حاصل کی؟ میں نے کہا: ''محمد بن علی سے'' کہنے لگا: ''تم نے یہ تفسیر اس کے اصلی مقام سے حاصل کی ہے'' شہر بن حوشب فرماتے ہیں کہ: میں نے حضرت محمد بن علی کا حوالہ اسے چڑانے کے لئے دیا تھا (کیوں کہ حجاج حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد سے سیاسی اختلاف رکھتا تھا) ورنہ بخدا یہ تفسیر مجھے (سب سے پہلے ام المومنین حضرت) ام سلمہؓ ہی نے سنائی تھی (لیکن بعد میں

محمد بن علی سے بھی سنی تھی، اس لئے محمد بن علی کا حوالہ دینا بھی خلاف واقعہ نہیں)''۔

پس آیت کریمہ پہلے اور دوسرے دونوں مفہوم پر منطبق ہوگئی۔ واضح رہے کہ اس آیت کریمہ کا نزول، نزول مسیح کے بعد اہل کتاب کے ایمان لانے کے حوالے سے قطعی ہے اور نزول مسیح سے پہلے ایمان لانے کے سلسلے میں محتمل ہے، جو اسی کے تحت داخل ہوگی۔ الحاصل آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہوا کہ تمام اہل کتاب حضرت عیسیٰ کی وفات سے پہلے، حضرت عیسیٰ پر ایمان لے آئیں گے، کچھ لوگ جاں کنی کے عالم میں، یا اس کے بعد جیسا کہ مذکورہ اثر سے معلوم ہوا اور کچھ لوگ حضرت عیسیٰ کے نزول کے وقت۔ الغرض آیت کریمہ کلی طور پر بلا تکلف صادق آتی ہے۔ نیز حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قرأت بھی قرأت متواترہ کے مصداقات میں داخل ہوگئی اور دونوں قرأتیں ہم آہنگ بھی ہوگئیں۔ رہے وہ اہل کتاب جو نزول آیت سے پہلے وفات پا چکے، تو اگر چہ ان کا ذکر نہیں ہے مگر ان کا بھی حکم یہی ہے جو مذکور ہوا اور صیغۂ استقبال زمانۂ خطاب یعنی زمانۂ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا لحاظ کر کے لایا گیا ہے۔ واللہ سبحانہ تعالی اعلم۔

نیز اگر دونوں قرأتوں کو ایک ہی محمل پر محمول کریں، تو ضروری ہوگا کہ حضرت ابی بن کعبؓ کی قرأت کو جمہور کی قرأت کے تابع بنائیں، نہ کہ اس کے برعکس (یعنی جمہور کی قراءت متواترہ کو حضرت ابیؓ کی قرأت کے تابع کریں) اس صورت میں آیت کی مراد بہ حیثیت قوم اہل کتاب کی ایک جماعت کی موت ہوگی، نہ کہ بہ حیثیت افراد و اشخاص اور یہ قیامت کبری کے وقت ہوگا، نہ کہ قیامت صغری کے وقت جو ان میں سے ہر ایک شخص کی موت کے وقت ہوتی ہے(۱)

غالباً اسی نکتہ کی وجہ سے ''لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ'' کی ضمیر جمع فاعلی ''هم'' اور ''قَبْلَ مَوْتِهِمْ'' کی ضمیر جمع ''هم'' کو ''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ'' مفرد کی طرف لوٹایا، ورنہ زیادہ دل نشیں اور ہم آہنگ یہ عبارت تھی ''یؤمنن به بأجمعهم معا قبل موتهم'' اور یہ مصدر ایسا ہی ہوگا، جیسا کہ ارشاد باری:

''ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْ م بَعْدِ مَوْتِكُمْ'' (البقرة: ۵۶)

''پھر ہم نے تم کو زندہ کر اٹھایا تمہارے مرجانے کے بعد''۔

میں ہے، گویا یہ حضرت ابیؓ کی اس قرأت کے مطابق ہے:

''وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ'' (آل عمران: ۸۱)

(۱) بفحوائے حدیث ''اذا مات احدکم فقد قامت قیامته الخ'' (جب تم میں سے کوئی مر گیا تو اس کی قیامت آ ہی گئی) کنز العمال: ج:۱۵، ص۶۸۶، رقم ۴۲۷۴۸۔ (از محمد صغیر)

''اور جب لیا اللہ نے عہد اہل کتاب سے کہ جو کچھ میں نے تم کو دیا کتاب اور علم پھر آوے تمہارے پاس کوئی رسول کہ سچا بتاوے تمھارے پاس والی کتاب کو تو اس رسول پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے''۔

میثاق انبیاء اور اس کی تکمیل

مذکورہ بالا آیت حضرت ابی ابن کعبؓ کے نزدیک اہل کتاب کے بارے میں ہے (جیسا کہ ''الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ'' سے ظاہر ہے) نہ کہ انبیاء کرام کے بارے میں (جب کہ جمہور کے نزدیک انبیاء کرام کے بارے میں ہے، چناں چہ جمہور کی قرأت ہے ''مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ'') نیز ارشاد باری: ''وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ'' (ال عمران: ۵۵) کے تحت یہ بات گزر چکی ہے کہ یہ آیت اسی آیت سے ہم آہنگ ہے۔ رہے انبیاء کرام علیہم السلام تو ان کو عنوان عام میں داخل کر دیا اور ان کی رسالت کو ''مِنْ کِتٰبٍ'' اور متعلقات نبوت کو ''وحکمۃٍ'' کے ذریعہ واضح کیا۔ نیز ان سب کو نبی کہنا، باوجودے کہ ان میں رسول بھی تھے، اس بات کی دلیل ہے کہ وہ شخص جو کہ ابھی باقی ہے اور جسے ''ثُمَّ جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ'' میں ''رسول'' سے تعبیر کیا گیا ہے، ایک ہے نہ کہ چند۔ پس آیت کریمہ میں رسول متعین ہے نہ کہ فرد منتشر، ورنہ تو یہ رسول بھی ان انبیاء کرام کے زمرہ میں داخل ہو جاتا، جن سے میثاق لیا گیا۔ اس صورت میں عبارت قرآنی رکاکت اور ضعف کا شکار ہو جاتی اور یہ وہم پیدا ہوتا کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے بعد آنے والے پیغمبر کے لئے عہد لیا گیا۔ العیاذ باللہ۔ مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ آیت ختم نبوت پر دلیل ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل آیت دلیل ہے:

''وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ'' (احزاب: ۴۰)

''لیکن (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے ختم پر ہیں''۔

ورنہ تو پھر مناسب تھا کہ یہ کہا جاتا ''**وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ ان یصدق بعضھم بعضاً**'' تا کہ متقدمین و متاخرین دونوں کو شامل ہو جاتی۔

پھر آخر کیا وجہ ہے کہ ''رسول'' کو مفرد لایا گیا، جب کہ یہاں زیادہ مطابقت رکھنے والی صورت ''رسول'' کے جمع لانے کی تھی۔ اگر یہاں ''من النبیین والرسل'' کہتے تو اس کی صورت کا پتہ نہ چلتا اور ''ثُمَّ جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ'' مکرر معلوم ہوتا اور ذہن اس کی وجہ وسبب جاننے کے لئے حیران و سرگرداں رہ جاتا۔

نیز اگر یہ میثاق انبیاء کرام سے رسولوں کی بابت لیا جاتا تو سابقہ رسولوں کی بابت لیا جاتا اور ہر نبی

سے اس کے رسول کے لیے لیا جاتا، حالاں کہ اللہ رب العزت نے "ثُمَّ جَآئَكُمْ رَسُوْلٌ" کو لفظ "ثم" سے ادا کیا ہے، جو تراخی پر دلالت کرتا ہے، جس کا حاصل متقدمین سے متأخر کے لئے عہد لینا ہوا۔ علاوہ ازیں متأخر سے متقدم کی بابت عہد لینا تو ظاہر ہے نہ کہ اس کے برعکس (یعنی متقدم سے متأخر کی بابت عہد لینا) یہ ایسا ہی ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

"فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ" (ص: ۷۲)

"سو میں جب اس کو (حضرت آدم کو) پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی (طرف سے) جان ڈالوں تو تم سب اس کے روبرو سجدہ میں گر پڑنا"۔

پھر یہ کہ بعد میں آنے والے کی پیش رو کی تصدیق کبھی زبانی ہوتی ہے اور اس سے بڑھ کر تصدیق عمل میں موافقت ہے؛ اگرچہ چند ہی چیزوں میں سہی اور اس سے بھی بڑھ کر تصدیق یہ ہے کہ اس کے بعض اعمال واحکام کو قانونی حیثیت دے کر نافذ کیا جائے۔ یہی مطلب ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کا:

"وعليكم –خاصة اليهود– أن لا تعتدوا في السبت" (ترمذی: ۱۴۶/۲)

"بالخصوص اے یہود تمہارے لئے یہ حکم ہے کہ سنیچر کے دن زیادتی اور احکام خداوندی سے سرکشی نہ کرو"۔

اسی طرح دو یہودیوں کو احکام تورات کے مطابق رجم کرنا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا:

"فانا احق بموسى منكم" (بخاری: ۱/ ۲۶۸)

"تمہارے مقابلے میں حضرت موسیٰ سے زیادہ قرب میرا ہے"۔

نیز مدینہ منورہ میں بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا (سب اسی قبیل سے ہے) چوں کہ اس وقت مدینہ والوں کا قبلہ بیت المقدس ہی تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا دراصل اس وقت شہروں اور ملکوں کے اختلاف سے تقسیم قبلہ کے حکم پر عمل کرنا تھا، تا آں کہ عمومی شریعت مستحکم ہوگئی (اور پوری امت کا ایک ہی قبلہ خانۂ کعبہ متعین ہوگیا) اظہار موافقت کے لئے اہل قبلہ کے نزدیک حسی طور پر، موافقت قبلہ سے بڑھ کر کوئی اور چیز نہ تھی، اس لئے اظہار موافقت کی حد تک اس کی رعایت کی گئی، پھر اصل اور دائمی شریعت مقرر و مستحکم ہوگئی۔

حضرت عیسیٰ اس میثاق کو (جو "وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ" میں مذکور ہے) عملی جامہ پہنانے کے لئے تمام انبیاء بنی اسرائیل کے وکیل ونائب ہیں، اس لئے آپ کو دوبارہ (امت محمدیہ میں) لایا جائے گا (تا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد، تمام انبیاء کرام کی طرف سے، دنیا میں آپ علیہ السلام، حضور صلی

اللہ علیہ وسلم کی عملاً بھی تصدیق کریں) متقدم کے متاخر کی تصدیق کے اظہار کی، اس کے علاوہ اور کوئی صورت بھی نہیں ہے کہ متقدم کو دوبارہ دنیا میں واپس لایا جائے، (پھر تصدیق کرائی جائے) چناں چہ معراج میں تمام انبیاء کرام کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کی یہی وجہ ہے۔

واضح رہے کہ میثاق کے دن یہ میثاق تمام انبیاء کرام سے ایک ساتھ لیا گیا، نہ کہ ہر ایک سے اس کے زمانے میں الگ الگ۔ اور یہ میثاق اس رسول کی بابت تھا جو تمام انبیاء کرام و رسل کے بعد آنے والا تھا۔ اسی وجہ سے حضرت عیسیٰ اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک ایسا طویل زمانہ ہے، جس میں کوئی بھی نبی و رسول نہیں ہوا، نیز ایمان و نصرت کا عہد، جیسا کہ سورہ اعراف میں ہے:

"اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَہٗ مَکْتُوْباً عِنْدَھُمْ فِی التَّوْرٰۃِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُھُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھٰھُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ وَیُحِلُّ لَھُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْھِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْھُمْ اِصْرَھُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْھِمْ ط فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِہٖ وَعَزَّرُوْہُ وَنَصَرُوْہُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ٥" (۱۵۷)

"جو لوگ ایسے نبی امی کا اتباع کرتے ہیں جن کو وہ اپنے پاس تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں (جن کی صفت یہ بھی ہے کہ) وہ ان کو نیک کاموں کا حکم فرماتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں اور پاکیزہ چیزوں کو ان کے لئے حلال بتلاتے ہیں (گو وہ پہلی شرائع میں حرام تھیں) اور گندی چیزوں کو (بدستور) ان پر حرام فرماتے ہیں اور ان لوگوں پر جو (پہلے شرائع میں) بوجھ اور طوق (لدے ہوئے) تھے (یعنی سخت اور شدید احکام جن کا ان کو پابند کیا ہوا تھا) ان کو دور کرتے ہیں (یعنی ایسے سخت احکام ان کی شریعت میں منسوخ ہو جاتے ہیں) سو جو لوگ اس نبی پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں اور اس نور کا اتباع کرتے ہیں جو ان کے ساتھ بھیجا گیا ہے (یعنی قرآن) ایسے لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں (کہ ابدی عذاب سے نجات پائیں گے)

ایک جماعت سے دوسری جماعت کے لئے ہے، نہ کہ کسی نبی سے اس سے پہلے کے رسول کی بابت۔ یہاں قاری کے پیش نظر آیت کی وہ غرض و غایت بھی رہے جو "الموضح" میں مذکور ہے۔ اس آیت کریمہ کا مفہوم ارشاد باری:

"وَالْمَلٰٓئِکَۃُ بَعْدَ ذٰلِکَ ظَھِیْرٌ" (تحریم : ۴)

"اور ان کے علاوہ فرشتے مددگار ہیں"۔

جیسا نہیں ہے، کیوں کہ اس کا تعلق سورہ تحریم میں مذکور واقعہ سے ہے نہ کہ متعلقات نبوت سے۔ اسی طرح

سورہ بقرہ کی اس آیت:

"اَفَكُلَّمَا جَآءَ كُمْ رَسُوْلٌ م بِمَا لَا تَهْوٰىٓ اَنْفُسُكُمْ "(سورہ بقرہ : ۸۷)

"جب کبھی بھی پیغمبر تمہارے پاس ایسے احکام لائے، جن کو تمہارا دل نہ چاہتا تھا"۔

میں خطاب بنی اسرائیل کو ہے، نہ کہ انبیاء کرام کو؛ لہذا دونوں جگہوں کو ایک نہ سمجھا جائے۔ پھر اس کے بعد ارشاد باری:

"فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ "(ال عمران: ۸۲)

"سو جو شخص (امتوں میں سے) روگردانی کرے گا (اس عہد سے) بعد اس کے (کہ انبیاء تک سے عہد لیا گیا اور امتیں تو کس شمار ہیں) تو ایسے ہی لوگ (پوری) نافرمانی کرنے والے (یعنی کافر) ہیں"۔

میں امتیں اور قومیں پیش نظر ہیں، جن کی طرف اس ارشاد سے اشارہ کیا گیا ہے:

"وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ "(آل عمران : ۸۱)

"اور لیا اس (مضمون) پر میرا عہد (اور حکم قبول کیا)"

یا پھر اس میں بعد میں پیش آنے والے واقعات کی خبر دی گئی ہے، کلام سابق کے مجموعہ میں یہ داخل نہیں، ملاحظہ فرمائیں "مستدرک حاکم: ۱/۳۷۴" اور کنز العمال: ۱/۲۳۸"۔ پھر ارشاد باری:

"فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ "(آل عمران : ۸۱)

"تو (اپنے اس اقرار پر) گواہ بھی رہنا اور میں (بھی) اس مضمون پر تمھارے ساتھ گواہوں میں سے (یعنی واقعہ کی اطلاع اور علم رکھنے والا) ہوں"

میں غالباً امت مرحومہ کی شہادت و گواہی مراد ہے، جیسا کہ "فتح الباری" میں ارشاد باری:

"وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا" (بقرہ : ۱۴۳)

"اور (اے متبعان محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اسی طرح ہم نے تم کو ایسی ہی ایک جماعت بنا دی ہے، جو (ہر پہلو سے) نہایت اعتدال پر ہے"۔

کی تفسیر میں ہے کہ ہماری طرف سے تمام انبیاء کرام کے احسانات کے بدلے کے طور پر وسط کہا گیا ہے۔ اور یہی مفہوم ہے:

"كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" (آل عمران : ۱۱)

"تم ہو بہتر سب امتوں سے جو بھیجی گئی عالم میں"۔

کا بھی۔ یہ بھی پیش نظر رہے کہ یہاں "للناس" کہا "فی الناس" اور "من الناس" نہیں کہا۔ بعض حضرات کی رائے ہے کہ اس آیت کریمہ:

"وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ" (آل عمران : ۱۴۰)

"اور (دوسری حکمت یہ ہے) تاکہ اللہ تعالی ایمان والوں کو (ظاہری طور پر) جان لیویں (کیوں کہ مصیبت کے وقت مخلص اور نیک کا امتحان ہوجاتا ہے) اور (تیسری حکمت یہ ہے کہ) تم میں سے بعض کو شہید بنانا تھا"۔

کا بھی یہی مفہوم ہے۔ واللہ اعلم۔ حقیقت شہادت کی تحقیق اصحاب طریقت علماء کے طرز پر "روح المعانی ۱/۲۴" میں ملاحظہ فرمائیں۔

امت محمدیہ بہت سے امور میں دیگر امتوں سے ممتاز ہے، ان میں سے ایک - جیسا کہ "مواہب" اور "کنز الاعمال: ۶/۱۰۸" میں یہ ہے۔

"انهم يكونون فى الموقف علىٰ كوم"

"کہ یہ لوگ موقف میں بلند مقام پر ہوں گے"۔

ابن عبدالسلام اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: "یہ شہادت اس امت محمدیہ کی خصوصیت ہے، جو کسی دوسری امت کو حاصل نہیں"۔

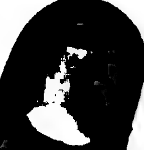
اسی بابت ابن قیم لکھتے ہیں:

"فهذه الامة اسبق الامم خروجاًمن الارض، و أسبقهم الى اعلى مكان فى الموقف، وإلى ظل العرش، وإلى فصل القضاء، والى الجواز على الصراط، والى دخول الجنة".

"یہ امت تمام امتوں سے پہلے زمین سے نکلے گی، سب سے پہلے موقف میں بلند جگہ کی طرف بڑھے گی، نیز سایۂ عرش میں آنے، حساب وکتاب کے چکانے، پل صراط سے گزرنے اور جنت میں داخل ہونے میں تمام امتوں سے آگے رہے گی"۔

گویا یہ لوگ دیگر تمام امتوں سے الگ اور ممتاز رہیں گے۔ اس سلسلے میں ابن قیم نے "کتاب الروح، ص: ۲۶۶" میں اچھی بحث کی ہے، اور حسن بن یحیی جرجانی سے "انبیاء کرام کی طرف میثاق کی نسبت کرنے کے حوالے سے اختصاص کی وضاحت اور اس امر کی بابت کہ یہ میثاق بہ واسطہ انبیاء ان کی امتوں سے بھی لیا گیا" کا قول نقل کیا ہے، وہاں ملاحظہ کریں۔ مناسب نہیں ہے کہ ارشاد باری:

"قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ" (آل عمران: ۸۱)



''فرمایا کہ: کیا تم نے اقرار کیا اور اس شرط پر میرا عہد قبول کیا؟''
کو زیر بحث مسئلہ میں پیش کیا جائے، کیونکہ ظاہر ہے کہ یہاں اقرار لسانی مراد ہے نہ کہ فقط اقرار آباء واجداد، ورنہ اس کے جواب میں ''قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا'' (بولے ہم نے اقرار کیا) کہنا، اس سے مربوط نہ ہوگا۔

الغرض بہ ظاہر اس آیت میں قولاً اقرار کا وقوع مراد ہے نہ کہ آباء واجداد کے اقرار کو بیٹوں اور پوتوں کے اقرار کے درجہ میں اتارنا (جس سے معلوم ہوا کہ یہ آیت زیر بحث مسئلہ سے متعلق نہیں ہے)۔ اسی طرح ارشاد باری:

''فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ'' (آل عمران: ۸۱)

''تو اب گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں''۔

کو بھی یہاں پیش نہیں کیا جا سکتا، غالباً اسی وجہ سے ''ء اقررتم به'' نہیں کہا گیا، اس لیے کہ مقصود ان سے زبانی اقرار کرانا ہے، قطع نظر اس سے کہ اس اقرار کا مصداق کیا ہے۔ پس جب اس آیت کا مقصد صریح اقرار لسانی ہے، تو امتوں کی جانب سے اس کا تحقق بھی بعید ہی ہے، ہاں انبیاء کرام کی طرف سے تحقق واضح ہے۔ فاعلمہ

خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور خانۂ کعبہ کے آپ کا قبلہ ہونے کا علم: حضرت آدم سے لے کر حضرت عیسیٰؑ کے زمانے تک کے تمام انبیاء کرام کو تھا، دیکھئے ''فتح الباری'' باب بنیان الکعبة، ۶/ ۲۸۵-۲۹۱''۔ نیز حضرت ہود اور صالحؑ کا وہاں مقیم ہونا، حضرت ابراہیمؑ کا وہاں کے لیے دعا کرنا اور حضرت موسیٰ وعیسیٰ کی بشارت، کسی پر مخفی نہیں ہے۔

البتہ اس ذیل میں حضرت نوحؑ کا تذکرہ نہیں ملا، ہاں ''درمنثور: ۱/ ۱۲۵'' میں ہے کہ تمام انبیاء کرام کو خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت حاصل تھی (ظاہر ہے کہ اس میں حضرت نوح بھی داخل ہیں) خواہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبلہ کا قبلۂ اعظم ہونے اور آپ کی شریعت کا شریعت کبریٰ ہونے کا علم، سب کو رہا ہو یا نہ رہا ہو۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے:

''جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ'' (مائدہ: ۹۷)

''خدا تعالیٰ نے کعبہ کو جو کہ ادب کا مکان ہے، لوگوں (کی مصلحتوں) کے قائم رہنے کا سبب قرار دیا ہے''۔

اسی وجہ سے: ''ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ'' (آل عمران: ۸۱) کا عنوان قائم کیا گیا۔

بعض حضرات انبیاء کو اس بات کا علم ہو گیا تھا، تاہم تمام انبیاء کرام نے اس کی تصدیق کی ہے اور ارشاد باری:

''وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا'' (بقرہ: ۱۲۵)

''اور جب مقرر کیا ہم نے خانۂ کعبہ کو اجتماع کی جگہ لوگوں کے واسطے اور جگہ امن کی''۔

کا مطلب یہ ہے کہ خانۂ کعبہ دائرۃ الامور کا مرکز ہے۔ واللہ اعلم۔ دیکھیے ''آل عمران کی آیت (۹۶) ''إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ'' کے تحت تفسیر ''در منثور''۔

نیز ارشادِ باری: ''ثُمَّ جَآءَ كُمْ'' یہ بتا رہا ہے کہ انبیاء کرام سے جو عہد ہے وہ یہ ہے کہ محمد ﷺ کی آمد خواہ تمہاری شریعتوں کے استحکام کے بعد ہی ہو، تاہم ضروری ہے کہ تم ان کی مدد کرو، چناں چہ بعض حضرات نے قولاً (آپ کی آمد کی بشارت دیکر اور امت کو اتباع کا حکم دے کر) مدد فرمائی اور بعض حضرات نے فعلاً، (جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نزول کے بعد شریعت محمدیہ کو اس زمانے میں جب کہ کمزور ہوگئی ہوگی، مستحکم فرمائیں گے) اسی وجہ سے یہ تعبیر اختیار فرمائی اور محض آپ ﷺ کی آمد کے علم تک معاملہ کو محدود نہیں رکھا، چناں چہ تمام انبیاء کرام اپنی شریعتوں پر اس علم وادراک کے ساتھ عمل پیرا تھے کہ ایک اور بڑی شریعت آنے والی ہے، اور ارشادِ باری: ''لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ'' تمام شریعتوں کو ایک کرنے کے لیے ہے، جیسا کہ ایک دوسری جگہ ارشادِ باری ہے:

إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ '' (آل عمران : ۱۹)

''بلاشبہ دین (حق اور مقبول) اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہے''۔

علاوہ ازیں متقدم نبی کا حق پر قائم ودائم اور گامزن رہتے ہوئے متأخر نبی کی اطاعت وفرماں برداری چونکہ نادر الوقوع اور نفس پر شاق ودشوار تھی، اس لیے ''ثُمَّ جَآءَ كُمْ'' یعنی آنے والا نبی کسے باشد، خواہ تم کو ابھی اس کا علم نہ ہو، بلکہ آنے کے بعد ہو اور خواہ تمہارے بعض احکام کا ناسخ ہی ہو، تب بھی تم پر اس کی تصدیق اور نصرت لازم ہے۔ انبیاء کرام کے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے تذکرہ کی بابت، دیکھیے ''مواہب: ۸/۹-۳۴۹، کنز العمال: ۶/۱۰۳-۱۰۴-۱۱۴'' اور ''در منثور: ۳/۱۱۷-۱۲۳''۔

سورہ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے بہ صیغۂ غائب ''وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ'' فرمایا، جب کہ سورہ احزاب (آیت: ۷) میں ''وَإِذْ أَخَذْنَا'' بہ صیغۂ متکلم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی جگہ اہل کتاب کو میثاق کی یاد دہانی کرانی مقصود تھی، جس کا علم انہیں پہلے سے تھا، پہلی مرتبہ خبر دینا مقصود نہ تھا، اس لیے بہ صیغۂ غائب میثاق کا تذکرہ کیا اور سورہ احزاب میں خطاب نبی اکرم ﷺ سے ہے، اس لیے بہ صیغہ تکلم بالمشافہ آپ ﷺ سے گفتگو فرمائی گئی۔ پھر چونکہ انبیاء کرام سے میثاق لینے کا اصل مقصد، ان کی امتوں کو تعلیم دینا تھا، اس لیے انبیاء کرام سے محض زبانی اقرار وگفتگو پر اکتفاء کیا گیا، کیونکہ عمل کا اصل تعلق امتوں سے ہے، اسی وجہ سے اقرارِ میثاق کا مطالبہ کیا گیا، ورنہ مقصود اس میثاق پر عمل کرنا ہے، نہ کہ اقرار محض، لیکن ''قَالُوْا: بَلٰى'' محض اقرارِ میثاق نہیں ہے، بلکہ دراصل ان سے ایک سوال کیا گیا تھا، جس کے جواب میں لازمی طور پر انہیں یہ الفاظ

کہنے پڑے تھے۔فاعلمہ۔جیسا کہ آیت کریمہ:

"خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْاط قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا" (بقرہ:۹۳)

"پکڑو جو ہم نے تم کو دیا زور سے اور سنو، بولے: سنا ہم نے اور نہ مانا"۔

میں ان کو ایک حکم دیا گیا جس کے جواب میں "سَمِعْنَا" کہنا پڑا غالباً ارشاد باری:

"وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ٥" (بقرہ:۸۴)

"اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے تم سے یہ قول وقرار (بھی) لیا کہ (خانہ جنگی کر کے) باہم خون ریزی مت کرنا اور ایک دوسرے کو ترک وطن مت کرنا، پھر (ہمارے اس اقرار لینے پر) تم نے اقرار بھی کر لیا اور اقرار بھی (ضمناً نہیں، بلکہ) ایسا جیسے تم (اس پر) شہادت (بھی) دیتے ہو"۔

میں بنی اسرائیل سے زبانی طور پر بھی اقرار ہوا، اگر چہ اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے کہ ان سے اقرار کا مطالبہ اور سوال کیا گیا تھا۔غالباً "وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ" (ال عمران:۸۱) سے اسی وقت کا اقرار مراد ہے؛ لہٰذا یہاں یہ اعتراض وارد نہ ہوگا کہ مناسب تو "تاخذون" (بہ صیغۂ استقبال) تھا، کیونکہ پہلی مرتبہ میثاق امتوں سے نہیں لیا گیا تھا۔ ابن اسحاق نے، ج:۱، ص:۱۵۱، پر "وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ" (میں "اِصْرِیْ" کی تفسیر کرتے ہوئے) فرماتے ہیں: "ای ثقل ماحملتکم من عھدی" (یعنی جس عہد وپیمان سے میں نے تمھیں گراں بار کیا، اس کا بوجھ)۔اس تفسیر کے مطابق انبیاء کرام سے اس بات کا عہد لیا گیا کہ وہ اس میثاق کو اپنے ماننے والوں اور تصدیق کرنے والوں تک پہنچائیں، لہٰذا امتیں بھی اس میثاق سے مستثنیٰ نہ رہیں، ہاں جن سے میثاق لیا گیا وہ دراصل انبیاء کرام ہی تھے اور اس صورت میں صیغۂ ماضی ہی مناسب ہے۔اس پر یہ اشکال وارد نہیں ہوتا کہ ایک ہی آیت میں اخذِ میثاق اور اس کے مصداق کے مفہوم میں انتشار لازم آرہا ہے۔کیونکہ پہلے کا تعلق "میثاق" سے ہے اور دوسرے کا "اصر" سے جو میثاق کا نتیجہ ہے پس دونوں الگ الگ ہیں (نہ کہ ایک کہ انتشار لازم آئے) غالباً حج خانۂ کعبہ انبیاء کرام کی خصوصیت ہے، اس امت مرحومہ کی طرح ان کی امتیں اس کی مکلف نہ تھیں [ملاحظہ فرمایئے "درمنثور" سورہ اعراف، عن وہب:۱۴۴/۳" اور "روح المعانی:۱۳۸/۳"] پس یہ ایمان جب ایسا تھا، جیسا کہ نظر، اعتبار اور علم میں اشیاء ہوتی ہیں، تو اس کے بعض آثار برزخ ہی میں ظاہر ہو گئے۔

اگر "وَلَوْ كَانَ مُوْسٰی حَیًّا..." جیسی حدیثیں نہ ہوتیں تو کوئی کہہ سکتا تھا کہ ارشاد باری "ثُمَّ جَآءَ

گم ''میں رسول کی آمد عام ہے، خواہ اس کے عہد میں ہو، یا اس کے بعد۔ اسی طرح اس مضمون سے ارشاد باری:

''اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ م بِمَالَاتَهْوٰى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ'' (البقرہ:۸۷)

''جب کبھی (بھی) کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسے احکام لائے جن کو تمہارا دل نہ چاہتا تھا جب ہی) تم نے (ان پیغمبروں کی اطاعت سے) تکبر کرنا شروع کردیا''۔

کا بھی مفہوم میل نہیں کھاتا۔

آیت کریمہ: ''مُصَدِّقٌ لِّمَامَعَهُمْ'' (بقرہ:۱۰۱) (جس کا تعلق حضور ﷺ سے ہے) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قول: ''وَمُصَدِّقًا لِّمَابَيْنَ يَدَىَّ مِنَ التَّوْرٰةِ'' (آل عمران:۵۰) سے مختلف ہے، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے متعین کرتے ہوئے صرف تورات کا ذکر کیا ہے، جب کہ یہ ارشاد عام ہے، اس لیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تورات کی تصریح کی ضرورت تھی اور ہمارے نبی ﷺ کو نہ تھی۔ ملاحظہ فرمائیں ''سورۂ اعراف:۱۵۷'' کی یہ آیت: ''وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِىْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ'' یہاں اکثر مفسرین نے ابن جریر کے حوالے سے ''اصر'' کی تفسیر ''عہد'' سے کی ہے، جیسا کہ سورہ بقرہ کے آخر میں اور آل عمران میں ہے، جو اس بات کا مؤید ہے، کہ اس ''عہد'' کا تعلق امتوں سے ہے، غالبًا یہی بات ''کنز العمال:۶/۱۳، مستدرک حاکم:۳/۴۱۵'' اور ''روح المعانی:۸/۸۱'' میں بھی ہے۔

''وَاِذْاَخَذَاللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ'' (آل عمران:۸۱) میں الف لام برائے استغراق ہے اور ظاہر ہے کہ جو شخص ان کے پاس آئے گا وہ ان کے بعد ہی آئے گا، جیسا کہ کہا جاتا ہے: ''جئتهم'' (میں ان کے پاس آیا یعنی ان کے بعد آیا) اور: ''ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَامَعَكُمْ'' (آل عمران:۸۱) میں، معین رسول مراد ہے، نہ کہ کوئی بھی رسول اور ان انبیاء کرام کی کتابوں اور ان کی تعلیمات کی تصدیق ہمارے رسول ﷺ سے ثابت ہے، جیسا کہ، ص:۸ر پر ہے:

''وَاٰمِنُوْا بِمَا اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَامَعَكُمْ وَلَاتَكُوْنُوْا اَوَّلَ كَافِرٍم بِهٖ'' (بقرہ:۴۱)

''اور ایمان لے آؤ اس کتاب پر جو میں نے نازل کی ہے (یعنی قرآن پر) ایسی حالت میں کہ وہ سچ بتلانے والی ہے، اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہے (یعنی تورات) اور مت بنو تم پہلے انکار کرنے والے اس قرآن کے''۔

اور صفحہ:۱۴ر پر ہے:

''وَلَمَّاجَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ (بقرہ:۸۹)

''اور جب ان کو (ایک) ایسی کتاب پہنچی (یعنی قرآن مجید) جو من جانب اللہ ہے (اور) اس (کتاب) کی

(بھی) تصدیق کرنے والی ہے، جو (پہلے سے) ان کے پاس ہے"۔

نہ کہ ارشاد باری:

"اَفَکُلَّمَا جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ م بِمَالَاتَھْوٰیٓ اَنْفُسُکُمُ اسْتَکْبَرْتُمْ" (بقرہ:۸۷)

"(اور) جب کبھی (بھی) کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسے احکام لائے جن کو تمہارا دل نہ چاہتا تھا، (جب ہی) تم نے (ان پیغمبروں کی اطاعت سے) تکبر کرنا شروع کر دیا"۔

کے مانند بلکہ جیسا کہ ص:۱۴/ پر ہے:

"وَھُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقاً لِّمَامَعَھُمْ" (البقرہ:۹۱)

"حالانکہ وہ کتاب سچی ہے جو تصدیق کرتی ہے اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے"۔

صفحہ:۱۵/ پر:

"مُصَدِّقاً لِّمَابَیْنَ یَدَیْہِ" (البقرہ:۹۷)

"تصدیق کر رہا ہے اپنے سے قبل والی (آسمانی) کتابوں کی"۔

اور:

"وَلَمَّاجَاءَ ھُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَھُمْ" (البقرہ:۱۰۱)

"اور جب پہنچا ان کے پاس رسول اللہ کی طرف سے تصدیق کرنے والا اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے"۔

میں ہے۔ یہی نظم آیت کا اکثر و بیشتر حصہ ہے۔ اور جیسا کہ ایک قرأت کے مطابق، صفحہ:۴۸/ پر "وَاِذْاَخَذَاللّٰہُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ" ہے، چوں کہ نبوت حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں منحصر تھی، اس لیے اس سے دونوں سلسلوں کو متحد کرنا مقصود تھا۔ اور اگر "ثُمَّ جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ" میں غیر متعین رسول مراد ہوتا، تو مناسب تھا کہ یہ کہا جاتا: "واذاخذاللہ میثاق النبیین ان یصدق بعضھم بعضاً"۔

الحاصل: نظم قرآنی نیز سیاق و سباق سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں معین رسول مراد ہے اور وہ ہمارے رسول ﷺ ہیں، جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے جو اس سے پہلے ہے:

"اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاِبْرٰھِیْمَ لَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْہُ وَھٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" (آل عمران ۶۸)

"بلاشبہ سب آدمیوں میں زیادہ خصوصیت رکھنے والے (حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ البتہ وہ لوگ تھے جنہوں نے (ان کے وقت میں) ان کا اتباع کیا تھا اور یہ نبی (محمد ﷺ) ہیں اور یہ ایمان والے (جو نبی ﷺ کی امت ہیں)"

اور ان کے قول:

"اَنْ یُّؤْتٰٓی اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِیْتُمْ" (آل عمران: ۷۳)

"اے اہل کتاب! تم) ایسی باتیں اس لیے کرتے ہو کہ کسی اور کو بھی ایسی چیز مل رہی ہے، جیسی تم کو ملی تھی (یعنی کتاب اور دین سماوی)"

میں ہے، نیز جیسا کہ اس ارشاد باری میں ہے جو اس کے بعد آرہا ہے:

"کَیْفَ یَهْدِ اللّٰهُ قَوْمًا کَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ" (ال عمران: ۸۶)

"اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو کیسے ہدایت کریں گے جو کافر ہو گئے بعد ایمان لانے کے (دل سے) اور بعد اپنے اس اقرار کے (زبان سے) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعویٰ رسالت میں) سچے ہیں"

اور:

"وَمِیْثَاقَهُ الَّذِیْ وَاثَقَکُمْ بِهٖ" (مائدہ: ۷)

"اور اس کے (اللہ کے) اس عہد کو بھی (یاد کرو) جس کا تم سے معاہدہ کیا ہے"۔

دیکھئے: "کتاب عہد، ص: ۱۰۷-۱۰۸-۴-۷۔ اور: ۱۷"۔

بعد ازاں ارشاد باری ہے:

"وَفِیْکُمْ رَسُوْلُهٗ" (آل عمران: ۱۰۱)

"اور تم میں اس کا رسول ہے"۔

تفسیر "موضح القرآن" میں اس آیت کی جو تشریح کی گئی ہے، وہ اس سے زیادہ واضح ہے جو: ص: ۸/ر کے حاشیے پر مذکور ہے اور اس سے بھی جو، ص: ۵۸/ر پر ہے، جب کہ ص: ۱۰۸/ر میں جس کا ذکر ہے وہ بالکل آخر میں لیا گیا عہد ہے، جیسا کہ "معالمات" "تحقیق ثانی" کے ص: ۴۸/ر سے، ص: ۱۱۹/ر تک مذکور ہے اور "غایہ" ص: ۱۱۱/ر پر ہے کہ یہ بات "سفر تثنیہ" آیت: ۲۸/ر میں ہے۔ جب کہ پہلی آیت کو انہوں نے "سفر تثنیہ" کی آیت: ۱۸/ر پر محمول کیا ہے۔ نیز سعید بن حسن اسکندرانی کی کتاب "مسالک النظر" میں بھی ان دونوں عہدوں کی صراحت ہے۔ "سفر تثنیہ" آیت: ۳۳/ر میں جس کا تذکرہ ہے، اس سے مراد وہ عہد ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے وقت لیا گیا۔

"اللہ رب العزت نے "ارسل الیہم" کے بجائے:

"وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ" (البقرہ: ۱۰۱)

"اور جب پہنچا ان کے پاس رسول اللہ کی طرف سے تصدیق کرنے والا اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے"۔

فرمایا، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ آپ ﷺ کی رسالت پر پہلے ہی سے ایمان رکھتے تھے (بایں طور کہ ان کی کتابوں میں آپ کی آمد کی بشارت تھی اور وہ اسے مانتے بھی تھے اور منتظر بھی تھے، اگرچہ ظہور کے بعد منکر ہوگئے) اس لیے یہی تعبیر مناسب تھی جو اللہ تعالیٰ نے اختیار فرمائی اور چونکہ وہ لوگ آپ ﷺ کی آمد سے پہلے مومن تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: آنے والا رسول ان کی کتاب اور تعلیمات کی تصدیق کرنے والا ہوگا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ آیت میثاق، ص:۱۶۹ ار کی آیت سے متحد ہو، بلکہ ضروری یہ ہے کہ ہر آیت کو اس کے موضوع کے تحت معمول بہا بنایا جائے اور اسے اس کو پورا حق دیا جائے، واضح رہے کہ حافظ ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر میں جو کچھ بیان کیا ہے، اس سے زیادہ بہتر وہ ہے، جسے انہوں نے سورہ ''صف'' اور ''الانشراح'' میں بیان کیا ہے اور جسے ابن اسحاق نے ''سیرت'' میں اختیار کیا ہے۔ دیکھیے: ج:۲، ص:۳۹۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ خاتم الانبیاء ﷺ کی ملاقات تو ان انبیاء کرام میں سے کسی سے بھی نہیں ہوئی، فقط حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زمانہ پایا، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں، برخلاف دیگر انبیاء کے، تو پھر آیت کی یہ تفسیر فرضی کلام بن جائے گی، جس سے کلام اللہ کو محفوظ رکھنا ضروری ہے، اس لیے آیت کی مراد یہ ہے کہ انبیاء کرام نے اپنی امتوں کو اس بات کی وصیت کی تھی کہ جب خاتم الانبیاء ﷺ تشریف لائیں تو ان پر ایمان لانا۔ واضح رہے کہ خاتم الانبیاء ﷺ تشریف لا چکے۔ نیز ایمان اگرچہ بعد میں آنے والے پر لانا ممکن ہے، لیکن نصرت کا تو تصور بھی نہیں ہے، جیسا کہ ہمارے اوپر بھی ضروری ہے کہ ہم تمام سابقہ انبیاء کرام پر ایمان لائیں اور کسی بھی رسول میں کوئی فرق نہ کریں۔ ابن صیاد کے جواب "اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ" کے تحت آیا ہے کہ نصرت کو اگر متاخر کے لیے عام کر دیا جائے تو یہ اس کو بھی شامل ہو جائے گا، جو اس متاخر سے بھی متاخر ہوگا۔

بعض لوگوں نے اس اعتراض کا یہ جواب دیا ہے کہ: مسجد اقصی میں انبیاء کرام کا آپ ﷺ کے ساتھ اجتماع اور ملاقات ہو چکی ہے اور ہو سکتا ہے یہ عہد اسی وقت لیا گیا ہو۔ یہ اجتماع مسئلہ ختم نبوت کے حوالے سے چنداں مضر نہیں، ہاں حضور ﷺ کے نبی الانبیاء ہونے میں مضر ہو سکتا ہے۔ تو اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ: پورے کے پورے عالم کی مثال ایک شخص واحد کی ہے، نہ کہ ہر ہر زمانے کے لحاظ سے الگ الگ عالم کی، بلکہ پورے عالم کا مجموعہ ایک شخص واحد ہے، جس کا ایک مبدأ ہے اور ایک غایت اور رسول اللہ ﷺ قوس نزولی میں مبدأ اور قوس عروجی میں غایت تھے اور غایت کا تاخر عالم زمانی میں، تاخر زمانی ہی سے ظاہر ہوگا۔

الحاصل: رسول اللہ ﷺ کی حیثیت امام اکبر کی ہے، جب کہ دیگر انبیاء کرام کی حاکموں اور گورنروں کی۔

تنبیہ

احوال مسیح اور ترتیب نظم قرآنی

واضح رہے کہ اللہ رب العزت نے پورے قرآن کریم میں صرف دو جگہ حضرت عیسیٰ کے حوالے سے لفظ ''موت'' کا ذکر صراحتاً کیا ہے، ایک تو اس آیت میں:

''وَاِنْ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ'' (نساء: ۱۵۹.)

''اور جتنے فرقے ہیں اہل کتاب کے سو عیسیٰ پر ایمان لاویں گے اس کی موت سے پہلے''۔

دوسرے اس آیت میں:

''وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا'' (مریم: ۳۳)

''سلام ہے جس روز میں پیدا ہوا اور جس روز مروں گا اور جس روز میں زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا''۔

اور ''توفی'' کا لفظ ان دو جگہوں میں استعمال کیا ہے: ''اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ'' (آل عمران: ۵۵) اور ''فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ'' (مائدہ: ۱۱۷) جس سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ ''توفی'' سے مراد پورا پورا اپنے حضور میں لے لینا ہے، جس کا آغاز، رفع کے وقت، رفع سے پہلے، بہ طور مقدمہ ہوا اور بالآخر آپ علیہ السلام کی موت پر منتہی ہوگا۔

چناں چہ سورہ ''آل عمران'' میں: پہلے بالترتیب ''توفی'' کو ذکر کیا، اس کے بعد اسے جو اس سے ملا ہے، پھر جو اس سے ملا ہے، اور آخر میں فرمایا ''وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ'' (آل عمران: ۵۵) پس یہاں ان امور کو ذکر کیا جو قیامت سے پہلے آپ علیہ السلام کو پیش آئیں گے اور اسی سے یہ اشارہ بھی فرما دیا کہ آپ آسمان سے اتریں گے۔ جیسا کہ بیان ہو چکا۔ پھر ''سورہ نساء'' میں [جو سورہ ''آل عمران'' کے بعد متصلاً ہے] آپ علیہ السلام کی موت تک کے احوال کو بیان فرمایا، اور جب پیش آنے والے احوال بیان کرتے کرتے موت تک پہنچے تو کھلے لفظوں میں بہ صراحت موت کا ذکر کر دیا (چناں چہ ارشاد ہوا: ''وَاِنْ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ'' (نساء: ۱۵۹) جس سے معلوم ہوا کہ اس سے پہلے موت کا وقوع نہیں ہوا ہے۔

پھر سورہ ''مائدہ'' میں جو سورہ ''نساء'' کے بعد ہے، ان حالات و واقعات کو بیان فرمایا، جو قیامت کے دن حضرت عیسیٰ کو پیش آئیں گے اور اس میں بہ صیغہ ماضی ''فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ'' (مائدہ: ۱۱۷) فرمایا اس لیے کہ اس

وقت یعنی روز قیامت آپ کی توفی ہو چکی ہوگی۔ برخلاف ''آل عمران'' کے کہ جن پیش آنے والے واقعات کا تذکرہ اس میں ہے، اس وقت توفی نہیں ہوئی تھی، اس لیے بہ صیغہ مستقبل ''اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ'' فرمایا۔

اس طرح اللہ رب العزت نے حضرت عیسیٰؑ کے حالات وواقعات کو تین سورتوں میں تقسیم کر کے مرتب انداز میں بیان فرمایا اور یہ ترتیب فقط ایک ہی سورتوں کی عبارتوں میں نہیں ہے بلکہ تینوں سورتوں میں ہر سورت کے مفردات کے اعتبار سے بھی ہے اور مجموعی اعتبار سے بھی یعنی ہر ہر کلمہ، ہر ہر آیت، اور ہر ہر سورت میں ترتیب ہے، اس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مکمل احوال انتہائی مرتب انداز میں بیان ہوئے۔ سورہ ''نساء'' میں، سورہ ''آل عمران'' سے کچھ زیادہ مجمل انداز میں قیامت کے دن اپنی قوم کے خلاف حضرت عیسیٰؑ کی شہادت کے تذکرہ تک پہنچے ہیں، پھر سورۂ ''مائدہ'' میں اس کی تفصیل فرمائی --- **فسبحان العلیم الحکیم الذی یسمع دبیب النملة السوداء علی الصخرة الصماء فی اللیلة الظلماء.**

''آل عمران'' کے شروع میں حضرت عیسیٰؑ کے احوال کے بیان کا آغاز فرمایا، پھر بیچ میں، سورہ ''نساء'' کے آخر میں، آخری حالات کو بیان کیا۔ اس کے بعد سورہ ''مائدہ'' کے آخر میں آخر کے جو احوال رہ گئے تھے، انہیں بیان کیا۔

پھر فرمایا:

''وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا، (نساء : ۱۵۹)

''اور قیامت کے روز وہ (یعنی عیسیٰؑ) ان پر گواہی دیں گے''۔

جسے ''آل عمران'' میں بیان نہیں کیا تھا، وہاں تو فقط قیامت تک کے احوال بیان کئے تھے، جس میں حضرت عیسیٰؑ کے نزول من السماء کا معاملہ بھی شامل تھا اور یہاں خاص قیامت کے دن کے مزید حالات کا تذکرہ فرمایا۔ نیز دونوں میں فرق کرنے کے لیے ''آل عمران'' میں لفظ ''الی'' لائے اور یہاں ترک کر دیا۔ جب کہ سورہ ''مائدہ'' میں جہاں آپ علیہ السلام کے آخری احوال کا تذکرہ ہے، احوال قیامت سے متعلق مزید تفصیل بیان کی۔

شہادت مسیح

واضح رہے کہ مذکورہ بالا آیت میں جس شہادت کا تذکرہ ہے اس سے مراد، نزول کے بعد نصاریٰ کے آپ علیہ السلام پر ایمان لانے کی گواہی ہے، اسی وجہ سے مؤخر کیا، فقط رفع سے پہلے کے حالات کی گواہی مراد نہیں اور یہی شہادت سورہ ''مائدہ'' کی اس آیت میں بھی مراد ہے:

''وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ'' (مائدہ:۱۱۷)

''میں ان (کی حالت) پر مطلع رہا جب تک ان میں (موجود) رہا''۔

یعنی اس بات کی گواہی کہ وہ میثاق جو انبیاء کرام کی طرف سے ان کی امتوں کے متعلق ہوا تھا، ان امتوں نے

دنیا میں اس کا کیا جواب دیا اور اس عہد کو کتنا پورا کیا، اسی بابت اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے:

"یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَیَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ" (مائدہ ۱۰۹)

"جس دن اللہ جمع کرے گا سب پیغمبروں کو، پھر کہے گا: تم کو کیا جواب ملا تھا"۔

دونوں جگہوں میں آپ علیہ السلام کی یہ شہادت شہادت عامہ ہے، صرف آپ کے معبود بنائے جانے ہی سے متعلق نہیں۔ اس بات کو خوب ذہن نشین رکھیے اور آیتوں کی ترتیب کا بھی پورا پورا خیال رکھیے، جس طرح کہ کلمات ومفردات کی ترتیب کا حق ہے؛ کیونکہ آیت کے ہر ہر کلمہ کی ترتیب اس طرح ملحوظ ہے، جس طرح سورت کی ہر ہر آیت اور قرآن کریم کی ہر ہر سورت کی ترتیب پیش نظر ہے۔ **فسبحان من أعجز العالمین بآیات قرآنه وفرقانه، انه حکیم علیم**۔

آپ کے دل میں یہ خیال نہیں کھٹکنا چاہئے کہ اگر مراد نزول مسیح کے بعد اہل ایمان کی شہادت ہے، تو نظم "وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَكُوْنُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا" کے بجائے "یَكُوْنُ لَهُمْ شَهِیْدًا" ہونی چاہئے۔ اسی وجہ سے بعض نے یہ سمجھ لیا کہ یہاں تہدید مقصود ہے، لیکن پھر اشکال پیدا ہوتا ہے آیت کریمہ:

"وَیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ شَهِیْدًا" (بقرہ: ۱۴۳)

"اور ہو رسول تم پر گواہی دینے والا"۔

سے (کہ کیا یہاں بھی تہدید ہی مراد ہے، لفظ "علی" کی وجہ سے) حالانکہ جن لوگوں کا اس آیت سے پہلے تذکرہ ہے وہ صلحاء اور نیک لوگ ہیں۔ چناں چہ ارشاد باری ہے:

"وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ" (البقرہ: ۱۴۳)

"اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو امت معتدل تا کہ ہو تم گواہ لوگوں پر"۔

زجاج فرماتے ہیں [کمافی "شرح قاموس"] کہ: "وَیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ شَهِیْدًا" کا مطلب یہ ہے کہ تم نے جو امتوں کی شہادت دی، رسول اس کی تصدیق وتوثیق کریں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "شهید" کا لفظ رقیب ونگراں کے معنی کو متضمن ہے، اس لیے اس کا صلہ "علی" لایا گیا اور "شاهد" ایسے شخص کو کہتے ہیں، جسے واقعہ کا علم اتفاقی طور پر حاصل ہوا ہو، جب کہ اپنی امتوں کی بابت انبیاء کرام کی شہادت کی یہ نوعیت نہیں ہے، اس لیے کہ ان کو تو بھیجا ہی اس لیے جاتا ہے کہ وہ امت کے احوال کی نگرانی اور دیکھ بھال کریں۔ اسی وجہ سے یہاں لفظ "شاهد" اسم فاعل کے بجائے "شهید" صیغۂ صفت لائے، جیسا کہ علماء نے "سامع" اسم فاعل اور "سمیع" صیغۂ صفت میں فرق کیا ہے، چناں چہ "هذا سامع کلامک" کہتے ہیں، نہ "سمیع کلامک"۔

اس کی دوسری توجیہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ ان کی جنس پر گواہی دیں گے، جس کے دو فرد ہیں، ہلاک ہونے والے اور نجات پانے والے۔ اور تیسری توجیہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی گواہی، اپنی موت سے پہلے، ان کے صاحب ایمان ہونے، یا نہ ہونے کی بابت ہوگی؛ کیونکہ نزول مسیح کے بعد بھی بعض اہل کتاب ایمان نہیں لائیں گے، جس کے نتیجے میں قتل کیے جائیں گے، اس لیے مقام ''علیٰ'' کا ہی رہا، نہ کہ ''لام'' کا۔ فافھمہ۔ ملاحظہ فرمایئے ارشاد باری:

''اِنَّا اَرْسَلْنٰکَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ط لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ ط وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا o'' (فتح: ۸۔۹)

''ہم نے آپ کو گواہی دینے والا اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا کر کے بھیجا ہے؛ تاکہ تم لوگ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس (کے دین) کی مدد کرو اور اس کی تعظیم کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح میں لگے رہو''۔

یہاں بوقت ارسال آپ کو ''شاہد'' کہا گیا اسی وجہ سے ''ارسل'' حال محققہ کی طرح ہے، نہ کہ حال مقدرہ کی طرح۔ قاری بھی اس جگہ لفظ ''شاہد'' کے اختیار کرنے کے نکتے کا اظہار کر سکتا ہے، کیونکہ یہ نکتہ ان اعتبارات میں سے ہے، جو مقتضائے حال کے مناسب ہوتے ہیں۔

الحاصل: بوقت ارسال آپ کو ''شاہد'' کے ساتھ موصوف کیا گیا اور استقرار کے بعد ''شہید'' کے ساتھ۔ یہ فرق اس بات کو بھی بتا رہا ہے کہ ایمان مذکورہ ایسے وقت ہوگا، کہ جس وقت وہ مقبول ہے اور وہ حضرت عیسیٰؑ کے نزول کا زمانہ ہے، جہاں تک حالت غرغرہ کے ایمان کی بات ہے، تو جب وہ مقبول ہی نہیں ہے، تو کس چیز کی شہادت لی جائے گی؟ کیا ایسی چیز پر جو وہ عالم تکلیف کے بعد کریں گے، اور انبیاء کرام کی ذمہ داریوں سے باہر ہو جائیں گے؟ ظاہر ہے کہ قائل مجبور ہے کہ اسے رفع سے پہلے کے حالات پر محمول کرے، جسے اللہ رب العزت نے رفع کے بعد ذکر کیا ہے اور یہی اس کا مقام بھی ہے، بشرطیکہ ایک ایک آیت کی ترتیب کا اس طرح لحاظ رکھا جائے، جیسا کہ ایک ایک کلمہ کی ترتیب ہوتی ہے۔ فسبحان من وضع الاشیاء فی مواضعھا۔

نیز اس وقت یہ شہادت ان لوگوں کو شامل نہ ہوگی، جو رفع کے بعد آئیں گے، جب کہ ایمان بہ حالت غرغرہ ان میں مانا گیا ہے، الغرض کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جو اس بات پر آمادہ کرے کہ قرآن مقدس کو ایسے محمل پر محمول کیا جائے، جس میں پیہم تاویلات کرنی پڑے، بلکہ ایسے محمل پر محمول کیا جائیگا، جس کے زیادہ فصیح و بلیغ، پر اثر اور مقصد سے ہم آہنگ کوئی دوسرا محمل نہیں ہو سکتا۔

فارعہ سقیا لک ورعیا



قادیانی تحریفات کے نمونے

یہاں ان تحریفات کو بیان کیا جارہا ہے، جو اس بد بخت قادیانی اور اس کے چیلوں خصوصاً اس کے لاہوری دوست نے آیت قرآنیہ میں کیں ہیں اور اب بھی لگے ہیں، گویا ان میں سے ہر ایک الگ الگ وادیوں کی گہرائیوں میں بھٹک رہا ہے؛ جب کہ ہر نئی تحریف کی بابت وہ اس بات کو خوب سمجھتے ہیں کہ لاجواب کردیئے جائیں گے، اس لیے ہر سال ایک نئی تحریف کرتے ہیں۔ میرے بعض شاگردوں نے جب ان میں کے بڑے مجرمین کے بعض الحادات کو جمع کیا تو نوالحادا ایسے نکلے جو فقط خواہشات نفسانی پر مبنی تھے۔ قاتلهم الله ما اكفرهم.

آیت کریمہ: ''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ'' اور قادیانی تحریف

اس کمینے کے نزدیک آیت کریمہ: ''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ'' (نساء:۱۵۹) کا مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب کا ہر فرد ان باتوں پر ایمان رکھتا ہے، جو ہم نے بیان کیں، قبل اس کے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کی طبعی موت پر ایمان لائے اور وہ بات جو میں نے بیان کی، یہ ہے کہ قتل ان کے نزدیک ثابت و محقق نہیں ہے، بلکہ وہ محض اتباع ظن ہے۔ پس ان کا ایمان اس بات پر ہے کہ قتل عیسیٰ کا دعوی ظن و گمان ہے، محقق و ثابت نہیں ہے۔

مزید یہ بد بخت اس بات کو بھی کہتا ہے کہ: یہ آیت رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اہل کتاب کے مقابلہ میں بہ طور مباہلہ و چیلنج کے ہے، بایں طور کہ وہ قتل عیسیٰ کی بابت شک کرنے والے ہیں، اگر وہ شک کرنے والے نہ ہوتے، تو رسول اللہ ﷺ سے ضرور معارضہ کرتے اور جب خاموش رہے تو معلوم ہوا کہ واقعۃً وہ شک میں تھے، گویا اس آیت کے ذریعہ انہیں اس بات کا چیلنج دیا گیا کہ قتل عیسیٰ کی بابت تمہیں یقین نہیں بلکہ شک ہے اور اس چیلنج کا وہ کوئی جواب نہ دے سکے، بلکہ خاموش ہو گئے۔

اس بدنصیب نے مضارع مؤکد کو جو باجماع اہل لغت استقبال کے لیے ہے، حال کے لیے قرار دیا، فعل جو حدوث کے لیے ہے، اسم کے معنی میں ٹھہرایا اور ارشاد باری: ''قَبْلَ مَوْتِهٖ'' میں 'قبل ایمانہ

بموتہ"یا"قبل أن یؤمن بموتہ"مقدر ماننا، جب کہ اس تقدیر کا کوئی نام ونشان نہیں ہے۔اس طرح تو ہر شخص مثبت کو منفی اور منفی کو مثبت کر سکتا ہے۔

حق بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ آیت کریمہ میں تحریف والحاد ہے اور خلاف لغت وواقعہ، ایسی تحریفات تو کوئی بھی، جب چاہے؛ کر سکتا ہے، حالاں کہ وہ اس سلسلے میں اپنے الہام لیلیٰ کا دعوی کرتا ہے، بلکہ وہ تو اپنی ہر ایک بات وآواز کو الہام کہتا ہے یہاں تک کہ نقیضین میں بھی الہام کا دعوی کیا؛ چوں کہ یہ تحریف ایک جاہلانہ حماقت تھی[کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے اہل کتاب کو قتل عیسیٰ کا یقین اور پختہ اعتقاد تھا، اور اب تک ہے]اس لیے وہ کلیہ صادق نہیں آتا، جس کی تصویر یہ بد بخت پیش کرنا چاہتا ہے۔اسی لیے اس کے لاہوری دوست نے؛ اس کا معارضہ کرتے ہوئے ضمیر کا مرجع قتل ٹھہرایا اور کہا"ھذا ایمانھم"(یہی ان لوگوں کا ایمان ہے)جسے اس نے سر سید احمد خاں سے چرایا ہے، پس دونوں(نبی کاذب قادیانی اور اس کا دوست لاہوری)نقیض کے دو کناروں پر کھڑے ہیں؛ لہذا ایسے جاہل کی نبوت کے اعتراف سے دست کش ہو جاؤ، جس کی غلطیوں کی اصلاح اس کے مریدین وچیلے کر رہے ہیں۔

کوئی شخص یہاں یہ کہہ کر بھی اسے ساکت کر سکتا ہے کہ: چلیے ہم اس بات کو تسلیم کر لیتے ہیں کہ اس آیت کے معنی یہی ہیں کہ اہل کتاب کا اس پر ایمان ہے کہ وہ اتباع ظن ہے، لیکن یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات سے پہلے ہے، رہا موت کے قریب تو جب حضرت عیسیٰ کو دیکھیں گے، تو ان کے سامنے یہ بات عیاں ہو جائے گی کہ ان کا گمان غلط تھا، اس صورت میں بھی کلیہ صادق رہا اور اس بدنصیب کے حصے میں سوائے رسوائی اور کوئی چیز نہ آئی۔

پھر اگر اس بدنصیب کی مراد عیسیٰ علیہ السلام کی موت طبعی پر ایمان لانے سے پہلے، عدم قتل پر ایمان لانے سے، یہ ہو کہ اہل کتاب عدم قتل پر ایمان لے آئے اور موت طبعی پر ایمان نہ لائے، تو یہ نا قابل تصور ہے؛ کیونکہ جب اہل کتاب نہ حیات مسیح کے قائل ہیں، نہ قتل کے(اور نہ ہی موت طبعی کے)تو پھر ان کے نزدیک کیا صورت ہوئی؟ اور اگر مراد یہ ہو کہ عدم قتل پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور موت طبعی پر بھی، لیکن پہلا یعنی عدم قتل، ثانی یعنی موت طبعی سے پہلے ہے، تو یہ قبلیت بھی متصور نہیں، الا یہ کہ اس کو قبلیت رتبی پر محمول کریں، تب بھی تاویل کسی حد پر نہیں ٹھہرتی ہے اور نہ ہی وسوسہ اندازی کا دروازہ بند ہوتا ہے۔نیز اگر مراد یہ ہو کہ خود عدم قتل ہی موت طبعی سے پہلے ہوا، تو اس وقت قبل الموت کا تذکرہ بے فائدہ ہو جائے گا، کیونکہ موت طبعی کی ہمیشہ یہی شکل ہوتی ہے۔واضح رہے کہ یہ شقیں میں نے بطور مجاراۃ مع الخصم ذکر کی ہیں، ورنہ حقیقت یہ

ہے کہ وہ جاہل خود بھی اپنا کلام نہیں سمجھ سکتا۔ نیز قتل [جو امور حسیہ میں سے ہے] کی بابت لفظ ایمان کے استعمال میں قرآنی عرف واسلوب سے جو اجنبیت اور بعد ہے، وہ کسی پر مخفی نہیں۔ الحاصل یہ ملحد وبے دین اس آیت کے تعلق سے ہلاکت ہی میں ہے، خواہ کوئی بھی راہ اختیار کرے، کیونکہ یہ آیت ایسے ہی ہے، جیسے ہمارا قول: ''سیرجع فلان قبل موته'' (فلاں اپنی موت سے پہلے واپس آجائے گا) اور موت واقع نہ ہوئی ہو، نہ کہ ''رجع فلان قبل موته'' (فلاں اپنی موت سے پہلے واپس آگیا) کے مانند۔

یہ جاہل اس مقام پر اپنی کتاب ''ازالۃ الاوہام'' میں خود اپنی عبارت کا حاصل نہ سمجھ سکا، اور بدکے ہوئے اونٹ کی مانند جو کچھ چاہا بک دیا، رہے اس کے چیلے چاپڑے تو ان پر فارسی کی یہ مثل بالکل ٹھیک صادق آتی ہے:

''ابلہ گفت دیوانہ باور کرد''

''احمق وبے وقوف نے ایک بات کہی اور دیوانے نے اسے تسلیم کیا''۔

اس مقام پر مناسب ہوگا کہ قاری اس کی ان مہمل عبارتوں کا مطالعہ کرے، جو ہندستانی زبان میں ہیں اور دیکھے کہ ان مہمل عبارتوں کا کوئی معنی ومفہوم نکلتا ہے؟ ہرگز نہیں، بلکہ یہ سب وساوس ہیں، جن کی بابت دعوی کرتا ہے کہ الہامی ہیں، گویا اس کی اصطلاح میں وساوس ہی کو الہام کہا جاتا ہے، چناں چہ اس کتاب میں اسے یہ الہام ہوا کہ ''قَبْلَ مَوْتِہٖ'' کی ضمیر حضرت عیسیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے، جب کہ دوسری کتابوں: ''ضمیمه البراهین الاحمدیه'' کی پانچویں جلد، ''اسرار شریعت''، ''مرآة الحقائق'' اور ''خزینة العرفان'' میں لکھتا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ ضمیر کتابی کی طرف راجع ہے اور ''به'' کی ضمیر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یا عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہے؛ حالاں کہ یہ بات ظاہر ہے کہ اس سیاق میں اگر خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے تو آپ کی طرف ضمیر غائب لوٹانا کیسے صحیح ہوگا۔

آیت کریمہ: ''وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ'' اور قادیانی تحریف

''ازالۃ الاوہام'' ہی میں ارشاد باری: ''وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ'' (زخرف:۶۱) کی بابت لکھتا ہے کہ: اس کی ضمیر قرآن کریم کی طرف راجع ہے، اور کہتا ہے کہ یہی حق ہے، جب کہ ''حمامة البشری'' میں لکھتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی طرف راجع ہے۔

نیز اخبار ''الحکم'' میں ''ملفوظات احمدیہ'' کے عنوان کے تحت ہے کہ: ''الساعة'' سے مراد ایک عظیم الشان نشانی ہے اور وہ ختم نبوت ہے، اس کے برخلاف ''حمامة البشری'' میں ہے کہ اس سے مراد قیامت ہے

''اعجازِ احمدی'' میں رقم طراز ہے کہ: اس سے بنی اسرائیل کی وہ زیادتی اور ظلم مراد ہے، جوانہوں نے حضرت عیسیٰ کے بعد طیطوس پر کی۔

قبر عیسیٰ علیہ السلام کی بابت قادیانی مردود کے متعارض اقوال

''ازالۃ الاوھام'' میں یہ بھی لکھتا ہے کہ: حضرت عیسیٰ مقام جلیل میں دفن ہوئے، ''اتمام الحجۃ'' کے حاشیے میں لکھتا ہے کہ: بیت المقدس کے بڑے کنیسہ میں؛ جب کہ ''راز حقیقت'' میں لکھتا ہے کہ صوبہ کشمیر کے محلہ ''خانیار'' میں مدفون ہیں یہی بات صحیح ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے۔

اپنی ہر بات میں یہ مردود الہام کا انڈا دیتا ہے، کہا جاتا ہے کہ شیطان بھی انڈا دیتا ہے، بلکہ ہر بڑے کان والا جانور بچہ دیتا ہے اور چھوٹے کان والا انڈا۔ گویا یہ بیوقوف یمامہ کے مسیلمہ کذاب کی طرح چھوٹے کان والا احمق ہے، جو اپنے بنے ہوئے تانے بانے کو خود ہی ادھیڑ دیتا ہے، اگر اللہ رب العزت کو کسی آیت میں عیسیٰ علیہ السلام کی موت ذکر کرنا منظور ہوتا، تو آیت ذیل میں اس کا ذکر زیادہ مناسب تھا:

''لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ط وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ط اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ط وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ o لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ م وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ط وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ o اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ط وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ o مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ج قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ط كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ط اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ o (مائدہ: ۷۲۔۷۵)

''بیشک وہ لوگ کافر ہو چکے جنہوں نے یہ کہا کہ: اللہ عین مسیح ابن مریم ہے، حالاں کہ مسیح نے خود فرمایا تھا کہ: اے بنی اسرائیل! تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ بیشک جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ (خدائی میں یا خدائی خصوصیات میں) شریک قرار دے گا، سو اس پر اللہ تعالیٰ جنت کو حرام کر دیگا اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ بلاشبہ وہ لوگ بھی کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ تین (معبودوں) میں کا ایک ہے، حالاں کہ بجز ایک معبود کے اور کوئی معبود نہیں۔ اور اگر یہ لوگ اپنے اقوال (کفریہ) سے باز نہ آئے تو (سمجھ رکھیں کہ) جو لوگ ان میں کافر رہیں گے، ان پر دردناک عذاب واقع

ہوگا، کیا پھر بھی خدا تعالیٰ کے سامنے توبہ نہیں کرتے اور اس سے معافی نہیں چاہتے۔ حالاں کہ اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت کرنے والے (اور) بڑی رحمت فرمانے والے ہیں، مسیح ابن مریم (عین خدا یا جزو خدا) کچھ بھی نہیں، صرف ایک پیغمبرؑ ہیں، جن سے پہلے اور بھی پیغمبر گزر چکے ہیں (جن کو عیسائی خدا نہیں مانتے، پس اگر پیغمبر یا خرقِ عادت دلیل الوہیت ہے، تو سب کو الٰہ ماننا چاہئے اور اگر دلیل الوہیت نہیں ہے تو حضرت مسیح کو کیوں الٰہ کہا جاوے؟ غرض جب اوروں کو الٰہ نہیں کہتے تو عیسیٰؑ کو بھی مت کہو) اور (اسی طرح) ان کی والدہ (بھی الٰہ یا جزو الٰہ نہیں، بلکہ وہ) ایک ولی بی بی ہیں (جیسی اور بیبیاں بھی ولی ہو چکی ہیں۔ اور دونوں حضرات کے الٰہ نہ ہونے کے دلائل میں سے ایک سہل دلیل یہ ہے کہ) دونوں کھانا کھایا کرتے تھے (اور جو شخص کھانا کھاتا ہے، وہ اس کا محتاج ہوتا ہے، اور کھانا کھانا خواص مادیات سے ہے اور احتیاج اور مادیت، خاصہ ممکن الوجود کا ہے، جس کا وجود ضروری نہ ہو، اور ممکن یعنی جس کا وجود ہی ضروری نہ ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا) دیکھئے تو ہم کیوں کر صاف صاف دلائل ان سے بیان کر رہے ہیں، پھر دیکھئے وہ الٹے کدھر جا رہے ہیں''۔

اگر عیسیٰ علیہ السلام کی موت واقع ہو چکی ہوتی، تو یہاں کھلے لفظوں میں اس کا ذکر کیا جاتا، کیونکہ یہاں الوہیت مسیح کی تردید اور مبحث کو واضح شکل میں پیش کرنا تھا، اس لیے بالکل مناسب نہیں تھا کہ اس سے اعراض کر کے موجودہ پیرائے کو اختیار کیا جاتا، کیونکہ یہ تو بدیہی کو نظری بنانا ہوگا۔

اسی طرح اس ارشاد باری میں بھی ضروری تھا کہ موت مسیح کو ذکر کرتے:

''لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ط قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًاط (المائدہ: ۱۷)

''بلاشبہ وہ لوگ کافر ہیں جو یوں کہتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ مسیح بن مریم ہے، آپ ان سے یوں پوچھئے کہ اگر ایسا ہے تو بتلاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ عیسیٰ بن مریم (جن کو تم اللہ کا عین سمجھتے ہو) اور ان کی والدہ کو اور جتنے زمین میں آباد ہیں ان سب کو ہلاک کرنا چاہیں (تو) کیا کوئی شخص ایسا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ سے ذرا بھی ان کو بچا سکے (یعنی اتنی بات کو تو تم بھی مانتے ہو کہ ان کو ہلاک کرنا اللہ کی قدرت میں ہے، تو جس ذات کا ہلاک کرنا دوسرے کے قبضہ میں ہو وہ خدا کیسے ہو سکتا ہے۔)

تاریخ طبری کی عبارت ''ھذا قبر رسول اللہ عیسیٰ'' ایک غلط فہمی کا ازالہ

اس بدنصیب کے بعض چیلے، تاریخ طبری کے ایک نسخہ میں جو یہ لکھا ہے کہ ''حضرت عیسیٰؑ کی قبر مدینہ

طیبہ کے قریب ہے، وہاں ایک پتھر ملا، جس پر لکھا ہوا ہے: هذاقبر رسول الله عیسیٰ ؑ الی هذه البلاد" کے ذریعہ لوگوں کے ایمان کو مشتبہ کرتے ہیں؛ حالاں کہ یہ انتہائی جہالت ہے، کیونکہ اس نسخہ میں نسخہ نویس سے کچھ عبارت ساقط ہوگئی، جو "الوفاء" کے تیسرے باب میں ابن زبالہ کے حوالے سے مذکور ہے، (چناں چہ اس میں ہے کہ) ابن زبالہ پتھر کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: "میں نے وہ پتھر نکال کر ان دونوں کو دیا، اسے انہوں نے پڑھا، تو اس پر لکھا ہوا تھا:

"اناعبدالله الاسود رسول رسول الله عیسیٰ بن مریم الی اهل قری عرینة"

"میں اللہ کا بندہ اسود (بن سوادہ) اللہ کے رسول عیسیٰ بن مریم کا قاصد و مبلغ ہوں، جو عرینہ کی بستی کے لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہوں"۔

صاحب "الوفاء" لکھتے ہیں کہ: اس سے متعلق بقیہ تفصیل اسی کتاب (الوفاء) کی چوتھی فصل کے ساتویں باب میں آرہی ہے، وہاں ملاحظہ کریں۔

وہاں لکھتے ہیں:

"وروی الزبیر عن موسیٰ بن محمد عن ابیه قال: وجدقبر آدمی علیٰ رأس جماء أم خالد مکتوب فیه: آناأسود بن سوادة رسول رسول الله عیسیٰ بن مریم الی أهل هذه القریة"

"کہ زبیر بہ واسطہ موسیٰ بن محمد نقل کرتے ہیں کہ: محمد نے کہا: کہ جماء اُم خالد کے آخری سرے پر ایک آدمی کی قبر پائی گئی، جس پر لکھا ہوا تھا۔ "میں اللہ کے رسول عیسیٰ بن مریم کا، اس گاؤں والوں کی جانب بھیجا ہوا قاصد و مبلغ اسود بن سوادہ ہوں"۔

"وعن ابن شهاب قال: وجدقبرعلی جماء أم خالدأربعون ذراعاًفی اربعین ذراعاً مکتوب فی حجرفیه: أنا عبدالله من اهل نینوی رسول رسول الله عیسیٰ بن مریم. علیه السلام. الی أهل هذه القریة، فادرکنی الموت، فأوصیت أن ادفن جماء أم خالد".

"اور ابن شہاب سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: "جماء ام خالد میں چالیس گز لمبی اور چالیس گز چوڑی ایک قبر ملی، جس کے کتبہ پر لکھا ہوا تھا: "میں اس گاؤں والوں کی جانب، اللہ کے رسول عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) کا بھیجا ہوا قاصد و مبلغ، نینویٰ کا رہنے والا، اللہ تعالیٰ کا ایک بندہ ہوں، مجھے موت نے گھیر لیا تو میں نے وصیت کی کہ مجھے جماء ام خالد میں دفن کیا جائے"۔

الحاصل تاریخ طبری کے نسخہ میں لفظ "رسول" جو کہ مضاف تھا "رسول اللہ عیسیٰ بن مریم" کی جانب

(سہوا) ساقط ہوگیا اور محض اس سقوط کی وجہ سے ان جاہلوں کا ایمان بھی ساقط ہوگیا (اور اس بات کے قائل ہوگئے کہ حضرت عیسیٰ وفات پاگئے ہیں اور یہ انہی کی قبر ہے)۔

آیت کریمہ: ''وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰى... اور قادیانی تحریف

یہ احمق اپنی کتاب ''ازالۃ الاوہام'' میں سورہ مائدہ کی آیت:

''وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِىْ وَاُمِّىَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ''

(مائدہ:۱۱٦)

''اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب کہ: اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ: اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تم نے ان لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ مجھ کو اور میری والدہ (مریم) کو بھی علاوہ خدا کے معبود قرار دے دو؟''

کے تحت لکھتا ہے کہ یہاں ''قال'' بہ صیغہ ماضی ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ سوال (وجواب) حضرت عیسیٰ سے رفع کے وقت ہی ہو چکا اور ماضی کے پردہ میں جاچکا۔ جب کہ ''نصرۃ الحق'' ''براہین احمدیہ'' کے پانچویں حصے''، ''حقیقۃ الوحی'' اور ''تذکرۃ الشہادتین'' میں لکھتا ہے کہ: یہ سوال و (جواب) قیامت کے دن ہوگا اور یہی نظم آیت بھی ہے۔

یہ چند نمونے ہیں اس کے علوم قرآنیہ سے واقفیت کے، جو صرف اسی مردود قادیانی کے حصے میں آئے ہیں اور بہ قول اس کے امت کا کوئی فرد ان علوم تک نہ پہنچ سکا۔

ایسے موقع پر اس متنبیٔ لاحق (موجودہ مدعی نبوت قادیانی) کے بارے میں متنبیٔ سابق (پہلے کے مدعی نبوت ابوالطیب احمد بن حسین متنبیؔ صاحب ''دیوان'') کے اشعار یاد آجاتے ہیں:

وقدضل قوم باصنامهم ✿ واما بزق رياح فلا

''کچھ اپنے بتوں کے ذریعہ تو گمراہ ہوئے ہیں، لیکن ہوا بھرے ہوئے مشک سے کوئی گمراہ نہیں ہوا''۔

تلك صموت وذاناطق ✿ اذاحركوه فسا او هذى

''وہ بت تو خاموش ہیں اور یہ مشک جیسا کافور بولتا ہے جب اس کو ہلاتے ہیں تو پادتا ہے یا بکتا ہے''۔

ومن جهلت نفسه قدره ✿ رأى غيره منه مالايرى

''جو شخص اپنے مرتبے سے ناواقف ہو، دوسرے لوگوں کو اس کے بارے میں وہ چیزیں نظر آئیں گی، جن کو وہ خود نہیں دیکھتا''۔

''حمامة البشری'' میں جو کچھ مذکور ہے، اس کا ایک بڑا حصہ صاحب ''میبذی'' کی تالیفات سے چرایا ہے، جو ملحدین فلاسفہ سے منقول ہیں، میں نے اس کا خلاصہ ایک دوسری کتاب میں دیکھا ہے۔ الغرض جو کچھ بھی ہو بہ ہر حال یہ الحاد و بے دینی ہے۔ لاحول ولاقوۃ الا باللّٰہ العلی العظیم۔

واضح رہے کہ اللہ جل شانہ نے جس اہتمام کے ساتھ اس جلیل القدر، عظیم المرتبت پیغمبر عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے حالات وواقعات کو بیان فرمایا ہے، وہ کسی دوسرے کو حاصل نہیں، نیز آپ علیہ السلام کی ولادت کا جس شان سے ذکر کیا، وہ بھی صرف آپ ہی کا حصہ ہے، یہاں تک کی آپ کی والدہ صدیقہ کے دروزہ تک کو بیان کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ علیہ السلام کی ولادت بغیر باپ کے ہوئی، اسی لیے اپنی والدہ محترمہ کی طرف اپنی نسبت کرتے ہوئے ''وَبَرًّا بِوَالِدَتِیْ'' (مریم:۳۲- اور مجھ کو میری والدہ کا خدمت گزار بنانا) فرمایا، نہ کہ ''بِوَالِدَیَّ'' جیسا کہ حضرت یحییٰ کی بابت ہے ''وَبَرًّا بِوَالِدَیْہِ'' (مریم:۱۴- اور اپنے والدین کے خدمت گزار تھے)۔ پس اولاً اللہ رب العزت نے انتہائی اہتمام سے آپ کے دنیاوی حالات کو بیان فرمایا، اس کے بعد آپ کے روز قیامت کے احوال ذکر کیے، جیسا کہ سورہ ''آل عمران'' اور ''سورۂ نساء'' کے حوالے سے اس کی تفصیل گزر چکی ہے اور عنقریب سورہ ''مائدہ'' سے پیش کی جائے گی۔ نبی اکرم ﷺ نے آپ علیہ السلام کے انہی احوال کے سلسلے میں مباہلہ کا چیلنج بھی دیا، جس میں رفع جسمانی بھی شامل ہے، کیونکہ مباہلہ کی دعوت حضرت عیسیٰ کے تمام احوال بیان کرنے کے بعد دی گئی، چناں سب کو ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوا:

''فَمَنْ حَآجَّکَ فِیْہِ مِنْ م بَعْدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَکُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَکُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَکُمْ ثُمَّ نَبْتَہِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰہِ عَلَی الْکٰذِبِیْنَ ۞'' (ال عمران: ۶۱)

''پس جو آپ سے عیسیٰ کے باب میں (اب بھی) حجت کرے، آپ کے پاس علم (واقعی) آئے پیچھے، تو آپ (جواب میں یوں) فرما دیجئے کہ (اچھا اگر دلیل سے نہیں مانتے تو پھر) آجاؤ ہم (اور تم) بلا (کر جمع کر) لیں اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو اور خود اپنے تنوں کو اور تمہارے تنوں کو پھر ہم (سب مل کر) خوب دل سے دعا کریں اس طور پر کہ اللہ کی لعنت بھیجیں ان پر جو (اس بحث میں) ناحق پر ہوں''۔

لیکن یہ بے دین اٹھتا ہے اور اس جلیل القدر پیغمبر کی شان میں ایسی ایسی گستاخیاں کرتا ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جگر پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ جو کچھ اس نے آپ علیہ السلام کی توہین اور شان میں گستاخیاں کی ہیں، اس کا کچھ حصہ میرے رسالہ ''اکفار الملحدین فی شیء من ضروریات

الدین" میں موجود ہے جو مطبوعہ ہے۔ اور کچھ چیزیں مولوی سید مرتضیٰ حسن کے رسالہ "اشد العذاب علیٰ مسیلمة الفنجاب" میں مذکور ہیں۔

قادیانی کو نہ تو قرآن کا کوئی حصہ یاد تھا اور نہ حج کی توفیق ہوئی

اللہ رب العزت روسیاہ کرے اسے بھی اور انہیں بھی جنھوں نے کفر والحاد اور زندقہ میں اس کی پیروی کی، اس بدبخت نے معمولی دنیا کی خاطر اپنا ایمان بیچ دیا، چناں چہ اللہ رب العزت نے دعوائے عیسویت کی وجہ سے قرآن کریم کے کسی بھی حصہ کے حفظ کی توفیق نہیں دی، جب کہ مسلمانوں کے ننھے ننھے بچے بھی پورا قرآن کریم یاد کر لیتے ہیں، اسے حج کی بھی توفیق نہ ہوئی، حالاں کہ متوسط درجے کے مسلمان بھی حج کی سعادت سے سرفراز ہوتے ہیں، یہ بدبخت اس لائق بھی نہیں کہ ایک شریف انسان بن سکے، چہ جائے کہ مؤمن صالح، پس یہ مہدی مسعود یا عیسیٰ موعود کیسے بن سکتا ہے؟ ہاں اس لائق ہے کہ دجال کی سواری کا گدھا بنے۔ العیاذ باللہ۔

آیت کریمہ: "وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ" اور قادیانی تحریف

لاہوری زندیق نے اپنے بدبخت قادیانی نبی کے الہام کی خلاف ورزی کر کے، سرسید احمد خاں [جو اس کے نزدیک اس کے قادیانی نبی سے، بڑا نبی ہے] کی تفسیر سے چوری کرتے ہوئے کہا ہے کہ: "صلیب" سے مراد "کسر العظام" یعنی ہڈیوں کو توڑنا ہے، جیسا کہ لغت میں ہے۔ صلیب پر چڑھانا مراد نہیں ہے، اس معنی کے اعتبار سے حضرت عیسیٰ مصلوب (صولی پر چڑھائے ہوئے) نہ ہوئے ہاں مصلوب کے مانند ہو گئے (بایں طور کہ آپ کی ہڈیاں توڑی گئیں اور انتہائی تکلیف پہنچائی گئی۔ العیاذ باللہ) یہ بات اس نے سرسید احمد خاں اور حکیم محمد حسن امروہی سے لی ہے۔ لغت عرب سے ناواقفیت کی یہ ایک بڑی دلیل ہے، کیونکہ لغت عرب میں "صلب" بہ معنیٰ "ہڈیوں کر توڑنا" ایک نادر لغت ہے، جو "صلب" سے ماخوذ ہے، جب کہ یہاں پر "صلب"، "صلیب" سے ماخوذ ہے جو "جلیب" کا معرب ہے (جس کے معنی کھینچنے کے آتے ہیں) چناں چہ اس کپڑے کو جس پر صلیب کے نشان بنائے اور کھینچے گئے ہوں، "ثوب مصلب" کہا جاتا ہے۔ نیز عربوں نے اس سے بھی دوسرے کلمات مشتق کیے ہیں، جن کا پہلے معنی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لغویین کی عادت ہے کہ عجمی الفاظ کی عربی زبان میں بہت سی توجیہات ذکر کرتے ہیں، جیسا کہ حضرت نوح، حضرت موسیٰ اور کتاب "تورات" کے سلسلے میں بیان کیے ہیں؛ لیکن یہاں ایسا نہیں کیا، بلکہ "صلیب"

کے صرف دو معنی ذکر کیے ہیں: ایک اصلی عربی معنی، دوسرے صلیب۔ واضح رہے کہ آیت کریمہ ''وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَاصَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ o'' میں اہل کتاب کے دعوے کی اسی طرح تردید ہے، جس طرح کہ:

''وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا'' (بقرہ: ۱۰۲)

''حضرت سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا مگر (ہاں) شیاطین کفر کیا کرتے تھے''۔

میں یہود کے اس قول کی تردید ہے کہ حضرت سلیمانؑ نعوذ باللہ اخیر عمر میں مرتد ہو گئے تھے اور جیسا کہ آیت کریمہ:

''مَا كَانَ اِبْرَاهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ط وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ o''

(آل عمران: ۶۷)

''ابراہیمؑ نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی تھے، لیکن طریق مستقیم والے صاحب اسلام تھے اور مشرکین میں سے (بھی) نہ تھے)''۔

میں یہود و نصاریٰ کے اس خیال کی تردید ہے کہ ابراہیم علیہ السلام یہودی یا نصرانی تھے۔

مزید کہتا ہے کہ: فریقین کی تاریخ بتاتی ہے کہ نہ تو حضرت عیسیٰؑ قتل ہوئے اور نہ سولی پر چڑھائے گئے؛ جب کہ دونوں فریقوں کا ایمان یہ ہے کہ قتل بھی ہوئے اور سولی بھی دی گئی بلہذا تطبیق اس طرح دی جا سکتی ہے کہ کہا جائے کہ آپ اپنی موت سے پہلے قتل کیے گئے، گویا اللہ رب العزت کا یہ جملہ'' وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ o'' مقام انکار میں ہے، کیونکہ ان کا ایمان ان کی تاریخ کے خلاف ہے جو صحیح اور واقع ہے۔

اس بد بخت کا یہ قول بھی ایک شیطانی وسوسہ ہے، کیونکہ اللہ رب العزت نے کلام کے ابتداء ہی میں یہود کے اس قول کو بیان فرما دیا ہے: ''وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ'' اس آیت کریمہ کا عنوان بجائے ایمان کے قول قائم کیا ہے، پھر جب پہلی مرتبہ اسے ذکر کر دیا ہے، تو دوبارہ بے فائدہ کیوں ذکر کرتے، نیز اسے اتباع ظن سے تعبیر کیا کہ ان لوگوں کو اس کی بابت کوئی صحیح علم نہیں، بلکہ مبتلائے شک ہیں، جس کی وجہ سے اختلاف کر رہے ہیں، پس یہ کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے، کہ: وہ اس بات پر (یعنی حضرت عیسیٰؑ کے قتل و سولی پر) ایمان رکھتے تھے؟ یہ تفصیل تو شک کرنے والوں کے اعتبار سے ہے۔

ہاں اللہ رب العزت نے بعض اہل کتاب کا عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا ذکر کیا ہے، اور یہ وہ نصاریٰ ہیں، جو اصلاً یہودی تھے، چناں چہ ارشاد ہے: ''وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ'' (اس آیت سے معلوم ہوا کہ بعض لوگوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی اتباع و پیروی کی اور ایمان لائے، ظاہر ہے کہ وہ بنی اسرائیل یعنی یہود ہی تھے، اس لیے کہ آپ انہی لوگوں کی طرف مبعوث کیے گئے

تھے)۔ جو ماخوذ ہے حواریوں کی اس دعا سے:

''رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ''(آل عمران:۵۳)

''اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے ان چیزوں پر جو آپ نے نازل فرمائیں اور پیروی اختیار کی ہم نے رسول کی، سو ہم کو ان لوگوں کے ساتھ لکھ دیجئے، جو تصدیق کرتے ہیں''۔

اسی طرح سورہ ''صف'' کے آخر میں ہے (کہ بنی اسرائیل یعنی یہود کا ایک گروہ عیسیٰ پر ایمان لایا اور ایک گروہ منکر ہوا اور جو لوگ ایمان لائے اللہ نے انہیں منکرین پر غالب فرما دیا، چناں چہ ارشاد ہے:

''فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ م بَنِىْٓ اِسْرَآئِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ ج فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ۝''۔ صف:۱۴)

پس معلوم ہوا کہ ارشاد باری: ''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ'' سے مراد یہود ہی ہیں، نہ کہ نصاریٰ اور، رد انہی پر ہے نہ کہ کسی اور پر۔ رہی بات صیغۂ استقبال سے اس کی تعبیر کی؟ تو یہ زمانۂ تکلم یا زمانۂ واقعہ کے اعتبار سے ہے۔ قتل اور نفی کے حوالے سے کلام اس ارشاد باری پر پورا ہو گیا: ''وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا''، اس کے بعد ''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ فرمایا اور مضمون کا اختتام غلبہ اور حکمت پر کیا، پھر غلبہ اور حکمت کی مزید ایک صورت یہ ذکر کی: ''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۝ اس آیت کا، معاملۂ قتل سے ادنیٰ بھی تعلق نہیں ہے، اس سے فراغت کے بعد پھر غلبہ اور حکمت کو یوں بیان کیا: ''وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا'' اور کلام کو مکمل اور ختم کر دیا، اب اگر اس اختتام کے بعد دوبارہ اسی مضمون کی طرف عود کریں تو بے فائدہ ایک گھٹیا بات ہوگی، ایسا کام یعنی ختم کر کے، پھر اسی مضمون کو دہرانا، وہ کر سکتا ہے، جس کے حواس اس کا ساتھ نہ دیتے ہوں۔ العیاذ باللّٰہ من ذلک۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک بات مکمل ہو جانے کے بعد، حق تعالیٰ کو پھر اس تعلق سے کوئی اور بات سمجھ میں آئی؛ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات اول وآخر میں، ذیلی امور ذکر کر کے، پوری تفصیل سے بیان کر دی ہے۔

ارشاد باری: ''وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ'' سے مراد وہ لوگ نہیں ہیں، جنہوں نے: ''اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ'' کہا؛ بلکہ بعض دوسرے یہود مراد ہیں، یا پھر نصاریٰ مراد ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ صرف ضمیر لوٹانے پر اکتفاء نہیں کیا گیا، بلکہ اسم موصول لایا گیا، ورنہ کلام کا موقعہ یہ تھا کہ: ''وَاخْتَلَفُوْا فِيْهِ عَلٰى شَكٍّ مِّنْهُ'' کہتے، اسی طرح پہلوں کی طرح ان کو برا بھلا نہیں کہا، ابن حزم نے اپنی کتاب۔ ج:۱ص:۹۹۔ میں لکھا ہے کہ ''میری بہت سے ایسے ممتاز یہودیوں سے ملاقات ہوئی، جو حضرت عیسیٰ کی نبوت کے قائل تھے''۔ پھر یوسف

بن ہارون کی مختصر تاریخ ذکر کی، یہ جو حضرت یحییٰ کے زمانے میں یہودیوں کے ایک بڑے امام تھے، اور بہت اچھے انداز میں کی، نیز ان کی شان میں تحسینی کلمات بھی کہے، اس کے بعد لکھتے ہیں کہ: ''میں نے یہ بات یہ بتلانے کے لیے ذکر کی کہ یہ مذہب وعقیدہ ان کے ائمہ کے درمیان اُس وقت سے اس وقت تک شائع وذائع ہے''۔ (انتہی)

شہرستانی کہتے ہیں کہ: یہ عقیدہ (یعنی حضرت عیسیٰ نبی تھے) یہود کی ایک جماعت کا ہے۔

اس کے بعد ازسرِ نو کلام شروع کرتے ہوئے، مستونف عنہ کے اعادہ کے ساتھ، ارشاد ہوتا ہے ''وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْناً'' تا کہ مابعد اس سے مربوط ہو جائے۔ پس کلامِ اول کی جانب عود کیا اور ضمیر لوٹائی، پھر فرمایا ''وَاِنْ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ'' یہاں بجائے ضمیر، اسم ظاہر لایا گیا، کیونکہ یہاں جن اہل کتاب کا تذکرہ ہے، وہ پہلے ذکر کردہ اہل کتاب کے علاوہ دوسرے لوگ ہیں، ورنہ تو ''وَاِنْ مِنْهُمْ'' کہنا کافی تھا۔ نیز اس جملہ کو ''قَبْلَ مَوْتِهٖ'' سے مقید کر دیا، یہ قید اس زندیق کے بہ قول یقیناً زائد ہے، اس کے بعد ارشاد ہے: ''وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْداً o'' یہ شہادت امت اجابت کی طاعت ومعصیت کے سلسلے میں ہوگی، نہ کہ قتل کے سلسلے میں، کیونکہ اس سلسلے میں تو آپ کے علاوہ دوسروں کی شہادت چاہیے (آپ تو خود صاحب معاملہ ہیں اور صاحب معاملہ کی گواہی اپنے حق میں معتبر نہیں) نیز شہادت اسی ایمان کے متعلق ہوگی (جس کا ذکر ''لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ'' میں ہے) نہ کہ توفی سے پہلے کے ایمان کے متعلق۔ انکار صلب کی بابت دیکھیے: ''الفارق، ص: ۲۸۲'' جس میں ہے کہ نصارائے شام ومصر کا عقیدہ عدم قتل کا تھا اور المانی نے نصرانیت حقہ کے سلسلے میں جو کچھ ذکر کیا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ ''صلب وفدیہ کے حوالے سے نصاریٰ کے یہاں جو عقائد وخیالات پائے جاتے ہیں، وہ سب پولس اور اس جیسے دوسرے لوگوں کی ایجاد واختراع ہیں، جنھوں نے حضرت عیسیٰ کو دیکھا بھی نہیں، اصل نصرانیت کے اصولوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے''۔ میں کہتا ہوں کہ: عہد قدیم کی نویں فصل ''سفر دانیال علیہ السلام''، میں اس بابت جو کچھ مذکور ہے، اس کا حاصل یہ ہے: ''عندهم أن المسيح عليه السلام يقتل وليس له، وكان اصله أنه يقع السعي في قتله ولا يقع القتل (کہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت مسیح قتل کیے جائیں گے، مگر قتل ہوگا نہیں، یعنی قتل کی کوشش ضرور ہوگی، مگر قتل کا وقوع نہ ہوگا) تو ان لوگوں نے اس عبارت کا [جیسا کہ مجھے معلوم ہے] اپنے عقیدہ کے مطابق یوں ترجمہ کر دیا کہ: ''حضرت مسیح علیہ السلام کا قتل بہ طور کفارہ ہوگا (پوری قوم کے گناہوں کا)''۔ بعض لوگوں نے تاریخ کا سہارا لیتے ہوئے ذکر کیا ہے کہ فوطیس نے [جو قسطنطنیہ کا لاٹ پادری تھا] ''سیر الحواریین'' سے نقل کیا ہے کہ: ''حضرت عیسیٰ کو سولی نہیں دی گئی، بلکہ ان کی جگہ دوسرے کو دی

گئی"۔ اور دی بونس نے جو یہ کہا ہے کہ "صلب پولس کی ایجاد ہے"، تو یہ اس کے اور اس کے علاوہ ان کے دوسرے مشہور مؤرخین کے نزدیک طے شدہ بات ہے۔

ان سب سے زیادہ تعجب خیز بات وہ ہے، جو صاحب "کتاب الحراب" نے مصنف "السیوف البتارہ" سے نقل کیا ہے کہ: "کنیسۂ نصاری کے اسلاف میں سے ایک شخص ترتولیانوس نے یقین کے ساتھ یہ بات کہی ہے کہ حاکم بیلاطس بہ باطن نصرانی تھا" اور کہا ہے کہ: "اہم مؤرخین کی ایک جماعت نے یہ امکان ظاہر کیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی جگہ ایک مجرم کو سولی دی گئی، ان مؤرخین میں سیوشارل بیکار اور وارنست دی بونس وغیرہ سرفہرست ہیں، اول الذکر نے کہا ہے کہ: صلبِ مسیح کا مسئلہ قدیم دستور کی موافقت کے لیے مکمل طور پر گھڑا گیا ہے۔ قدیم دستور یہ تھا کہ کسی انسان کی قربانی دیکر اللہ تعالیٰ کی آتش غضب بجھائی جاتی تھی، چناں چہ یہود اللہ رب العزت کے غصے کو ختم کرنے اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے بطور قربانی اپنی اولادوں کو ذبح کے لیے پیش کرتے تھے، نیز اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ: ان لوگوں نے بسا اوقات بہ طور قربانی ذبح کیے گئے آدمی کا گوشت بھی کھایا ہے اور خون بھی پیا ہے، تا آں کہ انبیاء بنی اسرائیل -علیہم السلام- اٹھ کھڑے ہوئے اور اس قبیح عادت کی مذمت کی، تو آدمی کی جگہ جانور کی قربانی دی جانے لگی"۔ مسیو بیکار نے ان قدیم رسم ورواج کے ساتھ سیدنا عیسیٰؑ کی قربانی کا ربط بیان کرنے میں طویل تشریح سے کام لیا ہے اور کہا ہے کہ: صلیب ان کے یہاں "النجام" نامی ایک مخصوص چیز کی علامت کے طور پر استعمال ہوتی ہے اور یہ ان دو لکڑیوں سے عبارت ہے، جو ایک دوسرے سے ملی ہوتی ہیں"۔ (انتہی)

حاصل یہ کہ تمام اہل عالم خواہ یہود ونصاری ہوں یا مسلمان سب کا اجماع ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی موت طبعی نہیں ہوئی، اس لیے کہ اہل کتاب یعنی یہود ونصاری اس بات کے قائل ہیں کہ: حضرت عیسیٰؑ کو سولی دی گئی، پھر ان میں اختلاف ہو گیا، یہودیوں کا کہنا ہے کہ سولی کے بعد آپ علیہ السلام اسی طرح مصلوب باقی رہے اور مٹ مٹا گئے، جب کہ نصاری کا کہنا ہے کہ سولی کے بعد آپ علیہ السلام زندہ ہوئے اور آسمان پر چلے گئے، تیسرے گروہ اہل قرآن یعنی امت محمدیہ اور نصاری کی کچھ جماعتوں کا کہنا ہے کہ نہ تو آپ کو سولی دی گئی اور نہ ہی کسی طرح کی گزند پہنچی، بلکہ پورے جسم کے ساتھ زندہ آسمان پر اٹھا لیے گئے۔ الغرض تمام اہل مذاہب کے قول کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کی موت طبعی نہیں ہوئی، بالخصوص امت محمدیہ کے عقیدہ کے مطابق کہ ان میں سے کسی نے بھی اس عقیدہ کی بابت کوئی اختلاف نہیں کیا۔ پس اگر اب کوئی اختلاف کرتا ہے تو وہ جہنم کا کندن بنے گا۔ من شذ شذ فی النار.

مجھے صحابی رسول حاطب بن ابی بلتعہ کے بارے میں ان لوگوں کی یہ بات معلوم ہوئی کہ جس وقت شاہ اسکندریہ مقوقس کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک لے کر حضرت حاطبؓ پہنچے تو مقوقس نے اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ: اگر تمہارا ساتھی (محمد ﷺ) نبی ہے، تو جس وقت اس کی قوم (اہل مکہ) نے اسے شہر سے نکالا، اس نے ان کے خلاف بددعا کیوں نہ کی؟ حضرت حاطبؓ نے جواب دیا کہ: حضرت عیسیٰؑ نے بھی، جس وقت کہ انہیں سولی دی گئی اپنی قوم کو بددعا نہیں دی تھی۔ اس واقعہ کو یہ بدبخت ''الاستیعاب لابن عبدالبر'' کے حوالے سے نقل کرتا ہے، حالاں کہ اس نے حکیم محمد حسن امروہی سے، اسے لیا ہے۔ یہ غایت درجہ کی جہالت اور غباوت ہے، کیونکہ عام کتب سیر میں حضرت حاطب بن ابی بلتعہ کے الفاظ اس طرح ہیں [جیسا کہ ''خصائص'' میں ہے] ''کہ حاطب نے جواب میں کہا کہ: کیا تم اس بات کی شہادت نہیں دیتے ہو کہ عیسیٰؑ بن مریم اللہ کے رسول ہیں؟ تو پھر جب ان کی قوم نے اُنہیں پکڑ کر سولی دینی چاہی، تو انہوں نے ان کی ہلاکت کی بددعا کیوں نہیں کی؟ تا آں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھالیا؟ تو مقوقس نے کہا کہ: تم حکیم ہو اور حکیم کے پاس سے آئے ہو''۔

مگر یہ کمینے اپنی نادانی اور عربی زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے، اس کی صلاحیت نہیں رکھتے کہ اصول وماٴخذ سے مضمون نقل کریں اور نقل نویسوں کی غلطیوں سے بچ سکیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بڑی فاش غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اگر حضرت عیسیٰؑ کی موت طبعی ملک شام میں ہوئی ہوتی، یا آپ کشمیر منتقل ہو گئے ہوتے، تو بھلا یہ بات کسی پر کیسے مخفی رہتی، جب کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو واضح دلائل اور روشن معجزات کے ساتھ مبعوث فرمایا اور آپ کی امت قرناً بعد قرنٍ باقی رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب شیطانی وسوسہ ہے، جو شیطان اپنے محبین ومعتقدین کے دل میں ڈالا کرتا ہے اور جواز روئے عقل ونقل نیز تاریخ وعادت قابل رد ہے۔

مجھے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ ان کے جھوٹے نبی شیطان نے ایک حدیث پیش کی ہے: ''کَانَ فی الهند نبیاً أسود اللون اسمه کاهنا'' (ہندوستان میں کاہن نامی ایک کالے رنگ کا نبی تھا) چناں چہ دسیوں سال تک لوگ اس خبیث سے یہ مطالبہ کرتے رہے کہ دکھاؤ یہ حدیث کہاں ہے؟ کس کتاب میں اس کی تخریج ہوئی ہے؟ جس کے جواب میں اس کے پاس اللہ اور اس کے رسول پر افترا پردازی کے سوا کچھ نہ تھا۔ العیاذ باللہ من سوء المنقلب۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ جس نے اس بدبخت کو نبی بنایا تھا وہ ایک انتہائی خبیث اور بے حیا ہندو تھا، جس کی بے حیائی اجنبی عورتوں کے ساتھ ضرب المثل تھی۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

ہم کہتے ہیں کہ: جو چیزیں قابل رد تھیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان آیات میں ان سب کی تردید اور نفی

کر کے اس کا بدل ثابت کیا۔ پس اگر یہ چیز بھی قابل رد ہوتی تو ضرور بالضرور صراحتاً اس کی بھی نفی اور تردید کی جاتی، جس سے معلوم ہوا کہ یہ بلا تردید ونکیر اللہ تعالیٰ کی جانب سے قسم ہے، جو عنقریب سامنے آئے گی۔ ان شاء اللہ العزیز۔ نیز چونکہ جو اہل کتاب حضرت عیسیٰؑ پر ایمان نہیں لائے، اور عنقریب لائیں گے، وہ یہود ہی ہیں، تو یہ ہماری طرف سے تخصیص نہیں ہے، بلکہ سیاق عبارت سے مفہوم ہے، الا یہ کہا جائے کہ نصاریٰ کو یہودیوں کے تابع بنا کر تعبیر میں شامل کر دیا گیا ہے۔

اس مردود کا یہ الحاد بھی مخفی نہ رہے کہ اس نے صیغۂ استقبال کو حال کے لیے قرار دیا اور ارشاد باری: ''لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ'' میں مطلق ایمان مراد لیا، جو کتب شرع میں معروف ومشہور ہے، چناں چہ کہتا ہے کہ دونوں فریقوں کا ایمان متحقق ہے۔ الحاصل اس نے اس آیت پر ان کے ایمان مطلق کو موقوف ٹھہرایا، جو اساس دین اور ایمان کلی ہے۔ حالاں کہ آیت کریمہ میں ایک امر جزئی پر ایمان لانے کا حکم ہے۔

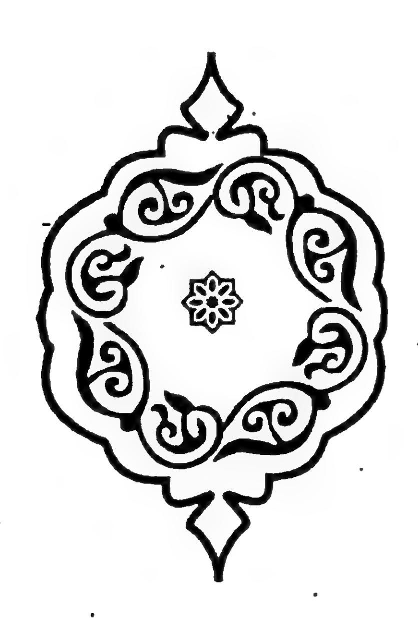
واضح رہے کہ ارشاد باری ''قَبْلَ مَوْتِهِ''، ''لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ'' کا ظرف ہے اور اگر اس ملحد کی بات مان لی جائے تو ''قبل موته'' کی حیثیت ایک اٹکل بچو بات جیسی ہو جائے گی (العیاذ باللہ، حالاں کہ قرآن اس سے محفوظ ہے) ''وما هو عنها بالحديث المرجم'' (اور وہ اٹکل بچو کہی ہوئی بات نہیں ہے) یا وہ اسے حال کا اعراب دیتا ہے۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ اس آیت کی بقیہ آٹھوں ضمیریں بالاتفاق حضرت عیسیٰ کی طرف راجع ہیں، پس اگر نویں کو اس کے خلاف لوٹایا جائے تو نظم قرآنی کے ربط کو توڑنا اور تتر بتر کرنا لازم آئے گا۔ علاوہ ازیں مراد یہ ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ پر لازماً ایمان لائیں گے، خواہ ان کی آخری زندگی میں ہی کیوں نہ ہو، یہ ان کے لیے مقدر ہو چکا ہے پس گویا غایت کا تعلق حضرت عیسیٰ سے ہے اگر خود ان اہل کتاب کی موت آیت میں مراد ہوتی تو ''قَبْلَ مَوْتِهِ'' کی جگہ ''عِنْدَ مَوْتِهِمْ'' کہا جاتا اور اس وقت اس استغراق سے پہلے ان لوگوں کا استغراق کرنا پڑتا، جو ایمان نہیں لائے۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ جو اہل کتاب گزر چکے ان میں سے بہت سوں نے ایمان قبول کیا اور بہت سوں نے حضرت عیسیٰ کا انکار حالاں کہ مراد وہ اہل کتاب ہیں، جو اس وقت موجود تھے او ر بتلانا یہ ہے کہ پہلے جو ان پر ایمان نہ لائے اور ان کے قتل کے درپے ہوئے، وہ بھی عنقریب ایمان لانے پر مجبور ہوں گے۔ پھر جب قرآن کریم دعوائے قتل کے اثبات ورد کی بابت اہل کتاب کی کتابوں سے کوئی اعتناء نہیں کرتا، تو اس کی کیا دلیل ہے کہ سولی دی جانے کی بابت ان کتابوں کو خاطر میں لایا ہو اور نفی صلب مآل کے لحاظ سے ہو۔ حالاں کہ سولی دی جانے کی تردید قتل کی تردید کے بعد ذکر کی گئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تردید بھی مستقلاً ہے پھر اگر یہ یہود ونصاریٰ کا رد ہے تو قتل وصلب کی نفی میں بھی ان کا رد ہونا چاہیئے یعنی یہ

کہ نہ تو وہ آپ کو کوئی تکلیف پہنچا سکے، نہ سولی دے سکے اور نہ ہی موت ہوئی۔ میرے کہنے کا حاصل یہ ہے کہ جب قرآن کریم ان کے رد کے درپے ہے اور ان کی کتب تاریخ کو کوئی اہمیت نہیں دیتا، تو اس کی جڑ اور بنیاد کو ہی اکھاڑ دینا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ: آیت توفی میں توفی سے مراد موت ہے اور رفع سے رفع درجات جو آپ علیہ السلام کی موت تک مستمر رہا، ہاں اسے قتل کے مقابلے میں زیادہ وضاحت سے ذکر کیا گیا، ورنہ موت تک رفع درجات ہوتا رہا اور اسی طرح تطہیر بھی مستمر رہی نیز اسی طرح: ''وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ'' بھی مستمر ہے اور موت کے وقت مکمل ہوگا، تو یہ بات اس لیے درست نہیں کہ اگر یہود نے انہیں قتل کر دیا ہوتا تو ایذاء اور افتراء تو خود بخود ختم ہو گئے تھے، حالاں کہ قرآن کریم نے ان دونوں کا ذکر کیا ہے اور ''جاعل الذين اتبعوك الخ کی بات تو اس وقت پوری ہوگی جب آپ علیہ السلام نازل ہوں گے اور چالیس سال زندہ رہیں گے، پھر موت ہوگی جیسا کہ آیت کریمہ:

''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ'' (مائدہ ۳)

''آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا''۔

میں استمرار ہے۔ الحاصل پورے قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کی کوئی دلیل سرے سے ہے ہی نہیں۔



قادیانیوں کولاجواب کریں

ملحدین کولاجواب کرنے کے حوالے سے اہل مناظرہ کے لیے ہدایات

یہ ہدایت دراصل کچھ سوالات ہیں، ملحدین کولاجواب اور خاموش کرنے کے لیے۔ ان کے ذریعے کتاب ہذا کا مطالعہ کرنے والوں کوانشاءاللہ مبحث کا اجمالی علم حاصل ہوگا اور بوقت مناظرہ فی البدیہہ مسکت سوالات پیش کرنے پر قدرت ہوگی۔

۱- کیا وجہ ہے کہ سورہ آل عمران میں یہودیوں کی ناپاک سازشوں کو بیان کرتے وقت حضرت عیسیٰ کے لیے چند وعدے تو بیان فرمائے گئے جیسے:

۱- توفی ۲- رفع ۳- تطہیر ۴- غلبہ متبعین

(چناں چہ ارشاد ہوا: ''یٰعِیسیٰ اِنِّی مُتَوَفِّیکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَهِّرُکَ مِنَ الَّذِینَ کَفَرُوْآ وَجَاعِلُ الَّذِینَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِینَ کَفَرُوْآ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ'' آل عمران:۵۵) لیکن یہ بات نہیں ذکر کی گئی کہ آپ کشمیر گئے اور وہاں ستاسی برس زندہ رہے (پھر وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے)۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے نہ اس کا تذکرہ کیا اور نہ اس کی طرف اشارہ کیا، تو پھر اس کا مأخذ کیا ہے؟ اور اگر اس کو مقدر مانا جائے تو کہاں؟ کیا ''توفی'' سے پہلے؟ تو اس کی کیا دلیل ہے؟ اور کیا یہ چیز یہودیوں کی شازشوں کے مقابلے میں مناسب ہے؟ یا وہ ''توفی'' جو اس ملحد کے نزدیک موت طبعی سے عبارت ہے؟ نیز یہودیوں کی شازشوں کو نیست ونابود کرنے میں موت طبعی کا کچھ دخل ہے، جو حسب عادت وقت مقررہ پر آتی ہے؟ اس لیے کہ اللہ رب العزت نے یہ نہیں فرمایا ''کہ ان کا مکر نہیں چل سکتا'' بلکہ فرمایا ''مکر اللّٰہ'' (اللہ نے تدبیر فرمائی) جو باری تعالیٰ کا فعل وجودی ہے، نیز ''توفی'' اور ''رفع'' کے درمیان نہ یہ انتقال واقامت حائل ہوسکتا ہے اور نہ تطہیر کے بعد اس کی گنجائش ہے، تو پھر اس مضمون کا کیا محل ہے؟ کیا آیت کے تمام مذکورات کے بعد، یا اس ملحد کے طریقے کے مطابق قیامت کے بعد اور جب ''توفی'' اور ''رفع'' کے معنی متعین ہیں، تو پھر خارج

میں حضرت عیسیٰ کی حفاظت وصیانت کے لیے اللہ تعالیٰ نے کیا تدبیر اختیار کی؟۔

۲- سورہ آل عمران کی وہ آیتیں، جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے وعدے کیے گئے ہیں، جب شروع شروع میں آپ علیہ السلام کے سامنے تلاوت کی گئیں، تو وہ صیغہ راز میں رہیں، آپ نے یہودیوں پر ظاہر نہیں کیا۔ پس اگر ''رفع'' بوقت وفات، رفع روح یا رفع درجات کے معنی میں ہو تو اس رفع کا کیا حاصل؟ کیوں کہ ''رفع'' اس معنی کر آپ علیہ السلام کو پہلے سے معلوم ہے اور ہر مقرب بلکہ ہر مؤمن کو حاصل ہے، وعدہ تو ایسی چیز کا ہوتا ہے جو پہلے سے حاصل نہ ہو، اور نہ یہ مطلق ہے جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے:

''وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ'' (البقرہ: ۲۵۳)

''اور بلند کیے بعضوں کے درجے''

کیوں کہ یہ ''توفی'' کے ساتھ مقید ہے اور کیا آپ -علیہ السلام- کے دنیا و آخرت میں صاحب مقام و مرتبہ ہونے، صلحاء و مقربین میں سے ہونے، نیز کلمۃ اللہ و روح اللہ اور اولوالعزم نبی و رسول ہونے کے بعد، اس رفعِ درجات میں کوئی شک وشبہ ہے؟ اور کیا اس رفع درجات کا، یہودیوں کے ہاتھوں سے آپ کو چھڑانے اور بچانے میں کوئی دخل ہے؟ جب کہ سیاق آیت میں نجات اور رہائی ہی کا تذکرہ ہے۔ نیز کیا اس سے پہلے آپؑ کی حفاظت کا وعدہ مفہوم ہوتا ہے؟ کیونکہ یہ رفع تو شہداء کو بھی بدرجہ اتم حاصل ہے پھر یہ کہ حضرت عیسیٰؑ کے لیے بالخصوص دونوں لفظوں (توفی اور رفع) کو جمع کرنے کی کیا وجہ ہے؟ جب کہ ایک لفظ بھی کافی تھا اور اللہ تعالیٰ نے کلمہ ''ثم'' کے ساتھ ''انی متوفیک ثم رافعک الیّ'' کیوں نہیں فرمایا، جب کہ اس مقام کے یہی زیادہ مناسب تھا؟

۳- اگر توفی اور رفع بمعنی رفعِ درجہ (جو ہر مؤمن کو حاصل ہے) یہودیوں کے مکر کو دفع کرنے کے لیے، اللہ تعالیٰ کی تدبیر لطیف ہے، تو ہر مومن کے ساتھ یہ تدبیر لطیف کیسے کی جائے گی؟ کیا اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ اور مخلوق کے تئیں اس کی عادت مستمرہ کو یہ کہا جائے گا کہ یہ حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ مخصوص ایک تدبیر لطیف ہے؟ یہ بات تو فہم سے بالاتر ہے۔

۴- اگر تطہیر سے مراد یہودیوں کے ہاتھوں آپ کی خلاصی اور رہائی ہے، تو یہ اس ملحد کے زعم کے مطابق ''توفیٰ'' اور ''رفع'' پر مقدم ہے اور اگر اس سے مراد خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی، یہودیوں کی تہمت اور الزام سے آپ علیہ السلام کی برأت کا اظہار ہے تو پھر باری تعالیٰ کے قول: ''وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا'' سے اسے مؤخر ہونا چاہئے۔ غرض ہر حال میں قرآن کریم کی ترتیب برقرار نہیں رہتی

اور یہ ملحد جو علماء اسلام پر یہ اعتراض کرتا تھا کہ انہوں نے کلمات کی ترتیب کو ضائع کر کے ان کلمات کو ان کی جگہوں سے ہٹا دیے اور اس کے نتیجے میں یہودی ہو گئے، یہ اعتراض خود اسی پر لوٹ آتا ہے اور اپنے اقرار کے مطابق خود یہودی ہو جاتا ہے۔

۵- اگر ''توفی'' سے مراد موت طبعی اور ''رفع'' سے مراد رفع درجات ہے، تو حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ ان دونوں لفظوں کو کیوں کر خاص کیا؟ جب کہ ایک لفظ دوسرے کو مستلزم ہے، نیز دوسرے لوگوں کو اس کی زیادہ ضرورت ہے۔ مناسب یہ تھا کہ معروف طریقے کے مطابق ''نفس'' کے لفظ کی تصریح کر دیتے، جیسا کہ ''سورۂ فجر'' میں ہے:

''یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ط ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً'' (الفجر: ۲۷-۲۸)

''اے وہ جی جس نے چین پکڑ لیا، پھر چل اپنے رب کی طرف، تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی''۔

نہ یہ کہ ضمیر خطاب کے ساتھ علی الترتیب چار وعدے ذکر کیے جاتے۔

۶- سورہ آل عمران کی مذکورہ آیت باتفاق مفسرین ومؤرخین وفد نجران کے سلسلے میں نازل ہوئی، جن کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کا رفع، رفع جسمانی ہے، اگر رفع جسمانی برحق نہ ہوتا تو کیا اس کی تردید کیے بغیر، قرآن بعینہٖ اسی لفظ کو لا سکتا تھا، جو وہ اس سے پہلے استعمال کرتے تھے، جس کے نتیجے میں وہ لوگ ہمیشہ کی گمراہی میں جا پڑتے اور ساتھ ہی مسلمان بھی؟

۷- جب قرآن نے ''رفع'' کی تصریح کر دی اور نزول عیسیٰؑ کے متعلق تواتر سے حدیث بھی آ گئی، جس میں اس واقعہ کے تمام اجزاء کا احاطہ ہے، تو کیا مسلمانوں کے لیے یہ جائز ہے کہ ان دونوں مضمونوں میں تحریف کریں اور ان الفاظ کو [جن میں ایک لفظ کی بناء دوسرے لفظ پر ہے] ایسے معانی پر محمول کریں، جن سے ان کا باہمی ربط اور توازن ختم ہو جائے؟ نیز یہ کہ جب رفع ونزول کے درمیان صنعت ''طباق'' (۱) ہے تو کیا نزول کو ''رفع'' کے مقابل کے علاوہ کسی اور معنی پر محمول کیا جا سکتا ہے؟ یا کسی نظیر ومثیل کے ظہور پر محمول کیا جا سکتا ہے؟ جس کے نتیجے میں موضوع الٹ جائے یعنی قائل نے جس مطابقت کی رعایت رکھی تھی وہ فوت ہو جائے؟

(۱) صنعت طباق محسنات بدیعیہ میں سے ایک صنعت ہے، جسے صنعت تضاد بھی کہتے ہیں، جس کا مطلب ہے کلام میں ضدین کو جمع کرنا۔ یعنی ایسے دو الفاظ لانا جن کے معنوں میں فی الجملہ تقابل اور ضد ہو۔ اس کی دو قسمیں ہیں: ۱- **طباق الایجاب**: یہ ہے کہ متضاد الفاظ کے ساتھ حرف نفی نہ ہو اور اس میں الفاظ متقابل ہوں، جیسے آیت کریمہ ''وَتَحْسَبُهُمْ اَیْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ'' (اور اے مخاطب! تو ان کو دیکھے تو جاگنے والا سمجھے گا، حالاں کہ وہ سو رہے ہیں) اس میں ''اَیْقَاظًا'' (جاگنے والے) اور ''رُقُوْدٌ'' (سونے والے) میں تقابل ہے۔ ۲- **طباق السلب**: یہ ہے کہ کلام میں ایک ہی مصدر کے دو فعل لائے جائیں، جن میں ایک فعل مثبت ہو اور دوسرا فعل منفی۔ جیسے: ''فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ'' (اور تم لوگوں سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو) یہاں ''وَلَا تَخْشَوْا'' (مت ڈرو) اور ''وَاخْشَوْنِ'' (ڈرو) میں تضاد ہے۔ (البلاغت: ۱۲۰) محمد صغیر

۸- جب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمادیا:

"وَمُطَهِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (آل عمران: ۵۵)

"اور پاک کردوں گا تجھ کو کافروں سے"۔

اور یہ بھی طے فرمادیا کہ اس وقت آپ کو ارضِ مقدسہ سے اور بنی اسرائیل کے درمیان سے [جو دراصل انبیاء علیہم السلام کی اولاد ہیں، لیکن حضرت عیسیٰ کی نبوت کے انکار سے کافر ہوئے] ہجرت کرنا ہوگا۔ تو کیا اللہ رب العزت آپ کو کشمیر جیسے کفرستان میں رکھے گا اور کیا اس طرح آپ کی روح میں تطہیر آئے گی؟ ہرگز نہیں۔ پھر یہ کہ جب "توفی" جسم پر واقع ہو، نیز "تطہیر" بھی جسم ہی کے لیے ہو، تو کیا درمیان سے رفع، جسم کے علاوہ کسی اور چیز کے لیے ہوگا؟۔

۹- جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ سے کہہ دیا:

"وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْآ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ (آل عمران: ۵۵)

"اور رکھوں گا ان کو جو تیرے تابع ہیں غالب، ان لوگوں سے جو انکار کرتے ہیں، قیامت کے دن تک"۔

اور حضرت موسیٰ سے ایسی کوئی بات نہیں فرمائی، تو کیا یہ مضمون بلاتکلف روزِ قیامت سے پہلے، حضرت عیسیٰ کے نزول کے علاوہ، کسی اور پر صادق آسکتا ہے؟

۱۰- کیا وجہ ہے کہ اللہ رب العزت نے حضرت عیسیٰ کے علاوہ دوسرے انبیاء کرام کے قتل کے متعلق رفع کا ذکر نہیں فرمایا، حالاں کہ ان کو، اس کی زیادہ ضرورت تھی، کیونکہ نعوذ باللہ یہودیوں کے زعمِ باطل کے مطابق یہ انبیاء کرام جرائم کی بنیاد پر قتل ہوئے اور ان کی شریعت میں ایسا ہر مقتول قابلِ لعنت ہے، لہٰذا اگر "رفع" "لعنت" کا مقابل ہے [جیسا کہ یہ ملحد کہتا ہے نہ کہ اس سے مراد رفع جسمانی ہے] تو یہ انبیاء کرام زیادہ مستحق تھے کہ ان کے بارے میں رفع ذکر کیا جائے۔

۱۱- اگر "توفی" "اماتت" کے معنی میں ہو، تو اس میں یہودیوں کی تردید کی گنجائش نہیں اور نہ حضرت عیسیٰ کے لیے سامانِ تسلی ہے، الا یہ کہ مفہوم مخالف مراد لیا جائے، یعنی یہودیوں کے ہاتھوں نہ قتل ہونا۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ نساء میں یہودیوں کی تردید میں عدمِ قتل کی تصریح ہے (چناں چہ ارشادِ ربانی ہے: "وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ" (النساء: ۱۵۷) اور انہوں نے نہ اس کو مارا اور نہ سولی پر چڑھایا) یہ جواب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے یہودیوں کو دیا گیا، برخلاف آیت آل عمران: "اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ" کے، جس میں حضرت عیسیٰ سے وعدہ تھا، جو مقدم ہے۔ اس لیے یہاں منطوق کو ذکر کرنا زیادہ ضروری تھا، حالاں کہ یہاں صرف لفظ "توفی" ذکر کیا گیا جو ناکافی ہے۔ پس قرآن نے، آل عمران میں (جو کہ مقدم ہے) منطوق

کے ذکر کو چھوڑ کر صرف مفہوم پر کیوں کر اکتفاء کیا؟ یہ تو عام طریقے کو چھوڑ کر عرض کلام پر اکتفاء کرنا ہوا؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے، جب کہ توفی کا اطلاق اس جیسے موقعوں پر بھی ہوتا ہے، چناں چہ کہا جاتا ہے: ''کانت وفاۃ زید علی ید عمرو ضربه بالسیف فمات من حینه'' (زید کی وفات عمر کے ہاتھوں ہوئی، بایں طور کہ اس نے زید کو تلوار سے مارا، جس کے سبب وہ اسی وقت مر گیا)

امام ترمذی نے حضرت عبداللہ بن حرام کی بابت ان کے لڑکے حضرت جابر کے اس قول کو نقل کیا ہے جو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا:

''ان عبد اللّٰه مات و ترک سبع بنات''. (ترمذی ج: ۱، ص: ۲۰۸)

''عبداللہ نے اپنی وفات کے وقت سات بیٹیاں چھوڑیں''۔

یہاں لفظ موت استعمال کیا، حالاں کہ حضرت عبداللہ غزوۂ احد میں شہید ہوئے، ایسے ہی اللہ رب العزت نے حضرت یحیٰؑ کے متعلق فرمایا:

''وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا'' (مریم: ۱۵)

''اور سلام ہو اس پر جس دن پیدا ہوا اور جس دن مرے اور جس دن اٹھ کھڑا ہو زندہ ہو کر''۔

یہاں بھی لفظ موت استعمال کیا گیا اس کے باوجود آپ کی شہادت طے فرمادی۔

پھر یہودیوں کی تردید میں اماتت کا معنیٰ کیسے صحیح ہوگا؟ اس لیے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اماتت اس وقت ہوئی جس وقت وہ قتل کی سعی کر رہے تھے، تو گویا اللہ تعالیٰ نے ان کے مطلوب میں جلدی کی اور یوں فرمایا: ''اسے قتل نہ کرو، میں خود ابھی مار دے رہا ہوں اور تمہاری طرف سے کافی ہوں'' اس صورت میں یہود کا جو اختلاف ہے، وہ صرف اعتباری رہ جاتا ہے، کہ العیاذ باللہ! اللہ تعالیٰ نے انہیں خود مارا، لیکن یہود یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے قتل کیا، تو اس صورت میں اصل مقصد یعنی موت عیسیٰؑ متحقق ہے، حالاں کہ یہود کی تردید کے لیے کوئی مشاہد نشان ظاہر نہ ہوا، بلکہ یہ سارا معاملہ اللہ تعالیٰ کے علم پر محول کردیا گیا اور اگر اماتت مؤخر ہو اور وقت مقررہ پر آئے تو گویا اللہ تعالیٰ نے ایسی چیز کا تذکرہ کیا، جس کا آپ کی رہائی میں کوئی دخل نہیں، اور مقصد اصلی کو ترک کردیا، یہ تو کلام کا عیب ہوگا، جس سے قرآن کریم کی حفاظت ضروری ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کی سنت میں ایسی کوئی نظیر موجود ہے کہ کسی کی موت اس بناء پر جلدی آئی ہو کہ اللہ تعالیٰ اسے، دشمنوں سے محفوظ کرنا چاہتے تھے؟۔

۱۲- بلاشبہ اگر اللہ تعالیٰ یوں فرماتا: ''يٰعِيْسٰى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ ثُمَّ رَافِعُكَ اِلَىَّ، ثُمَّ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ'' (یعنی بجائے حرف عطف ''واؤ'' جو کہ مطلق جمع کے لیے ہے، کلمہ ''ثم'' کے ساتھ ذکر کرتے جو تراخی کے لیے ہے) تو واقعہ کی

زیادہ وضاحت ہوتی، اس کے باوجود ''واؤ'' استعمال کیا، کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام وعدوں کو یکبارگی پورا کرنے کا ارادہ فرمایا ہے، نہ یہ کہ یہ وعدے علی الترتیب واقع ہوں گے، بایں طور کہ پہلے توفی ہوگی یعنی آپ کو پورا پورا لے لیا جائے گا، جس کے نتیجے میں رفع کا تحقق ہوگا اور رفع سے تطہیر کا، پھر رفع کے تحقق سے آپ کے متبعین کا کفار پر غلبے کا بھی تحقق ہو جائے گا، گویا یہ آپ کے متبعین کے غلبے اور برتری کی دلیل ہے۔ چوں کہ چوتھا وعدہ تیسرے وعدے کا عین نہیں ہے، اس لیے یہاں ''جَاعِلُ الَّذِیْنَ'' کا لفظ بڑھا دیا، گویا یہ جعل مستانف کا محتاج ہے، اسی لیے ''ومعلی الذین اتبعوک علی الذین کفروا'' نہیں فرمایا۔ جس طرح ارشاد باری ''ومکروا'' یہودیوں کی ناپاک سازشوں کا جامع اور ''وَمَکَرَ اللّٰہُ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ'' اللہ تعالی کی حکمت وتدبیر کا جامع ہے، اسی طرح ارشاد باری ''اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ'' (یعنی میں تجھے اپنے قریب جائے امن میں رکھ کر محفوظ رکھوں گا) پورے کلام کا مغز ہے اور باقی چیزیں اس کے لئے اسباب کے درجے میں ہیں، اسی وجہ سے اس لفظ کو مقدم کیا، اگر توفی کا معنی نزول مسیح کے بعد موت ہو تو یہ محض اشارۃ النص کے درجے میں رہا نہ کہ عبارۃ النص۔ پھر یہ کہ اگر توفی مثلاً موت کے معنی میں ہو تو کیا توفی اور رفع کی ترتیب میں قرآن کی ترتیب ناکافی ہے جب کہ اولاً سورہ نساء میں رفع کا ذکر فرمایا (چناں چہ ارشاد ہے ''رَفَعَهُ اللّٰہُ اِلَیْهِ'' (النساء:۱۵۸) (اس کو اٹھا لیا اللہ نے اپنی طرف'')

اور اسی پر اکتفاء کیا، توفی کا ذکر نہیں کیا بلکہ اس کو سورہ مائدہ کے لیے چھوڑ دیا جہاں قیامت کا ذکر ہے چناں چہ فرمایا:

''فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ'' (المائدہ:۱۱۷)

''پھر جب تو نے مجھ کو اٹھا لیا تو تو ہی تھا خبر رکھنے والا ان کی''۔

یہاں تک مؤخر کر کے ان دونوں کے درمیان ترتیب کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔

۱۳- جب یہود کا یہ عقیدہ ہے کہ قتل اور رفعِ درجہ، دونوں جمع نہیں ہو سکتے، اس لیے کہ قتل، لعنت کو اسی طرح مستلزم ہے، جس طرح رفع عدم قتل کو، اس سے نتیجہ قضیۃ مانعۃ الجمع حاصل ہوا (کہ جو مقتول ہوگا اس کو رفع درجہ حاصل نہیں ہو سکتا اور جس کو رفع درجہ حاصل ہوگا وہ مقتول نہیں ہو سکتا) اور یہودیوں کے ساتھ ''مجاراۃ مع الخصم'' کا معاملہ کرتے ہوئے رفع کا ذکر کر کے قتل کی نفی کر دی اور اس سے اس طرح اس پر استدلال بھی کیا۔ ہو سکتا تھا کہ کوئی شخص یہودیوں کے ہاتھوں انبیاء کرام کے قتل سے ان کے عدم رفع یعنی لعنت پر استدلال کرے (نعوذ باللہ من ذلک) تو کیا قرآن نے اس طرح ان انبیائے کرام کے سلسلے میں یہود کی بات تسلیم کر لی (کہ یہ لوگ جرائم پیشہ تھے، اس لیے انہیں قتل کیا گیا) کیوں کہ ارشاد باری: ''فَبِمَا

نَقْضِهِمْ مِيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ" سے "بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ" تک تمام آیتوں کا سیاق وسباق ایک ہی ہے(۱)۔ تو کیا قرآن کے معجز نظم میں اس طرح کا نقص اور صریح باطل کا گزر ہوسکتا ہے؟ عیاذا باللہ لا الہ الا ھو۔

۱۴- جب قتل اور رفع درجات کے درمیان علی الاطلاق منافات نہیں بلکہ بعض صورتوں میں قتل رفع درجات کو مستلزم ہے (جیسا کہ موت شہادت) تو پھر قرآن کریم نے "وَمَاقَتَلُوْهُ يَقِيْناً" اور "بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ" میں تقابل کیسے کیا؟ اگر مجاراۃ مع الخصم کا طریقہ اپنایا ہے تو کیا ایک جگہ اس غلط بات کی تردید کی اور دوسری جگہ اسی غلط بات پر سکوت اختیار کر کے بہ طریق مجاراۃ اس کو برقرار رکھا؟ اور اگر یہ کہا جائے کہ صلب، رفع کے منافی ہے نہ کہ مطلقا قتل، جس کا تذکرہ ماقبل میں آچکا ہے، تو پھر قتل اور رفع کو مقابل کیوں ٹھہرایا گیا؟ یہ تو اصل مقابل (صلب) کو ترک کر کے اس کے غیر، بلکہ خلاف مقصود کو ذکر کرنا ہوا، حالاں کہ اس موقعہ پر "وَمَاصَلَبُوْهُ يَقِيْناً" کہنا زیادہ بلیغ اور احتمال کو زیادہ ختم کرسکتا تھا، نیز صحت وصواب سے قریب تر تھا۔ کیا یہ کلام ربانی میں باعث عیب اور از قبیل پہیلی نہیں ہے؟ نیز جب یہودیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ کسی بھی جرم پر مقتول ہونا مطلقا لعنت کو مستلزم ہے (خواہ سولی دے کر ہو یا کسی اور طرح سے تو فقط صلب (سولی) کو رفع کے منافی کہنا بے معنی بات ہوگی)

۱۵- اگر "وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْناً ط بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ" سے اللہ رب العزت کا مقصد، یہودیوں کی تردید تھی، جسے ذکر نہ کر کے پوشیدہ رکھا، تو پھر "وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ" میں غیر مقصود بلکہ خلاف مقصود کو کیوں کر ذکر کیا؟ یہ تو کلام کا ایک نقص یا چیستاں ہے اور کیا ایسی باتیں اہل عرب کے سامنے بیان

(۱) مکمل آیات ملاحظہ ہوں: "فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ط بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَايُؤْمِنُوْنَ اِلَّاقَلِيْلًا٥ وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا٥ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَاقَتَلُوْهُ وَمَاصَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ط وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ط مَالَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ج وَمَاقَتَلُوْهُ يَقِيْنًا٥ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ط وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا٥ (النساء: ۱۵۵-۱۵۸)

"(ان کو جو سزا ملی) سو ان کی عہد شکنی پر اور منکر ہونے پر اللہ کی آیتوں سے اور خون کرنے پر پیغمبروں کا ناحق اور اس کہنے پر کہ: ہمارے دل پر غلاف ہے، سو یہ نہیں بلکہ اللہ نے مہر کردی ان کے دل پر کفر کے سبب، سو ایمان نہیں لاتے مگر کم۔ اور ان کے کفر پر اور مریم پر بڑا طوفان باندھنے پر اور ان کے اس کہنے پر کہ: ہم نے قتل کیا مسیح عیسی مریم کے بیٹے کو جو رسول تھا اللہ کا اور انہوں نے نہ اس کو مارا اور نہ سولی پر چڑھایا؛ لیکن وہی صورت بن گئی ان کے آگے اور جو لوگ اس میں مختلف باتیں کرتے ہیں تو وہ لوگ اس جگہ شبہ میں پڑے ہوئے ہیں، کچھ نہیں ان کو اس کی خبر، صرف اٹکل پر چل رہے ہیں اور اس کو قتل نہیں کیا بیشک؛ بلکہ اس کو اٹھالیا اللہ نے اپنی طرف اور اللہ زبردست حکمت والا ہے)"۔ محمد صغیر پرتاپ گڑھی۔

کرنا، جنھیں یہودیوں کے مسلمات اوران کے مخفی خیالات کا کچھ اندازہ ہی نہ ہو، بالکل ایسا نہیں ہے، جیسے کوئی شخص مخاطب کے سامنے ایسی اصطلاح پیش کرے، جواس کی اپنی ہی طبع زاد اور خانہ ساز ہو۔

۱۶- جب اللہ تعالیٰ نے ''وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَاصَلَبُوْهُ'' میں صراحتاً قتل اور سولی کی نفی کرتے ہوئے اس کی بنیاد ہی ختم کردی، تو پھر کسی مسلمان کے لیے یہ کہنا کس طرح جائز ہوگا کہ سولی تو دی گئی، لیکن ان کی موت نہیں ہوئی۔ رہی بات تاویل وتلبیس کی، تو اسے ہر کوئی کرسکتا ہے (ہر شخص اپنے من کی گھڑ کر، نصوص میں تاویلات فاسدہ کر کے اسے مدلل کرسکتا ہے۔ مگر کیا آخرت میں بھی یہ تاویلات چل جائیں گی اور وہ شخص جواب دہی سے بچ جائے گا؟)۔ جس طرح شیطان نے عمرو بن لحی کے دل میں کلمات تلبیہ کے ذیل میں ''لاشریک لک الاشریکاھولک تملکه ومالک'' کا القاء کردیا تھا (اسی طرح قرآن کریم میں بہت سی جگہوں پر کفار کی تاویلات کا ذکر ہے، اس کے باوجود ان کی تکفیر کی گئی، لہٰذا یہاں بھی اگر نص قطعی کے خلاف کوئی تاویل کرے گا، تو اس کی بھی تکفیر کی جائے گی)

۱۷- اگر ارشاد باری: ''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ'' سے بوقت نزع اہل کتاب کا آپ علیہ السلام پر ایمان لانا مراد ہوتا، تو کیا اسے اس طرح ادا کرنا مناسب نہ ہوتا ''وان من اھل الکتب الا لیؤمنن بِهٖ عند موته'' (اور اہل کتاب کا ہر فرد بوقت موت آپ پر ایمان لے آتا ہے) یا کوئی دوسری تعبیر، جس میں زمانۂ مستقبل کی صراحت ہوتی؟۔

۱۸- جب ''وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ'' میں نص قرآنی نے قتل اور رفع کے درمیان صنعت طباق اور مقابلہ کا لحاظ کیا، نیز طرداً وعکساً جامع کلام پیش کیا، یعنی قتل کی نفی کر کے اس کی ضد- رفع -کا اثبات کیا اور طرد وعکس مراد متکلم اور اس کے مقصود میں صریح تر ہوا کرتا ہے، چناں چہ مقولہ ہے: ''وبضدھا تتبین الاشیاء'' یعنی اشیاء اپنی اضداد سے ظاہر اور واضح ہوتی ہیں۔ تو کیا اس سے انحراف کر کے ان خودساختہ اعتبارات کا لحاظ کیا جائے گا، جن کی شریعت میں کوئی گنجائش اور قیمت نہیں ہے۔ پھر یہ کہ جب رفع روح، موت کے بعد ہوئی، تو پہلے موت کا ذکر مناسب تھا، سورہ نساء میں موت مسیح کا تذکرہ کہاں ہے؟ بلکہ وہاں تو یہ فرمایا گیا: ''وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا'' جس کا تعلق یقیناً حیات سے ہے، نیز اسی حیات ہی کے بارے میں فرمایا: ''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ'' یہ عدم قتل اور رفع، آپؑ کی زندگی کی دو حالتیں ہیں جو ایک ہی مورد ومحل پر واقع ہوئی ہیں، نہ کہ موت وحیات الگ الگ مورد کے اعتبار سے ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ دونوں ایک موضوع سے متعلق دو حالتیں ہیں نہ کہ دو موضوع سے، کیوں کہ قضیہ مانعۃ الجمع کے اجزاء میں سے ایک کے اثبات سے دوسرے کی نفی کا نتیجہ نکلتا ہے، پس وہ اثبات یعنی رفع اور یہ نفی یعنی عدم قتل: دونوں چیزیں وقت حیات میں جمع

ہو جائیں گی اور اگر رفع موت کے بعد ہوتا تو پہلے موت کا ذکر کیا جانا ضروری تھا، حالاں کہ ''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ'' میں حیات کی تصریح ہے۔

۱۹- جب یہود کا کہنا یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کا قتل، قتل لعنت ہے (العیاذ باللہ) حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی واضح تردید کرتے ہوئے، سرے سے قتل عیسیٰ ہی کی تردید کردی ہے، تو پھر لازمۂ قتل، لعنت کا تحقق کیسے ہوسکتا ہے؟ اب سوال یہ ہے کہ ارشاد باری: ''وَمَا قَتَلُوْهُ'' لعنت کو چھوڑ کر صرف قتل کی نفی کرتا ہے، یا یہ نفی اس قتل کے لحاظ سے آئی ہے، جو اپنے لازم یعنی لعنت کے ساتھ مقرون ہے؟ جب پہلی شق متعین ہے تو کیا ''رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ'' کے مقابلے میں نفس قتل کا لحاظ ہوگا، یا اس متروک کا بھی اعتبار ہوگا؟ آپ ہی بتائے کہ ''لم يكن هناك قتل فضلا أن يكون لعن بل رفعه الله'' جیسی عبارت میں آپ کا ذوق کیا فیصلہ کرتا ہے؟ ظاہر ہے کہ سرے سے قتل ہی کا تحقق نہیں ہوا، تو قتل لعنت کیسا؟۔ نیز'' هذا الذى ادعى النبوة فى الفنجاب، لم يكن مومنا، بل اخزاه الله و القاه فى الدرك الا سفل، فكيف ان يكون مهد يا اونبيا او مسيحاً ؟و أنهٔ لم يكن عالماً بل جا هلاً محضاً، فكيف ان يكون محققاًموفقاً ؟ (پنجاب کا یہ مدعی نبوت مومن ہی نہیں ہے، بلکہ اللہ نے اسے رسوا کیا اور اسے سب سے نچلے طبقے میں ڈال دیا، تو یہ مہدی، یا نبی، یا مسیح کیسے ہوسکتا ہے، یا یہ کہ یہ عالم نہیں، بلکہ جاہل مطلق ہے، تو پھر کامیاب محقق کیسے ہوسکتا ہے؟) کیا اس عبارت میں جہالت، علم کے مقابل میں آئی ہے، یا تحقیق اور توفیق کے؟

۲۰- ارشاد باری: ''وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْناً'' کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت یہود نامسعود، حضرت عیسیٰ کو قتل کرنے کی تدبیر کر رہے تھے اس وقت قتل نہ کرسکے، بلکہ اللہ نے اپنی طرف اٹھالیا، الحاصل ''وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْناً'' جس زمانے کے متعلق ہے، اسی زمانے کے متعلق ''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ'' بھی ہے۔ دوسرا پہلے کی جگہ اتر آیا، پس اگر ایک طویل زمانے تک ثانی، اول سے مؤخر ہو تو ان دونوں میں ربط کیسے پیدا ہوسکتا ہے؟ نیز اس پر قرآن یا تاریخ کی کونسی شہادت دلالت کرتی ہے؟ کیا یہ شیطان کی وسوسہ اندازی نہیں ہے، جو اس نے اپنے دوستوں کے دلوں میں جاگزیں کردی ہے؟

۲۱- اگر ارشاد باری: ''وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْناً بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ'' سے مراد قتل کی نفی اور موت کا اثبات ٹھہرا تو تقدیری عبارت یوں ہوئی کہ گویا انھوں نے کہا ''نحن قتلناه'' (ہم نے عیسیٰ -علیہ السلام- کو قتل کیا) جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''بل الله'' (نہیں بلکہ اللہ نے -قتل کیا-) تو کیا یہ مناسب جواب اور ان کے اوپر رد کی صلاحیت رکھتا ہے؟ جب کہ اس وقت حضرت عیسیٰ کی حیات منقطع ہوچکی اور بحث صرف موت کی صورت پر قائم رہ گئی، کہ وہ قتل سے ہوئی، یا خدا کے موت دینے سے؟ اور کیا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے قتل کی کوشش کے وقت

میں حیات کا منقطع ہو جانا ناکامی کی علامت ہے؟ ایک دشمن کو تو اپنے دشمن کی موت سے سروکار ہوتا ہے، خواہ وہ خود اسے قتل نہ کرے۔ نیز کیا ایسی صورت میں اپنی ذات کی طرف منسوب کر کے اور اپنا فعل قرار دے کر، باری تعالیٰ کا کہنا بجا ہے: ''بَلْ رَّفَعَهُ اللهُ اِلَيْهِ'' ؟ یا یہ کہنا مناسب تھا ''وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْناً بل مات حتف انفه'' (بالیقین انھوں نے آپ کو قتل نہیں کیا، بلکہ آپ کی طبعی موت ہوئی) پس معلوم ہوا کہ ''وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْناً ۝ بَلْ رَّفَعَهُ اللهُ اِلَيْهِ'' میں قتل کی نفی اور زندگی کا اثبات ہے جو اہلِ اسلام کا عقیدہ ہے۔

۲۲- جب قرآن نے نیند پر بھی لفظ ''توفی'' کا اطلاق کیا ہے اور یہ اطلاق قرآن ہی سے معلوم ہوا، نیز جس نے بھی یہ مفہوم سمجھا، قرآن سے ہی سمجھا، تو کیا یہ لفظ اسی معنی تک محدود رہے گا؟ یا ہر اس مقام کے لیے گنجائش ہوگی، جہاں یہ لفظ آ سکے؟ لہٰذا اس کا انکار نفاق خفی یا کھلی حماقت کے سوا کچھ نہیں۔

۲۳- کیا مثیلی نزول، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے علاوہ کسی اور نبی کے لیے بھی متحقق ہے یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ خاص ہے؟ اگر مخصوص نہیں تو متواتر حدیثوں میں لفظاً اور ذکراً حضرت عیسیٰ ہی کو کیوں خاص کیا، ان کے غیر کو کیوں نہیں لائے؟

۲۴- حضرت عیسیٰ کی موت کا قائل نہ امت مرحومہ کا کوئی فرد ہے اور نہ ہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ بدبخت، امام مالک، بخاری، ابن حزم، ابن تیمیہ اور ابن قیم رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے حضرات پر افتراء پردازی کر کے (کہ یہ حضرات موت مسیح کے قائل تھے) اللہ تعالیٰ کی لعنت کا مستحق ہوا۔ کیا یہود نا مسعود کے علاوہ متقدمین میں سے کسی کا یہ عقیدہ تھا؟ اور کیا یورپ کے، اس وقت کے بعض نصاریٰ کے علاوہ اور کوئی ظہور مثیل کا قائل ہے؟ حق تو یہ ہے کہ اس کا دین یہودیت اور نصرانیت کے درمیان ایک نیا دین ہے اور اسے چاہیے کہ انھیں دونوں کو اپنا اوڑھنا، بچھونا اور اپنا آئیڈیل بنائے (اور اسلام سے خارج ہونے کا اعلان کر دے) العیاذ باللہ۔

۲۵- اگر کوئی فرض کرنے والا موت مسیح، فرض بھی کرے، تو کیا اس سے اس ملحد کا دعوا سچا ہو سکتا ہے؟ نیز کیا بلا دلیلِ خصوص کسی کی موت سے دوسرے کی حیات ثابت ہو سکتی ہے؟ کیا یہ عوام کو فریب دینا نہیں ہے، جس کے سبب یہ بدبخت علماء کے نزدیک ذلیل و رسوا ہوا، اسی جیسے لوگوں کے لیے کہا گیا ہے: ''ان السفیه اذا لم ينه مامو ر'' (بیوقوف کو جب تک منع نہ کرو وہ مامور ہے) اس بدبخت کی عادت یہ ہے کہ جب اس کے سامنے ان چیزوں کو بطور اعتراض پیش کیا جاتا ہے، جو موجب دخول نار ہیں، تو وہ اسے دفع نہ کر سکنے کی صورت میں انبیاء علیہم السلام پر اعتراض کرنے لگتا ہے۔ حاصل یہ کہ انبیاء پر اعتراض کر کے اپنے اوپر سے اعتراض کو دور کرتا ہے، اس کے پاس اس کے سوا اور کچھ تو ہے بھی نہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اسے رسوا اور نامراد کیا۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

آیات سورہ مائدہ اور موضوع زیر بحث

ہماری بحث سے متعلق سورہ مائدہ کی آیتوں کی بابت مفسرین نے جو کچھ ذکر کیا ہے، اسے یہاں اختصاراً بیان کیا جاتا ہے۔

''يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ......''

صاحب ''البحر المحیط'' ارشاد باری:

''يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَا ذَا اُجِبْتُمْ قَالُوْا لَاعِلْمَ لَنا اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ''
(المائدہ: ۱۰۹)

''جس دن اللہ جمع کریگا سب پیغمبروں کو، پھر کہے گا، تم کو کیا جواب ملا تھا؟ وہ کہیں گے ہم کو خبر نہیں، تو ہی ہے چھپی باتوں کو جاننے والا''۔

کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ: ماقبل سے اس آیت کی مناسبت یہ ہے کہ اس سے پہلے اللہ تعالی نے گواہان وصیت کی بابت فیصلے کی اطلاع دی اور سمع وطاعت، نیز تقوی اور پرہیز گاری کا حکم دیا، اس کے بعد خوفناک دن (قیامت) کا تذکرہ کیا، اس طرح شہادت وگواہی میں تحریف کرنے، تقوی اور سمع وطاعت سے کنارہ کشی اختیار کرنے، والوں کے لیے دنیا کی ذلت ورسوائی اور آخرت کی سزا دونوں جمع کر دیں۔

مزید لکھتے ہیں کہ: امام ابوعبداللہ رازی فرماتے ہیں کہ علم اصول کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ ''علم'' اور ''ظن'' دونوں الگ الگ ہیں اور یہ کہ ہر شخص کو دوسرے کے بارے میں ظن ہی حاصل ہے، علم نہیں۔

اسی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''نحن نحكم بالظواهر والله يتولى السرائر'' (التفسير الكبير للرازی: ۱۰۲/۱۲)

''ہم ظاہری حالات پر فیصلہ کرتے ہیں، مخفی باتوں کا ذمہ دار تو اللہ ہے''۔

نیز ارشاد نبوی ہے:

''انكم تختصمون الیّ ولعل بعضكم الحن بحجته من بعض فمن قضيت له بحق

اخیه شیئاً بقوله فانما أقطع له قطعة من النار فلا یأخذها" (بخاری: ۳۶۸/۱)

"تم لوگ میرے پاس مقدمہ لاتے ہو اور یہ ممکن ہے کہ (مدعی اور مدعا علیہ میں سے) ایک دوسرے سے زیادہ بہتر طریقہ پر اپنا مقدمہ پیش کرے، اس لئے اگر میں نے کسی فریق کے لیے اس کی (اچھی) بحث کے نتیجے میں اس کے بھائی کے حق کا فیصلہ کر دیا، تو اس کے سوا کچھ نہیں ہوا کہ میں نے دوزخ کا ایک حصہ اسے دے دیا ہے، اس لیے وہ اس کو نہ لے"۔

اور ارشاد انبیاء علیہم السلام ہے:

"لاعلم لنا البتة باحوالهم، انما الحاصل عندنا من احوالهم هو الظن" (التفسیر الکبیر للرازی: ۱۰۲/۱۲)

"ہم گروہ انبیاء کو، لوگوں کے حالات کا یقینی علم نہیں ہے، بلکہ ظن ہے"۔

معلوم ہوا کہ دنیا میں ظن ہی کا اعتبار ہے، کیوں کہ دنیا میں احکام کی بنیاد ظن ہی پر ہے، ہاں آخرت میں ظن کا مطلق اعتبار نہیں۔ اس لیے کہ آخرت میں احکام کی بنیاد اشیاء کے حقائق اور باطنی امور پر ہے۔ اسی وجہ سے انبیاء کرام نے علم کی نفی کرتے ہوئے فرمایا "لاعلم لنا" اور جو ظن انھیں حاصل ہے، اس کا قطعاً ذکر نہ کیا، کیوں کہ قیامت میں ظن کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔

"وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسٰی......"

نیز ارشاد باری:

"وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ......" الایة (المائدہ: ۱۱۶)

"اور جب کہے گا اللہ اے عیسیٰ مریم کے بیٹے! تو نے کہا لوگوں کو... الخ"

کے متعلق حضرت ابن عباس، قتادہ اور جمہور مفسرین کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: "اس ارشاد باری کا تعلق، روزِ قیامت سے ہے، حق جل مجدہ بر سر عام تمام لوگوں کی موجودگی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے یہ بات فرمائیں گے، جس سے کفار کو اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ ان کا عقیدہ باطل تھا۔

اور ارشاد باری:

"فَاِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ" (المائدہ: ۱۱۸)

"تو ہی ہے زبردست حکمت والا"۔

کی بابت اہل سنت کا قول نقل کرتے ہیں کہ: اس سے حضرت عیسی علیہ السلام کا مقصد تمام امور کو اللہ تعالی کے حوالے کرنا اور کسی درجے میں بھی اعتراض سے گریز کرنا ہے، اسی وجہ سے اپنی گفتگو: "فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ" پر ختم کی، جس کا مفہوم یہ ہے کہ: اے اللہ! تو جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے اور اس پر مکمل قدرت رکھتا ہے، تیرے اوپر کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

کلمہ ''اذ'' کی تحقیق

واضح ہو کہ جس طرح نحویوں کے نزدیک گذری ہوئی چیز کو صیغۂ مستقبل سے تعبیر کر دیا جاتا ہے، جسے وہ حکایتِ حال اور استحضار کا نام دیتے ہیں، درج ذیل اشعار میں یہی صنعت مستعمل ہے:

فمن ينكر وجود الغول منكم ۞ اخبر عن يقين بل عيان

''تم میں سے جس کسی کو بھوت پریت کے وجود سے انکار ہو، (تو اس کو) میں یقین بلکہ مشاہدہ کی خبر دیتا ہوں''۔

باني قد لقيت الغول تهوى ۞ بسهب كا لضحيفة صحصحان

''کہ میں نے پلیٹ کی طرح ہموار و کشادہ میدان میں بھوت پریت کو اترتے ہوئے دیکھا''۔

فاضربه فأ دهشه فخرت ۞ صريعا لليدين وللجران

''تو ان کی پٹائی کر کے مدہوش کر دیا، جس کی وجہ سے ہاتھوں اور چہروں کے بل گر پڑے''۔

اسی طرح مستقبل میں پیش آنے والی چیز کو بھی صیغۂ ماضی سے تعبیر کر دیا جاتا ہے، تا کہ آئندہ آنے والی چیز کو کھینچ کر نگاہوں کے سامنے اور مخاطب کے دیکھنے و سننے کی جگہ پر حاضر کر دیا جائے اور اس کی تعبیر بہت دفع لفظ ''اذ'' سے کی جاتی ہے، بالخصوص قرآن کریم میں؛ چناں چہ بہت سی آیات کا آغاز ''اذ'' سے کیا گیا ہے اور گذشتہ یا آئندہ امور کی یاد دہانی، نیز قاری کی توجہ ان امور کی طرف مبذول کرانے اور اس کے خیال کا رخ اس طرف پھیرنے کے لیے کلمہ ''اذ'' کا استعمال قرآن کریم میں بکثرت ہوا ہے۔ حکایت حال کی طرح استحضار مستقبل کا ذکر نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ نحاۃ نے سمجھا کہ یہاں استحضار ہی کلمہ ''اذ'' کا مدلول ہے، گویا کلمہ ''اذ'' نے ہی اسے حاضر بنا دیا؛ لہٰذا انھوں نے اسے ہی کافی سمجھا۔ البتہ علامہ نیسا پوری نے اس موقع پر اپنی تفسیر میں بطور حکایت مثال پیش کرتے ہوئے فرمایا: مثلاً کسی نے اپنے ساتھی سے کہا: ''كانك بنا وقد دخلنا بلدة كذا وصنعنا كذا'' (گویا تم ہمارے ساتھ تھے، جب ہم فلاں شہر میں داخل ہوئے اور فلاں کام کیے) یہی اصول اس سلسلے میں امر فیصل ہے۔

اس سے بیان کا مقصد کبھی یہ ہوتا ہے کہ جب کسی فعل کا وقوع اور تحقق زمانۂ مستقبل میں یقینی طور پر ہوگا تو اس کی تعبیر کی کیا صورت ہوگی؟ ایسے موقع پر اسی شئ مستقبل کے وقوع کو، لازماً صیغۂ ماضی سے تعبیر کیا جائے گا۔ حالاں کہ وہ شئ درحقیقت مستقبل میں وقوع پذیر ہوگی، لیکن مقصد یہ بتانا ہوتا ہے کہ جب وہ چیز مستقبل میں گذرے گی اور وجود کے تحت داخل ہوجائے گی، تو اس کی کیا صورت ہوگی؟ ایسے موقع پر کلمہ ''اذا'' ماضی پر داخل کیا جاتا ہے، کیوں کہ کلمہ ''اذا'' کا کام صرف ماضی کو مستقبل کے معنی میں کرنا نہیں ہے، بلکہ یہ بھی بیان کرنا ہے کہ جب وہ چیز زمانۂ مستقبل میں واقع ہوگی تو کیا حالت ہوگی؟ مثلاً آپ کسی سے کہیں: ''اذاجاء ک فلان فأکرمه، ثم اذاحیاک فرحب به'' (جب فلاں شخص تمہارے پاس آئے تو اس کا اکرام کرنا اور جب وہ تمہیں سلام کرے، تو اس کو خوش آمدید کہنا) یعنی یکے بعد دیگرے ایسا کرنا۔ یہاں شرط، ماضی کو مستقبل کے معنی میں کرنے کے لیے نہیں، بلکہ قصہ کو تدریجاً بیان کرنے کے لیے آئی ہے، یعنی جیسے جیسے ایک جز واقع ہوتا جائے ویسے ویسے اسے کرو۔ یا مثلاً کہا جائے: ''اذاجاء ک فلان وقال کذا'' تو اس کا مقصد ماضی کو، مستقبل میں تبدیل کرنا نہیں ہے، بلکہ مستقبل کو ماضی سے تعبیر کرنا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں ''اتقان'' اور ''رضی'' ص:۹۱/ر، باب ''ضربی زیداً قائما''۔ نیز ماضی کے جزا ہونے کی صورت میں اس پر ''فاء'' داخل کرنے کے بارے میں اُشمونی نے جو کچھ ذکر کیا ہے اسے بھی دیکھ لیا جائے۔ یہ وہ مسئلہ نہیں ہے، جو علمائے نحو کے یہاں ''نفخ فی الصور'' کے نام سے مشہور ہے(۱)۔

بلکہ یہ تو ''مفاجات'' کے معنی کے قریب ہے، جو ان کے یہاں حال کے لیے ہے۔

اگر زمانۂ مستقبل میں کسی کام سے فراغت مقصود ہو اور بتانا یہ ہو کہ زمانہ ماضی میں یہ کام ہو چکا ہے، تو کس طرح ادا کیا جائے گا؟ جیسا کہ آئندہ پیش آنے والے امر کو صیغہ ماضی سے ادا کیا جاتا ہے، اس سے کچھ پہلے کے زمانہ ماضی کا اعتبار کر کے۔ چناں چہ کہا جاتا ہے: ''اذاخرج أمس یلقاک البارحة، وکنت

---

(۱) اس سے مراد یہ ہے کہ جس طرح آیت ''وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ'' میں ''نفخ'' فعل ماضی ہے اور معنی اس کے ''ینفخ'' فعل مستقبل کے ہیں۔ اسی طرح یہ لفظ جو فعل ماضی سے مستعمل ہوا ہے فعل مستقبل کے معنی میں۔

مستقبل کو بہ سبب تحقق و وقوع کے لفظ ماضی سے تعبیر کرنا زبان عربی ہی کا خاصہ نہیں، بلکہ ہر زبان میں یہ محاورہ عام پایا جاتا ہے۔ جیسے ہماری اپنی ہندی زبان میں جب کوئی کسی کو بلاتا ہے، تو دوسرا شخص ان لفظوں سے جواب دیتا ہے ''جی آیا جی''۔ حالاں کہ وہ ابھی اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں ہوتا۔ اسی طرح جب کوئی کسی کو، کسی کام پر بھیجے اور سخت تاکید سے کہے: ''جلدی جانا اور شتاب واپس آنا'' تو اس کی تسلی کے لیے اور اپنی مستعدی و شتابی ظاہر کرنے کے لیے جواب میں یہ کہا جاتا ہے: ''بس جی یہ گیا اور وہ آیا''۔ حالاں کہ وہ اس کے روبرو ہی یہ سب کچھ کہہ سن رہا ہوتا ہے۔ یہ صرف اس لیے ہوتا ہے تاکہ مخاطب کو اس امر کا ضرور در ضرور واقع ہو جانا متیقن ہو جائے۔ (شہادۃ القرآن: ۲/۲۷) ابوطہ صغیر

سرت حتی ادخل البلد، و کان یفعل کذا'' (اگر وہ کل گذشتہ نکلا، تو تم سے گذشتہ رات ملا ہوگا۔ میں چل رہا ہوں تا آں کہ شہر میں داخل ہو جاؤں۔ وہ فلاں کام کر رہا تھا) وغیرہ۔

علاوہ ازیں کبھی مستقبل کو زمانۂ مستقبل میں بیان کرنا مقصود ہوتا ہے۔ جیسا کہ ان آیات میں ہے:

''فَاِ ذَا بَرِقَ الْبَصَرُ o وَخَسَفَ الْقَمَرُ o وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ o یَقُولُ الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّ o'' (القیمة : ۷۔۱۰)

''پھر جب چندھیانے لگے آنکھ، اور گہ جائے چاند، اور اکٹھے ہوں سورج اور چاند، کہے گا آدمی اس دن کہاں چلا جاؤں بھاگ کر''۔

اور کبھی کسی امر کو مستقبل میں بیان کرنا ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہے:

''اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ o وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجاً o فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْهُ'' (النصر : ۱۔۳)

''جب پہنچ چکے مدد اللہ کی اور فیصلہ اور تو دیکھے لوگوں کو داخل ہوتے دین میں غول کے غول، تو پاکی بول اپنے رب کی خوبیاں اور گناہ بخشوا اس سے''۔

اگر اس سورت کا نزول فتح مکہ سے پہلے مانا جائے (۱)۔

تفصیل کے لیے دیکھیے ''فتح الباری، ج:۶، ص:۲۰۷''۔ کلمات شرط کے بعد، بہ کثرت ماضی لانے کی وجہ وہی ہے، جو میں نے بیان کی۔ عموماً لوگوں نے اسے ذکر نہیں کیا ہے ہاں ''الروض الانف، ج:۱، ص:۲۸۶'' میں اس پر گفتگو کی گئی ہے۔

اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ پھر ''وَلَوْ تَرٰیٓ اِذْ وُقِفُوْا'' (الانعام:۲۷) اور ''وَلَوْ تَرٰیٓ اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاکِسُوْ رُءُوْسِهِمْ'' (السجدة : ۱۲) کی کیا توجیہ کی جائے گی، کیا بقول ابن ہشام یہاں ''اذ'' بمعنی ''اذا'' نہیں ہے، جو استقبال کے لیے آتا ہے؟ تو جواب دیا جائے گا کہ ''اذا'' کے معنی میں کیسے ہو سکتا ہے؟ اس لئے کہ ''اذا'' کے بعد مبتداء اور خبر واقع نہیں ہوتے، جب کہ: ''اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاکِسُوْ رُءُوْسِهِمْ'' کی تقدیر عبارت یہ ہوگی ''ولو تری ندمهم وحزنهم فی ذلک الیوم بعد وقوفهم علی النار''. اس لیے صحیح بات یہ ہے کہ ''اذ'' اپنی اصل کے مطابق ظرف برائے زمانۂ ماضی ہی ہے، مگر ان کے رنج و غم اور ندامت کے

---

(۱) اس سورت کے نزول میں اختلاف ہے، ایک قول تو یہی ہے جو صاحب کتاب علامہ کشمیریؒ نے ذکر کیا ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا نزول بعد فتح مکہ ہوا، بلکہ باعتبار نزول سب سے آخری سورت ہے۔ محمد صغیر

ساتھ، گویا رنج والم اور ندامت، مشاہدہ چشم اور اس کے سامنے کھڑے کیے جانے کے بعد، واقع ہوں گے۔ اس طرح کھڑے کیے جانے کا وقت، مابعد کے اعتبار سے، زمانہ ماضی بن جائے گا؛ اس کے بعد کا جملہ "تری" کا مفعول واقع ہو رہا ہے۔ یہ وہم اور اعتراض ایسا ہی ہے، جیسا کہ آیت کریمہ: "فَانْطَلَقَا حَتّٰى اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا" (الکہف: ۷۱) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ: یہاں کلمہ "اذا" (جو کہ زمانہ مستقبل کے لیے آتا ہے) "اِذ" (جو کہ زمانہ ماضی کے لیے آتا ہے) کے معنی میں ہے، کیوں کہ اس آیت کریمہ میں واقعہ گذشتہ کا تذکرہ ہے، یہ وہم درست نہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ "اذا" اپنے اصل معنی ہی میں ہے اور اس کے بعد فعل "رکبا" انطلاق کے اعتبار سے مستقبل ہے، اس لیے کہ رکوب انطلاق کے بعد ہے اور انطلاق، رکوب سے پہلے، ہاں اگر "حتی" نہ ہوتا تو "انطلقا اذ رکبا" ہی کہنا ضروری ہوتا؛ کیوں کہ "حتی" میں جو غایت کا معنی ہے، اس سے پتہ چلا کہ رکوب، انطلاق کے بعد ہے اور جب رکوب، انطلاق کے بعد ہے، تو "رکبا" بھی اس کے اعتبار سے مستقبل ہوگا۔ اسی طرح زیر بحث مسئلہ میں حزن اور سوء حال جو "تری" کا مفعول ہے، اگرچہ لفظوں میں مذکور نہیں، لیکن وقتِ وقوف کے بعد ہے، اس لیے وقتِ وقوف، حزن و سوء حال کے اعتبار سے ماضی ہوگا۔

حاصل یہ کہ زمانہ ماضی کا جزء آخر، اپنے ماقبل کے اعتبار سے مستقبل اور زمانہ مستقبل کا جزء اول، اپنے مابعد کے اعتبار سے، ماضی ہوتا ہے۔ قرآن و حدیث اور لغت میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں: قرآن کریم سے اس کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

"وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ" (البقرہ: ۲۲۲)

"اور نزدیک نہ ہو ان کے جب تک پاک نہ ہوویں، پھر جب خوب پاک ہو جائیں..... الخ"۔

"وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ط فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ" (البقرہ: ۱۹۱)

"اور نہ لڑو ان سے مسجد حرام کے پاس جب تک کہ وہ نہ لڑیں تم سے اس جگہ، پھر اگر وہ خود ہی لڑیں تم سے تو ان کو مارو"۔

"اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ" (الشعراء: ۴)

"اگر ہم چاہیں اتاریں ان پر آسمان سے ایک نشانی، پھر رہ جائیں......"۔

"وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى" (طٰہٰ: ۸۱)

"اور جس پر اترا میرا غصہ سو وہ پٹکا گیا"۔

"وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ" (البقرہ: ۱۰۸)

"اور جو کوئی کفر لیوے بدلے ایمان کے، تو وہ بہکا سیدھی راہ سے"۔

"اِذَاالشَّمۡسُ كُوِّرَتۡ" (التکویر : ۱)

"جب سورج کی دھوپ تہ ہو جائے"۔

"وَالَّيۡلِ اِذۡاَدۡبَرَ ٥ وَالصُّبۡحِ اِذَآ اَسۡفَرَ" (المدثر : ۳۳، ۳۴)

"اور رات کی جب پیٹھ پھیرے اور صبح کی جب روشن ہو"۔

نیز اسی قبیل سے یہ آیتیں بھی ہیں:

"فَاِذَا قَرَاۡنٰهُ فَاتَّبِعۡ قُرۡاٰنَهٗ" (القیٰمة : ۱۸)

"پھر جب ہم پڑھنے لگیں فرشتہ کی زبانی، تو ساتھ رہ اس کے پڑھنے کے"۔

"حَيۡثُمَا كُنۡتُمۡ فَوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ شَطۡرَهٗ" (البقرہ : ۱۴۴)

"اور جس جگہ تم ہوا کرو، پھیر و منہ اسی کی طرف"

"فَسَوۡفَ يَعۡلَمُوۡنَ ٥ اِذِ الۡاَغۡلٰلُ فِىۡۤ اَعۡنَاقِهِمۡ" (المؤمن : ۷۰، ۷۱)

سو آخر جان لیں گے، جب طوق پڑیں ان کی گردنوں میں۔

فَاِذَا مَسَّ الۡاِنۡسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ اِذَا خَوَّلۡنٰهُ نِعۡمَةً مِّنَّا، قَالَ اِنَّمَآ اُوۡتِيۡتُهٗ عَلٰى عِلۡمٍ" (الزمر : ۴۹)

"سو جب آلگتی ہے آدمی کو کچھ تکلیف تو ہم کو پکارنے لگتا ہے، پھر جب ہم بخشیں اس کو اپنی طرف سے کوئی نعمت، کہتا ہے: یہ تو مجھ کو ملی، کہ پہلے سے معلوم تھی"۔

دوسری قسم کی مثال:

"وَسِيۡقَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ٥ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوۡهَا فُتِحَتۡ اَبۡوَابُهَا" (الزمر : ۷۱)

"اور ہانکے جائیں جو منکر تھے دوزخ کی طرف گروہ گروہ؛ یہاں تک کہ جب پہنچ جائیں اس پر، کھولے جائیں اس کے دروازے"۔

"اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ" (نوح : ۴)

"وہ جو وعدہ کیا ہے اللہ نے جب آپہنچے گا، اس کو ڈھیل نہ ہوگی"۔

احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کی مثال حضور کا یہ ارشاد ہے:

"واذاقال : "غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ" فقولوا آمين" (بخاری: ۱/۱۰۸)

اور جب امام "غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ" کہے، تو تم آمین کہو۔

نیز "صحیح بخاری" میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں، ملاحظہ ہو، ص: ۹۶۹، ۱۱۰۶، ۱۳۳، مطبعہ احمدیہ۔

مزید برآں ارشاد نبوی:

"وسحقا سحقا لمن بدل بعدی" (بخاری: ۲/۱۰۴۵)

"بربادی اور دوری ہو ان کے لیے جنہوں نے میرے بعد دین کو بدل ڈالا"۔

اور حماسی کا یہ شعر بھی اسی قبیل سے ہے: ؎

ان يسمعوا سبة طاروا بها فرحا ۞ منی ومايسمعوا من صالح دفنوا

"وہ لوگ اگر میری گالی سنیں، تو خوشی سے لے اڑیں اور اگر میری اچھائی سنیں تو دفن کر دیں"۔

علاوہ ازیں شعرائے عرب کے اشعار سے اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔

ابن حجر مکی ہیتمی [تا کے ساتھ، مصر کے مغربی صوبہ "محله ابو الهيتم" کی طرف منسوب ہے۔ اور علامۃ الامیر نے اپنی یادداشت میں مصر کی ایک بستی "ہیاتم" کی طرف منسوب بتایا ہے] کی کتاب "فتاوی حدیثیۃ" میں، آیات کے شروع میں کلمہ "اذ" لانے کی بابت ایک نکتہ مذکور ہے اور وہ یہ ہے کہ کلمہ "اذ" مفعول بہ ہوتا ہے؛ چناں چہ اسی اعتبار سے "اذ" کا استعمال یہاں ہے، نیز نظم قرآنی بہ صراحت اس پر دلالت بھی کر رہی ہے۔ جیسا کہ:

"يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ۝ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَاط اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ" (المائدہ: ۱۰۹)

"جس دن اللہ جمع کرے گا سب پیغمبروں کو، پھر کہے گا: تم کو کیا جواب ملا تھا؟ وہ کہیں گے: ہم کو خبر نہیں، تو ہی ہے چھپی باتوں کو جاننے والا"۔

میں آیت کا آغاز اس طرح کیا کہ وہ یوم قیامت ہے اور سوال و جواب تمام رسولوں کو عام ہے، پھر خاص طور پر حضرت عیسیٰ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

"اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۝ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ" (المائدہ: ۱۱۰)

"جب کہے گا اللہ: اے عیسیٰ مریم کے بیٹے! یاد کر میرا احسان جو ہوا ہے تجھ پر اور تیری ماں پر۔ جب مدد کی میں نے تیری، روح پاک سے"۔

یہاں پر "اذکر" فرمایا، بُعد عہد کی وجہ سے، نہ کہ اس وجہ سے کہ ابھی یہ زمانہ گذرا ہے۔

ارشاد باری "اِذْ قَالَ اللّٰهُ" ایسا ہی ہے، جیسے ہم کہیں: "اذكر اذاقامت القيامة وقال الله

لک کذاو کذا" پھر قصۂ مائدہ (نزول دسترخوان) کی یاددہانی کرائی کہ یہ بھی انہی واقعات میں سے ہے، جنہیں اللہ تعالیٰ اس دن ذکر فرمائیں گے۔ نیز وہ ماقبل میں مذکور حوالہ کا تکملہ ہے، اسی وجہ سے درمیان میں حرف عطف نہیں لایا گیا، جیسا کہ ابن عطیہ کی رائے ہے۔ [البحر المحیط]۔ "النهر الماد من البحر" میں آیت کریمہ: "وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ" کے تحت ہے کہ صیغۂ ماضی کا استعمال اس لیے ہے کہ یہاں تقدیر عبارت یہ ہے: "ماذاوقع في يوم القيمة". نیز حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے "اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ" سے جو جواب دیا ہے قیامت کے دن تمام رسولوں کا یہی جواب ہوگا۔ اس کے بعد بطور تتمہ فرمایا: "هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ"۔ (المائدہ:۱۱۹)

ان سب سے نصِ صریح کے طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ روزِ قیامت ہوگا، نہ کہ یہ سب کچھ گذشتہ زمانے میں وقوع پذیر ہو چکا ہے، جیسا کہ اس بدبخت ملحد قادیان کا خیال فاسد ہے؛ چناں چہ اس نے اپنے اسی باطل مفروضے کی بنیاد پر یہ کہا ہے کہ ماضی میں حضرت عیسیٰ کی وفات ہو چکی ہے۔ اس ملحد نے اپنا معبود خواہش نفس کو ٹھہرایا، جس نے اسے ہلاکت کے غار میں ڈھکیل کر رسوا کر دیا۔ لاحول ولاقوة الا باللّٰہ.

سطور بالا میں ذکر کردہ ساری باتیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعلق روز قیامت سے ہے، صریح احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں، چناں چہ "فتح الباری" میں احادیث شفاعت کے تحت ہے:

"لكن وقع في رواية الترمذي من حديث ابي نضرة عن ابي سعيد: "اني عبدت من دون الله" وفي رواية احمد والنسائي من حديث ابن عباس: "اني اتخذت الهاً من دون الله" وفي رواية ثابت عن سعيد بن منصور نحوه، وزاد: وان يغفرلي اليوم حسبي". (فتح الباري: ۱۱/۵۳۲).

"لیکن ترمذی کی روایت میں بواسطہ ابونضرہ حضرت ابوسعید کی حدیث ہے: "بجائے اللہ کے میری عبادت کی گئی"۔ احمد اور نسائی کی روایت میں ابن عباس کی حدیث کے الفاظ ہیں "اللہ کو چھوڑ کر مجھے معبود بنالیا گیا" اور ثابت عن سعید بن منصور کی روایت میں یہی مضمون ان الفاظ کی زیادتی کے ساتھ ہے "وان يغفرلي اليوم حسبي"۔ آج کے روز میری بخشش، میرے لیے کافی ہے"۔

"مواہب" کے آخر میں بواسطہ نضر بن انس حضرت انس بن مالک کی حدیث ہے جس میں حضرت انس فرماتے ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ نے مجھ سے فرمایا:

"اني لقائم انتظر امتي عند الصراط اذ جاء عيسى، فقال: يا محمد! هذه الانبياء

قدجآء تک یسئلونک لتدع اللہ ان یفرق جمیع الامم الی حیث شاء لعظم ما ھم فیہ".

"کہ میں پل صراط کے پاس کھڑا اپنی امت کا انتظار کر رہا ہوں گا کہ اتنے میں حضرت عیسیٰ آ کر کہیں گے: اے محمد (ﷺ) یہ انبیاء کرام آپ کے پاس اس لیے آئے ہیں کہ آج کی ہولناکی کی وجہ سے سب انتہائی پریشان ہیں، آپ اللہ تعالیٰ سے شفاعت کر دیں کہ تمام امتوں کو جہاں چاہے منتشر کر دے"۔

ابن ابی حاتم روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"یلقی اللہ حجتہ، ولقاہ اللہ تعالی فی قولہ: "وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" قال ابوهريرة عن النبي صلى الله عليه و سلم فلقاه الله "سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ".... الاية.

"اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ کے دل میں، جواب القا فرمائیں گے، چناں چہ سوال باری تعالیٰ: "اے عیسیٰ مریم کے بیٹے! تو نے کہا لوگوں کو کہ ٹھہرا لو مجھ کو اور میری ماں کو دو معبود سوا اللہ کے" کی بابت، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ جواب القا فرمایا: "تو پاک ہے، مجھ کو لائق نہیں کہ کہوں ایسی بات جس کا مجھ کو حق نہیں.. الخ"۔

امام ثوری نے بواسطہ معمر عن ابن طاؤس عن طاؤس اسی جیسا مضمون روایت کیا ہے۔ (ابن کثیر ج:۲، ص:۱۲۶) اور حافظ سیوطی "درمنثور" (ج:۲،ص:۶۱۴) میں لکھتے ہیں کہ: امام ترمذی اور نسائی نے اس حدیث کی تخریج کی ہے اور ترمذی (۱۳۷/۲) نے اس کو صحیح کہا ہے۔ اس جیسی اور بھی بہت سی روایتیں "المواہب" میں مذکور ہیں۔ علاوہ ازیں ائمہ دین نے بھی اس کی تصریح کی ہے: چناں چہ امام احمد بن حنبل کی کتاب "کتاب الرد علی الجھمیہ" میں ہے:

"فقلنا للجھمیة من القائل یوم القیٰمة "وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" الیس ھو القائل"

"جہمیہ سے ہم نے کہا کہ قیامت کے روز یہ بات کون کہے گا: "اے عیسیٰ مریم کے بیٹے! تو نے کہا لوگوں کو کہ ٹھہرا لو مجھ کو اور میری ماں کو دو معبود سوا اللہ کے؟" کیا اس کا کہنے والا خود اللہ ہی نہ ہوگا؟"۔

اگر اس کو "نفخ فی الصور" کے مسئلہ پر محمول کیا جائے تو اس کے ساتھ اس مضمون کا اضافہ کرنا ہوگا کہ وجود تقدیری، وجود خارجی پر مقدم ہے، چناں چہ تاریخ طبری میں ہے کہ حضرت مجاہد نے فرمایا:

یقضی اللہ. عزوجل. امر کل شیئ الف سنة الی الملائکة، ثم کذٰلک حتی یمضی الف سنة، ثم یقضی امر کل شیئ الفا، ثم کذٰلک ابدا، قال: "فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ

سَنَةٍ" قال :اليوم ان يقول لما يقضى الى الملائكة الف سنة كن فيكون، ولكن سماه يوما كما شاء" .

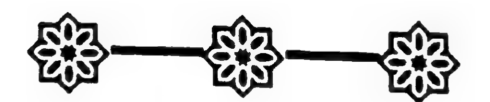
''اللہ تعالیٰ ایک ہزار برس کے معاملات طے کر کے فرشتوں کے سپرد کردیتے ہیں اور یہ امور ایک ہزار سال تک اسی طرح انجام پاتے ہیں۔ اس کے بعد پھر ہر بات کو آئندہ ایک ہزار سال کے لیے طے فرمادیتے ہیں۔ یوں ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے ارشاد باری ہے: ''فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ اَلْفَ سَنَةٍ'' (السجدۃ:۵- تدبیر سے اتارتا ہے کام آسمان سے زمین تک پھر چڑھتا ہے وہ کام اس کی طرف- ایک دن میں، جس کا پیمانہ ہزار برس کا ہے تمہاری گنتی میں)''

اور فرماتے ہیں کہ آج کے روز آئندہ ایک ہزار سال تک کے فیصل شدہ امور فرشتوں کے حوالے کرتے ہوئے باری تعالیٰ فقط ''کن'' فرمائیں گے اور یہ سب کچھ ہوجائے گا؛ تاہم حق تعالیٰ نے اسے ''یوم'' کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔ وہ اپنے ہر امر میں اپنی مشیت کا مالک ہے۔

نیز حضرت مجاہد کہتے ہیں کہ: ''فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ اَلْفَ سَنَةٍ'' اور ''وَاِنَّ یَوْماً عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَo(الحج:۴۷)''

''اور ایک دن تیرے رب کے یہاں ہزار برس کے برابر ہوتا ہے جو تم گنتے ہو''۔

یہ دونوں بالکل یکساں ہیں۔



خلاصۂ کلام

اس فصل میں مذکورہ ایات کا حاصل، خلاصہ اور باہمی ربط، بیان کیا جائے گا؛ تا کہ کلام کا مدار واضح اور بے غبار ہو کر سامنے آجائے، نیز قاری کو ان آیات کے مفہوم و مضمون اور غرض وغایت کا بخوبی علم ہو جائے۔

واضح ہو کہ اس بدبخت قادیانی اور اس کے لاہوری چیلے نے، مذکورہ آیات کے تحت بڑے زور وشور سے ایسے مضامین بیان کیے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید مشیت ازلی کا قطعی فیصلہ یہی ہے کہ یہ دونوں قرآن حکیم کے مقاصد سے جاہل اور توفیق خیر سے محروم رہیں؛ چناں چہ ''تذکرۃ الشہادتین'' میں لکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوال کا حضرت عیسیٰؑ نے جو جواب دیا، اس کا حاصل اپنی قوم میں پیدا ہونے والے بگاڑ سے اپنی ناواقفیت کا عذر بیان کرنا ہے۔ جب کہ ''کتاب البریۃ'' میں لکھتا ہے [اور اسی کے نقش قدم پر لاہوری بھی چلا ہے] کہ حضرت عیسیٰؑ کے جواب کا خاصل یہ ہے کہ جب تک وہ قوم میں موجود رہے، اس وقت تک قوم میں فساد پیدا نہیں ہوا تھا، بعد میں پیدا ہوا۔ اس کے بعد دونوں کا خیال یہ ہے کہ اگر نزول مسیح طے ہوتا تو آپ کو اس کا علم ہوتا۔ لہذا عدم علم کا عذر چہ معنی دارد؟ یا حضرت عیسیٰ یہ فرماتے کہ: ''میری امت میں فساد میری وفات کے بعد آیا'' فساد ان کی امت میں پیدا ہو چکا، جیسا کہ ان کی امت کی حالت کے مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے، جب کہ ان کی وفات تو اس سے پہلے ہی ہو چکی تھی۔ اس مضمون کو ان دونوں نے ''تفسیر مظہری'' سے سرقہ کیا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں اللہ کے یہاں اس سے بھی گئے گزرے ہیں۔ تفسیر مذکور میں مصنف کا مختار اور راجح قول یہ ہے کہ ''توفی'' بہ معنی ''رفع'' ہے اور ان دونوں کے سرقہ کردہ کلام کی بنیاد اس پر ہے کہ ''توفی'' موت کے معنی میں ہے اور موت زمانۂ ماضی میں ہو چکی ہے؛ اس بارے میں سیر حاصل گفتگو گزر چکی، لہذا وہیں ملاحظہ کی جائے۔

پھر جب اس کو یہ جواب دیا گیا کہ حضرت عیسیٰؑ یہ بات قیامت کے دن فرمائیں گے، اس لیے قیامت سے پہلے آپ علیہ السلام کا نزول اور نزول کے بعد موت، قیامت کے دن کے لحاظ سے، ماضی ہوئی۔ تو اس بات کو دہرانے لگا کہ موت بوقت رفع ہی ہو چکی ہے۔ اس بارے میں اس کا اپنی ذات سے مناقشہ بھی

مذکور ہو چکا ہے۔ نیز فساد امت کے حوالے سے، حضرت عیسیٰ کو علم وعدم علم کی بابت بھی، اس کی باتوں میں تضاد ہے، ''تذکرۃ الشہادتین'' اور ''کتاب البریۃ'' میں لکھا ہے کہ: حضرت عیسیٰ کو امت کے فساد کا علم ہوا ہی نہیں جب کہ ''آئینہ کمالات'' میں لکھتا ہے کہ ''جس وقت آسمان میں حضرت عیسیٰ کی روح کو اپنی قوم کے فساد کا علم ہوا، تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعاء کی: ''خدایا: مثالی نزول عطا فرمایا'' اور یہ مثالی نزول بزعم خویش قادیانی کا ہوا۔ جس نے اس سلسلے میں الہام بھی گھڑا، مگر شاید اسے یہ خبر نہیں کہ اس کے پیٹ سے کیا چیز نکل رہی ہے۔ العیاذ باللہ:۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک ❁ کجا عیسیٰ کجا دجال ناپاک

''خاک کو عالم بالا سے کیا نسبت؟ کہاں حضرت عیسیٰ اور کہاں ناپاک دجال''۔

جو شخص سورہ مائدہ میں ''توفی'' بہ معنی موت مراد لے اور یہ کہے کہ: موت رفع کے وقت ہو چکی ہے، اس کے حال کے زیادہ مناسب یہ ہے کہ وہ خالص یہودی ہو جائے، جیسا کہ کہا گیا ہے ''کن یھودیا صرفا، والافلا تلعب بالتوراۃ'' (یا تو پکا یہودی بن جا، یا پھر تورات سے کھلواڑ مت کر) کیونکہ آیت کریمہ:

''وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ ۖ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ''

(المائدہ: ۱۱۷)

''اور میں ان سے خبردار تھا، جب تک ان میں رہا، پھر جب تو نے مجھ کو اٹھا لیا، تو تُو ہی تھا خبر رکھنے والا ان کی''۔

کا ظاہر، ان دونوں کے درمیان مقارنت اور عدم فصل ہے، لہٰذا اگر ''توفی'' سے موت مراد لی جائے تو یہ یہود کا عقیدہ ہوگا، جو اس کم بخت قادیانی مردود کے حال کے مناسب ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضرت عیسیٰ کا جواب اپنی امت میں پیدا ہونے والی خرابی اور فساد سے ناواقفیت پر مبنی نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس پر کہ جب تک آپ ان کے درمیان رہے، اس وقت تک فساد کا وقوع نہیں ہوا۔ جواب تو بس ایک ہی حرف ہے، یعنی اپنی امت سے صرف وہی باتیں کہنا، جن کا اللہ نے حکم دیا تھا، خود کو معبود بنائے جانے، اس پر اپنی رضامندی اور حکم الٰہی کے خلاف سکوت اختیار کرنے کا جواب سے تعلق نہیں ہے، جواب تو صرف یہ ہے:

''مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ'' (المائدہ: ۱۱۷)

''میں نے کچھ نہیں کہا ان کو مگر جو تو نے حکم کیا، کہ بندگی کرو اللہ کی، جو رب ہے میرا اور تمہارا''۔

جواب کے الفاظ یہی ہیں، بقیہ کلمات یا تو تمہید ہیں، یا تکملہ، وتتمہ۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی تو ہم کہتے ہیں کہ آیت کریمہ:

"یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَیَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَاعِلْمَ لَنَاط اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ" (المائدہ: ۱۰۹)

"جس دن اللہ جمع کرے گا سب پیغمبروں کو پھر کہے گا: تم کو کیا جواب ملا تھا؟ وہ کہیں گے: ہم کو خبر نہیں، تو ہی چھپی باتوں کو جاننے والا ہے"۔

میں مذکور سوال باری "مَاذَآ اُجِبْتُمْ" (تم کو کیا جواب ملا تھا؟) کے جواب میں رسولوں کا یہ کہنا "اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ،، (تو ہی چھپی باتوں کا جاننے والا ہے) اس بات کی دلیل ہے کہ ان حضرات کے "لَاعِلْمَ لَنَا" (ہمیں کچھ خبر نہیں) کہنے کی وجہ یہی ہے (کہ خداوندا! تیرے علم کامل ومحیط کے سامنے ہمارا علم کچھ بھی نہیں، ہم آپ کو کیا بتائیں۔ تمام بواطن وسرائر کا علم آپ کو ہے) نہ یہ کہ قطعاً ان کو کسی بات کا علم ہی نہیں۔ (اگر کسی بات کا علم نہ ہوتا تو پھر ان حضرات کو گواہ کیسے بنایا جاتا، جس کی قرآن کریم میں تصریح ہے، چناں چہ) ارشاد باری ہے:

"فَکَیْفَ اِذَاجِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّةٍ م بِشَهِیْدٍ وَّجِئْنَابِکَ عَلٰی هٰؤُلَآءِ شَهِیْدًا"۔ (النساء: ۴۱)

"پھر کیا حال ہوگا جب بلاویں گے ہم ہر امت میں سے احوال کہنے والے اور بلاویں گے تجھ کو ان لوگوں پر احوال بتانے والا"۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

"وَجِایْٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ (الزمر: ۶۹)

"اور حاضر آئیں پیغمبر اور گواہ"۔

اور سورہ آل عمران میں ہے:

"قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُاللّٰهِج اٰمَنَّابِاللّٰهِط وَاشْهَدْبِاَنَّامُسْلِمُوْنَطرَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاکْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِیْنَ (آل عمران: ۵۲، ۵۳)

"کہا حواریوں نے: ہم ہیں مدد کرنے والے اللہ کے، ہم یقین لائے اللہ پر اور تو گواہ رہ کہ ہم نے حکم قبول کیا۔ اے رب! ہم نے یقین کیا اس چیز کا جو تو نے اتاری اور ہم تابع ہوئے رسول کے، سو تو لکھ لے ہم کو ماننے والوں میں"۔

حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں، سند جید کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے "مَعَ

الشّٰھِدِیْنَ" کی تفسیر "مع امۃ محمد" نقل کی ہے۔

مفسرین نے اور بھی مناسب توجیہات ذکر کی ہیں، چناں چہ "معالم التنزیل" (ج:۲،ص:۳۲۱) میں امام بغوی نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: "سرچشمۂ علم آپ ہیں، آپ جس کو چاہیں اور جتنا چاہیں عطا فرمائیں، ہمارے پاس تو بس اتنا ہی ہے، جس قدر آپ نے عنایت کیا ہے، آپ کے علم وسیع ومحیط کے سامنے، ہمارے علم کی کوئی حقیقت نہیں"۔

کبھی کبھی دل میں یہ خیال آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کسی سے کچھ معلوم کرنا تو قرین قیاس نہیں، کیوں کہ معلوم کرنے کا مقصد غیر معلوم بات کا علم حاصل کرنا ہوتا ہے، جب کہ حق تعالیٰ عز اسمہ کو تو تمام باتوں کا علم ہے۔ لیکن چند حکمتوں اور مصالح کے سبب، یہ انداز اختیار کیا گیا، چناں چہ ان حضرات انبیاء کے قول "لَاعِلْمَ لَنَا" کا مفہوم ہے "لَاعِلْمَ عندنا، وانما العلم عندک، تعطیه من تشاء بماتشاء"۔

چوں کہ انبیاء کرام کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ پہلا محاضرہ تھا، اس لیے ان حضرات نے پہلے ہی مرحلے میں اس حقیقت کا اظہار فرمادیا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق چلتے رہے، اس کی مثال حضرت آدم وحضرت موسیٰ علیہم السلام کا مباحثہ ہے، جو راز تقدیر کے اظہار کے لیے تجویز ہوا(۱)۔

حضرت عیسیٰ کے جواب میں اسی بات کا ازسرِ نو اعادہ کیا گیا، لہٰذا ان کا "اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ" کہنا، اس حوالے سے دیگر انبیاء کرام کے ارشاد کے عین مطابق ہے، حضرات انبیاء کی مراد اور منشاء بھی یہی ہے۔

اس کے بعد:

"اِذْقَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ اذْكُرْنِعْمَتِیْ عَلَیْكَ وَعَلٰی وَالِدَتِكَ" (المائدہ : ۱۱۰)

"جب کہے گا اللہ اے عیسیٰ مریم کے بیٹے یاد کر میرا احسان جو ہوا ہے تجھ پر اور تیری ماں پر"۔

سے، حضرت عیسیٰ اور آپ کی والدہ محترمہ پر اپنے انعامات کا ذکر فرمایا اور حضرت عیسیٰ کو ان کی یاد دہانی کرائی۔

(۱) مباحثہ یہ ہوا: عن ابی هریرة قال النبی ﷺ احتج آدم وموسیٰ فقال له موسی یا آدم انت ابونا خیّبتنا وأخرجتنا من الجنة قال له آدم یاموسیٰ اصطفک الله بکلامه وخطّ لک بیده اتلومنی علی امر قدره الله علی قبل ان یخلقنی باربعین سنة فحج آدم موسی (بخاری: ۲/۹۷۹)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ روایت کرتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آدم اور موسیٰ علیہما السلام نے مباحثہ کیا، موسیٰ نے آدم سے کہا اے آدم آپ ہمارے باپ ہیں آپ ہی نے ہمیں محروم کیا اور جنت سے نکالا۔ آدم نے جواب دیا اے موسیٰ اللہ نے آپ کو ہم کلامی کے لئے منتخب کیا اور اپنے ہاتھ سے آپ کے لئے لکھا، کیا آپ مجھے ایک ایسی بات پر ملامت کرتے ہیں جو اللہ نے مجھے پیدا کرنے سے چالیس سال پہلے میری تقدیر میں لکھ دیا تھا۔ پس آدم موسیٰ پر غالب رہے۔ (محمد صغیر)

یہ ارشاد ماقبل میں مذکور باتوں: یعنی اللہ تعالیٰ کا انبیاء کرام کو جمع کرنا اوران سے سوال وجواب؛ کا ایک حصہ ہے، لہذا یہ بھی بلاشبہ قیامت کے دن ہوگا۔ پھر انزال مائدہ کو، بغیر کسی حرف عطف کے، بطور انعام ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

''قَالَ اللّٰهُ اِنِّی مُنَزِّلُهَا عَلَیْكُمْ ج فَمَنْ یَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّیْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ o''(المائدہ:۱۱۵)

''کہا اللہ نے میں بیشک اتاروں گا، وہ خوان تم پر، پھر جو کوئی تم میں ناشکری کرے گا اس کے بعد، تو میں اس کو وہ عذاب دوں گا، جو کسی کو نہ دوں گا جہاں میں''۔

اس کے ذریعہ کفر پر انتہائی سخت وعید سنائی، اس کے بعد فرمایا:

''وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ''
(المائدہ:۱۱۶)

''اور جب کہے گا اللہ: اے عیسیٰ مریم کے بیٹے، تو نے کہا لوگوں کو کہ ٹھہرالو مجھ کو اور میری ماں کو دو معبود سوائے اللہ کے۔

ظاہر ہے کہ اس کا تعلق بھی قیامت کے دن سے ہی ہے، کیوں کہ اس کا آغاز:

''یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ''.(المائدہ:۱۰۹)

''جس دن اللہ جمع کرے گا سب پیغمبروں کو (یعنی روز قیامت)''۔

سے کیا ہے، جس کے ذیل میں شہادت کا ذکر ہے، جو قیامت کے دن ہوگی، چناں چہ ارشاد باری ہے:

''وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَكُوْنُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا o(النساء:۱۵۹)

''اور قیامت کے دن ہوگا ان پر گواہ''۔

کیوں کہ آپ اپنی امت کے تمام لوگوں کے سامنے شہادت دیں گے اور آپ کا اپنی قوم کے ساتھ جمع ہونا قیامت ہی میں ہوگا نہ کہ آسمان میں، جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

''وَیَوْمَ یَحْشُرُهُمْ وَمَا یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَقُوْلُ ءَ اَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِیْ هٰٓؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِیْلَ'' (الفرقان:۱۷)

''اور جس دن جمع کر بلائے گا ان کو اور جن کو وہ پوجتے ہیں اللہ کے سوا، پھر ان سے کہے گا: کیا تم نے بہکایا، میرے ان بندوں کو یا وہ آپ بہکے راہ سے''۔

اور سورہ اعراف میں ارشاد ہے:

"فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِیْنَ اُرْسِلَ اِلَیْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِیْنَ○(الاعراف:٦)

"سو ہم کو ضرور پوچھنا ہے ان سے جن کے پاس رسول بھیجے گئے تھے اور ہم کو ضرور پوچھنا ہے رسولوں سے"۔

اس کے بعد:

"قَالَ سُبْحٰنَکَ مَایَکُوْنُ لِیْ اَنْ اَقُوْلَ مَالَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ" (المائدہ:١١٦)

"کہا تو پاک ہے، مجھ کو لائق نہیں کہ کہوں ایسی بات، جس کا مجھ کو حق نہیں"۔

فرمایا گیا، جس کا مقصد حق سبحانہ وتعالیٰ کی بابت، ان ظالموں کی الزام تراشیوں سے براءت کا اظہار اور ان کے قول کی تغلیط ہے۔ علاوہ ازیں یہ جواب کی تمہید ہے، نہ کہ اصل جواب۔ اسی طرح:

"اِنْ کُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ط تَعْلَمُ مَافِیْ نَفْسِیْ وَلَآ اَعْلَمُ مَافِیْ نَفْسِکَ ط اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ". (المائدہ:١١٦)

"اگر میں نے یہ کہا ہوگا تو تجھ کو ضرور معلوم ہوگا، تو جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے جی میں ہے، بیشک تو ہی ہے جاننے والا چھپی باتوں کا"۔

سے جواب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جواب نہیں دیا گیا تا آں کہ فرمایا:

"مَاقُلْتُ لَهُمْ اِلَّامَا اَمَرْتَنِیْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبَّکُمْ"، (المائدہ:١١٧)

"میں نے کچھ نہیں کہا ان کو مگر جو تو نے حکم کیا کہ بندگی کرو اللہ کی جو رب ہے میرا اور تمہارا"۔

یہ ارشاد سوال باری کا مکمل جواب ہے۔ اس لیے کہ حضرت عیسیٰ بھی دیگر انبیائے کرام کی طرح اپنی قوم کے تعلق سے شاہد و گواہ ہیں، لہذ شاہد ہونے کے اعتبار سے، نہ کہ جواب دہندہ و مدعی علیہ ہونے کے اعتبار سے، ادائے شہادت کے لئے کھڑے ہوں گے، چنانچہ ارشاد ہوگا:

"وَکُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّادُمْتُ فِیْهِمْ ط فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ وَاَنْتَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ"، (المائدہ ١١٧)

"اور میں ان سے خبر دار تھا، جب تک ان میں رہا۔ پھر جب تو نے مجھ کو اٹھالیا، تو تو ہی تھا خبر رکھنے والا ان کی اور تو ہر چیز سے خبر دار ہے"۔

آپ علیہ السلام کا یہ قول عدم علم کی کوئی وجہ نہیں ہے، کیوں کہ زندگی میں بہت سی چیزیں پوشیدہ رہ جاتی ہیں، جیسا کہ مرنے کے بعد بہت سی چیزیں ظاہر ہوتی ہیں، تو یہ عام نہیں ہے، بلکہ مستقل مضمون ہے، جو بعثت کے حوالے سے کوتاہی نہ کرنے اور اللہ تعالیٰ نے جس چیز کا آپ کو حکم دیا ہے، اس کے علاوہ اپنی طرف سے کسی اور

بات (یعنی معبود وغیرہ ہونے کا دعوی) کے نہ کہنے کا واضح بیان ہے۔ اس وقت اس تفسیر کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی، جو بعض مفسرین نے کی ہے کہ: ''میں ان کو ایسی باتیں کہنے سے روکتا تھا''۔ کیوں کہ جس وقت آپ ان میں تھے یا اس کے بعد، آپ کو معبود بنائے جانے کے تعلق سے کلام ساکت ہے، اللہ تعالی کا سوال محض آپ کی طرف سے قول کے صادر ہونے سے متعلق ہے نہ اس سے کہ انھوں نے کیا کہا؟ یا یہ کہ آپ کو اس کا علم بھی ہے یا نہیں؟ اگر سوال یہ ہوتا کہ آپ کی امت میں یہ خرابی کیسے آئی؛ تو جواب یقیناً مشکل ہو جاتا، اس لئے اللہ رب العزت نے آپ کے لئے آسانی فرمائی اور جواب کی گنجائش باقی رکھتے ہوئے، سوال کیا کہ: کیا آپ نے یہ بات کہی ہے یا نہیں؟ جس کی وجہ سے جواب آسان ہو گیا۔ نیز ''وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّادُمْتُ فِيهِمْ''، امت کے ہدایت یافتہ اور گمراہ: دونوں قسم کے لوگوں کو عام ہے، کیوں کہ انبیاء کرام کی گواہی تمام لوگوں کو شامل ہوتی ہے، گمراہ لوگوں کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی، اسی وجہ سے اس کے بعد فرمایا:

''اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ط وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ ط فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ'' (المائدہ: ۱۱۸)

''اگر تو ان کو عذاب دے، تو وہ بندے ہیں تیرے اور اگر تو ان کو معاف کر دے تو، تو ہی ہے زبردست حکمت والا''۔

(جس میں مہتدین و مضلین: دونوں گروہوں کو ذکر کر دیا) اس کے علاوہ اور بھی مناسب توجیہات، حضرات مفسرین نے ذکر فرمائی ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کا نصاری کے تئیں رقیب اور نگراں ہونا، ان کے حضرت عیسیٰؑ کو معبود بنائے جانے کے معاملے تک محدود نہیں کما لا یخفیٰ۔

پھر اس میں کیا مضائقہ ہے کہ رفع سے پہلے، نیز نزول اور وفات؛ کے بعد قوم کے ساتھ آپ کے معاملہ اور سیرت و کردار کو ذکر کریں، مگر مدت رفع کو ترک کر دیں؟ اس لیے کہ رفع، خرق عادت امر ہے لہذا ترک کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ علاوہ ازیں بعد رفع اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت کی ذمہ داری لی (اس لیے بعد رفع، اس قول کے صادر ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا) حاصل یہ کہ: یہاں سوال صرف اس بات کا ہے کہ آپ (علیہ السلام) سے یہ قول صادر ہوا یا نہیں؟ نہ یہ کہ آپ کی جانب سے بلا کسی سبب کے، امت میں اس (عقیدہ اتخاذ الہہ) کا وجود، لوگوں کی افتراء پردازی اور اس کے باقی رہنے، کے متعلق۔ چوں کہ قول کے صدور کا تصور اس وقت ہو سکتا تھا، جب آپ ان کے درمیان تھے، نہ کہ اٹھائے جانے کے بعد، اس لیے مدت رفع کو ترک کر دیا۔ خلاصہ یہ نکلا کہ ''وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّادُمْتُ فِيهِمْ'' اور ''فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي'' کا مدار، واقعۂ اتخاذ نہیں، بلکہ یہ تو جواب اور ادائے شہادت کا مجموعہ ہے۔ پھر آپ کی شہادت، آپ کے سابقہ زمانے کے ساتھ ساتھ، دوسرے زمانے کے لحاظ سے ہوگی۔ جب بعد رفع آپ کا نزول طے ہے، تو مناسب

ہوا کہ توفی کو ذکر کیا جائے، اگر ''توفی'' بمعنی موت بعد النزول ہو، کیوں کہ یہ ماضی ہے، جس کا وقوع قیامت سے پہلے ہو چکا ہوگا۔ برخلاف ''اِنِّی مُتَوَفِّیکَ'' کے کہ وہ مستقبل ہے اور رفع کا عدم ذکر، چنداں مضر نہیں، بالخصوص جب کہ اللہ تعالی نے آپ کی تطہیر کا ذمہ لے رکھا ہے۔ نیز اس قول کو آپ کی طرف منسوب کرنے میں اس مضمون کی زیادہ تقویت بھی ہے۔

یہ قول۔نعوذ باللہ۔ اگر آپ سے صادر ہوا ہوتا، تو ہمیشہ کے لیے ایک غلط روش چل پڑتی، اس لیے ضروری ہوا کہ آپ کی زندگی کے دونوں حصوں [قبل الرفع اور بعد النزول] میں آپ سے اس قول کے صدور کی مطلقاً نفی کر دی جائے۔ علاوہ ازیں سوال صرف ان اہل کتاب تک محدود نہیں، جو خاتم الانبیاء ﷺ کے زمانے تک موجود تھے، بلکہ اس کے بعد کے لوگوں کو بھی شامل ہے؛ اس لیے کہ اگر وہ مقولہ اور جملہ آپ سے صادر ہوا ہوتا تو ضرور باقی رہتا اور کیوں نہ ہو؟ اللہ رب العزت نے تو ان لوگوں کے متعلق:

''وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَكُوْنُ عَلَیْهِمْ شَهِیْداً ط (النساء: ۱۵۹)

''قیامت کے دن ہوگا ان پر گواہ''۔

فرمایا، جو نزول کے بعد آپ پر ایمان لائیں گے۔ نیز اس قول سے برأت تو آپ کا ذاتی فریضہ ہے، کیوں کہ اس کا تعلق آپ ہی سے ہے، لہٰذا جس زمانے میں بھی اس کا وقوع ہو، بلکہ تمام زمانوں کے اعتبار سے بھی آپ کے لیے برأت لازم ہے۔ قبل ازیں اس تعلق سے دو بڑی جماعتیں ہلاک اور اپنا دین وایمان غارت، کر چکی ہیں یعنی، آپ کے تعلق سے افراط اور بے جا غلو کے مرتکب نصاری اور آپ کی عداوت ومخالفت میں نمایاں یہود۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی ایک حدیث (۱) اس طرح کی وارد ہوئی ہے۔ اس لیے ضروری ہوا کہ عالم دنیا کے باقی رہتے ہوئے آپ (علیہ السلام) نزول فرما کر ان لوگوں سے اظہار برأت کریں،

---

(۱) عن ربیعة بن ناجذ عن علی، قال: "قال لی النبی صلی اللہ علیه وسلم فیک مثل من عیسی ابغضته الیهود حتی بهتوا امه واحبته النصاری حتی انزلوه بالمنزلة التی لیس به". ثم قال: یهلک فیَّ رجلان: محب مفرط یقرّظنی بما لیس فیَّ، ومبغض یحمله شنآنی علی أن یبهتنی (مسند احمد: ۱/۱۶۰/۱۳۷۶)

حضرت ربیعہ بن ناجذ روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی نے بیان کیا کہ: ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ: تم عیسیٰ بن مریم کا نمونہ ہو، ان سے یہود نے اس درجہ بغض بڑھایا کہ ان کی والدہ پر بہتان لگا دیا۔ اور نصاری نے ان سے محبت کی تو اس منزل پر پہنچا دیا، جو ان کی نہیں تھی۔ پھر حضرت علی نے فرمایا کہ: میری ذات کے بارہ میں (افراط وتفریط کی وجہ سے) دو طبقے ہلاک ہوں گے: محبت وثنا خوانی میں غلو کرنے والے، جو میری ایسی تعریف کریں گے جو مجھ میں نہیں ہے، اور ایسے بغض کرنے والے، جن کی دشمنی ان کو مجھ پر بہتان لگانے پر مائل کرے گی۔ (ابو طہ صغیر)

جنھوں نے آپ کو معبود بنایا۔ مزید برآں آپ کے سوا کسی اور نبی کی امت نے اپنے نبی کو معبود نہیں بنایا، اس لیے بھی ضروری ہوا کہ آپ نازل ہو کر ان کی اصلاح کریں اور خود ہی یہ فریضہ انجام دیں، چوں کہ دونوں زمانوں میں آپ کا اپنی قوم سے سابقہ لازمی ہے، اس لیے کلام کو بھی عام کر کے ''مَادُمْتُ فِيهِمْ'' ارشاد ہوا، تا کہ دونوں زمانوں کو شامل ہو جائے۔ حضرت عیسیٰ کو معبود اور فرزند قرار دینے والے نصاریٰ ہی کی صف میں وہ یہود بھی ہیں، جنھوں نے حضرت عزیر (علیہ السلام) کو ابن اللہ (۱) قرار دے رکھا تھا، کہ یہ تعداد میں بہت کم ہیں، پھر حضرت عزیر کو بھی دوبارہ زندہ کیا گیا ہے (۲)۔

اوپر کی تقریر میں اس برأت کو بہ طور عموم ثابت کیا گیا ہے کہ کسی زمانے میں بھی حضرت عیسیٰ کے قول کی وجہ سے، ان کو اور ان کی ماں کو معبود نہیں بنایا گیا، نہ شروع میں، نہ نزول کے بعد قبل الموت اور نہ ہی بعد الموت، اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ بعد الموت کی برأت ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ نزول کے بعد جب آپ کی وفات ہوگی، تو وفات کے بعد بھی کوئی آپ کو اور آپ کی والدہ کو معبود بنائے گا یا نہیں؟ یہ معلوم نہیں۔ لیکن بعد رفع، قبل النزول نصاریٰ نے آپ کو اور آپ کی والدہ کو معبود بنایا، یہ مشاہدے سے ثابت ہے۔ اور ''وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا'' میں شہادت کا معاملہ اگر چہ عام ہے، لیکن اس اتخاذ کے جزئیہ کے ساتھ، اس کا جوڑ کیسے ہو سکتا تھا اگر براءت کو تمام زمانوں کے اعتبار سے عام نہ رکھا جائے۔ قرآن کریم میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ کسی آیت کے موضوع کو بعض مفسرین خاص سمجھتے ہیں اور دوسرے لوگ اسی کو عام قرار دیتے ہیں۔ مثلاً ارشاد باری:

''اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وُّجْدِكُمْ'' (الطلاق: ٦)

''ان کو (یعنی مطلقہ کو) گھر دو رہنے کے واسطے، جہاں تم آپ رہو، اپنے مقدور کے موافق''۔

کو حضرت فاطمہ بنت قیس نے طلاق رجعی کے ساتھ خاص کیا ہے اور حضرت عمرؓ نے اسے عام کر کے مبتوتہ بائنہ کو بھی شامل کر دیا، خواہ وہ غیر حاملہ ہو۔ جس کی وجہ سے ائمہ مجتہدین کے درمیان اس مسئلے میں اختلاف بھی ہوا۔

''سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ'' کا مطلب یہ ہے کہ مجھ سے اتخاذ آلہہ کا امر ممکن ہی نہیں ہے۔ شہادت کے زمانے میں تو اس وجہ سے کہ آپ نے مجھے قابل شہادت ٹھہرایا، تو خداوندا! اس وقت تو میں آپ کا امین ہوں اور توفی کے بعد یہ کہنے کی قدرت ہی نہیں۔

(۱) ارشاد باری ہے: وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُنِ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ (التوبۃ: ۳۰) اور یہود نے کہا کہ: عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا کہ: مسیح اللہ کا بیٹا ہے)۔ ابو طاصغیر

(۲) دیکھیے: ''تفسیر در منثور'' ارشاد باری: ''اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا'' کے تحت سورہ البقرہ: ۲۵۹۔ (ابو طاصغیر)

علاوہ ازیں قیاس یہ تھا کہ درازیٔ عمر کے سبب، ادائے شہادت بھی دراز ہوتی؛ مگر حضرت عیسیٰ نے عبارت میں ندرت پیدا کر کے جامعیت کے ساتھ ساتھ غایت اختصار سے کام لیا (اور فرمایا) ''وَ كُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيداً مَّادُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ط وَأَنتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيءٍ شَهِيدٌ ٥'' (المائدہ: ۱۱۷) چوں کہ اس جملے سے ادائے شہادت کا طریقہ معلوم ہوتا ہے، اس لیے نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی آپ علیہ السلام سے یہ جملہ اخذ کیا (جیسا کہ حدیث رسول ''فاقول کماقال العبد الصالح'' کے تحت اس پر تفصیلی گفتگو آ رہی ہے) پھر ادائے شہادت اور اس کے ماقبل میں ایسی ذاتی مناسبت ہے، جس میں اظہار مقصود کے لیے کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔

جب ہماری ذکر کردہ تفصیل آپ نے اچھی طرح سمجھ لی، تو یقیناً یہ بات عیاں ہوگئی ہوگی کہ مدار جواب یہ نہیں ہے کہ اتخاذ کا وقوع توفی کے بعد ہوا، جس کی وجہ سے آپ کو اس کا علم نہیں ہوا۔ اس لیے کہ توفی سے پہلے بھی اس کا وقوع ممکن ہے، اگر چہ واقع نہ ہوا ہو۔ ہاں اگر وقوع ہوا اور آپ کو معلوم بھی ہو گیا، تو پھر اس سے منع کرنا ضروری ہے۔ سورہ مائدہ میں اس سے پہلے ارشاد باری ہے:

''لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوٓا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ط وَقَالَ الْمَسِيحُ يَـٰبَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ط إِنَّهُۥ مَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ ط وَمَا لِلظَّـٰلِمِينَ مِنْ أَنصَارٍ'' (المائدہ: ۷۲).

''بیشک کافر ہوئے، جنہوں نے کہا: اللہ وہی مسیح ہے مریم کا بیٹا اور مسیح نے کہا کہ: اے بنی اسرائیل! بندگی کرو اللہ کی، جو رب ہے میرا اور تمہارا، بیشک جس نے شریک ٹھہرایا اللہ کا، سو حرام کی اللہ نے اس پر جنت اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور کوئی نہیں گنہگاروں کی مدد کرنے والا''۔

اس موقع پر ابن حزم کی ''الفصل فی الملل والنحل'' ج:۱،ص:۱۱۲'' کی مراجعت مناسب ہوگی۔ بلکہ جواب کا مدار اور مراد ''توفی'' کے بعد فریضۂ شہادت سے بری الذمہ ہونا ہے، خواہ بعد التوفی اجمالاً علم ہو گیا ہو یا قطعاً علم ہی نہ ہوا ہو۔ بس اتنی ہی مقدار، جس کا ذکر صراحتاً ہے، مدار جواب ہے، نہ کہ فرضی وہمیات۔

الحاصل: مدار جواب، وفات سے پہلے اتخاذ کا وجود، یا عدم نہیں ہے، بلکہ آپ سے قول کا صدور یا عدم صدور ہے، نیز فریضۂ شہادت میں داخل ہونا یا نہ ہونا ہے۔ کیوں کہ علم اور شہادت دونوں الگ الگ چیزیں ہیں اور آپ کا قول ''وَ كُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيداً'' وقوع اتخاذ اور عدم وقوع اتخاذ دونوں کو شامل ہے، فقط عدم کے ساتھ خاص نہیں۔ اس لیے کہ شہادت وجود کے منافی نہیں، بلکہ وجود اور عدم دونوں کو یکساں طور پر عام

ہے اور آپ کی بات کا خلاصہ یہ ہوا کہ میں شاہد ہوں، مجھ سے ضرور گواہی لیجیے، جب میں اپنی زندگی میں گواہ تھا تو اس وقت بھی آپ نگراں تھے اور میرے اٹھائے جانے کے بعد بھی۔ پس ''وَاَنْتَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ شَہِیْدٌ'' کا مطلب یہ ہوا کہ: اے اللہ! جس شہادت کی نسبت آپ نے میری طرف کی ہے، وہ آپ کے لیے بھی ہے، بلکہ میری بہ نسبت آپ کے لیے زیادہ عام وتام اور ہمہ گیر ہے۔ اگر شہادت، وجود کے لیے مانع ہوتی تو رقابت بدرجۂ اولیٰ مانع تھی۔ اس لیے اس مقام پر اس کا ذکر مناسب نہ ہوا؛ کیوں کہ اس صورت میں خود باری تعالیٰ پر اعتراض لازم آئے گا (عیاذاباللہ) اور اگر مطلب یہ ہو کہ جب تک میں قوم میں رہا، تو اس وقت تک کے حالات سے واقف ہوں، وفات کے بعد کے حالات کا علم مجھے نہیں، تو یہ وفات بعد النزول پر بھی صادق آتا ہے۔ کیوں کہ مدت رفع میں، اللہ تعالیٰ نے آپ کی کفار سے تطہیر کا ذمہ لے رکھا ہے۔

حق یہ ہے کہ آپ کا فریضہ صرف شہادت ہے، نہ کہ ہونے والی نامناسب چیزوں کا خاتمہ کرنا۔ اس لیے کہ شہادت کے معنی صرف وقوع پذیر چیزوں سے واقف ہونا ہیں، نیز یہ بھی قوم میں رہنے کے زمانے تک ہی محدود ہے۔ ''رقابت'' اور ''توفی'' کے بعد کے حالات اللہ تعالیٰ کے حوالے ہیں، اسی لیے بعض کا تذکرہ کر کے مجموعے کی طرف اشارہ کر دیا گیا، جو ''صنعت احتباک (۱)'' کی ایک نوع ہے۔ مابعد الشہادۃ کے سلسلے میں نفی کی اور ماقبل رقابۃ اللہ کے سلسلے میں سکوت اختیار کیا، پس مقابلہ شہادت اور رقابت کا ہے اور تفصیل مابعد الموت وماقبل الموت کی نہے۔ ماقبل الموت کے بارے میں شہادت اور مابعد الموت کے بارے میں رقابت کا ذکر کیا، حالاں کہ اس میں عموم ہے، جس کا ذکر سورہ ''نساء'' کی اس آیت: ''وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یَکُوْنُ عَلَیْھِمْ شَہِیْدًا'' میں ہے۔

لہٰذا اس بدنصیب کے چیلے نے جو یہ بات کہی کہ توفی لازماً اتخاذ الٰہ (یعنی آپ کے معبود بنائے جانے) سے پہلے ہے، اسی لیے اس کا عذر کیا، بالکل باطل ہے۔ نیز اس نے ''وَاِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ (النساء:۱۵۹) سے جو نصاریٰ مراد لیا ہے، وہ بھی اس کی جہالت ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ حضرت عیسیٰؑ نے عدم علم کا عذر کیا ہے، تو اس میں کیا حرج ہے؟ کیا تمام انبیاء کرام نے ''لاعلم لنا انک انت علام الغیوب ٥'' (المائدہ:۱۰۹) نہیں کہا۔ لہٰذا آپ کا عدم علم بھی اسی قبیل سے ہوگا۔

(۱) الاحتباک: ھو ان یجتمع فی الکلام متقابلان، ویحذف من کل واحد منھما مقابلہ لدلالۃ الآخر علیہ، کقولہ: علفتھا تبنا وماءً بارداً، ای: علفتھا تبنا وسقیتھا ماءً بارداً (کتاب التعریفات للجرجانی: ص۸) احتباک یہ ہے کہ کلام میں دو مقابل چیزیں یک جا ہوں۔ پھر ان میں سے ہر ایک کے مقابل کو اس وجہ سے حذف کر دیا جائے کہ دوسرا اس پر دال ہے، مثلاً ''علفتھا تبنا وماءً بارداً'' میں اصل عبارت ''علفتھا تبنا کو اور سقیتھا ماء بارداً'' ہے۔ ''سقیتھا'' کو اس لیے حذف کر دیا گیا کہ ''علفتھا تبنا'' سے سمجھ میں آرہا ہے۔ (ابو طہ صغیر)

الغرض یہاں تین چیزیں ہیں:

۱۔ آپ کے زمانے میں عدم وقوع اتخاذ الہ۔

۲۔ آپ کے زمانے میں وقوع اتخاذ الہ، لیکن آپ کی اس سے ناواقفیت۔

۳۔ آپ کا اتخاذ الہ کا حکم نہ دینا، خواہ آپ کے زمانے میں اس کا وقوع ہوا ہو یا نہ ہوا ہو اور خواہ آپ کو معلوم ہو یا نہ ہو۔

تیسری صورت ہی آیت کی نص اور اس کے الفاظ کے مطابق صحیح جواب ہے اور آپ (علیہ السلام) پر اس کے سوا کچھ لازم نہ تھا کہ علم کے بعد، اس سے منع کرتے۔

پھر اگر سوال فساد امت کے علم کے بارے میں ہوتا، تو یہ اس وقت کے اعتبار سے ہوتا، جب آپ ان کے درمیان موجود تھے، رہا نزول کے بعد، نزول سے پہلے کے زمانے اور رفع کے بعد کی گزری ہوئی باتوں کا علم، تو یہ آپ علیہ السلام کے ذمہ ہے ہی نہیں، اس لیے آپ کو اس علم کی نفی کا حق ہے، بہ شرطے کہ توفی بمعنی اخذ ہو اور اگر توفی بمعنی موت ہو تو اس کا بھی جواب، بالکل سوال کے مطابق آ رہا ہے۔

واضح رہے کہ اللہ تعالی نے: ''ءَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ'' (المائدہ:۱۱٦- کیا تو نے کہا لوگوں کو؟) فرمایا ''ء انت سننت للناس'' (کیا آپ نے لوگوں کے لیے نیا طریقہ ایجاد کیا) نہیں فرمایا۔ اس کی وجہ مذکور ہو چکی ہے۔ نیز ''وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا'' (المائدہ:۱۱۷) میں ''عَلَيْهِمْ'' کو مقدم کیا، کیوں کہ ان کے ساتھ اظہار تعلق کا مدار، یہی لفظ ہے اور ''شھیداً'' کی صورت وہی ہے جو ''وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا'' (البقرۃ: ۱۴۳) میں ''شھیداً'' کی ہے۔ ''تفسیر در منثور'' میں ہے کہ ابن ابی حاتم، ابن عساکر اور ابن مردویہ نے حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا:

''اذا كان يوم القيامة دعى بالانبياء وأممها ثم يدعى بعيسى فيذكر الله نعمته عليه فيقربها، يقول ''يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ...'' الايه ثم يقول ''ءَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَأُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللهِ'' فينكر أن يكون قال ذلك، فيؤتىٰ بالنصارى فيسئلون؟ فيقولون: نعم هو أمرنا بذلك، فيطوّل شعر عيسى حتى يأخذ كل ملك من الملئكة بشعرة من شعر راسه وجسده، فيجاثيهم بين يدى الله مقدار الف عام؛ حتى يوقع عليهم الحجة، ويرفع لهم الصليب، وينطلق بهم الى النار''. (در المنثور: ۲/۲۰۸)

''قیامت کے دن تمام انبیاء کرام اور ان کی امتوں کو بلایا جائے گا، پھر خاص طور پر حضرت عیسیٰ کو بلا کر اللہ رب

العزت، ان پر کیے جانے والے اپنے انعامات کا ذکر کریں گے اور حضرت عیسیٰ ان سب کا اقرار کریں گے؛ چناں چہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: ''اے عیسیٰ مریم کے بیٹے! یاد کرو میرا احسان جو ہوا ہے تجھ پر اور تیری ماں پر......الخ'' پھر ارشاد باری ہوگا: ''تو نے کہا: لوگوں کو کہ: ٹھہرالو مجھ کو اور میری ماں کو دو معبود سوائے اللہ کے'' اس پر حضرت عیسی فرمائیں گے: میں نے ہرگز ایسا نہیں کہا، پھر نصاریٰ کو بلا کر پوچھا جائے گا، تو وہ کہیں گے۔ہاں انہوں نے ہی ہمیں اس کا حکم دیا تھا، اس کے بعد حضرت عیسیٰ کے بال لمبے کردیئے جائیں گے اور ہر ایک فرشتہ آپ کے سر اور جسم کا ایک ایک بال پکڑے گا اور ایک ہزار سال تک، اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ فرشتے آپ کے ساتھ گھٹنے ٹیک کر بیٹھے رہیں گے، تا آں کہ نصاریٰ کے خلاف حجت قائم ہو جائے گی پھر ان کے سامنے صلیب لائی جائے گی اور مع صلیب ان سب کو جہنم رسید کردیا جائے گا''۔

حافظ ابن کثیر (۲/۱۶۶) اپنی تفسیر میں مذکورہ حدیث ذکر کرنے سے پہلے لکھتے ہیں: اس سلسلے میں ایک مرفوع حدیث بھی ہے، جسے حافظ ابن عساکر نے ابوعبد اللہ مولی عمر بن عبد العزیز [جو کہ ثقہ تھے] کے ترجمہ میں ذکر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے سنا کہ ابو بردہ حضرت عمر بن عبد العزیز سے، اپنے والد ابوموسیٰ سے روایت کرتے ہوئے بیان کررہے تھے کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا...''الخ۔ پھر ابن کثیر نے حدیث مذکور مکمل ذکر کی اس کے بعد فرمایا: ''ھذاحدیث غریب عزیز''۔

گزشتہ آیات کی تشریح کے سلسلے میں ہم نے جو کچھ بیان کیا، یہ روایت بالکل اسی کے مطابق ہے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا:

''اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُکَ وَاِنْ تَغْفِرْلَهُمْ فَاِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ٥'' (المائدہ: ۱۱۸)

''اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ بندے ہیں تیرے اور اگر تو ان کو معاف کردے تو تو ہی ہے زبردست حکمت والا(۱)''۔

اس کی وجہ مذکور ہو چکی۔ حضرت عیسیٰ نے اس مضمون کو یا تو سورہ مائدہ ہی میں اس سے پہلے مذکور آیت کریمہ:

''قَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ج فَمَنْ يَّكْفُرْبَعْدُمِنْكُمْ فَاِنِّیْ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًالَّآاُعَذِّبُهٗ اَحَدًامِّنَ الْعٰلَمِيْنَ٥'' (المائدہ: ۱۱۵)

(۱) مذکورہ آیت کے ظاہری مضمون سے ایک اشکال پیدا ہوسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کے اس کلام میں نصاریٰ کے لیے سفارش کا پہلو ہے، حالاں کہ نصاریٰ مشرک ہیں اور مشرک کے لیے شفاعت اور دعاء مغفرت جائز نہیں؟ اس کے متعدد جوابات مفسرین نے نقل فرمائے ہیں، انہیں میں سے چند یہاں ذکر کیے جارہے ہیں۔ (محمد صغیر)

''کہا اللہ نے میں بیشک اتاروں گا وہ خوان تم پر پھر جو کوئی ناشکری کرے گا اس کے بعد، تو میں اس کو وہ عذاب دوں گا، جو کسی کو نہ دوں گا، جہاں میں''۔

سے اخذ کیا ہے، یا پھر ''آل عمران'' کی اس آیت سے:

''اِذْقَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰىٓ اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ج ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ٥ فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ٥'' (آل عمران: ۵۵.۵۶)

''جس وقت کہا اللہ نے: اے عیسیٰ! میں لے لوں گا تجھ کو اور اٹھا لوں گا، اپنی طرف اور پاک کردوں گا تجھ کو کافروں سے اور رکھوں گا ان کو جو تیرے تابع ہیں، غالب ان لوگوں سے جو انکار کرتے ہیں قیامت کے دن تک، پھر میری طرف ہے تم سب کو پھر آنا، پھر فیصلہ کردوں گا تم میں، جس بات میں تم جھگڑتے تھے۔ سو وہ لوگ جو کافر ہوئے ان کو عذاب دوں گا سخت عذاب دنیا میں اور آخرت میں اور کوئی نہیں ان کا مددگار''۔

''معالم التنزیل والانس الجلیل'' میں ہے کہ: حضرت عیسیٰؑ نے ''اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ'' نافرمان اہل مائدہ کے بارے میں بھی فرمایا تھا۔ یہ واقعہ رفع سے پہلے کا ہے۔ پھر قیامت کے دن بھی یہی جملہ ارشاد فرمائیں گے۔ اس لیے اس جملے کا اتخاذ اللہ کے ساتھ کوئی اختصاص نہیں، جیسا کہ وہم ہوتا ہے۔

''معالم التنزيل فی التفسير والتاويل'' میں ہے کہ: حضرت عطاء بن ابی رباح حضرت سلمان فارسی سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

''فاَوحیٰ الله تعالیٰ الی عیسی -علیہ السلام- اجعل مائدتی ورزقی للفقراء دون الاغنیاء، فعظم ذلک علی الاغنیاء حتی شکوا وشککوا الناس فیها، وقالوا: أترون المائدة حقا تنزل من السماء؟ فاوحی الله الی عیسیٰ علیہ السلام: انی شرطت ان من کفر بعد نزولها عذبته عذابا لا اعذبه احدا من العلمین، فقال عیسی علیہ السلام: اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ''. (معالم التنزیل: ج ۳۲۸/۲)

''اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کے پاس وحی بھیجی کہ: میرے دسترخوان اور رزق کو فقراء تک محدود رکھنا، اغنیاء کو اس میں شامل نہ کرنا تو اغنیاء کو یہ بات بہت شاق گزری، یہاں تک کہ انہوں نے اس سلسلے میں خود شکوک وشبہات کا اظہار کیا اور دوسروں کو بھی مبتلائے شک کیا اور کہا: کیا تمہارا خیال ہے کہ واقعی یہ دسترخوان آسمان

سے نازل ہوگا؟ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کے پاس وحی بھیجی کہ: اس شرط پر دسترخوان اتاروں گا کہ جو نزول مائدہ کے بعد بھی کفر کرے گا، تو میں اسے ایسی سخت سزا دوں گا، جو دنیا و آخرت میں کسی اور کو نہ دوں گا۔
اس پر حضرت عیسیٰ نے فرمایا: ''اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُکَ وَاِنْ تَغْفِرْلَهُمْ فَاِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ''۔

ابن ابی حاتم نے اسے روایت کیا ہے لیکن انہوں نے تلاوت آیت کا ذکر نہیں کیا۔ اور ابن کثیر نے مع سند مکمل ذکر کیا ہے، نیز یہ بھی فرمایا: ''کہ یہ اثر انتہائی غریب ہے، ابن ابی حاتم نے اس روایت کو واقعہ کے مختلف مقامات پر ٹکڑے ٹکڑے کر کے بیان کیا ہے اور میں نے پوری روایت ایک ساتھ ذکر کر دی، تا کہ اس کا سیاق تام اور کامل ہو جائے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم''۔ صاحب ''درمنثور'' (۶۱/۲) نے اس کی تخریج کے سلسلے میں کئی ایک مصادر ذکر فرمائے ہیں (وہاں دیکھ لیا جائے) معالم التنزیل (۳۳۰/۲) میں ایک قول یہ بھی مذکور ہے کہ: ''اس آیت کریمہ کا تعلق دونوں فریقوں سے ہے، جس کا مفہوم یہ ہوا کہ (عقیدہ تثلیث کی وجہ سے) ان میں کے کافروں کو عذاب دیں (تو جب بھی آپ مختار ہیں، کیوں کہ یہ آپ کے بندے ہیں) اور اگر ان میں سے مومنین کی مغفرت فرمائیں (تو جب بھی آپ مختار ہیں، کیوں کہ آپ قدرت والے اور حکمت والے ہیں)

حافظ سیوطی ''درمنثور'' میں ابوالشیخ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ: آیت کریمہ ''اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُکَ'' کی بابت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

''اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبٰدُکَ' یقول: عبیدک قد استوجبوا العذاب بمقالتهم 'وَاِنْ تَغْفِرْلَهُمْ'' ای من ترکت منهم ومُدَّ (بـ صیغة المجهول) فی عمره حتی أهبط (بـ صیغة المجهول) من السماء الی الارض یقتل الدجال، فنزلوا عن مقالتهم ووحدوک وأقروا أنا ''وَاِنْ تَغْفِرْلَهُمْ'' حیث رجعوا عن مقالتهم' فانک اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ''. (درمنثور: ۲/۲۱۶)

''حضرت عیسیٰ اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے کہ ''تیرے یہ بندے (نصاریٰ) اپنی (غلط) باتوں کی وجہ سے عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں، پس اگر آپ ان کو سزا دیں (تو جب بھی آپ مختار ہیں) اور اگر آپ ان کی مغفرت فرما دیں (یعنی ان میں سے ان مؤمن لوگوں کی مغفرت فرما دیں) جن کو میں نے (آسمان پر جاتے وقت دنیا میں) چھوڑا تھا اور (ان لوگوں کی بھی) جو اس وقت زندہ تھے، جب کہ میں قتل دجال کے لیے آسمان سے زمین پر نازل ہوا اور اس وقت انہوں نے اپنے دعوائے (تثلیث) سے توبہ کر لی اور آپ کی توحید کے قائل ہو گیے اور اس بات کو اقرار کر لیا کہ ہم سب (اللہ کے) بندے ہیں، تو اگر آپ ان کی اس بناء پر مغفرت

فرمادیں کہ انہوں نے اپنے دعوائے (تثلیث) سے توبہ کرلی تو (جب بھی آپ مختار ہیں، کیوں کہ) آپ قدرت والے اور حکمت والے ہیں"۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے جواب کا حاصل یہ ہوا کہ یہ سفارش اگرچہ الفاظ کے اعتبار سے تمام نصاریٰ کے لیے ہے، لیکن مراد صرف دو قسم کے نصاریٰ ہیں: ایک وہ جو حضرت عیسیٰ کے رفع سماوی کے وقت موجود تھے اور دین عیسائیت پر ایمان رکھتے تھے، تثلیث وغیرہ کافرانہ عقائد کے قائل نہ تھے، تو مومن ہونے کی وجہ سے ان کے لیے سفارش میں کوئی اشکال نہیں اور دوسرے وہ نصاریٰ جو آپ علیہ السلام کے نزول کے بعد آپؑ پر ایمان لے آئے اور تثلیث وغیرہ غلط عقائد سے توبہ کرکے مشرف بہ اسلام ہوگئے۔ غرض یہ سفارش ان نصاریٰ کے لیے نہ ہوگی، جن کی موت حالت کفر میں ہوئی، اس لیے کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔

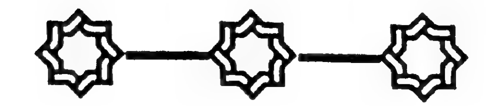
اس کے بعد ارشاد باری ہے:

"ھٰذَا یَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُھُمْ"۔

"یہ دن ہے کہ کام آوے گا سچوں کو ان کا سچ"۔

یہ آیت نیز ماقبل میں ذکر کردہ تصریحات، اس بات پر نص ہیں کہ یہ سب کچھ (یعنی سوال و جواب، اور استغفار وغیرہ) قیامت کے روز ہوگا (نہ کہ ماضی میں ہوچکا)۔

اللہ سچا، اللہ کا رسول سچا اور ہم بھی عقائد و مسائل، بالخصوص مسئلہ ختم نبوت میں؛ سچے ہیں، انشاء اللہ اس سچائی کا نفع ہمیں ضرور ملے گا۔ "وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ o" اس سچائی کی تکذیب کرنے والے ظالموں کو عنقریب معلوم ہوجائے گا کہ وہ کس انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔



کیا حیات مسیح کا عقیدہ مسلمانوں نے نصاریٰ سے لیا؟

ملحد لاہوری قادیانی کا خیال ہے کہ حیات مسیح کا عقیدہ مسلمانوں نے نصاری سے لیا ہے، ورنہ اصل اسلام میں اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ جب کہ یہ صریح جھوٹ ہے، جس کی وجہ سے یہ شخص اللہ، ملائکہ اور تمام انسانوں کی لعنت کا مستحق بن رہا ہے۔

نزول مسیح علیہ السلام کے متعلق تو نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے ساتھ حدیثیں ثابت ہیں اور پوری امت محمدیہ کا اس پر اجماع بلا فصل ہے۔ ہاں نزولِ مثالی یعنی ظہورِ مثیلِ مسیح کا عقیدہ، البتہ ماضی قریب کے کچھ نصارائے یوروپ کا اختراعی ہے۔ اس کے لیے ''دائرة المعارف للبستاني؛ من تاريخ الالفيين و سويد نبرغ'' ملاحظہ کی جائے۔ بلکہ یہ بات ان ہندوستانی رسالوں میں بھی ملے گی، جو گرجا گھروں کی طرف سے شائع ہوتے رہتے ہیں، انہی سے ان ملحدوں نے لیا ہے، نہ کہ خود اس شقی بد بخت (غلام احمد قادیانی) کا کشف والہام ہے جیسا کہ اس کا لاہوری چیلا کہتا ہے۔ اللہ ان کو غارت کرے۔ سب سے پہلے یہ بات ماضی قریب میں مشرکین نصاری نے کہی، انہی سے ان کے شیاطین نے چوری چھپے کچھ سننے کی کوشش کی، تو ان کے تعاقب میں شہاب ثاقب آپہنچا۔

ان میں سے بعض کا خیال اب بھی یہ ہے کہ نزول مسیح سے مراد روحانی علوم کا ظہور ہے، نہ کہ کسی خاص شخص کا ظہور۔ مرزا قادیانی اور اس کے لاہوری مرید نے یہ سب کچھ سر سید احمد خاں کی ''تفسیر قرآن'' سے سرقہ کیا ہے۔ جو نصرانیت اور اسلام میں صلح اور موافقت کے لیے کوشاں تھا؛ اسی لیے اس نے معجزات کا کلیۃً انکار کیا، نیز بہت سے متواترات مثلاً: وجود ملائکہ، آسائش جنت، احادیث رسول وغیرہ کا بھی انکار کیا، قرآنی آیات کی الحادی تفسیر کی اور قرآن میں تحریف کا ارتکاب کیا۔ اگر انہی چیزوں کا نام نبوت ہے تو ''الفضل للمتقدم'' کی رو سے اسی سر سید کو نبی ہونا چاہیے تھا، نہ کہ مرزا قادیانی کو، (اعوذ باللہ منہ) علاوہ ازیں مرزا قادیانی کچھ

چیزوں میں حکیم محمد حسن امروہوی کا پیرو ہے، جو ہر حق و باطل پر ایمان رکھتا ہے۔ **لاحول ولاقوۃ الا باللّٰہ**۔

فرقہ بہائیہ کا بانی "بہاؤالدین (۱)" "**الحراب فی صدر البھاء والباب**" میں دعویٰ کیا ہے کہ:
یہود، نصاریٰ اور مسلمان؛ جس مسیح کا انتظار کر رہے ہیں، یعنی عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) وہ سولی پا کر وفات پا چکے اور ایک گذرے ہوئے لوگوں کی طرح وہ بھی مٹ مٹا چکے ہیں۔ ان کی روح شریفہ مجھ میں منتقل ہوگئی ہے اور میں آپ علیہ السلام کی حقیقت اور روح سے عبارت ہوں، نہ کہ آپ کے جسمانی ڈھانچے سے۔ (انتہیٰ)

یہ اور اس جیسی دوسری چیزیں ان دونوں کم بختوں کے اصول ہیں اور یہ کم بخت لاہوری مرید اپنے بد بخت قادیانی پیر سے بھی کفر میں بڑھا ہوا ہے۔ کیوں کہ اس نے اس سلسلے میں تدریجی قدم اٹھایا اور اللہ تعالیٰ بھی ایک ایک درجہ ڈھیل دیتا رہا، چناں چہ یہ قادیانی کسی زمانے میں اپنا عقیدہ یہ ظاہر کرتا رہا کہ حضرت عیسیٰ آسمان میں زندہ ہیں، عنقریب اترنے والے ہیں اور اسی پر ارشاد باری:

"هُوَالَّذِیٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ" (الفتح: ۲۸)

---

(۱) بہاؤاللہ بانی فرقہ بہائیہ مرزا علی محمد باب شیرازی متوفی ۱۸۵۰ء (لعنت اللہ علیہا) کا مرید اور اس کا جانشین تھا۔ مرزا علی محمد شیرازی ۱۲۵۲ھ مطابق ۱۸۲۰ء میں ایران میں پیدا ہوا، یہ اثنا عشری شیعہ تھا، مگر اثنا عشریوں کے حدود سے تجاوز کر گیا، اس نے اسماعیلی فرقہ کے عقائد باطلہ اور فرقہ سبعہ کے عقیدہ حلول کا ایک ایسا معجون مرکب تیار کیا، جسے اسلامی عقائد سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ ابتداء میں اس نے شیعوں کے بارہویں امام "امام غائب" کے علوم وفنون کے وارث وامین ہونے کا دعویٰ کیا، کچھ عرصہ بعد مستقل مہدی ہونے کا دعویٰ کیا، بعد ازیں یہ دعویٰ بھی داغ دیا کہ: ذات خداوندی اس میں حلول کر آئی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے توسط سے مخلوقات کے سامنے جلوہ افروز ہوتے ہیں، مرزا علی روز آخرت اور بعد از حساب، دخول جنت وجہنم پر ایمان نہیں رکھتا تھا، اس کا دعویٰ تھا کہ روز آخرت سے ایک جدید روحانی زندگی کی جانب اشارہ کرنا مقصود ہے، رسالت محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے نزدیک آخری رسالت نہ تھی، وہ کہتا تھا کہ: ذات باری مجھ میں حلول کر چکی ہے اور میرے بعد آنے والوں میں بھی حلول کرتی رہے گی، (گویا حلول الوہیت کو وہ اپنے لیے مخصوص نہیں ٹھہراتا تھا) بنابریں بہائی فرقہ یہودیت، نصرانیت اور اسلام کا معجون مرکب ہے اور ان میں کوئی حد فاصل نہیں پائی جاتی۔

مرزا نے اپنی نیابت کے لیے اپنے دو مریدوں کو منتخب کیا تھا، ایک "صبح ازل" نامی اور دوسرا "بہاؤاللہ" ان دونوں کو جب فارس سے نکال دیا گیا تو "صبح ازل" قبرص جا کر سکونت پذیر ہوا اور بہاؤاللہ "آدنہ"۔ صبح ازل کے پیرو بہت کم تھے۔ اس کے بالمقابل بہاؤاللہ کا حلقہ خاصا وسیع تھا، بعد ازاں اس مذہب کو بہاؤاللہ کی طرف منسوب کر کے "بہائی" کہنے لگے، نیز اس فرقہ کو اس کے اصل بانی وموسس کی جانب منسوب کر کے "بابی" بھی کہا جاتا ہے۔ مرزا نے اپنے لیے "باب" کا لقب تجویز کیا تھا۔

بہاؤاللہ نے مرزا کی طرح بہت سی اختراعات کیں، وہ بھی مرزا کی طرح حلول کا قائل تھا اور اپنے آپ کو مظہر الوہیت قرار دیتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ: وہ ذات باری کے حسن وجمال کا جلوہ گاہ ہے۔ علاوہ ازیں اس کے پیروکار اسے فوق البشر تصور کرتے اور اکثر صفات الہیہ کا مجموعہ قرار دیتے۔ بہاؤاللہ کا دعویٰ تھا کہ وہ جس مذہب کی دعوت دے رہا ہے وہ اسلام سے الگ ایک جداگانہ مسلک کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۱۶ رمئی ۱۸۹۲ء کو جہنم رسید ہوا اور اس کا بیٹا عباس آفندی اس کا جانشین بنا (ملاحظہ ہو "تاریخ المذاہب الاسلامی" اردو، ص: ۳۶۲)۔ ابوطہ صغیر

''وہی ہے جس نے بھیجا اپنا رسول سیدھی راہ پر اور سچے دین پر، تاکہ اوپر رکھے اس کو ہر دین سے''۔

کو محمول کرتا تھا۔ یہ بات اس نے ''براہین'' میں ذکر کی ہے، پھر ''حمامۃ البشریٰ'' میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ نے مجھے بذریعہ الہام یہ بتایا ہے کہ حضرت مسیح کی وفات ہوگئی ہے اور آپ کے نزول وظہور سے، آپ کے مثیل کا ظہور مراد ہے اور وہ میں ہوں۔ لیکن اس الہام کو میں نے دس سال تک چھپائے رکھا۔ علاوہ ازیں اس نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ مذکورۃ الصدر آیت کا مصداق بھی میں ہی ہوں۔لعنت اللہ علیہ''. (اعجاز احمدی)

''ازالہ'' میں لکھتا ہے کہ: ''آئندہ زمانوں میں میرے علاوہ دسیوں ہزار مثیلِ مسیح ہوسکتے ہیں، نیز دمشق میں بھی مثیلِ مسیح کا ظہور ہوسکتا ہے، جیسا کہ ظاہر احادیث سے معلوم ومستفاد ہوتا ہے، پھر علماء کیوں شکوک وشبہات میں ہیں، اس لیے کہ وہ مسیح بھی آسکتا ہے، جس کے بارے میں انہیں علم ہے، اس طرح ان کی مراد بر آجائے گی''۔

''آئینہ کمالات اسلام'' میں لکھتا ہے کہ: ''مجھے کشف ہوا ہے کہ ایک عرصہ گذرنے کے بعد خشکی پر دوبارہ فتنہ وفساد اور شرک وظلم کا ظہور ہوگا، مسیح کی عبادت ہوگی، انھیں دوبارہ معبود بنایا جائے گا، چناں چہ اس وقت مسیح کا دوبارہ جلالی نزول ہوگا اور دنیا کا وہیں خاتمہ ہوجائے گا''۔

سچ کہا ہے کسی کہنے والے نے:

''دروغ گو را حافظہ نہ باشد''

کہنے والا اس سے کہہ سکتا ہے پھر تو تو ان ہی بدنصیبوں میں سے ایک ہے، جن کے دلوں اور کانوں پر من جانب اللہ مہر لگی ہوئی ہے، آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے اور جن کے لیے دردناک عذاب خداوندی ہے، بدبخت تمام امور میں کسی نہ کسی الہام کا دعویٰ کردیتا ہے۔ چناں چہ اس کے بعد کہنے لگا کہ: ''حیات مسیح کا عقیدہ (نعوذ باللہ) کفر اور شرک ہے''۔ لہٰذا وہ خود بھی اپنے اقرار کے بہ موجب زندگی کے بیشتر حصے میں کافر رہا اور پچاس سال سے زیادہ عرصہ کفر پر گذار دیا۔ اس وجہ سے آپ اس کافر کی نبوت، عیسویت، مہدویت، بلکہ اس کے ایمان اور عقل سے بھی ہاتھ دھولیجئے، مجھے تو اس کے انسان ہونے میں تردد ہے، شاید وہ شیطان ہے، جس نے انسان کا روپ اختیار کرلیا ہے، کیوں کہ میں نے بنی آدم میں جہاں تک مجھے علم ہے، اس جیسا سرتاپا کبر ونخوت، سرکشی اور شرارت سے لبریز انسان نہیں پایا، جب وہ شیطان کی طرف سے آئی ہوئی وحی، یا اپنے کسی مقصد کے متعلق کسی کا ادنی اختلاف سنتا، تو بے قابو ہوجاتا، غصے سے آگ بگولا ہوجاتا، اس کی سرکشی میں اضافہ ہوجاتا اور ہر ممکن طریقے سے اپنے مخالف کی بے آبروئی پر اتر آتا، اس کی کسی چیز کو نہ چھوڑتا۔ اسی

ادھیڑ بن میں اس کی پوری زندگی کٹ گئی۔ جب نصاریٰ نے اس سے مناظرہ کیا تو حضرت عیسیٰ پر بھی ایسی زبان درازی کی، جس سے جگر پارہ پارہ ہو جائے۔ نیز ہر اس شخص کے ساتھ یہی معاملہ کیا، جس نے بھی اس سے حق پر مناظرہ کر کے اسے لاجواب کر دیا۔ لاحول ولاقوۃ الا باللّٰہ.

اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیے، اشک برسانا چاہیے، اس موقع پر اللہ تعالیٰ کے یہ ارشادات یاد کیجئے:

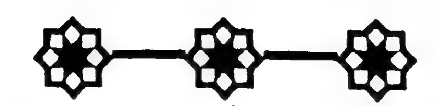
"وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلاً اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ط وَقَالُوْا ءَ اٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَط مَاضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلاًط بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ط اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلاً لِّبَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ ط وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَلٰٓئِكَةً فِى الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ط وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ ط هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ط وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ ج اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ٥" (الزخرف:۵۷-۶۲)

"اور جب مثال لائے مریم کے بیٹے کی، تبھی قوم تیری اس سے چلانے لگتی ہے اور کہتی ہے کہ: ہمارے معبود بہتر ہیں یا وہ۔ یہ مثال جوڑالتے ہیں تجھ پر، سو جھگڑنے کو، بلکہ یہ لوگ ہیں جھگڑالو۔ وہ کیا ہے، ایک بندہ ہے، کہ ہم نے اس پر فضل کیا اور کھڑا کر دیا اس کو بنی اسرائیل کے واسطے۔ اور اگر ہم چاہیں تو نکالیں تم میں سے فرشتے، رہیں زمین میں تمہاری جگہ۔ اور وہ نشان ہے قیامت کا، سو اس میں شک مت کرو اور میرا کہا مانو، یہ ایک سیدھی راہ ہے۔ اور نہ روک دے تم کو شیطان وہ تو تمہارا دشمن ہے، صریح"۔

دوسری جگہ ارشاد باری ہے:

"فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" (النحل : ۹۸)

"سو جب تو پڑھنے لگے قرآن، تو پناہ لے اللہ کی شیطان مردود سے"۔



تحریفات قادیانی

پھر مجھے اس ملحد کی کچھ دوسری تحریفات کا بھی علم ہوا، جن میں اس نے اپنی جہالت، بے دینی اور ڈھٹائی کا ثبوت دیا ہے۔ باجودے کہ ان کی تردید کی چنداں ضرورت نہ تھی، لیکن ہمارے یہاں بہت سے ایسے جہلاء ہیں، جنھیں نہ تو علوم شرعیہ کا کچھ پتہ ہے اور نہ ہی کسی اور چیز کا، ان کا کل مبلغ علم صرف انگریزی زبان دانی ہے، تاہم ان کے دعوے بہت لمبے چوڑے ہیں، جو جہل مرکب سے عبارت ہیں۔ ملحد قادیانی بھی ان سے کچھ مختلف نہیں ہے، اس لیے ازراہ ہمدردیٔ مسلمانان عالم، اسی سے متعلق کچھ باتیں سپرد قرطاس کر رہا ہوں۔

تحریف نمبر:۱

ان میں سے ایک تحریف، وفد نجران کے واقعے سے متعلق، سورہ آل عمران کی آیتوں کی بابت ہے۔ جسے ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ چناں چہ ارشاد نبوی: ''وان عِیسیٰ یَأتِی عَلَیْهِ الْفناء'' (درمنثور: ۵/۲) کے بارے میں کہتا ہے کہ: یہاں مضارع، ماضی کے معنی میں ہے اور دلیل پیش کرتا ہے کہ نصاریٰ، نزول کے بعد حضرت عیسیٰ کی موت کے قائل نہیں ہیں، پس اگر ''یأتی'' فعل مضارع، ماضی کے معنی میں نہ ہوتا تو نصارائے نجران، اس سلسلے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موافقت کیسے کرتے؟ یہ اس کی انتہائی جہالت کی دلیل ہے، جس کا اندازہ پوری روایت پڑھنے سے ہو جائے گا۔ اس لیے ہم اس روایت کو مع تتمہ، جو ''تفسیر کبیر'' سے مأخوذ ہے، نقل کر رہے ہیں امام رازی نے اپنی ''تفسیر'' میں اس روایت کو ایک ہی جگہ پر مکمل ذکر کیا ہے جب کہ امام طبری نے، اپنی سند سے اسے دو جگہوں پر بیان کیا ہے۔

امام رازی ''تفسیر کبیر'' میں لکھتے ہیں:

" والقول الثاني من ابتداء السورة إلى آية المباهلة فى النصارى، وهو قول محمد بن إسحاق، قال: قدم على رسول الله –ﷺ– وفد نجران ستون راكبا فيهم أربعة عشر رجلا من أشرافهم، وثلاثة منهم كانوا أكابر القوم: أحدهم أميرهم، واسمه عبدالمسيح، والثاني

مشيرهم وذو رأيهم، وكانوا يقولون له: السيد، واسمه الأيهم. والثالث حبرهم وأسقفهم وصاحب مدراسهم، يقال له: أبوحارثة بن علقمة أحد بني بكر بن وائل، وملوك الروم كانوا شرفوه ومولوه وأكرموه؛ لما بلغهم عنه من عمله واجتهاده في دينهم،فلما قدموا من نجران ركب أبوحارثة بغلته، وكان إلى جنبه أخوه كرزبن علقمة، فبينا بغلة أبي حارثة تسير إذ عثرت فقال كرز أخوه: تعس الأبعد، يريد رسول -ﷺ- فقال:أبو حارثة: بل تعست أمك، فقال: ولم أخي؟ فقال: إنه والله النبي الذى كنا ننتظره، فقال له أخوه كرز: فما يمنعك منه وأنت تعلم هٰذا؟ قال لأن هؤلاء الملوك أعطونا أموالاً كثيرة وأكرمونا فلوآمنا بمحمد-ﷺ-لأخذوا منا كل هٰذه الأشياء، فوقع ذٰلك في قلب أخيه كرز، وكان يضمرإلى أن أسلم، فكان يحدث بذٰلك.

ثم تكلم أولئك الثلاثة الأمير والسيد، والحبر، مع رسول-ﷺ- على اختلاف من أديانهم، فتارة يقولون: عيسىٰ هو الله، وتارة يقولون:هو ابن الله، وتارة يقولون: ثالث ثلاثة، ويحتجون لقولهم: هو الله، بأنه كان يحي الموتى، ويبرئ الأكمه والأبرص، ويبرئ الأسقام، ويخبر بالغيوب، ويخلق من الطين كهيئة الطير فينفخ فيه فيطير. ويحتجون في قولهم: إنه ولد الله ، بأنه لم يكن له أب يعلم. ويحتجون على ثالث ثلاثة بقول الله-تعالىٰ:- فعلنا، وجعلنا،ولو كان واحدا لقال: فلعت.

فقال لهم رسول الله-ﷺ- أسلموا، فقالوا: قد أسلمنا، فقال-ﷺ:- كذبتم، كيف يصح إسلامكم وأنتم تثبتون لله ولداً، وتعبدون الصليب، وتأكلون الخنزير؟ فقالوا: فمن أبوه، فسكت رسول الله-ﷺ- فأنزل الله- تعالىٰ- في ذٰلك أول سورة آل عمران إلى بضع وثمانين آية منها، ثم أخذ رسول الله-ﷺ- يناظر معهم، فقال: ألستم تعلمون أن الله حي لايموت؟ وأن عيسىٰ يأتي عليه الفناء؟ قالوا بلىٰ، قال: ألستم تعلمون أنه لا يكون ولد الاويشبه أباه؟ قالوا بلى ، قال ألستم تعلمون أن ربنا قيم على كل شيئ يكلؤه ويحفظه ويرزقه؟ فهل يملك عيسى شيئًا من ذٰلك؟ قالوا: لا، قال:ألستم تعلمون أن الله لا يخفى علية شيئ في الأرض ولا في السماء؟ فهل يعلم عيسىٰ شينا من ذٰلك إلا ماعلم؟ قالوا: لا، قال: فإن ربنا صور عيسى في الرحم كيف

شاء، فهل تعلمون أن ربنا لا يأكل الطعام، ولا يشرب الشراب، ولا يحدث الحدث؟ وتعلمون أن عيسىٰ حملته امرأة كحمل المرأة، ووضعته كما تضع المرأة ، ثم كان يطعم الطعام ويشرب الشراب، ويحدث الحدث؟ قالوا: بلى ، فقال-ﷺ:- فكيف يكون كما زعمتم؟ فعرفوا ثم أبوا إلا جحودا.

ثم قالوا: يا محمد، ألست تزعم أنه كلمة الله وروح منه؟ قال: بلى، قالوا: فحسبنا، فأنزل الله-تعالى:- ﴿فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ﴾ الآية. ثم إن الله-تعالى- أمر محمد-ﷺ-بملاعنتهم إذ ردوا عليه ذلک، فدعاهم رسول الله -ﷺ- إلى الملاعنة، فقالوا: يا أبا القاسم، دعنا ننظر فى أمرنا، ثم نأتيک بما تريد أن نفعل، فانصرفوا.

ثم قال: بعض أولئک الثلاثة لبعض: ما ترى؟ فقال: والله يامعشر النصارى، لقد عرفتم أن محمدا نبى مرسل، ولقد جاء كم بالفصل من خبر صاحبكم، ولقد علمتم مالاعن قوم نبيا قط إلا وفي كبيرهم وصغيرهم، وأنه الاستيصال منكم إن فعلتم وإن أنتم قد أبيتم إلا دينكم والإقامة على ما أنتم عليه، فوادعوا الرجل وانصرفوا إلى بلادكم، فأتوا رسول الله-ﷺ- فقالوا: يا أبا القاسم، قد رأينا أن لا نلاعنک، وأن نترکک على دينک، ونرجع نحن على ديننا، فابعث رجلا من أصحابک معنا يحكم بيننا فى أشياء قد اختلفنا فيها من أموالنا، فإنكم عندنا رضا،فقال-عليه السلام-آتوني العشية أبعث معكم الحكم القوى الأمين.

وكان عمر-رضي الله عنه- يقول: ماأحببت الإمارة قط إلا يومئذ رجاء أن أكون صاحبها، فلما صلينا مع رسول الله -ﷺ- الظهر سلم، ثم نظر عن يمينه وعن يساره. وجعلت أتطاول له ليراني، فلم يزل يردد بصره حتى رأى أبا عبيدة بن الجراح فدعاه. فقال: اخرج معهم واقض بينهم بالحق فيما اختلفوا فيه قال عمر: فذهب بها أبوعبيدة. ا ھ. (تفسير كبير:۷/۱۳۴)

''نزولِ آلِ عمران کی بابت دوسرا قول یہ ہے کہ یہ سورت ابتداء سے آیت مباہلہ تک (جو تقریباً ۸۰ر آیتیں ہیں) نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جیسا کہ محمد بن اسحٰق کی رائے ہے، چناں چہ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ساٹھ افراد پر مشتمل، نجران کے نصاریٰ کا وفد آیا، ان میں سے چودہ سردار تھے، پھر ان چودہ میں سے تین اکابرِ قوم تھے۔ ان میں سے ایک ان کا امیر تھا، جس کا نام عبدالمسیح تھا۔ دوسرا ان

کا مشیر اور صاحب الرائے تھا، اسے لوگ ''سید'' کہا کرتے تھے اور اس کا نام ''ایھم'' تھا۔ تیسرا ابو حارثہ بن علقمہ تھا جو بنی بکر بن وائل کا ایک فرد، ان کا دینی پیشوا اور ماہر عالم تھا، اسے اپنے علوم میں خوب مہارت ہوگئی تھی، یہاں تک کہ روم کے عیسائی بادشاہوں کو جب دینی علوم میں اس کی مہارت کی خبر پہنچی تو انھوں نے اسے بڑا مرتبہ دیا اور مال ومنال، خدم وحشم سے نوازا۔ جب یہ لوگ نجران سے رسول اللہ ﷺ کی طرف چل کھڑے ہوئے، تو ابو حارثہ اپنے خچر پر سوار ہوا، اس کے برابر میں اسکا بھائی کرز بن علقمہ بھی تھا، ابو حارثہ کا خچر چلتے چلتے پھسل گیا، تو اس کے بھائی کرز نے کہا ''تعس الابعد'' (دور والا برباد ہو) اس کی مراد رسول اللہ ﷺ تھے۔ ابو حارثہ نے کہا: ''بل تعست امک'' (-وہ نہیں- بلکہ تیری ماں برباد ہو) کرز نے کہا: برادرم ایسا کیوں؟ ابو حارثہ نے جواب دیا: بخدا یہی وہ نبی ہے، جس کا ہم انتظار کررہے تھے۔ کرز نے کہا: جب آپ جانتے ہیں، تو پھر ان پر ایمان لانے سے کیا مانع ہے؟ اس نے جواب دیا: ان بادشاہوں نے ہمیں بے پناہ مال ودولت دے رکھی ہے، عزت واکرام سے نواز رکھا ہے، اگر ہم محمد (ﷺ) پر ایمان لے آئیں، تو یہ سارا مال ومتاع چھن جائے گا۔ کرز کے دل میں یہ بات جاگزیں ہوگئی اور اس نے اسے دل میں چھپائے رکھا، تا آں کہ اسلام قبول کرلیا، چناں چہ کرز اس واقعہ کو بعد میں بیان کیا کرتے تھے۔

جب یہ وفد مدینہ منورہ پہنچا تو امیر، سید اور پادری نے، باوجودے کہ ان میں کچھ مذہبی اختلاف تھا، رسول اللہ ﷺ سے گفتگو کی ان میں کے بعض تو عیسی (علیہ السلام) ہی کو خدا کہتے، بعض خدا کا بیٹا اور بعض تین (مسیح، روح القدس اور اللہ۔ یا مسیح، مریم اور اللہ) میں کا تیسرا کہتے تھے۔

حضرت عیسی ہی کو اللہ کہنے والے دلیل یہ پیش کرتے تھے، کہ آپ مردوں کو زندہ کرتے، مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو شفا دیتے، بیماریوں کو دور کرتے، غیب کی باتیں بتاتے اور مٹی سے پرندے کی شکل بنا کر اس میں پھونک مارتے، تو وہ اڑنے لگتا۔ (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا تھے، ورنہ ایک انسان سے یہ سب چیزیں کیوں کر وجود میں آسکتی ہیں؟)

اللہ کا بیٹا کہنے والے دلیل یہ پیش کرتے کہ: آپ (علیہ السلام) کا کوئی معروف باپ نہیں (اس لیے اللہ آپ کا باپ ہے)

اور تین میں کا تیسرا کہنے والے اپنے قول کی دلیل میں اللہ تعالی کا ارشاد: ''فعلنا وجعلنا'' وغیرہ پیش کرتے کہ اللہ تعالی بہ صیغۂ جمع فرماتا ہے (جس کے کم از کم مصداق تین افراد ہوں گے) اگر اللہ ایک ہی ہوتا، تو ''فعلت'' بہ صیغۂ واحد فرماتا۔ (حقیقت یہ ہے کہ جمع کے صیغوں سے مراد، اللہ، عیسی اور مریم۔ یا مسیح، روح

القدس اور اللہ؛ ہیں) نعوذ باللہ من ذٰلک۔

رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں سے فرمایا: تم لوگ اسلام لے آؤ۔ ان لوگوں نے جواب دیا: ہم تو اسلام اختیار کر ہی چکے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جھوٹ بولتے ہو، تمہارا اسلام کیسے صحیح ہو سکتا ہے، جب کہ تم اللہ تعالیٰ کے لیے لڑکا ثابت کرتے ہو، صلیب کی عبادت کرتے ہو اور خنزیر کھاتے ہو؟۔ انھوں نے کہا، تو پھر حضرت عیسیٰ کا باپ کون تھا؟ رسول اللہ ﷺ نے خاموشی اختیار فرمائی (اور انھیں کوئی جواب نہ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول اور ان کے تمام مختلف معاملات کی بابت) سورہ آل عمران کی ابتدائی ۸۰؍ سے کچھ زائد آیتیں نازل فرمائیں۔

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ بحث و مباحثہ کرتے ہوئے فرمایا: کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ زندہ ہے، جسے کبھی موت نہیں آئے گی اور عیسیٰ (علیہ السلام) پر فنا آنے والی ہے؟ انھوں نے کہا: بیشک ہمیں معلوم ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا! کیا تم نہیں جانتے کہ لڑکا باپ ہی کے مشابہ ہوتا ہے؟ انھوں نے کہا بیشک ہمیں معلوم ہے۔ آپ نے فرمایا: کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارا رب ہر چیز کا نگہبان ہے، ہر چیز کو کھلاتا، پلاتا اور روزی دیتا ہے، ہر چیز کی حفاظت کرتا ہے؟ کیا عیسیٰ (علیہ السلام) ان میں سے کسی چیز کے مالک تھے؟ انھوں نے کہا :نہیں۔ آپ نے فرمایا: کیا تمھیں معلوم نہیں کہ زمین و آسمان کی کوئی بھی چیز اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں؟ انھوں نے کہا: بیشک۔ آپ نے فرمایا: کیا عیسیٰ کو ان میں سے کسی چیز کا علم ہے، علاوہ ان چیزوں کے جو ان کو بتلائی گئیں؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: ہمارے رب نے عیسیٰ کو رحم مادر میں جس طرح چاہا، بنایا، کیا تمھیں معلوم نہیں کہ ہمارا رب نہ کھاتا ہے، نہ پیتا ہے اور نہ اس کو حدث لاحق ہوتا ہے؟ تمھیں معلوم ہے کہ عیسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کو حمل اسی طرح تھا، جیسا کہ عورتوں کو ہوتا ہے، پھر انھوں نے ان کو اسی طرح جنا، جس طرح ہر عورت اپنے بچے کو جنتی ہے، اور وہ کھانا کھاتے تھے، پانی پیتے تھے، اور حدث بھی لاحق ہوتا تھا؟ انھوں نے کہا: بیشک۔ آپ نے فرمایا: پھر کیوں کر حضرت عیسیٰ معبود ہو سکتے ہیں، جیسا کہ تمہارا خیال باطل ہے؟ چناں چہ وہ لوگ اچھی طرح پہچان گئے (کہ آپ علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، نہ کہ معبود و خالق) لیکن سرکشی کی وجہ سے بات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

پھر ان لوگوں نے کہا: اے محمد! (ﷺ) کیا آپ یہ نہیں کہتے کہ حضرت عیسیٰ کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہیں؟ آپ نے فرمایا: کیوں نہیں۔ ان لوگوں نے کہا: بس ہمارے لیے یہی کافی ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی:

"فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَاتَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَاوِیْلِه"

الایۃ (آل عمران : ۷)

''سو جن کے دلوں میں کجی ہے وہ پیروی کرتے ہیں متشابہات کی، گمراہی پھیلانے کی غرض سے اور مطلب معلوم کرنے کی وجہ سے۔

جب ان لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات ٹھکرادی، تو اللہ تعالی نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا کہ: آپ ان سے مباہلہ کریں، چناں چہ آپ نے انھیں مباہلہ کی دعوت دی۔ انھوں نے کہا: اے ابو القاسم! ہمیں اس مسئلے پر غور کرنے کا موقع دیجیے، پھر ہم آپ کی مرضی کے مطابق، آپ کے سامنے فیصلہ کن بات پیش کریں گے۔ غرض وہ آپ کے پاس سے (مشورہ کرنے کے لیے) اٹھ کر چلے گئے۔

پھر وہ تینوں آپس میں مشورہ کرتے ہوئے ایک دوسرے سے کہنے لگے؟ تمھاری کیا رائے ہے۔ ایک نے کہا: ہم بہ خوبی جانتے ہیں کہ محمد (ﷺ) اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے نبی ہیں، تمہارے نبی کے متعلق فیصلہ کن خبر لے کر آئے ہیں اور تمھیں یہ بھی معلوم ہے کہ جس قوم نے بھی کسی نبی سے مباہلہ کیا اس قوم کے تمام چھوٹے بڑے ہلاک و برباد گئے، اگر تم نے بھی ایسا کیا، تو تم بھی نیست و نابود کردیے جاؤ گے، اس لئے اگر اپنے دین کو ترجیح دے کر اپنے عقائد پر جمے رہنا چاہتے ہو تو ان سے صلح کرلو اور اپنے وطن صحیح سلامت واپس چلے چلو۔

چناں چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس آئے اور کہا: ہماری رائے یہ ہے کہ ہم آپ سے مباہلہ نہ کریں، آپ کو اپنا اور ہمیں ہمارا دین مبارک ہو۔ اب ہم وطن جانا چاہتے ہیں، اس لیے آپ اپنے اصحاب میں سے کسی کو ہمارے ساتھ بھیج دیں، ہمارے مختلف فیہ مسائل میں فیصلہ کرے، کیوں کہ آپ لوگ ہمارے نزدیک پسندیدہ ہیں۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ایتونی العشیۃ ابعث معکم الحکم القوی الامین''

''تم لوگ شام میرے پاس آؤ، ایک امانت دار فیصل کو تمہارے ساتھ بھیج دوں گا''۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ اس دن کے علاوہ کبھی بھی میرے دل میں امارت اور سرداری کی خواہش نہ ہوئی، صرف اس امید میں کہ میں امیر ہوسکوں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہم نماز ظہر پڑھ چکے اور آپ سلام پھیرنے کے بعد دائیں اور بائیں دیکھنے لگے، تو میں اونچا ہو ہو کر آپ کی نظروں کے سامنے پڑ رہا تھا، تا کہ آپ مجھے دیکھ لیں۔ آپ برابر نظر دوڑاتے رہے، تا آں کہ حضرت ابو عبیدہ نظر آگئے، آپ نے انھیں بلا کر فرمایا:

''اخرج معھم واقض بینھم بالحق فیما اختلفوا فیہ''

''ان لوگوں کے ساتھ جاؤ اور ان کے اختلافی امور میں حق کے مطابق فیصلہ کرو''۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اس طرح امارت حضرت عبیدہ (رضی اللہ عنہ) کے حصے میں آئی''۔

اس روایت میں کچھ ایسی چیزوں کا بھی تذکرہ ہے، جن کے اس زمانے کے نصاری بالکل قائل نہیں ہیں، جب کہ وفد نصارائے نجران نے بہ حیثیت استدلال ان تمام امور مذکورہ کو تسلیم کیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق بھی کی، ان کے باوجود اپنا مذہب چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے۔ یہی مفہوم ہے راوی کے قول ''فعرفوا ثم ابوا الاجحوداً'' اور ان کے قول ''ولقد جاء کم با لفصل من خبر صاحبکم'' نیز ''ان انتم قد ابیتم الا دینکم والاقامة علی ماانتم علیه'' کا۔ کیا ایسی واضح باتوں میں اس بد بخت کی تحریف چل سکتی ہے؟۔

اس کم بخت کو کس نے بتایا کہ تمام نصاری اس کے قائل نہیں؟ حالاں کہ مصر وشام کے نصاری جو حضرت عیسیٰ سے وطنی اعتبار سے قریب تر ہیں، وہ آپ کی سولی کے بالکل قائل نہیں، وہ تو رفع جسمانی کے قائل ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ نزولِ مسیح علاماتِ قیامت میں سے ہے۔ جیسا کہ ''الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح'' کے حوالے سے یہ بات مذکور ہو چکی ہے۔ نیز قرآن وحدیث سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کچھ نصاری اس وقت بھی حق پر تھے۔ اس سلسلے کی کچھ باتیں، جو حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہیں ارشاد باری: ''وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ'' (آل عمران: ۵۵) اور آیت ''صف: ۱۴'' (فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ'') کے تحت مذکور ہو چکی ہیں۔ اس لیے وہ یقیناً نزول کے بعد آپ کی موت کے قائل ہوں گے۔ حضرت عیسیٰ کے مصلوب ہونے کی بے بنیاد بات، پولس اور اس کے متبعین نے یوروپ میں پھیلائی ہے، جیسا کہ خود یوروپین مؤرخین: ڈی یونس اور ملمن وغیرہ نے اس کی تصریح کی ہے۔ [کما فی الفارق] انھوں نے تو تاریخ وغیرہ کی مدد سے عقلاً ونقلاً مسئلہ صلب کی جڑ ہی اکھاڑ کر پھینک دی ہے۔ اس ملحد کو علمائے اسلام کی تقلید کی توفیق نہ ہوئی، بلکہ نصاری کے کذب وافترا کی پیروی مقدر بنی۔

صاحب ''الفارق'' لکھتے ہیں: ''یہ حقیقت ہے کہ نصارائے شام کے درمیان یہ واقعہ پیش آیا، اس لیے انہیں اور آس پاس کے علاقے: مصر وغیرہ کے نصاری کو، اس کی حقیقت سے زیادہ واقفیت ہونی چاہیے۔ لہٰذا ان کی شہادت اوروں کے مقابلے میں اقرب الی الحق ہوگی'' (انتہی)۔ ''موسیو ار دواریوس'' سے منقول ہے کہ اسے کتب حواریین کا ایک حصہ ملا، جس کا مضمون، باسلیدیین کے کلام سے بعینہ ملتا جلتا ہے۔ (انتہی) وہ

لوگ (یعنی نصارائے شام) سولی کے کلیۃً منکر ہیں۔ نیز صاحب ''الفارق'' نے نصارائے شام کے ساتھ، دوسرے اور ایسے ۹ر فرقوں کا ذکر کیا ہے، جو انکار صلب میں انہی کے ہم نوا ہیں۔ مزید برآں لکھتے ہیں: ''کہ جو لوگ تاریخی حقائق سے واقف ہیں، ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ مسئلہ صلب عیسیٰ، ان اہم مسائل میں سے ہے، جس کی وجہ سے تمام نصاریٰ کے درمیان عموماً اور اسلام سے پہلے مصر و شام کے نصاریٰ کے درمیان خصوصاً اختلاف تھا، اس لیے کہ اکثر نصاریٰ سولی کے قطعاً منکر تھے''۔ نیز فرماتے ہیں کہ: ''ان لوگوں کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی ہیں، جو تاریخی دلائل کا سہارا لے کر سولی کا انکار کرتے ہیں''۔ علاوہ ازیں ''تاریخ کلیسا'' میں مزید ایسے فرقوں کا ذکر ہے، جو سولی کا سرے سے انکار کرتے ہیں''۔ اور ''فتح المنان'' میں ہے کہ ''تاریخ یوسیفس'' کے اصل نسخوں میں سولی کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ (اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عقیدۂ صلب کا وجود بعد میں ہو، ورنہ متقدمین کی کتابوں میں ضرور تذکرہ ہوتا)

وفد نجران کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل گفتگو، نفی الوہیتِ مسیح کے سلسلے میں تھی اور یہ بہر حال طے ہے، خواہ موت مسیح کو ماضی میں فرض کریں، یا مستقبل میں۔ اسی وجہ سے وفد نجران نے لفظی مناقشہ نہیں کیا۔ حاصل یہ کہ حیات مسیح علیہ السلام کے سلسلے میں روایات صریحہ موجود ہیں (ان کا کوئی مؤمن منکر نہیں ہوسکتا) نیز نصاریٰ کے پاس بھی نزول مسیح کے بعد، حضرت مسیح کے حالات کی تفصیل نہیں ملتی، غالباً اسی وجہ سے اس پر انھوں نے بحث نہیں کی۔ یہ بے دین ملحد بہ کثرت اپنے کلام میں مضارع کو ماضی اور ماضی کو مضارع قرار دیتا ہے اور خوب چیخ چیخ کر اس کا اعادہ کرتا رہتا ہے، شاید اس نے یہ کہیں سن لیا ہے کہ لغت عرب میں ایسا استعمال ہے، اس لیے موقع و محل کی رعایت کے بغیر وہ اس کو دہراتا رہتا ہے۔ اسی جیسے احمقوں کے سلسلے میں یہ کہاوت مشہور ہے:

''ان السفیه اذا لم ینه مأمور''

''یعنی بے وقوف کو جب تک کسی کام سے روکا نہ جائے وہ کرتا رہتا ہے، گویا وہ مامور ہے''۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

تحریف:۲

اس تحریف کا تعلق امام رازی کی طرف اس بات کی نسبت سے ہے کہ آپ ''حضرت عیسیٰ کے لیے رفع رتبی کے قائل ہیں، نہ کہ رفع مکانی کے اور اس سلسلے میں اس نے امام موصوف کی یہ عبارت نقل کی ہے۔ (جو انھوں نے ''التفسیر الکبیر'' میں ارشاد باری:

"اِذْقَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسٰیٓ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ ......، الاٰیۃ" (آل عمران: ۵۵)

"کے تحت تحریر فرمائی ہے:)

"واعلم ان هذه الآية تدل على ان رفعه فى قوله "وَرَا فِعُکَ اِلَیَّ" هو الرفعة بالدرجة والمنقبة، لا بالمكان والجهة، كما ان الفو قية فى هذه الآ ية ليست بالمكان؛ بل بالدرجة والرفعة"

"معلوم ہو کہ مذکورہ آیت اس بات پر دال ہے کہ ارشاد باری "وَرَافِعُکَ اِلَیَّ" میں رفع سے مراد، رفع درجہ ورفع منقبت ہے، نہ کہ رفع مکان و جہت، جیسا کہ اسی آیت میں فوقیت سے مراد فوقیت درجہ ورفعت ہے، نہ کہ فوقیت مکان"۔

اس ملحد نے امام موصوف کی طرف اس عقیدہ کی نسبت اگر قصداً کی ہے، تو یہ اس کی بے حیائی اور بے دینی کی دلیل ہے اور اگر قصداً نہیں کی ہے، تو کم فہمی اور کم عقلی کی؛ کیوں کہ امام موصوف نے حضرت عیسیٰ کے لیے رفعِ جسمانی کے اثبات میں، کئی صفحات میں بحث کی ہے اور اتنی تفصیل سے کلام کیا ہے کہ اس پر اضافے کی گنجائش نہیں۔ اس کے باوجود آپ کے کلام میں وہی تحریف کر سکتا ہے، جس کو اللہ رب العزت نے راہ راست سے برگشتہ کر کے جہالت کی وادیوں میں پہنچا دیا ہو۔ امام رازی کی مراد تو صرف یہ ہے کہ آیت کا مقصود رفع مکانی لذاتہ نہیں ہے، بلکہ رفع مکانی اس لیے ہے کہ یہ رفع رتبی کو متضمن ہے۔ جیسا کہ معراج رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہا جاتا ہے۔

نیز منبروں پر ائمہ اور خطباء کے بلند ہونے کے بارے میں بھی یہ بات کہی جاتی ہے۔ امام راغب کی بھی مراد یہی ہے، جیسا کہ "البحر" کے حوالے سے مذکور ہو چکا۔ نیز "کشف الاسرار" کی عبارت میں ہم نے اس کی وضاحت کر دی ہے۔ امام رازی کا منشا فرقہ مشبہہ کے استدلال کو دفع کرنا ہے، جو باری تعالیٰ کے لیے مکان ثابت کرتے ہیں (چناں چہ آپ "تفسیر کبیر" دیکھ لیجئے، امام موصوف نے فرقہ مشبہہ کی تردید کرتے ہوئے، آخر میں مذکورہ بات لکھی ہے۔)

امام بوصیری کا شعر ہے:

رافعاً رأسه وفى ذلك الرفـ ۞ ـع الى كل سودد ايماء

"وہ اپنا سر اٹھائے ہوئے ہیں، دراصل اس میں ہر سرداری کی طرف اشارہ ہے"۔

امام موصوف پر یہ بہتان سب سے پہلے سر سید احمد خان نے لگایا، اس کے بعد اس ملحد قادیانی نے

اس کی تقلید کی، جیسا کہ گمراہوں کا عموماً طریقہ ہوا کرتا ہے۔ واللہ الموفق لمن اھتدی.

تحریف:۳

اس بدبخت نے ارشاد باری:

”وَاِذْ کَفَفْتُ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ عَنْکَ اِذْ جِئْتَھُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْھُمْ اِنْ ھٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ○“ (المائدہ ۵:۱۱۰)

”اور جب روکا میں نے بنی اسرائیل کو، تجھ سے، جب تو لے کر آیا ان کے پاس نشانیاں، تو کہنے لگے جو کافر تھے ان میں اور کچھ نہیں یہ تو جادو ہے صریح“۔

میں ایسی تحریف کی ہے، جس سے اس ملحد کے عقیدۂ صلب وعدم موت سے، آیت ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ العیاذ باللہ۔ اور اپنی تحریف کے استدلال میں آیت کریمہ:

”وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ ○“ (المائدہ :۶۷)

”اور اللہ تجھ کو بچالے گا لوگوں سے۔ بیشک اللہ راستہ نہیں دکھلاتا قوم کفار کو“۔

کو پیش کرتا ہے۔ (کہ جس طرح باوجود وعدہ خداوندی ”عصمۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم“) غزوہ احد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ انور زخمی ہوا، دندانہائے مبارک شہید ہوئے، خیبر کے دن ایک یہودیہ نے آپ کو زہر دیا (ہاں وہ آپ کو قتل نہ کر سکے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہاں آیت مذکورہ میں جزوی حفاظت مراد ہے، نہ کہ کلی۔ اسی طرح ”وَاِذْ کَفَفْتُ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ عَنْکَ۔ الایۃ“ میں ”کف عن الاعداء“ جزوی مراد ہے، یعنی وہ لوگ آپ کو مارنے پر قادر نہ ہوں گے۔ پس اگر آپ کو زدوکوب کیا گیا ہو، تختۂ دار پر لٹکایا گیا ہو، تو یہ مضمون آیت کے خلاف نہیں۔ اس لیے ممکن ہے کہ آپ کو اذیت دی گئی ہو، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو بچایا ہو اور کشمیر میں آکر وفات ہوئی ہو) اس نقض کو جاہل نے ”التفسیر الکبیر“ وغیرہ سے چرایا ہے، لیکن اس اجہل کو دونوں آیتوں کے فرق کا علم نہیں۔

اس نقض کا جواب یہ ہے کہ ”کف“ کا مفہوم حضرت عیسیٰ کے پاس سے دشمنوں کو ہٹا دینا اور درمیان میں اس طرح حائل ہو جانا کہ وہ بالکل قابو نہ پاسکیں، ہے۔ اسی وجہ سے آپ کے دشمنوں پر فعل ”کف“ کا اطلاق کیا گیا؛ تاکہ اس مفہوم میں قوت اور تاکید پیدا ہو جائے۔ (جس طرح کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب مشرکین کی کچھ ٹولیوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گزند پہنچانے کا ارادہ کیا اور اللہ نے آپ کی

حفاظت فرمائی، یہ لوگ کوئی تکلیف نہ پہنچا سکے، تو اس واقعہ کو اللہ رب العزت نے فعل ''کف'' کے ذریعے بیان فرمایا، چناں چہ ارشاد باری ہے:

''وَهُوَ الَّذِیْ كَفَّ اَیْدِیَهُمْ عَنْكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ م بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَیْهِمْ ط وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرًا o'' (الفتح : ۲۴)

''اور وہی ہے جس نے روک رکھا ان کے ہاتھوں کو تم سے اور تمہارے ہاتھوں کو ان سے بیچ شہر مکہ کے بعد اس کے کہ تمہارے ہاتھ لگا دیا ان کو۔ اور ہے اللہ جو کچھ تم کرتے ہو دیکھتا)''

جب کہ ''عصمۃ'' کے معنی ہیں، مطلق حفاظت کرنا، جو اس طرح بھی صادق آسکتا ہے کہ مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو، آپ کے دشمن پکڑنے میں کامیاب نہیں ہوئے (پس ''وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ'' صادق ہے) اسی سے ''معصم'' (جائے پناہ، ٹھکانہ) ہے۔ حاصل یہ کہ ''کف'' اور ''عصمۃ'' کے درمیان فرق ہے، ''عصمۃ'' رسی کو کہتے ہیں، اسی سے ارشاد باری:

''وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا'' (آل عمران :۱۰۳)

''اور مضبوط پکڑو رسی اللہ کی سب مل کر''۔

ہے اور ''کف'' سے ''الكافة من الاول الى الاخر'' (اول سے آخر تک مکمل شئی) ہے (نیز اسی سے ارشاد باری ہے:

''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً'' (البقرہ :۲۸)

''اے ایمان والو! داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے''۔

فارسی میں ''کف'' کا ترجمہ ''باز گردانیدن'' یعنی پھیرنا، ''راندن'' یعنی بھگانا اور ''عصمۃ'' کا ''نگاہ داشتن'' یعنی بچانا، ہے۔ چناں چہ شاعر کہتا ہے:

اليوم عندک دلها وحديثها ❁ وغداً لغيرک كفها والمعصم

''آج تو تمہارے پاس محبوبہ کا ناز و انداز اور گفتگو ہے، کل کسی اور کے ہاتھ میں اس کی ہتھیلی اور کلائی ہوگی''۔

(الحاصل ''کف'' میں شئی کا مکمل احاطہ اور مکمل حفاظت ہوتی ہے، جب کہ ''عصمۃ'' کے معنی شئی کے کچھ حصے کی حفاظت سے بھی ادا ہو جائیں گے، دونوں میں فرق نہ کرنا اور ایک ہی معنی مراد لینا انتہائی جہالت کی بات ہے)

دوسری بات یہ کہ سورہ مائدہ باعتبار نزول، قرآن کی آخری سورت ہے اور مذکورہ آیت کا شمار، سورہ مائدہ کی باعتبار نزول، آخری آیات میں ہے۔ جیسا کہ صاحب ''روح المعانی'' نے اس پر تفصیلی گفتگو کی ہے،

نیز حافظ ابن کثیر کی بھی یہی رائے ہے، چناں چہ انھوں نے اسی کو صحیح قرار دیا ہے۔ (جب یہ بات واضح ہوگئی کہ اس کا نزول آخر میں ہے، تو معلوم ہو کہ اس کے نزول کی بابت) امام ترمذی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مندرجہ ذیل روایت ذکر فرمائی ہے:

"عن عائشة قالت: كان النبي صلى الله عليه وسلم يحرس حتى نزلت هذه الاية "وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ" فاخرج رسول الله ﷺ راسه من القبة، فقال لهم: ايها الناس! انصرفوا عني، فقد عصمني الله" (وقال الترمذي: هٰذا حديث غريب. ۱۳۵/۲)

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ (اس آیت کے نزول سے قبل) آپ کی پہرا داری کی جاتی تھی، لیکن جب آیت کریمہ: ''وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ'' نازل ہوئی، تو آپؐ نے اپنا سر مبارک خیمہ سے نکال کر فرمایا (اب پہرے کی ضرورت نہیں) آپ لوگ جاسکتے ہیں، اللہ نے یہ کام خود اپنے ذمے لے لیا ہے''۔

حاکم نے اس حدیث کی تصحیح فرمائی ہے اور ذہبی نے ان کی تائید کی ہے۔ نیز حافظ ابن کثیر نے اس کے بہت سے شواہد و متابعات ذکر فرمائے ہیں، حافظ ابن حجر نے ''فتح الباری'' میں ''باب الحراسة في الغزو في سبيل الله'' میں اس کو حسن قرار دیا ہے اور ''باب تفرق الناس عن الامام عند القائلة'' میں ایک شاہد ذکر کیا ہے۔ یہ تمام احادیث قویہ، نزول آیت کی تاریخ میں اختلاف کے باوجود، اس بات پر متفق ہیں کہ اس آیت کے نزول کے بعد، آپ کی پہرا داری نہیں کی گئی۔ ''مواہب'' وغیرہ کتب سیر میں بھی اس کا تذکرہ ہے۔ افسوس اس بے دین کو ان دلائل قطعیہ پر ایمان لانے کی توفیق نہ ہوئی اور جا کے عقائد نصاریٰ کے سامنے پیشانی خم کردی۔ فنعوذ بالله من الحور بعد الكور.

دوسری بات یہ کہ: ''وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَنكَ'' کا تعلق ایک جزئی واقعہ [یعنی حضرت عیسیٰ کو قتل کرنے کی شازش] سے ہے اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ''وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ'' فرمانا امر کلی ہے، جو نزول کے بعد پوری عمر پر منطبق ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے بھی دونوں میں فرق ہے۔

تحریف: ۴

اس ملحد نے ارشاد باری:

''قَالُوا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَن كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا'' (مریم: ۲۹)

''بولے ہم کیوں کر بات کریں اس شخص سے کہ وہ ہے گود میں لڑکا''۔

میں لفظ ''کان'' کے ماضی ہونے سے استدلال کرتے ہوئے، گہوارے میں حضرت عیسیٰ کے تکلم کا انکار کیا ہے اور آیت کو اس معنی پر محمول کیا ہے کہ اس کا تعلق زمانۂ نبوت سے ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ: ان لوگوں نے کہا: ہم اس شخص سے کیسے بات کریں، جو کہ ہمارے سامنے کا پیدا شدہ اور اب بھی وہ ہماری نظروں میں مثل ایک بچہ ہی ہے، گو کہ حقیقت میں بالغ ہے۔ یعنی حضرت عیسیٰ کی حیثیت ان کے نزدیک کل کے ایک بچہ کے سی تھی۔

اس بدنصیب نے اس آیت کو ہندوستانی محاورہ پر محمول کیا۔ سچی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے فہم مراد کی صلاحیت ہی سلب کر لی، بھلا یہ جاہل:

''إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ'' (ق: ۳۷)

''اس میں اس شخص کے لیے بڑی عبرت ہے، جس کے پاس دل ہو یا متوجہ ہو کر (بات کی طرف) کان بھی لگا دیتا ہو''۔

جیسے قول میں کیا کہے گا، کیا اسے ماضی بعید پر محمول کرے گا؟

''المغنی'' میں ہے کہ ''کان'' کو ناقصہ، تامہ اور زائدہ میں سے کسی ایک پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے۔ امام رازی نے ''تفسیر کبیر'' (۱۷۸/۲۱) میں ''کان'' کو ''تامہ'' پر محمول کیا ہے، جیسا کہ: ''مَاشَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَالَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ'' میں ہے اور یہی بہتر ہے۔ صاحب کشاف نے ایک لطیف صورت پر محمول کیا ہے چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

ای كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ عهد صبيا ؟'' (ایسے شخص سے ہم کیسے بات کریں، جو ابھی بچہ ہے) یہ معہودیت ان کی مراد سمجھنے میں زیادہ موثر ہے، جو ''کان'' ہی سے مستفاد ہو سکتی ہے (۱)۔

میں کہتا ہوں کہ لفظ ''کان'' کی وجہ سے یہ قول ایک ضابطے کے تحت آ گیا، اگر ''کیف نکلم من کان فی المهد صبی'' ہوتا، تو یہ ضابطے کے دائرہ میں نہ آتا، برخلاف ''كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا'' کے، کہ اس قول میں ہر وہ شخص آ جائے گا، جو اس وصف یعنی ''صبا'' کے ساتھ متصف ہو، اس کی مثال وہ ضابطہ ہے، جو نحویوں کے یہاں طے ہے کہ ''لیس زید بقائم''، ''لیس زید قائماً'' سے بلیغ

(۱) علامہ شبیر احمد صاحب عثانی اپنے تفسیری فوائد میں مذکورہ آیت کے تحت لکھتے ہیں: ''مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا'' میں ''کان'' کا لفظ اس پر دلالت نہیں کرتا کہ تکلم کے وقت وہ صبی نہیں رہا تھا، قرآن میں بہت جگہ مثلاً ''كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا'' یا ''لَا تَقْرَبُوا الزِّنَا اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً'' یا ''اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ'' میں ''کان'' کا استعمال ایسے مضمون کے لیے ہوا ہے، جس کا سلسلہ زمانۂ ماضی کے گذرنے کے ساتھ منقطع نہیں ہوا اور یہاں ''مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا'' سے تعبیر کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ کہنے والے نے نفی تکلیم کو ایک ضابطے کے رنگ میں پیش کیا، یعنی نہ صرف عیسیٰ بلکہ ہر اس شخص سے جو گود میں بچہ ہو کلام کرنا عادۃً محال ہے۔ (ابوطٰہٰ محمد صغیر)

ہے، کیوں کہ پہلی صورت میں کلام کی تقدیر یوں ہوگی: ''أن زیدالیس برجل قائم'' اس میں تاکید ہے، کیوں کہ اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ زید ان لوگوں میں سے نہیں ہے جن کی شان کھڑا ہونا ہے۔ وہ بدنصیب ''کان'' کو زائدہ پر بھی محمول کرسکتا تھا (جیسا کہ ان اشعار میں ہے):

فی غرف الجنة العلیا التی وجبت ❁ لهم هناک بسعی کان مشکور

''وہ جنت کے ان بلند خانوں میں ہوں گے، جو ان کی قابل قدر کوشش کے نتیجے میں ان کے لیے ثابت ہوئے ہیں''۔

فکیف اذا مررت بدار قوم ❁ وجیران لنا کانوا کرام

''تو کیا حال ہوگا، جب تمہارا گذر ہمارے معزز پڑوسیوں اور شریف قوم کے پاس سے ہوگا''۔

(پہلے شعر میں ''مشکور''، ''سعی'' کی صفت اور دوسرے شعر میں ''کرام'' ''جیران'' کی صفت ہے جب کہ دونوں شعروں میں ''کان'' زائدہ ہے)

لیکن وہ بدنصیب انہیں چیزوں کو اختیار کرتا رہا، جو کتب نصاریٰ سے ماخوذ ہیں، حالاں کہ نصاریٰ کو گہوارے میں حضرت عیسیٰ کی گفتگو کا علم ہی نہیں ہے۔ (چہ جائے کہ اس سلسلے میں وہ کوئی صحیح بات کہہ سکیں) دیکھئے: ''الاجوبة الفاخرہ'' اور ''التفسیر الکبیر''۔ اس ملحد نے ''کلام فی الملحد'' پر وہی اعتراض کیا ہے، جو ''تفسیر کبیر'' میں نصاریٰ سے منقول ہے۔ حالاں کہ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''لم یتکلم فی المهد الا ثلاثة :عیسی...... الحدیث (۱)''

---

(۱) مکمل حدیث یہ ہے: حدثنا مسلم بن ابراهیم ثنا جریر بن حازم عن محمد بن سیرین عن ابی هریرة عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: لم یتکلم فی المهد الا ثلثة عیسی، وکان فی بنی اسرائیل رجل یقال له جریج یصلی جاء ته امه فدعته فقال اُجِیْبُهَا او اصلی. فقالت: اللهم لاتمته حتی تریه وجوه المومسات، وکان جریج فی صومعته، فتعرضت له امرأة فکلمته فابیٰ، فأتت راعیاً، فامکنته من نفسها فولدت غلاما فقیل لها ممن؟ فقالت: من جریج، فأتوه فکسروا صومعته وانزلوه وسبوه فتوضا وصلی، ثُم اتی الغلام فقال: من ابوک یا غلام! فقال: الراعی: قالوا: نبنی صومعتک من ذهب قال: لا الا من طین. وکانت امرأة ترضع ابنا لها من بنی اسرائیل فمر بها رجل راکب ذوشارة فقالت: اللهم اجعل ابنی مثله فترک ثدیها فاقبل علی الراکب، فقال: اللهم لاتجعلنی مثله ثم اقبلَ علی ثدیها یمصُه. قال: ابوهریرة کانی انظر الی النبی صلی الله علیه وسلم یمص اصبعه ثم مُرَّ بامة فقالت: اللهم لا تجعل ابنی مثل هذه فترک ثدیها. فقال: اللهم اجعلنی مثلها، فقالت: لم ذلک فقال: الراکب جبار من الجبابرة، وهذه الامة، یقولون: سرقت زنیت ولم تفعل. (بخاری، الانبیاء، باب قول الله واذکر فِی الْکِتٰبِ مَرْیَمَ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا (۱/۴۸۹)

(امام بخاری، فرماتے ہیں) ہم سے مسلمؒ بن ابراہیم نے حدیث بیان کی، ان سے جریر بن حازم نے، ان سے محمد بن سیرین نے اور ان سے

"گہوارے میں سوائے تین بچوں کے کسی نے گفتگو نہیں کی، ان میں ایک حضرت عیسیٰ ہیں"۔

اس لیے ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ حضرت عیسیٰ کے کلام فی المہد پر ایمان رکھے اور شیطان کے وسوسے پر کان نہ دھرے۔۔قرآن کریم کے ان الفاظ:

"وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا" (آل عمران: ۴۶)

"اور باتیں کرے گا لوگوں سے جب کہ ماں کی گود میں ہوگا اور جب کہ پوری عمر کا ہوگا"۔

میں کسی اور مفہوم کی گنجائش ہی نہیں اور یہی سورہ مریم کی آیت:

"قَالُوا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا" قال إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ" الاية (مریم ۲۹، ۳۳)

"بولے ہم کیوں کر بات کریں اس شخص سے کہ وہ ہے گود میں لڑکا، وہ بولا میں بندہ ہوں اللہ کا۔۔الخ"۔

ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) نے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گہوارے میں سوائے تین بچوں کے اور کسی نے گفتگو نہیں کی (اول) عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ (دوسرے بچے کا واقعہ یہ ہے کہ) بنی اسرائیل میں ایک بزرگ تھے، جن کا نام جریج تھا، وہ نماز پڑھ رہے تھے کہ ان کی والدہ نے انہیں پکارا۔ انہوں نے اپنے دل میں سوچا کہ میں والدہ کا جواب دوں یا نماز پڑھتا رہوں؟ (بالآخر انہوں نے نماز نہیں توڑی) اس پر ان کی والدہ نے (غصہ ہو کر) بددعا کی، اے اللہ! اس وقت تک اسے موت نہ دے جب تک کہ یہ زانیہ عورتوں کا چہرہ نہ دیکھ لے، جریج اپنے عبادت خانے میں رہا کرتے تھے ایک مرتبہ ان کے پاس ایک عورت آئی اور ان سے گفتگو کی (زنا کی دعوت دی) انہوں نے انکار کر دیا۔ پھر وہ زانیہ ایک چرواہے کے پاس آئی اور اسے اپنے اوپر قابو دے دیا (یعنی زنا کرالیا) اس سے ایک بچہ پیدا ہوا، جب اس زانیہ سے قوم کے لوگوں نے پوچھا کہ کس کا بچہ ہے؟ تو اس نے کہا کہ: جریج کا ہے۔ چنانچہ قوم کے لوگ آکر جریج کی عبادت گاہ توڑ ڈالے اور انہیں عبادت گاہ سے اتار کر سب وشتم کیا۔ پھر جریج نے وضو کر کے نماز پڑھی، اس کے بعد بچے کے پاس آئے اور اس سے پوچھا کہ: تمہارا باپ کون ہے بچہ (بحکم الٰہی) بول پڑا کہ: چرواہا۔ (اس پر قوم کے لوگ اپنی ناز یبا حرکت پر شرمندہ ہوئے) اور جریج سے کہا کہ: ہم آپ کا عبادت خانہ سونے کا بنائیں گے، انہوں نے کہا ہر گز نہیں (سونے سے بنانے کی ضرورت نہیں، میرا تو) مٹی ہی سے بنائیے۔ (تیسرے بچے کے بات کرنے کا واقعہ یہ ہے کہ) بنی اسرائیل کی ایک عورت تھی، جو اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ قریب سے ایک سوار نہایت وجیہ اور خوش پوش گذرا، عورت نے (اسے دیکھ کر) دعا کی۔ اے اللہ! میرے بچے کو بھی اسی جیسا (وجیہہ) بنا دیجئے۔ (یہ سن کر اللہ کے حکم سے) بچہ بول پڑا کہ: اے اللہ! مجھے اس جیسا نہ بنانا، پھر اس کے سینے سے لگ کر دودھ پینے لگا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں (کہ مجھے اللہ کے رسول کے بیان کرنے کی تفصیل اس وقت بھی اس طرح یاد ہے کہ) جیسے میں اس وقت بھی دیکھ رہا ہوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی انگلی چوس رہے ہیں (بچے کے دودھ پینے لگنے کی کیفیت بیان کرتے وقت۔) پھر ایک باندی اس کے قریب سے لے جائی گئی (جسے اس کے مالک مار رہے تھے) تو اس عورت نے دعا کی کہ: اے اللہ! میرے بچے کو اس جیسا نہ بنانا۔ بچے نے پھر اس کا پستان چھوڑ کر کہا: اے اللہ! مجھے اسی جیسا بنا دے، عورت نے پوچھا ایسا تم کیوں کہہ رہے ہو؟ بچے نے کہا: وہ سوار (جس کے جیسا بننے کی تمہاری خواہش تھی) ایک انتہائی ظالم شخص ہے (اس لیے میں نے اللہ سے اس جیسا بننے کی پناہ مانگی) اور اس باندی سے لوگ کہہ رہے ہیں کہ تو نے چوری اور زنا کی ہے، حالاں کہ اس نے کچھ بھی نہیں کیا ہے (گویا یہ ایک نیک اور مظلوم شخصیت ہے اور ظاہر ہے کہ ظالم کے مقابلے میں مظلوم بننا بہتر ہے تا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں حساب نہ دینا پڑے اس لئے میں نے اس جیسا بننے کی خواہش کی) محمد صغیر۔

کا بھی مفہوم ہے۔ (کہ قوم کے لوگوں کو جب بچے سے سوال کرنے کے لیے کہا گیا، تو اگر چہ ان کو تعجب ہوا، مگر بہ طور معجزہ حضرت عیسیٰ اسی وقت گفتگو فرمانے لگے اور کہا: میں اللہ کا بندہ ہوں...الخ)۔

افسوس اس ملحد کو نہ ایمان کی توفیق ملی، نہ عربیت کا ذوق۔ یہ بد دین نصاریٰ پر طعن و تشنیع بھی کرتا ہے کہ قرآن نے ان کے نبی کا ذکر خیر کر کے ان لوگوں پر احسان کیا، لیکن انہوں نے اس خصوصی نعمت کی ناشکری کی، حالاں کہ یہ ملحد خود بھی اسی وصف کا حامل ہے۔ اس کی تفسیر کی بنیاد، عقائد نصاریٰ کے مطابق ہوتی ہے، یہاں تک کہ ان کی مخصوص باطل اصطلاحات بھی اس کی تفسیر میں اساس کا درجہ رکھتی ہیں۔ مثلاً: روحانی ولادت وغیرہ جو نصاریٰ کی مخصوص اصطلاحات ہیں، اس بنیاد پر کہ نصاریٰ سے اس کی ایک خاص وضع داری ہے وہ یہ کہ اس کی نبوت بغیر انگریزوں کے چل نہیں سکتی، لیکن مسلمانوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے عیسائیوں پر اعتراض بھی کر دیتا ہے۔

تحریف: ۵

موتِ مسیح (علیہ السلام) پر آیت کریمہ:

"وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَادُمْتُ حَیًّا" (مریم: ۳۱)

"اور تاکید کی مجھ کو نماز کی اور زکوٰۃ کی جب تک میں رہوں زندہ"۔

سے استدلال کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر زندہ رہ کر آسمان میں ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب نہیں (جب کہ اللہ نے پوری حیات زکوٰۃ کا حکم دیا ہے خواہ زمین میں ہوں یا آسمان میں، پس معلوم ہوا کہ آپ زندہ نہیں، بلکہ وفات پا چکے ہیں)

اور آیت کریمہ:

"قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ"۔ (مریم: ۳۰، ۳۱)

"وہ بولا میں بندہ ہوں اللہ کا، مجھ کو اس نے کتاب دی اور مجھ کو اس نے نبی کیا اور بنایا اس نے مجھ کو برکت والا جس جگہ میں ہوں"۔

کے بارے میں یوں بکواس کرتا ہے کہ اس کا تعلق عیسیٰ علیہ السلام کے بچپن سے نہیں، بلکہ نبوت کے زمانے سے ہے۔ نیز یہ بھی کہتا ہے کہ اس جملے کے سارے افعال ماضی ہیں، اس لیے استقبال کا معنی قطعاً درست نہیں، مزید برآں معنیٰ مستقبل مراد لینے والوں پر یہ کہتے ہوئے پھبکی کستا ہے کہ اگر معنیٰ استقبال مراد ہوں تو گویا

عبارت ہوئی: ''انی عبداللہ سیو تینی الکتاب، وسیجعلنی نبیا، وسیجعلنی مبارکا، ''وسیوصینی بالصلاۃ والزکوٰۃ مادمت حیاً'' اور یہ صحیح نہیں اس لیے کہ اگر صلاۃ وزکوٰۃ کا حکم زمانۂ ماضی میں نہ ہو تو ''مادُمْتُ حَیاً''، ''وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکوٰۃِ'' سے مربوط نہ ہوگا۔

یہ سب انتہائی جہالت وغباوت کی باتیں ہیں، اس جاہل کا خیال یہ ہے کہ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ ماضی یہاں درحقیقت مستقبل کے معنی میں ہے تو ترجمہ بدل جائے گا، نیز تعبیر بھی بدلنی پڑے گی۔اس جاہل کو یہ معلوم نہیں کہ صورت حال اگر ایسی ہی ہوتی، یعنی عبارتوں میں ایسے اعتبارات کے وقت ترجمہ بدل جاتا، تو مقتضائے حال اور اعتبارات مناسبہ کے حوالے سے مستقبل سے ماضی کی طرف عدول کرنے کا کیا فائدہ ہوتا؟ اس کا کہنا ہے کہ جب کسی مقام پر علماء کہتے ہیں کہ یہاں فلاں نکتہ کی وجہ سے مستقبل کو ماضی سے اور فلاں فائدہ کی وجہ سے ماضی کو مستقبل سے تعبیر کیا گیا ہے، تو اس وقت معنی بھی بدل کر یوں اور یوں ہو جائے گا۔یہ اس کی غایت درجے کی بے وقوفی ہے کیوں کہ اگر صورت یہی ہے۔تو ظاہر سے عدول کا فائدہ ہی کیا ہوا، علماء تو اس سے مصداق مراد لیتے ہیں اور وہ اس کو مفہوم سمجھ بیٹھا، سچ ہے کہ جہالت کے مفاسد بے شمار ہیں۔

جب آپ نے یہ تفصیل سمجھ لی تو اب معلوم ہونا چاہیے کہ آیت کا مفہوم علی حالہ بصیغۂ ماضی برقرار ہے۔ہاں جس چیز کا آپ سے وعدہ کیا گیا ہے، یا آپ کو کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ مستقبل میں واقع ہوگا، لہٰذا عبارت اور نظم قرآنی کی تقدیر اس وقت یوں ہوگی:

''اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ ○ای قد آتانی، ولکن الکتاب آت''

''میں بندہ ہوں اللہ کا، مجھ کو اس نے کتاب دی ہے۔لیکن کتاب ابھی (پہنچی نہیں ہے بلکہ) آ رہی ہے''۔

''وَجَعَلَنِیْ نَبِیاً○والنبوۃ آتیۃ ای اودع فیّ فطرۃ نبویۃ ورشحنی لھا''

''اور بالیقین مجھ کو اس نے نبی بنایا۔لیکن بنوت ابھی (ملی نہیں ہے بلکہ) آ رہی ہے، یعنی مجھ میں نبوت کی صلاحیت ودیعت کر دی گئی ہے اور مجھے اس کے لیے نامزد کر دیا گیا ہے)''

''وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَکاً اَیْنَ مَا کُنْتُ ○وربانی للبرکۃ أینما کنت''

''اور بنایا مجھ کو برکت والا جس جگہ میں ہوں یعنی میں جہاں کہیں رہوں، مجھے برکت کے لیے نشو ونما دی گئی ہے''۔

''وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکوٰۃِ مَا دُمْتُ حَیاً○والصلاۃ والزکاۃ آتیۃ علی شروطھما ووقتھماو محالھما وتفاصیلھما''

''اور تاکید کی مجھ کو نماز کی اور زکوٰۃ کی جب تک میں رہوں زندہ۔لیکن یہ احکام ابھی پہنچے نہیں ہیں بلکہ اپنی

شرائط، اوقات محل اور تفاصیل کے ساتھ آرہے ہیں"۔

قرآن کریم کے عرف میں "صلوٰۃ" کی نسبت فرشتوں، انسانوں اور دوسری مخلوقات کی جانب کی گئی ہے، مگر ہر جگہ اس کے مناسب حال معنی مراد ہیں، چناں چہ ارشاد ربانی ہے:

"اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ط كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ" (النور : ۴۱)

"کیا تو نے نہ دیکھا کہ اللہ کی یاد کرتے ہیں، جو کوئی ہیں آسمان وزمین میں اور اڑتے جانور پَر کھولے ہوئے۔ ہر ایک نے جان رکھی ہے اپنی طرح کی بندگی اور یاد"۔

لفظ "صلاۃ" مشترک معنوی ہے ہر جگہ اس کے معنی میں شکر گذاری اور مدح وستائش کا مفہوم پایا جائے گا، معلوم ہوا کہ یہ لفظ خواہ ہر جگہ نماز کے معنی میں نہ ہو، لیکن تزکیہ کے معنی میں ضرور ہوگا۔ جیسا کہ ابوالبقاء نے ذکر کیا ہے۔ پھر منسوب الیہ اور موقع ومحل کے فرق سے اس کی مختلف اقسام اور تفصیلات ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری: "كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ" اس پر دلالت کر رہا ہے، اسی طرح لفظ "سجود" ہے کہ قرآن کریم کے عرف میں موقع ومحل کے اعتبار سے اس کی بھی کئی قسمیں ہیں۔

یہاں یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ لفظ "صلاۃ" سے ارکان مخصوصہ (نماز) کی طرف ذہن جانا، از راہ لغت نہیں ہے، بلکہ اس لیے ہے کہ ہمارے عرف میں اسی معنی میں یہ لفظ بہ کثرت مستعمل ہے، استعمال لغوی اور عرفی میں بہت فرق ہے، جسے علمائے کرام نے اچھی طرح واضح کر دیا ہے۔ چناں چہ لفظ "صلاۃ"، "سجدۃ" اور "زکاۃ" سے ہماری شریعت کی مخصوص اور معروف عبادتوں کا ذہن میں آنا عرف عملی ہے، نہ کہ عرف لفظی۔ جب کہ قرآن کریم اور امم سابقہ کا عرف تو اس سے بھی عام ہے، چناں چہ "سجود" کے سلسلے میں ارشاد باری ہے:

"اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ ط وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَافِى السَّمٰوٰتِ وَمَافِى الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ٥ (النحل: ۴۸، ۴۹)

"کیا نہیں دیکھتے وہ جو کہ اللہ نے پیدا کی ہے کوئی چیز کہ، ڈھلتے ہیں سائے ان کے داہنی طرف سے اور بائیں طرف سے سجدہ کرتے ہوئے اللہ کو، اور وہ عاجزی میں ہیں۔ اور اللہ کو سجدہ کرتا ہے، جو آسمان میں ہے اور جو زمین میں ہے، جانداروں سے اور فرشتے اور وہ تکبر نہیں کرتے"۔

(ظاہر ہے کہ تمام مخلوقات کا سجدہ یہاں تک کہ دائیں و بائیں سے سمٹ کر آنے والے کا سجدہ وہ

ہوگا جو اس کے مناسب حال ہے، ملائکہ کا سجدہ وہ ہوگا جو ان کے مناسب حال ہے اور انسانوں کا سجدہ متعارفہ بھی ہوسکتا ہے نیز انقیاد کے معنی میں بھی ہوسکتا ہے)

''نہایہ'' میں ہے کہ باعتبار لغت ''زکاۃ'' کے اصل معنی پاکی، نما، برکت اور مدح وغیرہ کے ہیں، اور یہ سارے معانی قرآن وحدیث میں مستعمل ہیں۔ اس تفصیل سے ناواقفیت کے سبب اس ظالم نے ارشاد باری:

''وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ O''(المومن: ۴)

''اور جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں''۔

میں عین زکاۃ مراد لیا ہے حالاں کہ اس سے تزکیہ مراد ہے(۱)۔

اس لیے کہ زکوٰۃ اموال کے لیے طہارت و پاکی کا ذریعہ ہے اور صدقۂ فطر اجسام کی پاکی کا۔ لفظ ''زکوٰۃ'' قرآن کریم میں ''سورہ مومنون'' کی اس آیت میں ''صلوٰۃ'' کے ساتھ مستعمل ہے:

''قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ط الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ط وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ط وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ O'' (المومنون: ۱-۴)

''کام نکال لے گئے ایمان والے، جو اپنی نماز میں جھکنے والے ہیں اور جو نکمی بات پر دھیان نہیں کرتے اور جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں''۔

اگر اس کے دل میں ایمان ہوتا تو سورہ مریم کی یہ آیت (جو حضرت عیسیٰ کی ولادت سے متعلق ہے) کافی تھی:

''قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّکِ لِاَهَبَ لَکِ غُلٰماً زَکِیّاً'' (مریم: ۱۹)

''بولا میں تو بھیجا ہوا ہوں تیرے رب کا کہ دے جاؤں تجھ کو ایک لڑکا ستھرا''

اور یہ آیت جو آپ علیہ السلام کے (خالہ زاد)(۲)

(۱) علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی تفسیری فوائد میں لکھتے ہیں ''بعض مفسرین نے یہاں زکوٰۃ کو 'طہارت' (پاکیزگی) یا تزکیۂ نفس کے معنی میں لیا ہے گویا آیت حاضرہ کو 'قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى' اور 'قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا' کے مشابہ قرار دیا ہے۔ اگر یہ مراد ہو تو اس کے مفہوم کو عام رکھا جائے جس میں بدن کا، دل کا اور مال کا پاک رکھنا سب داخل ہو۔ زکوٰۃ وصدقات بھی ایک قسم کی مالی تطہیر ہے 'خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا'' (التوبۃ: ۱۰۳) (لے ان کے مال سے زکوٰۃ کہ پاک کرے تو ان کو اور بابرکت کرے تو ان کو) ابو طہ محمد صغیر۔

(۲) مشہور قول یہ ہے کہ حضرت یحییٰ کے والد حضرت زکریا حضرت مریم علیہم السلام کے خالو تھے اس اعتبار سے حضرت یحییٰ، حضرت مریم کے خالہ زاد بھائی ہوئے اہل عرب ماں، باپ کی خالہ کو بھی خالہ ہی کہتے ہیں۔ لیکن دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت مریم کی دوسری بہن ''ایشاع'' حضرت زکریا کے نکاح میں تھیں اور حضرت یحییٰ انہی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ اس اعتبار سے حضرت یحییٰ، حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے خالہ زاد بھائی ہوتے ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کا، حضرت عیسیٰ و یحییٰ علیہما السلام کے بارے میں فرمانا ''وہما ابنا الخالۃ'' (بخاری، الانبیاء، باب: ذِكْرُ رَحْمَةِ رَبِّكَ عَبْدَهُ زَكَرِيَّا ج:۱ص:۴۸۸) اس کی تائید کرتا ہے۔ (دیکھئے تفسیر ''البحر المحیط'' آل عمران: ۳۷، ج:۲ص:۴۶۰۔ وارشاد الساری لشرح البخاری، ج:۵ص:۴۰۶)۔ محمد صغیر۔

بھائی حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں ہے:

"یٰیَحْیٰی خُذِ الْکِتٰبَ بِقُوَّۃٍط وَاٰتَیْنٰہُ الْحُکْمَ صَبِیًّا ط وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَکٰوۃً ط وَ کَانَ تَقِیًّا"

(مریم: ۱۲-۱۳)

"اے یحییٰ! اٹھالے کتاب زور سے اور دیا ہم نے اس کو حکم کرنا لڑکا پن میں اور شوق دیا اپنی طرف سے اور ستھرائی اور تھا پرہیزگار"۔

باوجودے کہ نبی امت کو تبلیغ کرنے کے اعتبار سے مخاطب ہوتا ہے، جیسا کہ اسی سورت میں حضرت اسماعیل کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے:

"وَکَانَ یَاْمُرُ اَھْلَہٗ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ" (مریم: ۵۵)

"اور حکم کرتا تھا اپنے گھر والوں کو نماز کا اور زکوٰۃ کا"۔

حاصل کلام یہ کہ "صلوٰۃ" اور "زکوٰۃ" کی، موقع ومحل کے اعتبار سے مختلف صورتیں ہیں اور حضرت عیسیٰ آسمان پر صلوٰۃ وزکوٰۃ کی ادائے گی، وہاں کے موقع اور محل کے اعتبار سے کرتے ہوں گے۔ جس شخص کا خدا اور اس کے رسول پر ایمان ہوگا اس کے لیے اس ارشاد قرآنی کو ماننے میں ادنیٰ بھی تامل نہ ہوگا۔ رہی اس مردود قادیانی کی بات، جس کے سینے میں شیطان نے انڈے دے رکھے ہیں، جس کی وجہ سے اس نے اللہ کے ہر فیصلے سے راہِ فرار اختیار کی اور کسی حکم کو تسلیم نہیں کیا، تو اس سے کچھ بحث ہی نہیں۔

مفسرین عظام نے جو یہ بیان کیا ہے کہ ادائیگی صلاۃ وزکاۃ کا حکم کائنات ارضی کے اعتبار سے ہے، نہ کہ عالم بالا کے اعتبار سے- جیسا کہ "روح المعانی" میں ہے-تو یہ قول بھی صحیح ہے۔ اس لیے کہ کسی چیز کے شرائط، خاص اوقات اور اس کے متعلقات، خارج پر محمول ہوتے ہیں۔ مثلاً نماز اور زکاۃ کے ہم مکلف ہیں، مگر ظاہر ہے کہ کیا ہر وقت؟ اس لیے اس حکم کو عالم ارضی ہی کے اعتبار سے ہونا چاہئے۔ اس میں استحالہ اسی شخص کو نظر آسکتا ہے جو کج طبیعت کا مالک ہو، جیسے یہ ملحدِ قادیان، کیوں کہ جب کوئی چیز اس کی خواہش کے مطابق ہوتی ہے، تو اس کو دلیل قطعی کے طور پر لے اڑتا ہے جیسے "لو کان موسی وعیسی حیین لما وسعھما الا اتباعی" کے الفاظ کو بہ طور حجت پیش کرتا ہے۔ جس کی کوئی اصل نہیں ہے (کمامر) اور اگر اس کی خواہش کے خلاف ہو، خواہ اصح الکتب بعد کتب اللہ: "البخاری" میں ہی کیوں مذکور نہ ہو، تو اس کی تردید کردیتا ہے اور اس پر مطلقاً کان نہیں دھرتا، جیسا کہ "صحیح بخاری" کے حوالے سے حضرت عیسیٰ کے بارے میں "تکلم فی المھد" (گہوارے میں بات کرنے) کی روایت گذر چکی ہے مگر اس ملحد نے اس کی طرف

دیکھا تک نہیں (اور آیت کریمہ کے من گھڑت معانی بیان کر دیے)

علاوہ ازیں غور و فکر کرنے والے پر یہ بات پوشیدہ نہیں کہ لفظ "الایصاء" سے باعتبار موصی الیہ تراخی کے ساتھ کسی کام کو کرنے کا معنی مستفاد ہوتا ہے، "الایصاء الی أحد" کے معنی ہیں "کسی کو کسی چیز کی ذمہ داری دینا"، جیسا کہ علماء لغت نے لفظ "ایصاء" اور لفظ "عهد" کے بارے میں لکھا ہے۔ پھر یہ کہ شریعت میں عبادات کے اوقات مقرر ہیں اور وہ انہیں اوقات کے ساتھ خاص ہیں۔ لیکن اس کی برکت اور اس کا حکم، درمیانی اوقات بلکہ اس کے بعد کے اوقات پر بھی مکمل چھایا رہتا ہے اور حکماً وہ عبادات باقی رہتی ہیں۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے:

"ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يقول: الصلوٰت الخمس، والجمعة الى الجمعة، و رمضان الى رمضان مكفرات لما بينهن اذا اجتنبت الكبائر" (مسلم: ۱/۱۲۲)

"اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ پانچوں نمازیں اور جمعہ سے (آئندہ) جمعہ تک اور ایک رمضان سے دوسرے رمضان تک یہ عبادات اپنے درمیانی عرصوں میں صادر ہونے والے گناہوں کے لیے کفارہ بن جاتی ہیں، بشرطے کہ کبائر سے اجتناب کیا جائے"۔

کا یہی مفہوم ہے۔ اسی طرح حج کا حکم بھی ان تمام اوقات کو گھیرے ہوئے ہے، جو حج کرنے کے بعد حاجی کے پوری عمر کے اوقات ہیں۔ مزید برآں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اوليس قد جعل الله لكم ماتصدقون به أن بكل تسبيحة صدقة، وبكل تكبيرة صدقة وبكل تحميدة صدقة وبكل تهليلة صدقة" (مسلم: ۱/۳۲۴)

"کیا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے وہ چیزیں نہیں بنائیں، جسے تم صدقہ کرو (خوب جان لو کہ) ہر تسبیح (ایک بار "سبحان اللہ" کہنا) صدقہ ہے اور ہر تکبیر ایک بار "اللہ اکبر" (کہنا) صدقہ ہے اور ہر تحمید (ایک بار "الحمد للہ" کہنا) صدقہ ہے اور ہر تہلیل (ایک بار "لا الہ الا اللہ" کہنا) صدقہ ہے الخ)

ضیاء وغیرہ نے حضرت عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے (کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا کرتے تھے):

"اللهم احينى مسكيناً وامتنى مسكيناً واحشرنى فى زمرة المساكين" (كنز العمال: ۶/۴۷۰، رقم: ۱۶۵۹۲، به حواله ضياء)

"اے اللہ! مجھے مسکین ہی زندہ رکھ اور مجھے مسکین ہی موت دیجئے اور مسکینوں کے گروہ میں میرا حشر فرمائیے"۔

نیز ابو نعیم نے حضرت ابو ہریرہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت

ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا:

"اشبه الناس بعيسى نسكاً وزهداً وبراً"

"وہ عبادت، زہد اور نیکی میں حضرت عیسیٰ سے خوب مشابہ ہیں"۔

اس روایت کی اصل ترمذی (۱) کی وہ حدیث ہے، جسے انھوں نے حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت کیا ہے اور تحسین فرمائی ہے، نیز امام حاکم نے "مستدرک" (۲) میں اس کی تصحیح کی ہے اور امام ذہبی نے ان کی تائید فرمائی ہے۔

اس تفصیل سے یقیناً آپ پر "مَادُمْتُ حَياً" کا اپنے ماقبل سے ارتباط واضح ہو گیا ہوگا، نیز یہ کہ یہ ارشاد، رفع الی السماء کے بالکل منافی نہیں ہے۔ جیسا کہ اس جاہل قادیانی کا خیال ہے، بلکہ عین ممکن ہے کہ اس سے حضرت عیسیٰ کی درازیٔ عمر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہو، اس لیے کہ عام حالات میں یہ بات کہی نہیں جاتی۔ علاوہ اس کے آسمان پر حضرت عیسیٰ کے حالات کیا ہیں، چوں کہ امت کو اس کی ضرورت نہ تھی، اس لیے اس سلسلے کی بہت کم تفصیلات احادیث میں آئی ہیں، صرف رفع اور اس سے متعلق انھیں چند چیزوں کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا ہے، جن کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے، ہاں آپ کے نزول اور اس کے بعد کے حالات سے واقفیت ضروری تھی، اس لیے احادیث اس بارے میں مکمل تفصیلات کے ساتھ متواتر وارد ہوئیں (۳)۔

(۱) ترمذی کی روایت یہ ہے: "عن ابی ذر قال: قال لی رسول اللہ ﷺ: ما اظلت الخضراء ولا اقلت الغبراء من ذی لهجة اصدق ولا اوفی من ابی ذر شبه عیسیٰ بن مریم، فقال عمر بن الخطاب. کالحاسد: یارسول الله افنعرف ذلک له، قال نعم، فاعرفوه". (وقال الترمذی) هذا حدیث حسن غریب من هذاالوجه، وقد روی بعضهم هذا الحدیث فقال "ابو ذر یمشی فی الارض بزهد عیسیٰ بن مریم"، (ترمذی، المناقب، باب مناقب ابی ذر الغفاری ج: ۲ ص: ۲۲۰)

(۲) المستدرک الحاکم ۳/۳۴۲/۵۴۶۱۔

(۳) زیر بحث آیت "وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَادُمْتُ حَيًّا"ؕ کی تفسیر وتشریح کرتے ہوئے علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی لکھتے ہیں: یعنی جب تک زندہ رہوں، جس وقت اور جس جگہ کے مناسب جس قسم کی صلوٰۃ وزکوٰۃ کا حکم ہو، اس کی شروط وحقوق کی رعایت کے ساتھ برابر ادا کرتا رہو، جیسے دوسری جگہ مومنین کی نسبت فرمایا: "اَلَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلٰوتِهِمْ دَآئِمُوْنَ" اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر آن اور ہر وقت نمازیں پڑھتے رہتے ہیں، بلکہ یہ مراد ہے کہ جس وقت جس طرح کی نماز کا حکم ہو ہمیشہ پابندی سے تعمیل حکم کرتے ہیں اور اس کی برکات وانوار ہمہ وقت ان کو محیط رہتی ہیں۔ کوئی شخص کہے کہ جب تک زندہ ہیں نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج وغیرہ کے مامور ہیں کیا اس کا مطلب یہ لیا جائے گا کہ ہر ایک مسلمان مامور ہے کہ ہر وقت نماز پڑھتا رہے، ہر وقت زکوٰۃ دیتا رہے ہر وقت روزے رکھتا رہے، ہر وقت حج کرتا رہے؟ حضرت مسیح کے متعلق بھی "مَادُمْتُ حَيًّا" کا ایسا ہی مطلب سمجھنا چاہئے۔ یاد رہے کہ لفظ "صلوٰۃ" کچھ اصطلاحی نماز کے ساتھ مخصوص نہیں قرآن نے ملائکہ اور بشر سے گذر کر تمام جہاں کی طرف صلوٰۃ کی نسبت کی ہے "اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِیْحَهٗ (نور: رکوع: ۶) اور یہ بھی بتلا دیا کہ ہر چیز کی تسبیح وصلوٰۃ کا حال اللہ ہی جانتا ہے کہ کس کی صلوٰۃ وتسبیح کس رنگ کی ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ کے معنی بھی اصل میں طہارت، نما، برکت ومدح کے ہیں، جن میں سے ہر ایک معنی کا استعمال قرآن وحدیث

تحریف نمبر:٦

ماقبل میں زیر بحث وہ آیات تھیں، جو حضرت عیسیٰ کی بابت نازل ہوئی ہیں (اوران پر تفصیلی کلام گذر چکا) رہیں وہ آیات، جن کا اس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں، نیز عمومات غیر مقصودہ سے استدلال، تو ان پر کلام کرنا میں ضروری نہیں سمجھتا، طلبہ خود بہ سہولت اس کا جواب دے لیں گے اور ملحدین کو رسوا کر دیں گے۔ انشاء اللّٰہ المستعان وباللّٰہ التوفیق۔

مثلاً ارشاد باری:

"وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ، قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ، اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ" (آل عمران:۱۴۴)

"اور محمد تو ایک رسول ہے، ہو چکے اس سے پہلے بہت رسول، پھر کیا اگر وہ مر گیا یا مارا گیا تو تم پھر جاؤ گے الٹے پاؤں"۔

سے ان ملحدین نے موت مسیح پر اس طرح استدلال کیا ہے کہ "خلو" بہ معنی موت ہے۔ حالاں کہ یہ انتہائی جہالت ہے، بلکہ یہ ارشاد تو ایسا ہی ہے، جیسا کہ:

"سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ" ہے (یعنی "خلت" کے جو معنی یہاں اس آیت میں ہیں، وہی وہاں ہیں) اور سنت سے مراد عادت اللہ ہے۔ یا بایں طور استدلال کرتے ہیں کہ "الرسل" پر الف لام استغراق کا ہے (یہ بھی ان قادیانیوں کی نادانی ہے) بلکہ یہاں الف لام اسی معنی میں ہے، جس معنی میں کہ اس ارشاد باری میں ہے، جو حضرت عیسیٰ کے بارے میں ہے، یعنی:

"مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ، قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ" (المائدہ:۷۵)

میں اپنے اپنے موقع پر ہوا ہے۔ اسی رکوع میں حضرت مسیح کی نسبت "غُلَامًا زَكِيًّا" کا لفظ گذر چکا، جو زکوٰۃ سے مشتق ہے اور یحیٰ علیہ السلام فرمایا "وَحَنَانًا مِنْ لَدُنَّا وَزَكٰوةً" سورہ کہف میں ہے "خَيْرًا مِنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا" اسی طرح کے عام معنی یہاں بھی زکوٰۃ کے، لئے جاسکتے ہیں اور ممکن ہے کہ اَوْصَانِیْ بالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ سے "اَوْصَانِیْ بِاَنْ اٰمُرَ بالصَّلٰوةِ والزَّكٰوةِ" مراد ہو، جیسے اسمٰعیل علیہ السلام کی نسبت فرمایا "وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ" پھر لفظ "اَوْصَانِیْ" اپنے مدلول لغوی کے اعتبار سے اس کو متقضی نہیں کہ وقت ایصاء ہی سے اس پر عمل درآمد شروع ہو جائے، نیز بہت ممکن ہے کہ "مَادُمْتُ حَيًّا" سے یہی زمینی حیاۃ مراد لے لی جائے۔ جیسے ترندی کی ایک حدیث میں ہے کہ حضرت جابر کے والد کو اللہ نے شہادت کے بعد زندہ کر کے فرمایا کہ ہم سے کچھ مانگ انھوں نے کہا کہ مجھے دوبارہ زندہ کر دیجئے کہ دوبارہ تیرے راستے میں قتل کیا جاؤں، اس زندگی سے۔ یقیناً زمینی زندگی مراد ہے ورنہ شہداء کے لیے نفس حیات کی قرآن میں اور خود اسی حدیث میں تصریح موجود ہے (تفسیر عثمانی ص:۴۱۰)

نہیں ہے مسیح مریم کا بیٹا مگر رسول، گذر چکے اس سے پہلے بہت رسول۔
یعنی دونوں جگہ ''الرسل'' پر الف لام جنس کا ہے۔ بس اس سے ہی سیاق کی مراد واضح ہو جاتی ہے۔
نیز حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت موت نبی اور اس کے جواز کے سلسلے میں ''اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ'' کو پیش نظر رکھتے ہوئے پڑھی تھی، یہی وجہ ہے کہ اس کے ساتھ:

''اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ'' (الزمر: ۳۰)
''بیشک تو بھی مرتا ہے اور وہ بھی مرتے ہیں''۔

بھی پڑھی۔ علاوہ ازیں ''روح المعانی'' میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے ''رُسلٌ'' نکرہ پڑھا ہے۔ (یہاں الف لام سرے سے ہے ہی نہیں، کہ استغراق کا وہم ہو سکے، پس اس قرات سے بھی ''کئی رسول گذر چکے'' کے ترجمے کی تائید ہوتی ہے)(۱)

(۱) صاحب کتاب حضرت علامہ کشمیریؒ نے اس بحث کی طرف فقط اشارہ فرمایا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ''شہادۃ القرآن'' مصنفہ مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی، سے قدرے تفصیل کے ساتھ زیر بحث مسئلہ گوذکر کر دیا جائے۔ چناں چہ ذیل کی سطور میں قدرے ترمیم وتلخیص کے ساتھ ''شہادۃ القرآن'' ج:۲، از: ص:۶۲ تا ص:۲۷، کی عبارت نقل کی جارہی ہے (از محمد صغیر)

''وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ، قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ، اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ'' (آل عمران: ۱۴۴)
(محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک رسول ہیں، ان سے پیشتر کئی رسول ہو چکے ہیں۔ پس اگر یہ فوت ہو جائیں، یا مارے جائیں، تو کیا تم اپنی ایڑیوں پر لوٹ کر بے دین ہو جاؤ گے)

اس آیت کریمہ سے مرزا قادیانی نے بایں طور استدلال کیا ہے کہ یہاں لفظ ''خَلَتْ'' بہ معنی موت ہے اور ''الرُّسُلُ'' کا الف لام استغراقی ہے، پس آیت کا ترجمہ ہوا ''حضور ﷺ سے پہلے سب کے سب رسول فوت ہو چکے ہیں'' اور چوں کہ حضرت عیسیٰ بھی حضور ﷺ سے پہلے کے ہیں، اس لیے اس آیت کریمہ سے ثابت ہو گیا کہ آپ علیہ السلام بھی وفات پا چکے ہیں اور اب دوبارہ دنیا میں تشریف نہیں لائیں گے۔

اس استدلال کے جواب کے لیے تین امور کی تحقیق ضروری ہے۔
اول: تحقیق لفظ ''خَلَتْ'' کہ لغت میں اس کے کیا معنی ہیں۔ دوم: ''مِنْ قَبْلِهِ'' یہ ترکیب میں کیا واقع ہوا ہے۔ سوم: ''الرُّسُل'' کا الف لام کیسا ہے۔
امر اول: تحقیق لفظ ''خلت''۔

''خَلَتْ'' مشتق ہے ''خلو'' سے اور موضوع ہے مکان کی صفت کے لیے، مراد اس سے ''جگہ خالی کرنا'' ہے۔ چناں چہ ''لسان العرب'' میں ہے ''خلا: خلا المکان و الشئ یخلوا خلوا وخلاء، ذاخلی، اذا لم یکن فیه احد ولاشی فیه وھو خال''۔ اسی طرح ''قاموس'' اور ''صراح'' میں بھی ہے۔ علاوہ ازیں قرآن شریف میں بھی نقل مکانی کے لیے آیا ہے۔ جیسے ''وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ'' (البقرہ:۱۴) (جس وقت یہ منافق اپنے بڑے شیطانوں یعنی رئیسوں کے پاس جاتے ہیں) اسی طرح ارشاد باری ہے ''وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَیْکُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَیْظِ'' (آل عمران:۱۱۹) (منافق لوگ جس وقت تم سے الگ ہوتے ہیں، تو تم پر غیظ وغضب کے مارے اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں) ''فَخَلُّوْا سَبِیْلَهُمْ'' (التوبۃ:۵) (یعنی مشرک لوگ جب ایمان لے آئیں اور احکام اسلام کے پابند ہو جائیں، تو ان کا راستہ خالی کر دو، یعنی ان سے تعرض نہ کرو)۔ ان سب آیات میں ایک جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ جانا مراد ہے، جسے ''انتقال مکانی'' کہتے ہیں۔ =

دوسرے معنی لفظ ''خلو'' کے جو زمانے کے متعلق ہوتے ہیں ''گذرنا'' ہیں جیسے آیت کریمہ ''بِمَا اَسْلَفْتُمْ فِی الْاَیَّامِ الْخَالِیَۃِ'' (الحاقۃ:۲۴) (یعنی جو کچھ تم نے ایام گذشتہ میں کیا اس کے عوض جنت کی ان نعمتوں میں رہو) ہر ذی علم سمجھ سکتا ہے کہ گذرنا زمانے کی صفت بالذات ہوا کرتی ہے اور جن چیزوں پر زمانہ گذرتا ہے، یہ معنی، یعنی ''گذرنا'' بعلاقہ ظرفیت ومظروفیت ان چیزوں کی صفت بھی ہوسکتا ہے، مگر بالذات نہیں، بلکہ بالعرض۔

بہرتقدیر آیت زیر بحث کے معنی یہ ہوں گے کہ ''جگہ خالی کر گیے اور گذر چکے پیشتر اس کے کئی رسول'' یہ معنی زندوں اور مردوں ہر دو پر صادق آسکتے ہیں، کیوں کہ جگہ خالی کرنے اور گذرنے کی کیفیت صرف موت ہی میں منحصر نہیں، بلکہ یہ لفظ ''خلو'' مردوں کے حق میں انتقال بالموت اور زندوں کے حق میں جگہ تبدیل کرنے کے معنی میں ہوگا۔

اگر ''خلو'' کے معنی مرنا اور معدوم ہونا مراد لیے جائیں، تو پھر ارشاد باری ''سُنَّۃَ اللّٰہِ الَّتِیْ قَدْخَلَتْ مِنْ قَبْلُ'' (رسم پڑی ہوئی اللہ کی، جو چلی آتی ہے پہلے سے) اور ''وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا'' (الفتح:۲۳) (اور تو ہرگز نہ دیکھے گا اللہ کی رسم کو بدلتے) میں تناقض واقع ہوجائے گا۔ کیوں کہ بہ موجب مذہب مرزا قادیانی پہلی آیت کا مفاد یہ ہوا کہ سنت اللہ معدوم ہوچکی ہے اور دوسری آیت کا یہ کہ سنت الٰہی میں تبدیلی بھی نہیں ہوسکتی (چہ جائے کہ معدوم ہوجائے) یعنی اسے ہمیشہ کے لیے اپنے حال پر بقا حاصل ہے۔ پس ''خلت'' سے موت اور عدم، مراد لینا بالکل باطل ہے۔

امر دوم: ''من قبلہ'' کی ترکیب

''مِنْ قَبْلِہٖ'' کو مرزا قادیانی اور مولوی محمد احسن امروہوی قادیانی نے ''الرسل'' کی صفت بنایا ہے، چناں چہ آیت کے معنی کرتے ہیں ''جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر تھے وہ مر گئے'' (جس میں حضرت عیسیٰ بھی شامل ہیں)

یہ ان کی صریح غلطی ہے، کیوں کہ آیت میں ''من قبلہ'' لفظ ''الرسل'' پر مقدم ہے اور مبتدی بھی جانتا ہے کہ موصوف صفت سے پہلے ہوتا ہے۔ لہٰذا ''من قبلہ'' ''الرسل'' کی صفت نہیں ہوسکتا، بلکہ محل ظرف میں واقع ہے اور متعلق ہے فعل ''خلت'' کے، پس آیت کے معنی یہ ہوں گے ''اس سے پیشتر کئی رسول گذر چکے''۔

امر سوم: ''الرسل'' کے الف لام کی تحقیق

مرزا قادیانی اور مولوی احسن امروہوی ''الرسل'' کے الف لام کو استغراقی قرار دیتے ہیں اور آیت کریمہ کا ترجمہ کرتے ہیں ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر سب کے سب رسول فوت ہوچکے''۔

''الرسل'' کے الف لام کو استغراقی قرار دینا بالکل غلط اور باطل ہے۔ اوّل اس وجہ سے کہ اوپر ثابت ہوچکا ہے کہ ''من قبلہ'' فعل ''خلت'' کے متعلق ہے، اور ''الرسل'' کی صفت نہیں ہے۔ پس یہی ترکیب اس الف لام کے استغراقی نہ ہونے کے لیے کافی ہے۔ کیوں کہ اگر ''من قبلہ'' کو ''خلت'' کے متعلق ٹھہرائیں، جو بالکل درست ہے اور ''الرسل'' کے الف لام کو استغراقی مانیں، جو بالکل غلط ہے، تو معاذ اللہ ثم معاذ اللہ اندریں صورت پہلے قضیہ ''وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ'' کے خلاف، رسول اللہ ﷺ جماعت مرسلین سے خارج ہوں گے، کیوں کہ پھر تو اس آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ جتنے اشخاص صفت رسالت سے موصوف تھے وہ محمد ﷺ سے پیشتر فوت ہوچکے ہیں۔ پس معاذ اللہ، حضور ﷺ رسول برحق ثابت نہ ہوں گے اور ظاہر ہے کہ جس معنی سے قرآن شریف کی آیات میں تعارض واقع ہو، خصوصاً کسی نبی برحق کی رسالت کا انکار لازم آتا ہو تو وہ معنی بالکل باطل ہیں۔ دیگر یہ کہ یہی الفاظ ''قَدْخَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ'' سورہ مائدہ میں، حضرت عیسیٰ کے حق میں در بارۂ نفی الوہیت وارد ہوئے ہیں (ارشاد باری ہے ''مَاالْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ، قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ'' (المائدہ:۷۵) (نہیں ہے مسیح مریم کا بیٹا مگر رسول، گذر چکے اس سے پہلے بہت رسول)

پس اگر جہالت سے الف لام استغراقی مانا جائے، تو لابد تسلیم کرنا پڑے گا، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کے نزول کے وقت فوت ہوگئے تھے اور یہ بالکل باطل ہے۔ یا معاذ اللہ انکار نبوت محمدی وعیسوی لازم آئے گا۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا، کیوں کہ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ "سب کے سب رسول حضرت عیسی سے پیشتر فوت ہوگئے ہیں" (جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی شامل ہوئے اور حضرت عیسی بھی) حالاں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت عیسی کے رفع الی السماء کے کئی زمانے بعد پیدا ہوئے اور شرف نبوت سے سرفراز ہوئے، اس آیت کے نزول کے وقت زندہ تھے، بلکہ یہ آیت آپ ہی پر نازل ہوئی۔

دوسری وجہ جس سے الف لام کو استغراقی کہنا غلط ثابت ہوتا ہے، یہ ہے کہ اس آیت "وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ، قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ" کا شان نزول یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بہ نسبت جنگ احد میں یہ غلط خبر اڑ گئی کہ آپ شہید ہوگیے۔ بعض حضرات نبوت اور موت میں منافات سمجھ کر، ارتداد کا راستہ اختیار کرنے کی سوچنے لگے۔ اللہ تعالی نے ان کے خیال کو باطل ثابت کرنے کے لیے یہ آیت نازل فرمائی اور ظاہر کر دیا کہ نبوت اور موت میں منافات نہیں ہے۔ کیوں کہ جس طرح بعض دیگر رسولوں کے حق میں ان کے مرجانے سے، ان کی نبوت میں کوئی قدح واقع نہیں ہوئی، اسی طرح اگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی طبعی موت سے فوت ہوجائیں یا میدان جنگ میں شہید ہوجائیں تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ آپ نبی برحق نہیں ہیں، اس لیے استغراق افراد، یعنی سب رسولوں کو فوت شدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں، صرف ایک رسول، یا چند رسولوں کی موت کے ذکر سے مقصود حاصل ہوجاتا ہے۔ حاصل یہ کہ "الرسل" کا الف لام استغراقی نہیں ہے، بلکہ جنسی ہے اور معنی ہوئے "آپ سے پیشتر کئی رسول گذر چکے ہیں" اور قادیانی کا یہ وہم کہ "اگر مسیح بن مریم زندہ ہیں تو پھر دلیل صحیح نہیں ہوگی" باطل ہے۔ اس لیے کہ جب کئی رسول فوت ہوجائیں اور ایک زندہ رہے، تو اس کا زندہ رہنا، دوسرے کی زندگی کے لیے علت موجبہ نہیں ہوسکتا اور نہ وصف رسالت اور موت میں منافات ہوسکنے کی وجہ بن سکتا ہے، بلکہ اس سے تو منافات کا ابطال صاف ظاہر ہے، کیوں کہ اگر منافات ہوتی تو کوئی شخص بھی جو وصف رسالت سے موصوف ہو، نہ مرتا۔ حالاں کہ ایسے کئی اشخاص جو اس صفت سے موصوف ہیں، وفات پا چکے۔

اس آیت کریمہ کے متعلق مرزا قادیانی اور مولوی محمد احسن ایک اور مغالطہ یہ دیا کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی وفات کے موقع پر یہی آیت پڑھ کر آپ کی وفات ثابت کی اور لوگوں کے دلوں سے یہ شبہ دور کیا کہ حضور ﷺ کی وفات نہیں ہوئی ہے۔ اس وہم کے ازالہ کے لیے مذکورہ بالا بیان کافی تھا۔ مگر چوں کہ یہ ایک طرح کا نیا سوال ہے، اس لیے ہم اس کو قدرے تفصیل سے لکھتے ہیں:

جو وہم بعض حضرات کو جنگ احد کے دن پڑا تھا کہ نبوت اور موت میں منافات ہے، اس لیے حضور کو مرنا نہیں چاہیے اور اس کی تردید میں مذکورہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ اسی طرح کا وہم بعض حضرات کو حضور کی وفات کے موقع پر بھی ہوا کہ آپ وفات نہیں پاسکتے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس آیت کو اس موقع پر فقط اسی وہم کو رفع کرنے کے لیے پڑھا کہ نبوت اور موت میں منافات نہیں ہے، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر موت کا طاری ہونا، منصب رسالت کے خلاف نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ اسی آیت میں آگے "أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ" موجود ہے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نظر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کے ممکن ہونے کے لیے "إِنْ مَاتَ" پر ہے کہ اللہ تعالی آپ کے حق میں موت کو ممکن فرماتا ہے۔ اس وجہ کی تائید دوسری آیت سے بھی ہوتی ہے۔ جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسی وقت حاضرین کو پڑھ کر سنائی تھی، وہ آیت یہ ہے "إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ" (الزمر: ۳۰۔ یعنی اے پیغمبر تو بھی اپنے وقت مقررہ پر مرنے والا ہے اور یہ کفار بھی اپنے اوقات مقررہ پر مرنے والے ہیں) اس آیت میں اللہ تعالی نے آں حضرت کے بارے میں لفظ "میت" کا اطلاق کیا ہے۔ پس اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا استدلال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بارے میں "أَفَإِنْ مَاتَ" سے ہے، نہ کہ "قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ" سے، کہ وفات مسیح کے لیے ضعیف اور غلط طور پر بھی مفید ہوسکے۔ (انتھی)

تحریف: ۷

مرزائی ارشاد باری:

''وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَایَخْلُقُوْنَ شَیْئًا وَّھُمْ یُخْلَقُوْنَ ۝ اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَاءٍ وَمَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ ۝'' (النحل : ۲۰، ۲۱)

''اور جن کو پکارتے ہیں اللہ کے سوائے، کچھ پیدا نہیں کرتے اور وہ خود پیدا کیے ہوئے ہیں۔ مردے ہیں جن میں جان نہیں اور نہیں جانتے کب اٹھائے جائیں گے''۔

سے بھی موت مسیح پر استدلال کرتے ہیں، حالاں کہ یہ ارشاد:

''اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ ۝'' (الزمر : ۳۰)

''بیشک تجھے بھی مرنا ہے اور وہ بھی مر جائیں گے''۔

کے مثل ہے۔ نیز سورہ نحل کی آیتوں کا سیاق وسباق اس امر کے سلسلے میں صریح ہے کہ یہ آیت بتوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے(۱)۔

(۱) چناں چہ آپ دیکھئے کہ ''اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَاءٍ''، ''مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ'' کی صفت ہے، یعنی مردے ہیں، کبھی زندہ اور ذی روح نہ تھے اور حضرت عیسیٰ صاحب حیات تھے، اصنام میں شامل ہی نہ تھے۔ کیوں کہ (یہ سورہ مکی ہے) کفار مکہ کے بارے میں نازل ہوئی اور کفار مکہ بت پوجتے تھے، حضرت عیسیٰ کیا، کسی بھی انسان کی پرستش نہیں کرتے تھے۔

دوسرے: اس آیت کے بعد فرمایا: ''لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ'' کہ وہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، حالاں کہ حضرت عیسیٰ کو پوجنے والے (نصاریٰ) تو آخرت کے قائل تھے۔

تیسرے: ''لَا یَخْلُقُوْنَ شَیْئًا'' مضارع کے ساتھ ہے، کہ وہ فی الحال یا آیندہ پیدا نہیں کر سکتے، اگر وہ مر چکے تھے تو ان کی نسبت یہ فرمانا سیاق کلام کے خلاف ہے اور نیز جب وہ مر چکے تھے پھر ان کی نسبت یہ فرمانا کیسے صحیح ہوگا کہ وہ پیدا نہیں کر سکتے، وہ ہیں کہاں جو پیدا کریں۔

چوتھے: ''وھم یخلقون'' جملہ اسمیہ لائے، جو باعتبار استمرار تینوں زمانوں پر دلالت کرتا ہے۔ بتاؤ کیا کسی مرزائی کا یہ مذہب ہے کہ حضرت مسیح پیدا کیے جائیں گے اور پیدا ہوتے رہیں گے؟

پانچویں: ''اَمْوَاتٌ'' فرمایا، یہ بھی جملہ اسمیہ ہے، یعنی ''ھم اموات'' جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سے بے شعور و بے حس ہیں اور رہیں گے، موت ان کے واسطے بالدوام ہے۔ بھلا کیا مسیح علیہ السلام کبھی زندہ نہ تھے، ہمیشہ سے مردہ ہیں اور ہمیشہ مردہ رہیں گے۔ (معاذ اللہ)

چھٹے: یہ کہ ''اَمْوَاتٌ'' کی تفسیر ''غَیْرُ اَحْیَاءٍ'' کے ساتھ فرمائی، تا کہ موت کی نوعیت متعین ہو جائے، کہ موت سے وہ موت مراد ہے، جس سے پہلے اور پیچھے زندگی نہیں، ورنہ اگر ایسی موت مراد نہ ہوتی تو ''غَیْرُ اَحْیَاءٍ'' کے بیان فرمانے کی کوئی ضرورت نہ تھی، کیوں کہ یہ مقصود تو ''اَمْوَاتٌ'' سے بھی حاصل تھا کہ وہ مردہ ہیں۔ پس اگر ان معبودوں سے مراد انسان ہوتے اور ان کا مردہ ہونا بیان کرنا مقصود ہوتا، جیسا کہ مرزا صاحب اور ان کے چیلے کہتے ہیں، تو یوں فرمایا جاتا: ''ان الذین یدعون من دون اللّٰہ لم یخلقون شیئا وھم خلقوا ماتوا ولبسوا

رہے اللہ کے وہ نیک بندے جن کی پرستش کی گئی، جیسے عیسیٰ علیہ السلام، تو قرآن ایک مرتبہ ان کفار کو اس کا جواب دے چکا ہے، چناں چہ اسی جیسے جدل ومنازعت کے بارے میں فرمایا:

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلاً اِذَاقَوْمُکَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ط وَقَالُوْا ءَ اٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ ط مَاضَرَبُوْهُ لَکَ اِلَّا جَدَلاًط بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ط اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلاً لِّبَنِیْٓ اِسْرَائِيْلَ ط وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِی الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ٥ وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ ط هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ط وَلَايَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ ج اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ٥. (الزخرف:۵۷-۶۲)

''اور جب مثال لائے مریم کے بیٹے کی تبھی قوم تیری اس سے چلانے لگتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارے معبود بہتر ہیں یا وہ۔ یہ مثال جوڑالتے ہیں تجھ پر، سو جھگڑنے کو، بلکہ یہ لوگ ہیں جھگڑالو۔ وہ کیا ہے، ایک بندہ ہے کہ ہم نے اس پر فضل کیا، اور کھڑا کر دیا اس کو بنی اسرائیل کے واسطے۔ اور اگر ہم چاہیں نکالیں تم میں سے فرشتے، رہیں زمین میں تمہاری جگہ۔ اور وہ نشان ہے قیامت کا، سو اس میں شک مت کرو اور میرا کہا مانو، یہ ایک سیدھی راہ ہے۔ اور نہ روک دے تم کو شیطان وہ تمہارا دشمن ہے صریح۔''

احیاء ''یعنی جن کو کفار مکہ خدا کے سوا پکارتے ہیں، انہوں نے کسی چیز کو پیدا نہیں کیا، یا نہیں کر سکے، وہ خود پیدا کیے گئے تھے اور مر گئے، زندہ نہیں ہیں جب کہ آیت کلام اللہ کے معنی یہ ہیں کہ ''وہ بت جن کو کفار مکہ خدا کے سوا پکارتے ہیں، وہ ہرگز کسی شئی کو پیدا نہیں کر سکتے اور نہ پیدا کر سکیں گے ، بلکہ وہ خود پیدا کیے جاتے ہیں (پجاری ان کو تراش کر بناتا ہے) اور ہوتے بھی رہیں گے، وہ بالکل ہمیشہ سے مردے ہیں، نہ کہ ذی روح (یعنی بالکل بے جان ہیں، کہ کبھی زندہ ہی نہ تھے، ان میں حیات رکھی ہی نہیں گئی تھی) وہ وقت بعث سے بالکل بے خبر ہیں (پھر اپنی پرستش کرنے والوں کو کیا خاک جزا وسزا دے سکتے ہیں، یا یہ کہ خود کفار اپنے بعث سے بالکل بے خبر ہیں، کیوں کہ قیامت کے منکر ہیں)

نیز ''اَمْوَاتٌ ''جمع ''میت'' بھی ہو سکتا ہے، یعنی سب مرنے والے فنا ہونے والے ہیں، لائق عبادت نہیں ہیں۔ یعنی سوائے اللہ کے سب معبود خواہ فرشتے ہوں، خواہ روح القدس، خواہ کوئی جن یا انس سب مرنے والے ہیں، نہ کہ زندہ رہنے والے۔ ورنہ اگر یہ معنی کیے جائیں کہ سوا اللہ کے سب معبود مر چکے، تو چاہیے کہ فرشتے اور روح القدس بلکہ جاندار اور سورج بھی فنا ہو گیے ہوتے۔ اس آیت میں وفات مسیح کی کون سی دلیل ہے؟۔

صحیح یہ ہے کہ مرزا قادیانی نے کفار مکہ کا طرز اختیار کیا ہے، کیوں کہ جب قرآن شریف میں یہ آیت نازل ہوئی ''اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ'' (الانبیاء:۹۸) یعنی تم اور اللہ کے سوا تمہارے معبود، سب دوزخ کا ایندھن ہیں) تو کفار نے کہا لیجیے اس میں تو ان کے عیسیٰ نبی بھی داخل ہیں، وہ بھی جہنم میں ڈالے جائیں گے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ نازل فرمایا ''مَاضَرَبُوْهُ لَکَ اِلَّا جَدَلاً ط بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ٥ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ'' (الزخرف:۵۸۔۵۹) (یعنی وہ لوگ جن کو ہم پہلے سے ہی مستثنیٰ کر چکے وہ کیوں جہنم میں داخل کیے جائیں گے، یہ قوم محض جھگڑالو ہے، بطور جدل کے کہتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ تو ہمارے نیک بندے ہیں، جن پر ہم نے انعام کیے، تمہارے یہ بت تمہاری ندامت اور حسرت بڑھانے کو ڈالے جائیں گے۔ (اسلام اور قادیانیت ایک تقابلی مطالعہ۔ ص:۲۱۶ تا ۲۱۸۔ مصنفہ: مولانا محمد عبدالغنی پٹیالوی) ابو طہ صغیر۔

جب جب قادیانی جدل کریں، تو ان آیات کو پڑھنا چاہیے۔ کیوں کہ جدل کا حاصل عناداً صریح دلائل کو چھوڑ کر، عمومات غیر مقصودہ سے استدلال کرنا ہے، جن کا اس مقام سے کوئی تعلق نہیں۔ وَلْيَسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ(۱)۔

(۱) حضرت علامہ کشمیریؒ نے یہاں بھی انتہائی اجمال سے کام لیا ہے۔ اس لیے ہم "شہادۃ القرآن" سے اس بحث کو بھی قدرے اختصار کے ساتھ نقل کررہے ہیں:

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئاً وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ o اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاءٍ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ" (النحل: ۲۰، ۲۱)

"اور جن کو پکارتے ہیں اللہ کے سوا، کچھ پیدا نہیں کرتے اور وہ خود پیدا کیے ہوئے ہیں۔ مردے ہیں، جن میں جان نہیں اور نہیں جانتے کب اٹھائے جائیں گے)"۔

مرزا قادیانی اس آیت سے اس طرح استدلال کرتا ہے کہ جو کوئی اللہ کے سوا پرستش کیا جاتا ہے، ان سب کو اللہ تعالیٰ مردہ کہتا ہے اور چوں کہ عیسائی حضرت عیسیٰ کو خدا مانتے ہیں، اس لیے ثابت ہوا کہ وہ بھی فوت شدہ ہیں۔

اس بدبخت نے نہ تو آیت کریمہ کا ترجمہ ٹھیک کیا ہے اور نہ ہی صحیح مراد تک اس کی رسائی ہو سکی۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ آیت بتوں کے حق میں ہے، ان کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: کفار مکہ اللہ کے سوا، جن کو پکارتے ہیں، وہ بے جان ہیں۔ کیوں کہ سورہ نحل جس کی یہ آیت ہے، مکی ہے، لہٰذا یہ آیت مکہ کے کفار کی تردید کے لیے نازل ہوئی، نہ کہ عیسائیوں اور یہودیوں کی تردید کے لیے۔

اس پر مرزائیوں کی طرف سے یہ جواب ہوا کرتا ہے کہ آیت میں "اَلَّذِيْنَ" کا لفظ ہے، جو ذوی العقول کے لیے آیا کرتا ہے، پس اس میں عیسائیوں اور یہودیوں کی تردید ہے، جن کے معبود ذوی العقول میں سے ہیں، یعنی حضرت عیسیٰ و حضرت عزیر علیہما السلام۔

ہم کہتے ہیں "اَلَّذِيْنَ" کا ذوی العقول سے مخصوص ہونا نحو یا لغت کی کسی کتاب میں تو ہے نہیں۔ اس جاہل اور اس کی ذریت کی اپنی عربی بولی میں ہوگا، جو ہم پر حجت نہیں، بلکہ زبان عربی میں "الذی" اور اس کی مؤنث "التی" کا استعمال جاندار و غیر جاندار، ذوی العقول وغیر ذوی العقول دونوں طرح کی اشیاء کے لیے آیا ہے۔

ملاحظہ ہوں آیات ذیل:

"ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَاماً عَلَى الَّذِيْ اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلاً لِّكُلِّ شَيْءٍ" (الانعام: ۱۵۴) اس آیت میں مذکور لفظ "اَحْسَنَ" کی بہ نسبت مفسرین کے دو قول ہیں:

۱- یہ اس جگہ صیغہ ماضی معلوم از باب افعال ہے۔ ۲- یہ کہ اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔

"اَحْسَنَ" کو صیغہ ماضی ماننے سے "اَلَّذِيْ" ذی عقل کے لیے ہوگا اور اسم تفضیل کی صورت میں اس کا غیر عاقل کے لیے ہونا صاف ظاہر ہے۔

دوسری آیت: "وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ" (الانعام: ۱۵۲)

تیسری آیت: "وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰماً" (النساء: ۵)

نیز متنبی شاعر کہتا ہے:

والذی تنبت البلا د سرور ۔ والذی تمطر السحاب مدام

اب جو کچھ شہروں کی زمین میں اُگے گا، وہ شراب ہی ہوگا اور جو کچھ بادل برسا رہے ہیں وہ بھی شراب ہی ہوگا۔
اسی طرح دیوان ابی العتاہیہ میں ہے:

الٰهی لا تعذبنی فانی — مقر با لذی قد کان منی

اے اللہ! مجھے عذاب نہ دے، کیوں کہ جو کچھ مجھ سے ہو چکا ہے، میں اس کا اقرار کرتا ہوں۔

اس بیان سے ظاہر ہو گیا کہ آیت زیر بحث میں ''اَلَّذِیْنَ'' سے کفار مکہ کے بت مراد لینا محاورہ عرب کے خلاف نہیں ہے۔

اگر کہاں جائے کہ ''مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ'' عام ہے، چاہے جاندار ہو، یا بے جان، سب کے لیے بولا جاتا ہے، پس اس میں کفار مکہ کے بت بھی شامل ہیں اور ان کے سوا اور بھی مثلاً حضرت مسیح اور حضرت عزیر علیہما السلام اور دیگر معبودان باطل جو کسی قوم نے ٹھہرایا ہو۔ کیوں کہ اس آیت میں دو لفظ ''اَمْوَاتٌ'' اور ''غَیْرُ اَحْیَاءٍ'' فرمائے گئے ہیں، یعنی جو جاندار اللہ کے سوا معبود مانے گئے ہیں، ان کے لیے تو ''اَمْوَاتٌ'' فرمایا، جس میں حضرت مسیح و عزیر علیہما السلام اور دیگر جاندار آ گئے اور ''غَیْرُ اَحْیَاءٍ'' میں بے جان معبود بت وغیرہ آ گئے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک کلمہ ''مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ'' عام ہے، جاندار اور بے جان دونوں پر بولا جاتا ہے اور ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے سوا ہر قسم کے باطل معبودوں کی تردید ہے۔ لیکن اس آیت کی رو سے یہ کہنا کہ وہ سب جاندار و ذوی العقول معبود، جن کو لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا پکارتے ہیں، اس آیت کے نزول کے وقت مردہ تھے، یا فی الحال مرے ہوئے ہیں، ٹھیک نہیں ہے۔ کیوں کہ اس آیت کے نزول کے وقت، کفار مکہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اور ان کی پرستش کرتے تھے، جیسا کہ قرآن شریف میں یہ مضمون کئی مقامات پر مذکور ہے۔ حالاں کہ فرشتے جن کو کفار پکارتے تھے، اس آیت زیر بحث کے نزول کے وقت زندہ تھے اور اب تک زندہ ہیں۔

پس اگر اس آیت کی رو سے جملہ معبودات باطلہ فی الحال مردہ ثابت ہوتے ہیں، تو فرشتوں کی نسبت کیا جواب ہوگا، جیسا کہ پارہ :۱۴، رکوع :۳۔ پارہ :۲۵، رکوع :۷۔ پارہ :۲۳، رکوع :۹۔ اور پارہ :۲۷، رکوع :۴ میں مذکور ہے، کہ کفار مکہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں۔

دیگر یہ کہ اگر کوئی شخص یا قوم اس وقت کسی زندہ شخص کو معبود قرار دے لے، تو اس کو اس آیت کی رو سے، جیتے جی کس طرح مردہ تسلیم کر سکتے ہیں۔ پس آیت اپنے مطلب میں غیر کافی رہے گی، جس سے قرآن شریف پاک ہے۔

''اَمْوَاتٌ'' کے متعلق اصل نکتہ یہ ہے کہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے سوا ان سب معبودوں پر جو اس وقت مردہ ہیں زندہ ہیں، دونوں پر صادق آ سکتا ہے۔ فوت شدہ پر اس طرح کہ وہ موت چکھے ہوئے ہیں اور مردہ خدائی کے لائق نہیں اور جو زندہ ہیں ان پر اس طرح کہ جو آخر کار مر جائیں گے، وہ بھی خدائی کے لائق نہیں، کیونکہ جو اپنی بقاء اور زندگی پر قادر نہیں وہ کس طرح معبود ہو سکتا ہے۔ دیکھئے قرآن شریف میں زندوں پر بھی ''میت'' کا لفظ آیا ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ ان سب کو انجام کار موت چکھنی ہوگی۔ چناں چہ سورہ زمر میں ہے:

''اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ'' (الزمر:۳۰)

تو بھی میت ہے اور یہ یعنی کافر بھی میت ہیں۔

اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو میت کہا گیا ہے، حالانکہ اس آیت کے نزول کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم صفحہ دنیا پر موجود تھے (بلکہ آپ ہی پر یہ آیت نازل ہوئی) اور اسی طرح آپ کے مخالفین کفار کو بھی میت کہا گیا ہے حالانکہ وہ بھی اس وقت زندہ تھے لہٰذا زندوں پر بھی اس لحاظ سے میت کا لفظ بولنا جائز ہے کہ وہ سب انجام کار اپنے مقررہ وقت پر مر جائیں گے۔

الحاصل حضرت عیسیٰ اس آیت زیر بحث کے حکم میں اس لحاظ سے داخل ہیں کہ وہ بھی آخر کار مر جائیں گے، جیسا کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، نہ اس لحاظ سے کہ وہ اس وقت یا اس آیت کے نزول کے وقت مر چکے تھے۔ لہٰذا بدبخت قادیانی کا اس آیت زیر بحث کو حضرت مسیح کی وفات کی دلیل سمجھنا عجب طرح کی الٹی منطق اور غلط استدلال ہے۔ وفات مسیح کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ (شہادۃ القرآن ج۲ص:۹۱،۹۶) محمد صغیر۔

فصل

ارشادِ نبوی: ''فاقول کما قال العبد الصالح'' ایک غلط فہمی کا ازالہ

ابن ابی شیبہ، احمد، عبد بن حمید، بخاری، مسلم، نسائی، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم، ابن حبان، ابوالشیخ، ابن مردویہ، اور بیہقی ''الاسماء والصفات'' میں؛ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"يا أيها الناس! إنكم محشورون إلى الله حفاة ،عراة ،غرلا،ثم قرأ "كَمَابَدَأنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيْدُهُ ط وَعْداً عَلَيْنَآاِنَّا كُنَّا فَاعِلِيْنَ o" ثم قال :ألاوان أول الخلائق يكسى يوم القيٰمة ابراهيم ،ألا وانه يجاء برجال من امتي فيؤخذبهم ذات الشمال، فأقول: يارب! أصحابي، أصحابي فيقال :انک لاتدری ماأحدثوا بعدک، فأقول كماقال العبد الصالح: "وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْداً مَّادُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِىْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ" فيقال :أماهؤلاء : لم يزالوا مرتدين على أعقابهم مذفارقتهم" (درمنثور،سوره مائده : ۱۱۷، ج:۲،ص: ۶۱۵)

''لوگو! تم اللہ کے پاس ننگے پیر، ننگے بدن اور غیر مختون اٹھائے جاؤ گے۔ اس کے بعد یہ آیت پڑھی: ''كَمَابَدَأنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيْدُهُ ط وَعْداً عَلَيْنَآاِنَّا كُنَّا فَاعِلِيْنَ o (الانبياء: ۱۰۴) (جیسا سرے سے بنایا تھا ہم نے پہلی بار، پھر اس کو دہرائیں گے، وعدہ ضرور ہو چکا ہے ہم پر، ہم کو پورا کرنا ہے)۔

پھر فرمایا سنو! قیامت کے دن تمام مخلوقات میں سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کو کپڑا پہنایا جائے گا۔ پھر میری امت کے کچھ لوگوں کو لایا جائے گا اور انہیں بائیں جانب (یعنی جہنم کی طرف) لے جایا جائے گا، اس پر میں کہوں گا: بار الٰہ! یہ تو میرے اصحاب ہیں، یہ تو میرے اصحاب ہیں، تو ارشاد ہوگا! آپ کو کیا معلوم کہ انھوں نے آپ کے بعد کیا کچھ کیا؟ اس وقت میں ایسا ہی کہوں گا، جیسا کہ نیک بندے (حضرت عیسیٰؑ) نے کہا: ''وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْداً مَادُمْتُ فِيْهِمْ ط فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِىْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ''، (اور میں ان سے خبردار تھا جب تک ان میں رہا، پھر جب تو نے مجھ کو اٹھالیا تو تو ہی تھا خبر رکھنے والا ان کی'')

پھر فرمایا جائے گا: جب سے آپ ان سے جدا ہوئے یہ دین سے برگشتہ ہوکر (موت تک) مرتد ہی رہے"۔

اس بدنصیب قادیانی اور اس کے مرید نے شور مچایا کہ دیکھو اس حدیث میں "توفی" بمعنی موت ہے، کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "فاقول کما قال العبد الصالح" اور "قال" فعل ماضی ہے، جو زمانہ تکلم سے پہلے گزر چکا، (اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰؑ سے یہ سوال و جواب ہو چکا اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ سوال و جواب مرنے کے بعد ہی ہوتا ہے، پس ثابت ہو گیا کہ "توفی" بہ معنی موت ہے اور یہ کہ حضرت عیسیٰؑ کی وفات ہو چکی ہے)

اس مردود کا یہ دعویٰ اور دلیل، علمی بے مائیگی اور معلوماتی تہی دستی کا آئینہ دار ہے۔ کیوں کہ یہ جملہ رسول اللہ ﷺ مقام حوض کے پاس فرمائیں گے، جیسا کہ صحیحین وغیرہ میں ہے۔ حوض کوثر، میزان اور پل صراط سے گزرنے کے بعد کی منزل ہے، جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے "فتح الباری" میں اسی کو ترجیح دی ہے، اگر چہ سیوطی نے اس سے اختلاف کیا ہے، لیکن جی کو لگتی ہوئی بات حافظ ہی کی ہے۔ کیوں کہ حوضِ کوثر جنت میں اترنے والے مہمانوں کے لیے بہ منزلہ ابتدائی ضیافت ہے، لہٰذا میزان اور صراط کے مراحل کے بعد، حوض کوثر جنت کے صحن میں ہوگی۔ لقیط ابن عامر کی حدیث کا بھی مضمون یہی ہے۔ زاد المعاد میں اس کی تشریح موجود ہے۔

پس چوں کہ حضرت عیسیٰؑ کا یہ قول محشر میں ہو چکا ہوگا (اور حضور ﷺ یہ بات حوض کوثر پر فرمائیں گے) اس لیے رسول اللہ ﷺ کی طرف نسبت کرتے ہوئے، فعل ماضی کا استعمال صحیح اور مبنی بر صداقت ہے۔ نیز "معالم التنزیل" کے حوالے سے پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے یہ بات رفع سے پہلے، نافرمان اہل مائدہ کے بارے میں کہی تھی (اس اعتبار سے بھی ماضی ہوا) اور قیامت کے دن بھی کہیں گے۔ الغرض یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ آپ کا قول ہے، خواہ دنیا میں آپؑ نے ارشاد فرمایا ہو (تب تو حضور ﷺ نے ماضی ہے ہی) یا روز محشر کہیں گے (مگر چوں کہ حضور ﷺ سے پہلے کہیں گے) اس وجہ سے ماضی کا صیغہ استعمال کیا۔

مسلم، نسائی، ابن ابی الدنیا "حسن ظن" میں، ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن حبان، طبرانی اور بیہقی "الاسماء والصفات" میں؛ روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے فرمایا کہ:

"ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم تلا قول اللہ فی ابراھیم "رَبِّ اِنَّھُنَّ اَضْلَلْنَ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّہٗ مِنِّیْ "الایہ. وقال عیسیٰ ابن مریم "اِنْ تُعَذِّبْھُمْ فَاِنَّھُمْ عِبَادُکَ وَاِنْ تَغْفِرْلَھُمْ فَاِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ "فرفع یدیه فقال :"اللھم امتی امتی" وبکی ،فقال اللہ یاجبرئیل! اذھب الی محمد ،فقل :انا سنرضیک فی امتک ،ولانسوک. "وقدقام

بها صلى الله عليه وسلم ليلة يرددها حتى اصبح بها يركع وبها يسجد"(درمنثور، سورہ مائدہ:۱۱۸، ج:۲،ص:۶۱۶)

''کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابراہیمؑ سے حکایت کرتے ہوئے یہ آیت کریمہ تلاوت کی'':

"رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِىْ فَاِنَّهٗ مِنِّى(ابراهيم:۳۶)"

(''اے رب انہوں نے گمراہ کیا بہت لوگوں کو، سوجس نے میری پیروی کی میری، سووہ تو میرا ہے اور حضرت عیسیٰؑ سے حکایت کرتے ہوئے یہ آیت پڑھی'')

"اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ط وَاِنْ تَغْفِرْلَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُالْحَكِيْمُ "(المائدہ:۱۱۸)

(اگر تو ان کو عذاب دے، تو وہ بندے ہیں تیرے اور اگر تو ان کو معاف کردے، تو تُو ہی ہے زبردست حکمت والا)'' پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا'' اللهم امتى امتى ''اور رو پڑے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل سے فرمایا: محمد(ﷺ) کے پاس جا کر کہو، ہم آپ کو، آپ کی امت کے بارے میں خوش کردیں گے۔ اور آپ کو رنج وغم میں مبتلا نہ کریں گے۔ ایک رات نبی اکرم ﷺ قیام لیل میں رات بھر یہی آیتیں بار بار پڑھ کر رکوع وسجود کرتے رہے، یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔

جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ یہ حضرت عیسیٰؑ کا قول ہے، تو گویا محکی عنہ ماضی میں واقع ہو چکا ہے، خواہ کلام نفسی ہی کے درجے میں۔ پس اس کا مقصد کمال وثوق واعتبار کا اظہار نہیں ہے، کیوں کہ یہ تو ادنی درجہ کی چیز ہے۔ بلکہ وہ علم مراد ہے جو اس کے وقوع سے حاصل ہو چکا، بالخصوص حضرت عیسیٰؑ کی عبارت سے۔ حدیث میں ہے:

"فلا أراه يخلص منهم الامثل همل النعم "(بخاری:۹۷۵/۲)

''میں نہیں سمجھتا کہ ان میں سے کوئی نجات پائے گا، مگر مثل آوارہ اونٹ یعنی معمولی تعداد''۔

اس سے معلوم ہوا کہ آیت (اِنْ تُعَذِّبْهُمْ......الآیہ) صرف ہلاک وگمراہ ہونے والوں میں منحصر نہیں ہے، جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ آپ ہدایت یافتہ اور گمراہ دونوں فرقوں کے متعلق گواہی دیں گے اور کوئی بعید نہیں کہ آپ علیہ السلام کو دنیا ہی میں اس سے آگاہ کر دیا گیا رہا ہو، جیسا کہ ہمارے نبی ﷺ کو باخبر کر دیا گیا تھا اور ایسا ہونا بھی چاہئے۔ کیوں کہ ان چیزوں کے بیان کرنے کا مقصد، جن کی بابت قیامت کے دن سوال ہوگا، دنیا میں ان پر عمل کرنا ہے اور آپ کی امت اس کی زیادہ محتاج ہے؛ چناں چہ آپ نے دنیا میں اس کی دعاء کی اور آیندہ کے لیے ذخیرہ بنالیا۔ جیسا کہ ہمارے نبی محمد ﷺ نے دعاء کی۔ یہاں پود لگائے، وہاں پھل توڑیں گے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

اہم علمی فائدہ

ذوالقرنین، سدّ اور یاجوج ماجوج کی تحقیق

احادیث متواترہ سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰؑ خروج دجال کے بعد نزول فرمائیں گے اور دجال کو قتل کر کے، اپنے نیزے پر اس کا لگا ہوا خون، لوگوں کو دکھائیں گے۔ پھر یاجوج و ماجوج کا خروج ہوگا، حضرت عیسیٰؑ ان کی ہلاکت کی دعا کریں گے اور اللہ تعالیٰ انہیں ہلاک کر دے گا۔

ملحدین نے ان احادیث متواترہ میں بھی تحریفات کیں ہیں۔ احقر نے یاجوج و ماجوج کے سلسلے میں احادیث اور تاریخی شواہد پر مشتمل رسالہ تصنیف کیا ہے۔ جس کے مکمل تذکرے کی یہاں گنجائش نہیں ہے، اس لیے یہاں فقط اس کا ایک حصہ ذکر کر رہا ہوں۔

ذوالقرنین

اس موقع پر اتنی بات جاننا مناسب اور کافی ہے کہ ذوالقرنین مشرق کے رہنے والے نہ تھے، جیسا کہ بعض حضرات کا خیال ہے کہ ذوالقرنین سے مراد چین کا ''فغفور'' (بادشاہ) ہے، جس نے بارہ سو میل لمبی ایک آہنی دیوار تعمیر کی، جو پہاڑوں اور سمندروں سے ہو کر گزرتی ہے۔ کیوں کہ ذوالقرنین اگر مشرق کے رہنے والے ہوتے تو قرآن کریم میں یہ بات بھی مذکور ہوتی کہ سفر مغرب کے بعد وہ مشرق لوٹ گئے، یعنی اپنے وطن کی جانب واپس ہو گئے۔ اور نہ ہی ذوالقرنین اہل مغرب میں سے تھے، بلکہ مشرق و مغرب کے درمیانی علاقے کے باشندہ تھے۔ راجح یہ ہے کہ ذوالقرنین، نہ یمن کے بادشاہوں میں سے تھے اور نہ شاہان عجم میں سے اور نہ ہی سکندر بن فیلقوس (مقدونی) ہی ذوالقرنین تھا۔ بلکہ وہ ان سب سے جدا ایک نیک اور صالح بادشاہ تھا، جس کا نسب، قدیم سامی عرب تک پہنچتا ہے، صاحب ''ناسخ التواریخ'' نے یہی لکھا ہے اور اس دیوار (سد ذوالقرنین) کی بنا کی تاریخ ہبوط آدم (علیہ السلام) سے تین ہزار چار سو ساٹھ (۳۴۶۰) سال بعد بتائی ہے، نیز ان عرب سامیین سے پہلے ان کا تذکرہ کیا ہے، جنہوں نے مصر پر حکومت کی ہے، مثلاً

شداد بن عاد بن عوض بن ارم بن سام۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ دونوں ایک ہی ہیں۔ شداد کا بھتیجا سنان بن علوان بن عاد۔ ان دونوں کے بعد، ریان بن ولید بن عمرو بن عملیق ابن عوج بن عاد۔

صاحب ''ناسخ التواریخ'' فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے ریان کے بعد ہونے والے فراعنہ مصر کو عمالقہ کے نام سے یاد کیا ہے، انھوں نے دراصل عملیق بن عوج کی طرف نسبت کرتے ہوئے، عمالقہ لکھا ہے۔ نہ کہ عملیق بن لاوذ بن ارم بن سام کی طرف، جس نے مکہ میں سکونت اختیار کی تھی۔ نیز ذوالقرنین اس ضحاک بن علوان سے بھی پہلے کا ہے، جو کہ سنان بن علوان کا بھائی تھا، اس نے شاہ ایران جمشید کو قتل کیا تھا اور پھر خود ایران کا بادشاہ بن گیا تھا۔ صاحب ''ناسخ التواریخ'' نے ذوالقرنین کا نام ''صعب بن روم ابن یونان بن تارخ بن سام'' لکھا ہے۔ گویا ذوالقرنین عاد اُولیٰ میں سے تھے، نہ کہ روم یا یونان سے، جیسا کہ ارشاد باری:

''وَاذْکُرُوْآ اِذْجَعَلَکُمْ خُلَفَآءَ مِنْ م بَعْدِقَوْمِ نُوْحٍ'' (الاعراف: ۶۹)

''اور یاد کرو جب کہ تم کو سردار کر دیا پیچھے قوم نوح کے''۔

نیز یہ بھی لکھا ہے کہ ''کورش'' ''کے قباذ'' نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق شاہان بابل کے طبقہ دُوم سے ہے۔

ذوالقرنین کی وجہ تسمیہ

ذوالقرنین کی وجہ تسمیہ کے حوالے سے حضرت علیؓ کا قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے، حافظ ابن حجر نے بھی اسی کو راجح قرار دیا ہے(۱) اور زبیدی نے ''تاج العروس شرح قاموس''(۲) میں اس کی تشریح فرمائی ہے۔

سدّ ذوالقرنین

قرآن عزیز میں ذوالقرنین کے تین اسفار کا ذکر ہے، پہلا مغرب کی طرف، دوسرا مشرق کی طرف اور تیسرے سفر کی جہت کا کوئی تذکرہ نہیں ہے نیز نہ ہی کوئی قرینہ ہے، جس سے جہت جنوب راجح ہو سکے۔ اس لیے یقیناً وہ سفر شمال کی طرف ہوگا اور اسی جانب اس کی (تعمیر کردہ) سدّ (دیوار) ہے، جو قوقا (کوہ قاف) کے پہاڑوں میں واقع ہے۔ جس کو اب جبل طائی کہا جاتا ہے، یہ ''اورال'' پہاڑوں کے سلسلہ کے علاوہ دوسرا پہاڑ

(۱) دیکھیے: فتح الباری، الانبیاء، باب: ۷۔ قصہ یاجوج وماجوج ج: ۶، ص: ۴۷۲۔ (محمد صغیر)

(۲) تاج العروس، مادہ ''قرن'' ج: ۹، ص: ۳۰۷۔ (محمد صغیر)

ہے۔ نیز کتاب حزقیل میں مذکور آخر الجربیاء سے مراد بھی یہی ہے: جیسا کہ روح المعانی میں ہے۔لغت میں ''جربیاء'' مشرق وشمال کے درمیان سے چلنے والی ہوا کو کہتے ہیں۔

جس غرض کے لیے ذوالقرنین نے سد بنائی تھی، (یعنی قبائل یاجوج وماجوج کے شر وفساد اور لوٹ مار سے بچنے کے لیے) اسی غرض کے لیے بعض شاہان چین نے بھی سد کی تعمیر کی ہے، مثلاً دیوار چین جس کو منگولین ''انکووہ'' اور ترک ''بوقورقہ'' کہتے ہیں۔صاحب ناسخ التواریخ نے اس کا مفصل تذکرہ کیا ہے اور اس کی تاریخِ بنا، ہبوط آدم علیہ السلام سے چار ہزار تین سو اکیاسی (۴۳۸۱) سال بعد بتائی ہے۔اسی طرح بعض عجمی بادشاہوں نے باب الابواب (دربند) کی تعمیر کی،ان کے علاوہ اور بھی بعض دیواریں ہیں اور سب کی سب شمال ہی کی جانب ہیں۔

یاجوج وماجوج

اگر یہ بات ثابت بھی ہوجائے ، جسے مؤرخین نے شہرت دے رکھی ہے اور دمیری نے ''حیاۃ الحیوان'' میں ابن عبد البر کی ''کتاب الأمم'' کے حوالے سے، ''کرکند'' کے تذکرے میں لکھا ہے کہ ماجوج یافث بن نوح کی اولاد میں سے ہے،اس نے وہیں سکونت اختیار کی تھی اور جوج بعد میں اس سے جاملا۔ماغوغ عبرانی زبان میں وہی ہے، جو عربی کا ماجوج ہے، جیسا کہ ابن خلدون نے بیان کیا ہے اور یہ کہ جوج ہی یاجوج ہے، باوجودے کہ کتاب حزقیل میں یاجوج کا لفظ نہیں ہے، بلکہ وہاں جوج کا لفظ ہے۔تاہم انہوں نے یہ تسلیم کیا ہے کہ یہ دونوں لفظ انگریزی کے ''گاگ'' اور ''میگاگ'' سے معرب ہیں۔اہل روس یاجوج کے کے قبیلے سے، جب کہ اہل برطانیہ ماجوج کے قبیلے سے ہیں۔تب بھی یہ اس بات کی دلیل نہیں بن سکتی کہ ذوالقرنین نے ان سب کے لیے دیوار بنائی تھی۔بلکہ صحیح یہ ہے کہ ان میں سے صرف چند ایک گروہوں کے لیے دیوار بنائی تھی۔

نصاریٰ پرانے زمانے سے مسلمانوں پر یہ اعتراض کرتے آئے ہیں کہ ارسطو نے ''کتاب الحیوان'' میں سد اور یاجوج وماجوج کا ذکر کیا ہے، اسی طرح بطلیموس نے بھی اپنی جغرافیا میں اسے بیان کیا ہے،تو حضور ﷺ سے یہود کا اس کی بابت سوال کرنا، تحصیل حاصل ہے، جو کہ قرآن کے من عند اللہ ہونے کو مشکوک بنا دیتا ہے۔

اس کے جواب میں ابن حزم نے ''الفصل فی الملل والنحل، ج:۱،ص:۱۲۰'' میں فرمایا کہ آں حضرت سے یہود کا سد اور ذوالقرنین کی شخصیت کی بابت سوال نہیں تھا، بلکہ ان کی تعیین اور مصداق کی بابت تھا اور یہ

سوال سب سے پہلے یہود ہی نے حضور ﷺ سے کیا (جس کے جواب میں آیت کریمہ نازل ہوئی)۔ جیسا کہ ''درمنثور'' کی بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ بعض حضرات ان دونوں الفاظ کی اصل ''منگولیا'' و ''منگوریا''، نیز بعض لوگ ''گاگ ومیگاگ'' کہتے ہیں، جب کہ بعض کی رائے میں ان کی اصل ''جین وماجین'' ہے۔

اس سے زیادہ تعجب خیز بات وہ ہے، جو صاحب ''ناسخ التواریخ'' نے تعمیر بیت المقدس کے تذکرے میں، ذکر کے ہے کہ علمائے بنی اسرائیل ''صور'' اور ''صیدا'' کو ''جین'' اور ''ماجین'' کہتے تھے۔ علاوہ ازیں بعض علمائے نصاریٰ نے تاریخ کلیسا کے حوالے سے، ایک ایسے فرقے کا تذکرہ کیا ہے، جس کا لقب ''یاجوجی'' تھا۔

صحیح بات یہ ہے کہ یاجوج وماجوج کی جو صفت قرآن کریم میں مذکور ہے وہ ''اَلْمُفْسِدُوْنَ فِیْ الْاَرْضِ'' ہے۔ جس کا مفہوم، مذکورہ بالا اقوام میں سے کسی ایک پر بھی مکمل صادق نہیں آتا، اس لیے کہ ''افساد فی الارض'' کا حاصل کھیتوں اور نسلوں کو تباہ وبرباد کرنا، ملک کو تہ وبالا کرنا، لوٹ مار اور قتل وغارت گری کا بازار گرم کرنا ہے، نہ کہ سیاست وتدبیر کے ذریعے حکومتوں پر تسلط وقبضہ کرنا۔ (یعنی یاجوج وماجوج کا وہ خروج جس کا ذکر سورہ انبیاء میں کیا گیا ہے اور جس کو علامات قیامت میں سے قرار دیا گیا ہے، وہ ایسے شر وفساد کے ساتھ ہوگا، جس کا تہذیب وتمدن سے دور کا بھی واسطہ نہ ہوگا، بلکہ خالص وحشیانہ انداز ہوگا) اور یہ تمام اقوام، جن کا ذکر ابھی ہوا، اسی دوسرے وصف (یعنی سیاست وتدبیر) کے ساتھ متصف ہیں، نہ کہ پہلے وصف کے ساتھ۔ نیز اب جب کہ ان کا لقب بھی یاجوج وماجوج نہ رہا، تو ان کی شناخت کا ذریعہ فقط ان کا وصف خاص ''افساد فی الارض'' ہی باقی رہا، جو مذکورہ اقوام (اہل برطانیہ وروس) پر صادق نہیں آتا۔ پس اگر ان کا سلسلہ یاجوج وماجوج تک پہنچ بھی رہا ہو، تب بھی کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا (اس لیے کہ اب ان قبائل کے اندر وصف خاص ''افساد فی الارض'' باقی نہ رہا، لہٰذا ان پر یاجوج وماجوج کا اطلاق بھی نہیں کیا جائیگا۔ یہ لفظ تو فقط ان ہی قبائل کے لیے بولا جائے گا، جو ''افساد فی الارض'' کے ساتھ اب بھی متصف ہیں اور تمدن وسیاست وغیرہ سے نابلد) غالباً (اسی وجہ سے) بعض آثار میں جنگلی انسان اور ہر ظلم شعار کو بھی یاجوج وماجوج میں شمار کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو: ''دائرۃ المعارف'' تذکرہ ''انسان الغاب والجبار''۔

تفسیر ''البحر المحیط'' میں ہے کہ ان کی تعداد وصفات کی بابت علماء کا اختلاف ہے اور صحیح روایت سے کچھ بھی ثابت نہیں ہے۔ لیکن بندے کا خیال ہے کہ کثرت تعداد کی بابت بہت سی صحیح احادیث موجود ہیں۔ نیز ''تاریخ ابن کثیر'' کے حوالے سے، علامہ عینی کی ''کتاب الجمان فی تاریخ الزمان'' میں بھی یہی مذکور ہے کی ان کی صفات کے بارے میں کچھ زیادہ صحیح روایات مروی نہیں ہیں۔

پھر یہ کہ اہل یورپ اپنے ملک سے نکل آئے، اپنے اخلاق اور سیرت و کردار سے دستبردار ہو گئے (یعنی اس گھاٹی سے نکل آئے، جہاں ان کے قبیلے کے لوگ — یاجوج و ماجوج — آباد ہیں اور متمدن دنیا میں بس گئے، نیز وحشیانہ طرز و طریق چھوڑ کر تمدن و سیاست اختیار کر چکے ہیں) اس لیے یہ مراد نہیں ہو سکتے۔ بلکہ شمال و مشرق میں ان کے قبیلے کا جو فرقہ آباد ہے وہی یاجوج و ماجوج ہے، آخری زمانے میں یہی لوگ خروج کریں گے (اور قتل و غارت گری مچائیں گے)

تعمیر سد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر چہار طرف سے دیوار تعمیر کر کے ان کو بند کر دیا گیا ہے، بلکہ کسی ایک جہت میں دیوار بنا کر ان کو خروج سے روکا گیا ہے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ یاجوج و ماجوج کے خروج کی راہ میں حائل حسی مانع بہت پہلے ہی اٹھ چکا ہے، دیوار ٹوٹ چکی ہے اور وہ لوگ نکل چکے ہیں۔ تو جواب یہ ہوگا کہ پھر (نصوص میں مذکور خروج سے) یہ خروج مراد نہیں ہے۔ کیوں کہ اس خروج سے پہلے حضرت عیسیٰؑ کا نزول نہیں ہوا (حالاں کہ نصوص کی رو سے، آپ علیہ السلام کا نزول، ان کے خروج سے پہلے ضروری ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ان میں کے کچھ لوگ نکل چکے ہوں) اور مستقبل میں بھی کبھی کبھار نکلتے رہیں، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ کے نزول کے بعد، ان میں کے جو لوگ اس وقت تک نہ نکلے ہوں گے۔ یکے بعد دیگرے دیوار سے نکلیں، جیسا کہ خوارج کا خروج ہوا تھا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ تمام کے تمام ایک ہی مرتبہ دیوار سے نکلیں گے۔ قرآن کریم نے یہاں "سورہ کہف" میں اس سد سے یاجوج و ماجوج کے نکلنے کا کوئی تذکرہ نہیں کیا (بلکہ فقط تعمیر سد اور وعدہ خداوندی پر اس سد کے ریزہ ریزہ ہونے کا ذکر کیا چنانچہ ارشاد فرمایا:

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ٥ قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ٥ قَالَ مَا مَكَّنِّىْ فِيْهِ رَبِّىْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِىْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ٥ اٰتُوْنِىْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ط حَتّٰٓى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ط حَتّٰٓى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا قَالَ اٰتُوْنِىْٓ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ٥ فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ٥ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّىْ ج فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّىْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ج وَكَانَ وَعْدُ رَبِّىْ حَقًّا ٥

(الکہف: ۹۳، ۹۸)

"یہاں تک کہ جب (ذوالقرنین ایک) ایسے مقام پر جو دو پہاڑوں کے درمیان تھا پہنچے تو ان پہاڑوں سے

اس طرف ایک قوم کو دیکھا جو (زبان اور لغت سے ناواقف وحشیانہ زندگی کی وجہ سے) کوئی بات سمجھنے کے قریب بھی نہیں پہنچتے تھے، انہوں نے عرض کیا اے ذوالقرنین قوم یاجوج و ماجوج (جو اس گھاٹی کے اس طرف رہتے ہیں، ہماری) اس سرزمین میں فساد مچاتے ہیں (یعنی قتل و غارت گری کرتے ہیں) سو کیا ہم لوگ آپ کے لئے چندہ کر کے کچھ رقم جمع کر دیں اس شرط پر کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی روک بنا دیں (کہ وہ اس طرف نہ آنے پائیں) ذوالقرنین نے جواب دیا کہ جس حال میں میرے رب نے مجھ کو (تصرت کرنے کا) اختیار دیا ہے وہ بہت کچھ ہے (اس لیے چندہ جمع کرنے کی ضرورت نہیں، البتہ) ہاتھ پاؤں کی طاقت (یعنی محنت مزدوری) سے میری مدد کرو تو میں تمہارے اور ان کے درمیان خوب مضبوط دیوار بنادوں گا (اچھا تو) تم لوگ میرے پاس لوہے کی چادریں لاؤ (چنانچہ چادریں لائی گئیں اور دیوار تعمیر کا کام شروع ہو گیا) یہاں تک کہ جب ان (دونوں پہاڑوں) کے دونوں سروں کے بیچ (خلاء) کو پہاڑوں کے) برابر کر دیا تو حکم دیا کہ دھونکو۔ یہاں تک کہ جب (دھونکتے دھونکتے) اس کو لال انگارا کر دیا تو حکم دیا کہ اب میرے پاس پگھلا ہوا تانبا لاؤ کہ اس پر ڈال دوں (کہ جس سے درازیں ختم ہو جائیں اور پوری دیوار ایک ذات ہو جائے) پھر نہ چڑھ سکیں یاجوج ماجوج اس پر اور نہ نقب لگا سکیں۔ ذوالقرنین نے (جب اس دیوار کو تیار دیکھا، جس کا تیار ہونا کوئی آسان کام نہ تھا تو بطور شکر کے) کہا کہ یہ میرے رب کی ایک رحمت ہے (مجھ پر کہ میرے ہاتھوں یہ کام ہو گیا اور اس قوم کے لئے بھی جن کو یاجوج و ماجوج ستاتے تھے) پھر جس وقت رب کا وعدہ آئے گا (یعنی اس کی فنا کا وقت آئے گا) تو اس کو ڈھا کر برابر کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے)۔

اور جب ''سورہ انبیاء'' میں (قیامت کے قریب ان کے خروج اور سرعت کے ساتھ بلندیوں سے پستی کی جانب فساد بپا کرنے کے لیے امنڈ پڑنے کا ذکر) ان الفاظ کے ساتھ کیا:

''حَتّٰىٓ اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ'' (الانبیاء: ۹۶)

''یہاں تک کہ جب کھول دیے جائیں یاجوج اور ماجوج اور وہ ہر اوچان سے پھسلتے چلے آئیں''۔

تو سد اور ردم کو نہیں ذکر کیا، جس سے معلوم ہوا کہ یہ خروج ان کے تمام قبیلوں کو شامل ہے (دیوار کے اندر رہنے والوں کو بھی اور باہر رہنے والوں کو بھی) شاید ارشاد باری:

''وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ'' (الکهف: ۹۹)

''اور چھوڑ دیں گے ہم خلق کو، اس دن ایک دوسرے میں گھستے''۔

سے اسی جانب اشارہ ہے کہ ان میں کے بعض دوسرے بعض کے مقابل ہیں، یعنی ان میں کے بعض تو اس سد

سے خروج کریں گے (جو دیوار کے اندر ہیں) اور بعض اس کے علاوہ کسی اور جگہ سے (یعنی جو دیوار کے باہر ہیں، یا ان کی جانب دیوار ہے، ہی نہیں) گویا کہ دیوار کے ٹوٹنے کو، بعض کے لیے تو نکلنے کی جگہ بنایا گیا ہے (جو دیوار کے اندر ہیں) اور بعض کے لیے نکلنے کا وقت (جو لوگ دیوار کے باہر ہیں)۔ ''مکاشفات یوحنا الانجیلی'' میں، ان کا یکے بعد دیگرے نکلنا مذکور ہے۔ یعنی وہ دو طرح کے لوگ ہیں: ایک وہ جن کی راہ میں دیوار بنائی گئی ہے، دوسرے وہ جن کی راہ میں دیوار نہیں بنائی گئی ہے۔ ''ناسخ التواریخ'' میں ''سفر سنہدرین'' کی گیارہویں فصل کے حوالے سے مذکور ہے: [''سفر سنہدرین'' کا درجہ یہود کے یہاں وہی ہے، جو اسلام میں احادیث رسول ﷺ کا ہے] کہ روم کے خزانوں میں بہ خط عبرانی یہ لکھا ہوا ملا کہ چار ہزار دو سو اکیانوے (۴۲۹۱) سال کے بعد دنیا یتیم ہو جائے گی، اس میں کوک وماکوک (گاگ ومیگاگ) کی جنگیں ہوں گی اور پورا زمانہ ''ماشیخ'' کا ہوگا۔ یہودیوں نے خاتم الانبیاء ﷺ کی ولادت باسعادت کی جو تاریخ بتائی ہے، یہ تاریخ اسی کے مطابق ہے۔ ''اس کے بعد دنیا یتیم ہو جائے گی، اس کا کوئی محافظ و نگراں نہ ہوگا'' کا مطلب یہ ہے کہ نبوت کا دروازہ بند ہو جائے گا اور اس کے بعد بلکہ خیر کثیر کے بعد، یاجوج وماجوج کی جنگیں ہوں گی۔ اس وقت حضرت عیسیٰؑ نزول فرمائیں گے۔ صاحب ''ناسخ التواریخ'' نے ''ماشیخ''، خاتم الانبیاء ﷺ کی ذات اقدس کو قرار دیا ہے۔

ایسے ہی کتاب حزقیل میں بھی یاجوج وماجوج کا ذکر ہے لیکن سد کا ذکر نہیں ہے۔ ان تمام نصوص سے یہ بات بہ صراحت ثابت ہوتی ہے کہ یاجوج وماجوج دنیا ہی میں ہیں، خواہ ان کے راستے میں دیوار تعمیر ہوئی ہو، یا نہ۔ قرآن کریم نے تمام کے تمام افرادِ یاجوج وماجوج، عام ہوں یا خواص، سب کے حالات یکجا کر دیے ہیں۔ کیوں کہ کفار مکہ نے ذوالقرنین کے بارے میں سوال کیا تھا، نہ کہ فقط یاجوج وماجوج کی بابت۔ اس لیے اللہ رب العزت نے پہلے ان یاجوج وماجوج کا ذکر کیا، جنھیں روکنے کے لیے ذوالقرنین نے دیوار تعمیر کی تھی، اس کے بعد اپنے ارشاد ''وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ'' میں عموم پیدا کر دیا (جس سے اس میں وہ لوگ بھی آ گئے، جن کی راہ میں دیوار حائل نہیں ہے)۔ اس لیے استمرار و تجدد کے ساتھ ان کا خروج ہوتا رہے گا، تا آں کہ نزول مسیح (علیہ السلام) کے وقت ان کا مخصوص خروج ہوگا۔ اس جگہ قرآن کریم میں حدیث شریف سے زیادہ عموم ہے۔ نیز ''وَهُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُوْنَ'' میں ''مِنْ كُلِّ حَدَبٍ'' کا لفظ استعمال فرمایا اور یہ ضروری بھی تھا، اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اہل یورپ انہی میں سے ہیں اور یہی خروج کریں گے۔ یا پھر قرآن کریم میں صرف ان لوگوں کا ذکر ہے، جن کے لیے دیوار تعمیر کی گئی، لیکن

یہ نہیں بیان کیا گیا کہ وہ دیوار نہیں ٹوٹے گی اور یہ کہ ان کا خروج کے بعد دیگرے بہ طور استمرار نہیں ہوتا رہے گا، کہ ان کا خروج، اس خروج سے مل جائے، جو نزول عیسیٰؑ کے وقت ہوگا۔ چناں چہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوار کے ٹوٹنے کی ابتداء ہو چکی ہے، جیسا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

"لااله الا الله ویل للعرب من شر قد اقترب فتح الیوم من ردم یاجوج وماجوج مثل هذا، وحلق باصبعه الابهام والتی تلیها" (مسلم: ۳۸۸/۲ — بخاری: ۱۰۴۶/۲)

"لا الہ الا اللہ" عرب کے لیے ہلاکت ہے، اس شر سے، جو قریب آرہا ہے، آج یاجوج و ماجوج کے لیے تعمیر کردہ دیوار میں سے اتنا کھل گیا اور انگوٹھے پر شہادت کی انگلی رکھ کر، حلقہ بنایا"۔

یہ لوگ جو دیوار کے راستے کے علاوہ دوسرے راستے سے نکلے ہیں، ان کے بارے میں یہ نہیں کہا جائے گا کہ ان کا خروج ہوا ہے۔ کیوں کہ یہ لوگ مذہب اور قوم کے اعتبار سے نصرانی ہیں، ان میں سے جو خاندان، قوم و مذہب کے اعتبار سے نصرانی نہیں ہیں، وہ رہ گئے ہیں آخری زمانے میں حضرت عیسیٰؑ کے نزول کے بعد خروج کریں گے۔

کتاب حزقیل میں بنی اسرائیل کے خلاف ان کے خروج کا تذکرہ ہے چناں چہ "روح المعانی" میں ہے کہ حضرت حزقیل کی کتاب میں؛ آخری زمانے میں ان کی آمد کی خبر دی گئی ہے کہ یہ جربیا (شمال ومشرق) کے آخر سے نکلیں گے، اور وہ بہت بھاری گروہ ہیں، جن کی تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے، زمین میں فساد مچانے اور بیت المقدس کا قصد کرنے کا بھی ذکر ہے، نیز اس بات کا بھی ذکر ہے کہ نوع بہ نوع عذاب میں مبتلا کر کے ایک بڑے میدان میں ہلاک کر دے جائیں گے (انتہی)

احادیث رسول میں بھی ان کے شام جانے کا تذکرہ ہے، لہذا بیت المقدس کے خلاف ان کا خروج اندکاک سے متصل نہیں ہوگا، بلکہ اس سے متصل تو عام لوگوں کے خلاف، ان کا خروج ہوگا، جیسا کہ بعض الفاظ حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو "کنز العمال" ج: ۷، ص: ۱۸۵۔ یہ واضح رہے کہ علامات قیامت کی حدیثوں میں سے کبھی کبھی جستہ جستہ علامتوں کو بیچ سے ذکر کر دیا جاتا ہے اور درمیانی علامتوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔

الحاصل ان کا خروج کئی بار ہوگا۔ قرآن کریم میں اس طرح کی کوئی صراحت نہیں ہے کہ دیوار نے انھیں ہر طرف سے روک رکھا ہے اور نہ ہی اس بات کی، کہ آئندہ زمانوں میں ان کا نہ نکلنا، دیوار نہ گرنے کی

وجہ سے ہوگا۔ کیوں کہ یہ (ارشاد ''فَمَا اسْطَاعُوْآ اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا'' - الکہف: ۹۷- پھر نہ چڑھ سکیں اس پر اور نہ کر سکیں اس میں سوراخ) تو سد کی تعمیر کے وقت اور اس کے بعد ایک عرصہ دراز تک کے بارے میں ہے۔ رہا اس کے بعد ان کا خروج، تو وہ کئی بار ہے، ملاحظہ ہو ارشاد باری: ''حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ ''۔ یہاں ''فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ '' کہا گیا نہ کہ ''فتح الردم''۔ ''فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ '' میں ''فتح'' سے مراد اسی آخری مرتبہ کا خروج ہے۔

یہ بھی ذہن نشین رہے کہ ذوالقرنین کا یہ قول:

''هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ج فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا'' (الکھف: ۹۸)

''یہ ایک مہربانی ہے میرے رب کی، پھر جب آئے وعدہ میرے رب کا، گرادے اس کو ڈھا کر اور ہے وعدہ میرے رب کا سچا''۔

ان کا اپنا قول ہے، نیز سیاق وسباق میں کوئی ایسا قرینہ بھی موجود نہیں ہے جس سے سد کے ریزہ ریزہ ہونے کے واقعے کو علامات قیامت میں سے شمار کیا جائے۔ شاید ذوالقرنین کو یہ علم بھی نہ رہا ہو کہ علامات قیامت میں سے خروج یاجوج وماجوج بھی ہے اور اس نے ''وَعْدُ رَبِّيْ '' سے، صرف دیوار کا کسی وقت ٹوٹ پھوٹ جانا، مراد لیا ہو۔ پس اس صورت میں ذوالقرنین کے قول ''هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ... الآیۃ'' کے بعد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد:

''وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ'' (الکھف: ۹۹)

''اور چھوڑ دیں گے ہم خلق کو، اس دن ایک دوسرے میں گھستے''۔

استمرار تجددی پر دلالت کرتا ہے (یعنی ایسا برابر ہوتا رہے گا کہ ان میں سے بعض قبائل، بعض پر حملہ آور ہوتے رہیں گے، حتی کہ خروج موعود کا وقت آجائے گا) ہاں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد:

''حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ''. (الانبیاء: ۹۶)

''یہاں تک کہ جب کھول دیے جائیں یاجوج اور ماجوج اور وہ ہر اد چان سے پھسلتے چلے آئیں''۔

بلاشبہ علامات قیامت میں سے ہے، لیکن اس میں سد کا قطعاً کوئی ذکر نہیں ہے۔ لہذا اس فرق کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔

یہ بھی واضح رہے کہ جس سد کو ایک صحابی رسول نے دیکھا تھا، جیسا کہ ''فتح الباری'' (ج:۶، ص: ۴۷۰) ''درمنثور'' اور ''حیاۃ الحیوان'' میں مذکور ہے، بظاہر وہ اس سد ذوالقرنین کے علاوہ کوئی اور سد ہے (جو غالباً اسی

غرض کے لیے بنائی گئی تھی، جس غرض کے لیے ذوالقرنین نے بنایا تھا) اور اس سد میں محصور یاجوج وماجوج سے مراد اہل شرک ہیں۔ نیز روزآنہ سد کھودنے کا ذکر جس حدیث(۱) میں آیا ہے ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں، اس حدیث کے رفع کو معلل قرار دیا ہے، بایں طور کہ ہوسکتا ہے، راوی (حضرت ابوہریرہؓ) نے کعب احبار سے سنا ہو[کیوں کہ ٹھیک اسی قسم کی ایک اسرائیلی کہانی، کعب احبار سے منقول ہے] اور بطور ایک اسرائیلی کہانی اس کو بیان کیا ہو (جیسا کہ حضرت ابوہریرہ کعب احبار سے اسرائیلی قصے سنا کرتے تھے اور کہانی کے طور پر بیان کرتے تھے۔) جس کو نیچے کے راوی نے یہ سمجھا کہ حضرت ابوہریرہ کی یہ روایت، نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے، اس لیے اس نے اسے مرفوعا بیان کردیا۔ جو درحقیقت اس کا وہم ہے۔ (ابن کثیر)۔ ''فتح الباری'' میں ہے کہ عبد بن حمید نے اسے، حضرت ابوہریرہ سے موقوفا روایت کیا ہے۔ (اور اگر اسے

(۱) حدیث یہ ہے: ''قال الامام احمد حدثنا روح حدثنا سعید بن أبی عروبة عن قتادة حدثنا ابورافع عن ابی هریرة عن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: ''ان یاجوج وماجوج لیحفرو ن السدکل یوم ،حتی اذاکادوا یرون شعاع الشمش،قال الذی علیهم ارجعوا فستحفرونه غداً،فیعودون الیه کاشدماکان،حتی اذا بلغت مدتهم وأرادالله أن یبعثهم علی الناس حفروا،حتی اذاکادوا،یرون شعاع الشمش ، قال الذی علیهم ارجعوا،فستحفرونه غداًان شاء الله ،فیعودون الیه کهیئته، حین ترکوه ،فیحفرونه ویخرجون علی الناس ،فینشفون المیاه ،و یتحصن الناس منهم فی حصونهم فیرمون بسهامهم الی السماء ،فترجع وعلیها کهیئة الدم فیقولون قهرنا أهل الارض، وعلونا اهل السماء،فیبعث الله علیهم نغفا فی رقابهم ،فیقتلهم بها .قال رسول الله صلی الله علیه وسلم''والذی نفس محمد بیده ان دواب الارض لتسمن وتشکر شکراً من لحومهم ودماء هم'' (تفسیر ابن کثیر، سورہ الکہف: ۹۷، ج ۳، ص ۱۴۱)

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ بیان کیا مجھ سے روح نے، (انھوں نے) کہا کہ بیان کیا مجھ سے سعید بن ابی عروبہ نے، انھوں نے قتادہ سے انھوں نے ابورافع سے، انھوں نے ابوہریرہ سے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ آپ نے فرمایا ہر روز یاجوج وماجوج اس دیوار کو کھودتے ہیں، یہاں تک کہ قریب ہوتا ہے کہ سورج کی شعاعیں ان کو نظر آجائیں (تو دن کے ختم ہوجانے کی وجہ سے) ان کے سردار کا حکم ہوتا ہے کہ اب بس کرو، کل آکر توڑ دیں گے، لیکن جب وہ دوسرے دن آتے ہیں تو اسے پہلے دن سے زیادہ مضبوط پاتے ہیں (یہ سلسلہ چلتا رہے گا) یہاں تک کہ جب ان کا نکلنا خدا کو منظور ہوگا تو یہ کھودتے ہوئے جب اتنے قریب ہوجائیں گے کہ سورج کی شعاعیں نظر آجائیں، تو ان کا سردار کہے گا، اب چھوڑ دو، کل انشاء اللہ اسے توڑ ڈالیں گے (پس انشاء اللہ کہہ لینے کی برکت سے) دوسرے دن جب وہ آئیں گے، تو جیسی چھوڑ گئے تھے، ویسی ہی پائیں گے، فوراً گرادیں گے اور باہر نکل پڑیں گے، تمام پانی چاٹ جائیں گے، لوگ تنگ آکر قلعوں میں پناہ گزیں ہوجائیں گے۔ پھر یہ اپنے تیر آسمان کی طرف چلائیں گے، تو وہ خون آلود ان کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ (تیروں کو خون آلود دیکھ کر) یہ کہیں گے، زمین والے سب دب گئے اور آسمان والوں پر بھی ہم غالب آگئے۔ پھر بہ حکم خدا ان کی گردنوں میں گلٹیاں نکلیں گی اور سب کے سب اسی وبا سے ہلاک کردیئے جائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں محمد کی جان ہے: زمین کے جانوروں کی خوراک ان کے جسم وخون ہوں گے، جس سے وہ خوب موٹے تازے ہوجائیں گے۔ (محمد صغیر)

صحیح مانا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ) انھوں نے پہلے کھدائی شروع کی، مگر جب کامیاب نہ ہوئے تو چھوڑ دیا، اب قیامت کے قریب، خروج مخصوص کے وقت، پھر کھدائی کریں گے۔ نیز اگر انھوں نے حضرت عیسیٰؑ کے وقتِ خروج کے علاوہ بھی خروج کی کوشش کی ہے، تو اس میں بھی کوئی اشکال نہیں۔ کیوں کہ آیت کریمہ ''وما استطاعوا له نقبا'' میں مذکور نقب سے، مراد ایسا نقب ہے، جس سے وہ سد سے باہر نکل سکیں (پس دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے)[کما ذکرہ ابن کثیر] میری رائے ہے کہ اگر قارئین کے ایمان ویقین میں وسعت ہے، تو پھر مذکورہ بالا تاویل تسلیم کرنے میں کوئی تنگی نہیں نہ ہونی چاہیے۔

حاصل یہ کہ سد ٹوٹ گئی ہو، یا نہ ٹوٹی ہو، لیکن اس زمانے میں، متمدن آبادی کی جانب آمد ورفت سے ان کے لیے اب کوئی مانع نہیں ہے۔ بایں طور کہ پہاڑوں سے ہو کر، یا اس سد کے پیچھے سے، دور دراز کے راستوں کو طے کر کے، یا جہازوں اور سواریوں پر سوار ہو کر خروج کریں (اور متمدن آبادی میں آجائیں)

واضح رہے کہ ان کا خروج مخصوص (جو کہ نزول عیسی کے وقت ہوگا) اس سد کے ٹوٹنے سے وابستہ نہیں ہے اور ہو بھی کیسے سکتا ہے، جب ایک طویل عرصے تک وہ سد کھلی ہوئی تھی، (بایں طور کہ وہ بنی ہی نہ تھی) نیز وہ سد جسے ناظرین نے سد ذوالقرنین قرار دیا ہے، اس کے صرف نقوش اور کھنڈرات رہ گئے ہیں، پھر بھی اس سد سے ان کا خروج وابستہ نہ ہوا، تو اگر مزید ایک اور عرصہ بھی ایسا ہی رہے، تو کیا محال ہے۔ (پس اگر دیوار ٹوٹ بھی گئی ہے، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ) ہمارے اس دور میں ان کا خروج مخصوص ہو چکا ہے اور اب ہمیں (ان سے حفاظت کے لیے) حضرت عیسیٰؑ کو تلاش کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اگر سد کے ٹوٹنے، یا یاجوج وماجوج کے نکلنے کے بعد، ایک طویل زمانے تک حضرت عیسیٰؑ سے نزول میں تاخیر ہوئی ہے (یعنی ابھی تک حضرت عیسیٰؑ کا نزول نہ ہوا، حالاں کہ دیوار بہت پہلے ٹوٹ چکی اور خروج یاجوج وماجوج ہو چکا جیسا کہ بعض کا خیال ہے) تو مزید ایک عرصہ تک اگر تاخیر ہو جائے، تو کیا مضائقہ ہے۔ اگرچہ اس دیوار میں اتنا شگاف نہ ہوا ہو، جو دونوں پہاڑوں کے درمیان ہے، نیز اس کی لمبائی بھی اتنی کم ہے کہ جس کا پوشیدہ رہنا مستبعد نہیں، جیسا کہ ''روح المعانی'' میں آیت کریمہ ''حَتّٰٓی اِذَا بَلَغَ بَیْنَ السَّدَّیْنِ'' کے ضمن میں ہے۔ ''سُد'' سین کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ، ''سُد'' سین کے ضمہ کے ساتھ، اسم ہے اور ''سَد'' سین کے فتحہ کے ساتھ مصدر ہے۔ ابن ابی اسحاق فرماتے ہیں کہ ''سُد'' ضمہ کے ساتھ، اس دیوار کو کہتے ہیں جو نظر آئے اور ''سَد'' فتحہ کے ساتھ، وہ دیوار جو نظر نہ آئے۔ نیز صاحب ''البحر المحیط'' نے بھی یہی لکھا ہے۔

اب بات یہ ہے کہ انتظار ہو رہا ہے اور اس کا تعلق ایمان سے ہے، لہٰذا انتظار کرنا چاہیے۔ کیوں کہ

اگر وہ کسی دوسرے راستے سے نکل چکے ہیں، مگر ان کا خروج دیوار سے معروف انداز پر نہیں ہوا (تو یہ خروج مراد نہیں، اس لیے کہ علامات قیامت میں سے تو وہ خروج ہے جو معروف طریقے پر، دیوار میں راستہ بنا کر ہوگا) ہاں! وہ دیوار ٹوٹ پھوٹ گئی ہو، یا باقی ہو، مگر اس ملحدِ قادیان نے دجل وفریب کی جو عمارت کھڑی کی تھی، وہ ضرور مسمار ہوگئی۔ علاوہ ازیں اہل یورپ کا یاجوج وماجوج میں سے ہونا، یا نہ ہونا، بھی اس ملحد کے حق میں مفید نہیں، کیوں کہ اگر چہ ان کا خروج ہوا، لیکن سد سے نہیں ہوا اور کیسے ہوسکتا ہے؟ جب کہ وہ ملحد خود بھی، اپنی تحقیق کے مطابق، ماجوج کی اولاد سے ہے، کیوں کہ وہ مغلوں میں سے ہے (اور مغل ماجوج سے ہیں) ان سارے دلائل کے ساتھ اہل جغرافیہ کا یہ اعتراف بھی (پیش نظر رہے) کہ اب تک بعض پہاڑوں، جنگلوں اور دریاؤں کا حال ان پر منکشف نہیں ہوا (تو کیا بعید کہ سد ذوالقرنین کا علم بھی نہ ہوسکا ہو۔ عدم علم سے وجود کی نفی کہاں لازم آتی ہے)۔

پھر جب انگریز اہل جرمن میں سے ہیں، جو ماجوج کے بھائی جومر کی اولاد ہیں، تو انگریز ماجوج کی نسل سے نہ ہوئے (کہ اس قادیانی کا مدعا ثابت ہوسکے) نیز جرمنیوں کے بارے میں، اس نے جو یہ کہا ہے کہ ان کا خروج ''کوہ قاف'' اور ''اورالی'' سے ہوا ہے، یہ بھی غلط ہے۔ کیوں کہ ''جبل اورال'' مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوا، ایک طویل سلسلہ ہے اور ماجوج کی نسل کے لوگ، یا وہ لوگ جن پر سد تعمیر ہے وہ مشرق میں ہیں۔ ''دائرۃ المعارف'' میں ہے کہ ''جوج، ''جومر'' سے ہے، جو ''سکیشین'' کا بادشاہ تھا۔ اس صورت میں یاجوج، ماجوج کے بھائی ہوتے ہیں۔ یہودیوں کا بھی یہی خیال ہے، [کمافی ''لقطة العجلان''] لہٰذا قیاس آرائیاں کرنے والوں کی باتوں سے دور رہنا چاہئے۔ ''سکیشین'' کا مذہب میتھالوجی تھا [یعنی علم الاصنام اور من گھڑت باتیں]، اس لیے وہ بنی اسرائیل سے نہیں ہوسکتا۔ نیز وہ جوج جو حضرت یعقوبؑ (بنی اسرائیل) کی اولاد سے ہے، ایک دوسرا شخص ہے، جب کہ وہ جوج جس کو ''کتاب حزقیل'' میں ماجوج کے ساتھ شمار کیا گیا ہے، حضرت یعقوبؑ (بنی اسرائیل) کی اولاد سے نہیں ہے، بلکہ وہ تو بنی اسرائیل کا مخالف اور دشمن ہے اور اگر یہ بات مان لی جائے کہ جوج روس کا حاکم تھا (تو پھر یہ بات بھی ماننی پڑے گی کہ) جن پر دیوار تعمیر ہوئی ہے، وہ یہ جوج نہیں ہیں، بلکہ انہیں کے کچھ افراد ہیں۔ علاوہ ازیں کتاب حزقیل سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جوج کا مسکن قریب ہے اور ماجوج کا بعید۔ نیز جب اریانہ، یورپین کی اصل ہے، تو اہل یورپ ماجوج سے کیسے ہوسکتے ہیں، ورنہ تو ہنود (اہل ہند) بھی ماجوج سے ہوجائیں گے۔ الا یہ کہا جائے کہ ان کے القاب بدل گئے، کیوں کہ اہل یورپ میں یہ بھی ہوتا رہتا ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے ''فتح الباری'' (۴۷۴/۱۱) میں حدیث رسول:

"أبشروا فإن یاجوج وماجوج الفا ومنکم رجل......الخ" (بخاری: ۹۶۷/۲)

''تمہیں خوشخبری ہو! ایک ہزار (مراد ایک کم ایک ہزار، یعنی نوسوننانوے۔ یاجوج وماجوج کی قوم سے ہوں گے (جو جہنم میں جائے گا اور ان کے مقابلے میں) تم میں سے ایک ہوگا۔ (جو جنت میں جائے گا)۔

کی تشریح میں امام قرطبی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''من یاجوج وماجوج الف'' سے یاجوج وماجوج کے قبیلے کے لوگ اور دوسرے انسانوں میں سے وہ لوگ جو انہی کی طرح شرک میں مبتلا ہیں، دونوں مراد ہیں اور ''منکم رجل'' سے آپ ﷺ کے اصحاب اور وہ لوگ جو ان کے نقش قدم پر ہیں (یعنی اہل ایمان) مراد ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہی روایت مستدرک حاکم میں، حضرت عمران بن حصین سے ان الفاظ کی زیادتی کے ساتھ مروی ہے:

"وأبشروافوالذی نفس محمد بیده انکم مع خلیقتین ماکانتا مع شئی الا کثرتاه ،یاجوج وماجوج ومن هلک من بنی آدم وبنی ابلیس "(مستدرک حاکم ، کتاب الاهوال : ج:۴،ص: ۶۱۱، رقم:۸۶۹۵)

''تمھیں خوشخبری ہو، اس ذات کی قسم، جس کے قبضۂ قدرت میں محمد کی جان ہے، تم لوگ دو ایسی مخلوقوں کے ساتھ ہو کہ وہ جس چیز میں بھی تمھارے ساتھ شامل ہو جائیں، تم سے بڑھ جائیں گے، ان میں سے ایک تو یاجوج و ماجوج، اور دوسرے بنی آدم و بنی ابلیس کے مشرکین''۔

یہ حدیث ''فتح الباری'' والی روایت کی تفسیر وتشریح کے درجے میں ہے۔ مگر ''فتح الباری'' میں بخاری کی مذکورہ حدیث کی تشریح میں، اس سے مدد نہیں لی گئی۔ حالاں کہ امام حاکم نے اس حدیث کی تصحیح فرمائی ہے اور امام ذہبی نے ان کی تائید کی ہے۔ نیز امام ترمذی ونسائی نے بھی کتاب التفسیر میں، اس کی تخریج کی ہے۔

واضح رہے کہ میں نے ان آیات کی تفسیر میں جو کچھ کہا، وہ قرآن کریم میں تاویل نہیں ہے۔ بلکہ قرآن کریم کے کسی لفظ پر اس کو اپنے موضوع سے نکالے بغیر، تاریخ اور تجربہ کے پیش نظر مزید اظہار خیال ہے۔ اس لئے کسی قسم کے اعتراض کی گنجائش نہیں۔ مثلاً تاریخ نے جب یہ بیان کر دیا کہ سد سے نکلنے والی بعض قومیں، یاجوج وماجوج کی نسل سے ہیں، تو ہم نے کہا کہ اگر یہ بات ثابت بھی ہو جائے (تو کوئی نقض وارد نہیں ہوتا) اس لئے کہ قرآن نے یہ تو نہیں بیان کیا ہے کہ سد ان کی تمام نسل پر بنائی گئی ہے اور یہ کہ ان کے ہر چہار جانب بنائی گئی ہے (جس کی وجہ سے وہ کسی بھی طرح، اس دیوار کے باہر نہیں آسکتے) اس لئے مذکورہ

خروج کرنے والے اگر یاجوج وماجوج کی نسل سے ہیں، تب بھی قرآن میں وہ مراد نہیں ہیں اور اگر یہ ثابت ہوجائے کہ دیوار ٹوٹ گئی ہے، یا یاجوج وماجوج کا خروج، دوسری جانب سے ہوگیا ہے، تو پھر یہ کہا جائے گا کہ ان میں کے بعض کا، بعض سے گتھم گتھا ہونا تجدد اور استمرار کے ساتھ ہوتا رہے گا، تا آں کہ حضرت عیسیٰؑ کا نزول ہوجائے، تو وہ لوگ اپنے ملک سے ٹوٹی ہوئی آہنی دیوار کے راستے سے خروج کریں گے اور زمین میں فساد مچائیں گے، پھر حضرت عیسیٰؑ کی دعا سے، اللہ تعالیٰ ان سب کو ہلاک کردے گا۔ علاوہ ازیں قرآن کی مراد، یہ خروج کیسے ہوسکتا ہے، جب کہ ارشاد باری ہے:

"وَحَرَامٌ عَلٰی قَرْیَةٍ اَهْلَكْنٰهَا اَنَّهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ○ حَتّٰۤی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ"۔ (الانبیاء: ۹۵، ۹۶)

"اور مقرر ہوچکا ہر بستی پر، جس کو غارت کردیا ہم نے، کہ وہ پھر کر نہیں آئیں گے۔ یہاں تک کہ جب کھول دیئے جائیں یاجوج وماجوج اور وہ ہر اونچان سے پھسلتے چلے آئیں"۔

یعنی جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں، اس کے علاوہ ممکن نہیں اور وہ یہ ہے کہ وہ دوبارہ دنیا میں واپس نہیں آسکتے۔ جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد باری ہے:

"اَلَمْ یَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَیْهِمْ لَا یَرْجِعُوْنَ" (یٰس: ۳۱)

"کیا نہیں دیکھتے کتنی غارت کرچکے ہم ان سے پہلے جماعتیں، کہ وہ ان کے پاس پھر کر نہیں آئیں گی"۔

اس نفی (لَا یَرْجِعُوْنَ) کے تحت روافض کی رجعت اور اس ملحد قادیانی کا بروز، بھی داخل ہے، کیوں کہ اس نے خود کہا ہے کہ یہ پہلے کا رجوع ہے۔

بعض کی رائے یہ ہے کہ دوبارہ واپسی ہوگی، جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں احادیث مرفوعہ وارد ہوئی ہیں، نیز حضرت عیسیٰؑ کی بابت حدیث کے یہ الفاظ بھی مذکور ہوچکے: "انه راجع الیکم قبل یوم القیمٰة" تو اگر یہی کسی کے رجوع کی حقیقت ہے، جیسا کہ اس قادیانی نے افترا کرتے ہوئے کہا ہے کہ کتب سماویہ کی اصطلاح یہی ہے۔ تو آیت کریمہ ("وَحَرَامٌ عَلٰی قَرْیَةٍ") نے اسے حرام (یعنی محال) قرار دیا ہے اور اس سلسلے میں اعتبار اسی کا ہے، جسے اہل عرف رجوع کہتے ہیں، نہ کہ کسی اور کا۔ اسی طرح مثیل مسیح کی آمد اگر ابتداءً ہے، تو یہ رجوع اول نہیں اور اگر کہا جائے کہ رجوع اول یہی ہے، تو آیت کریمہ اس کو شامل ہے، لیکن پھر جو یہ کہا گیا ہے کہ "وَحَرَامٌ عَلٰی قَرْیَةٍ" کا مطلب یہ ہے کہ آخرت سے پہلے ہمارے پاس ان کی واپسی نہیں ہوسکتی، ہاں آخرت میں ہمارے پاس آنا ضروری ہے۔ یہ بات ظاہر نہیں ہوتی۔

کیوں کہ اگر یہی مراد ہوتا، تو سیاق آیت میں پہلے ''اہلاک'' کا ذکر نہ کرتے، بلکہ ان کی واپسی کا ذکر کرتے، ورنہ تو اس پر قسم اور دوبارہ نہ آنے کی حرمت کا ذکر، مثل استدراک یعنی تلافی مافات ہو جائے گا۔

حدیث میں آیا ہے کہ غزوہ احد میں جب حضرت عبداللہ بن حرام شہید ہوئے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ دوبارہ دنیا میں واپس بھیج دیں، تاکہ پھر تیری راہ میں شہید ہوں، تو جواب میں اسی آیت مذکورہ کا مضمون پیش کیا گیا۔ اس حدیث کی تخریج امام ترمذی نے کی ہے اور ''حسن'' قرار دیا ہے۔(۱) پس جب مرنے کے بعد دوبارہ دنیا میں واپسی نہیں ہوسکتی، تو پھر عقیدۂ تناسخ یعنی ابدان میں روحوں کے منتقل ہونے کا عقیدہ بھی باطل ہے۔ اس لیے قیامت کا آنا ضروری ہوا، تاکہ ہر شخص کو اس کے عمل کا بدلہ دیا جائے۔

علامات قیامت میں سے خروج یاجوج وماجوج بھی ہے، لہٰذا اقرب قیامت میں ان کا خروج ہوگا۔ نیز انہی علامات میں سے یاجوج وماجوج کے خروج سے پہلے، حضرت عیسیٰؑ کا نزول بھی ہے، جیسا کہ صریح احادیث متواترہ اس پر دال ہیں (اور جو لوگ اس کے منکر ہیں، ان کے لیے یہ ارشاد باری کافی ہے)

''اِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيْداً وَّنَرَاهُ قَرِيْبًا''(المعارج :۶،۷)

''وہ دیکھتے ہیں اس کو دور اور ہم دیکھتے ہیں اس کو نزدیک''۔

(یعنی ان کے خیال میں قیامت کا آنا بعید از امکان اور دور از عقل ہے اور ہم کو اس قدر قریب نظر آ رہی ہے کہ گویا آ ہی گئی)

---

(۱) حدیث یہ ہے: قال جابر بن عبد الله لقینی رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال لی یا جابر مالی اراک منکسراً؟ قلت یا رسول الله استشهد ابی و ترک عیالاً و دیناً، قال: الا ابشرک بما لقی الله به اباک قال: بلی یا رسول الله، قال ما کلم الله احداً قط الا مّن وراء حجاب، واحیی اباک فکلمه کفاحاً وقال یاعبدی تمنّ علیّ اعطیک، قال: یارب تحیینی فاقتل فیک ثانیةً، قال الرب تبارک و تعالیٰ انه قد سبق فی "اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ" قال: وانزلت هذه الآية: "وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتاً" الآية. وقال الترمذی: هذا حدیث حسن غریب (۱۳۰/۲)

حضرت جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ مجھ سے ملے اور فرمایا جابر کیا بات ہے میں تمہیں افسردہ دیکھ رہا ہوں۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے والد اپنے پیچھے اہل وعیال اور قرض چھوڑ کر شہید ہو گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا میں تم کو اس بات کی خوش خبری نہ دے دوں، جس طرح اللہ تعالیٰ تمہارے والد سے ملے (اور ان پر اپنا فضل واحسان کیا) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ضرور بیان فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے کبھی کسی سے بلا حجاب گفتگو نہیں کیا۔ مگر تمہارے والد کو زندہ کر کے آمنے سامنے بلا حجاب گفتگو کی اور فرمایا تیری جو تمنا ہو مجھ سے مانگ میں دوں گا۔ تمہارے والد نے عرض کیا اے پروردگار تو مجھے دوبارہ زندگی عطا کر، تاکہ پھر دوبارہ تیرے راستے میں قتل کیا جاؤں۔ اس پر باری تعالیٰ نے فرمایا کہ میری طرف سے پہلے ہی یہ بات فیصل ہو چکی ہے ''اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ'' کہ دنیا میں دوبارہ لوٹنا نہیں ہے۔ حضرت جابر کہتے ہیں کہ پھر یہ آیت نازل ہوئی ''وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ...الآیۃ'' (جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ہرگز ان کو مردہ نہ سمجھو) محمد صغیر۔

یہ بھی واضح رہے کہ قرآن کریم کا موضوع تاریخ اور تمام واقعات کا احاطہ نہیں ہے، اس لیے جو شخص تاریخ پر قیاس کر کے اس میں اضافہ کرے، تو گویا وہ اس سے خارج بھی ہے اور ملی ہوئی بھی۔ ہاں اس پر تاریخ کا اضافہ وہ شخص نہیں کرسکتا، جس کے حواس سلیم ہوں اور دماغ حاضر ہو(۱)۔

(۱) جانشین حضرت علامہ کشمیریؒ، محدث جلیل حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب مسعودی دامت برکاتہم نے "نقش دوام" (سوانح حیات حضرت مؤلف "علامہ کشمیری) میں ذوالقرنین اور یاجوج و ماجوج سے متعلق مذکورہ بحث کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ فصل کے خلاصہ کے طور پر ہم اسے یہاں ذکر رہے ہیں۔

حضرت مرتب سوانح لکھتے ہیں: "عقیدۃ الاسلام" میں ذوالقرنین اور یاجوج و ماجوج...... پر طویل عالمانہ بحث کا یہ ایک طالب علمانہ خلاصہ ہے، جسے آپ کے سامنے پیش کیا جارہا ہے:

صاحب سوانح حضرت شاہ صاحبؒ نے ذوالقرنین پر اصلاتو نہیں، لیکن اپنی تصنیف "عقیدۃ الاسلام" میں ذیلاً گفتگو کی ہے۔ آپ کی رائے یہ ہے کہ ذوالقرنین اہل مشرق میں سے نہیں تھا اور نہ فغفور چین ہی تھا، جس نے چین میں بارہ سومیل ۱۲۰۰/لمبا بند تعمیر کرایا ہے اور جسے پہاڑوں اور دریاؤں پر سے گزارا گیا ہے۔ اس کے مشرقی نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اگر وہ مشرقی باشندہ ہوتا، تو اس کے سفر بہ جانب مغرب کے بعد، مراجعت بسوئے مشرق کی قرآن اطلاع دیتا ہے، حالاں کہ قرآن نے اس طرح کی کوئی اطلاع نہیں دی۔ قرآن کی بیان کردہ تفصیل سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ مشرق و مغرب کے مابین کسی علاقہ کا باشندہ ہے۔ اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ وہ اسکندر بن فیلقوس تھا، کیوں کہ یہ اسکندر کافر ہے حالاں کہ قرآنی تصریحات بتاتی ہیں کہ ذوالقرنین ایک مؤمن وصالح مزاج، بادشاہ عدل پرور تھا۔ پھر ذوالقرنین کو وزرائے یمن سے قرار دینا صحیح نہیں ہے اور عجمی بادشاہی سلسلہ میں اسے داخل کر کے "کیقباذ" کہنا بھی درست نہ ہوگا۔ صاحب ناسخ کی تحقیق کے مطابق وہ سام اول میں سے ہے، جس کا سلسلۂ نسب عربوں تک منتہی ہوتا ہے، اسی مصنف نے سد ذوالقرنین کی بنائے تعمیر ۳۴۶۰ ہبوط آدم سے قرار دی ہے۔ آپ کی رائے میں ذوالقرنین کا تعلق عاد اولیٰ سے ہے۔ روم اور یونان سے متعلق نہیں۔ یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ گورش (کے خسرو) "کیقباذ" نہیں ہے، بلکہ وہ بادشاہ بابل کے دوسرے طبقہ میں ہے۔ مرحوم نے ذوالقرنین کی وجہ تسمیہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول قول کو ترجیح دی ہے، جسے حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنی مشہور شرح بخاری "فتح الباری" میں راجح قرار دیا ہے۔ یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ حضرت علیؓ کے قول کی صحیح شرح "شرح قاموس" (تاج العروس) میں موجود ہے۔

پھر تحریر فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں ذوالقرنین کے تین سفر ذکر کیے گئے ہیں:

پہلا بہ جانب مغرب، دوسرا مشرقی علاقے میں، لیکن قرآن تیسرے سفر کی جہت متعین نہیں کرتا۔

اس تیسرے سفر کو جنوب کی طرف بتانے کا کوئی قرینہ بھی نہیں ہے۔ اس سے یہی سمجھا جائے گا کہ تیسرا سفر شمال کی جانب میں ہے اور یہیں وہ سد ذوالقرنین جبل قوقاف میں متعین ہوگی، جس کا اس وقت نام "طائی" ہے، حزقیلؑ کے صحیفہ میں جس "الجربیا" کا تذکرہ ہے، وہ دوسری چیز ہے، صاحب "روح المعانی" نے اس کی تصریح کی ہے، "جربیا" کے لغوی معنی "وہ ہوائیں جو مشرق و شمال سے چلتی ہیں" ہے۔ چین کے بادشاہوں نے بھی ذوالقرنین ہی کے مقاصد کے تحت ایک دیوار تعمیر کی ہے، جس کا مغل سیاح نے تذکرہ کیا ہے اور ترکوں نے اس کا نام "بوقور" ذکر کیا ہے۔ مصنف "ناسخ" نے اس طویل ترین دیوار کی تاریخ تعمیر (ہبوط آدم سے) ۴۳۸۱ سال (بعد) بتائی ہے۔ باب الابواب پر بھی بعض عجمی بادشاہوں کی ایسی ہی تعمیر کردہ دیوار موجود ہے، بلکہ اور بھی طویل ترین دیواریں موجود ہیں اور وہ سب شمال میں ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے یہ بھی وضاحت فرمائی ہے کہ ذوالقرنین نے جو دیوار تعمیر کی تھی، اس کا تعلق کلی یاجوج و ماجوج سے نہیں تھا، بلکہ یاجوج و ماجوج کے صرف ایک ہی گروہ کے قزاقانہ حملوں سے تحفظ کے لیے یہ دیوار تعمیر کی گئی تھی۔ ممکن ہے کہ یاجوج و ماجوج کے کچھ گروہ دوسرے اطراف و جوانب میں بھی اس طرح کی غارت گری کرتے ہوں اور یہ دوسری دیواریں جو دنیا میں موجود ہیں، ان ہی کی حفاظت کے لیے تعمیر کی گئی ہوں، اس لیے شاہ صاحبؒ کا خیال ہے کہ وہ دیوار جس کے دیکھنے کا تذکرہ "فتح الباری" میں ایک صحابی سے متعلق موجود ہے، جسے سیوطی نے

آخری بحث

ارشادِ باری "مَا کَانَ مُحَمَّدٌ..." پر شبہ اور اس کا جواب

اس بد بخت کے بعض پیروکاروں کا کہنا ہے کہ ارشادِ باری:

"مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلٰكِن رَّسُولَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّنَ" (الاحزاب: ۴۰)

"محمد باپ نہیں کسی کا تمہارے مردوں میں سے، لیکن رسول ہے اللہ کا اور مہر سب نبیوں پر"۔

"درمنثور" میں اور دمیری نے "حیاۃ الحیوان" میں ذکر کیا ہے۔ وہ سد ذوالقرنین نہیں ہے، بلکہ ان ہی بنائی ہوئی دیواروں میں سے کوئی دیوار ہے، جسے ان صحابی کو دیکھنے کا موقع ملا۔

اس بحث کے آخر میں حضرت مرحوم یہ بھی فرماتے ہیں کہ میں نے جو کچھ ذوالقرنین کے متعلق لکھا ہے، وہ قرآن میں تاویل نہیں، بلکہ تاریخی حقائق و تجربات کی روشنی میں، قرآن کے کسی لفظ کو، اس کی حقیقی مراد سے ہٹائے بغیر، گزارشات ہیں۔ مرحوم نے ذوالقرنین سے متعلق اس کے نبی یا فرشتہ ہونے کی رائے کو قطعاً غلط قرار دیا ہے۔ (نقش دوام، ص: ۲۷۴ تا ص: ۲۷۶)

مزید آگے تحریر فرماتے ہیں:

علامہ مرحوم کی ذکر کردہ تصریحات کو ذیل کی وضاحتوں میں دیکھئے:

۱- یاجوج وماجوج کیا گاگ و میگاگ کا معرب ہے؟ اس کا کوئی قرینہ نہیں اور اسی طرح روسی اقوام کو یاجوج کی نسل سے قرار دینا اور برطانوی قوم کو ماجوج کے سلسلۂ نسب میں داخل کرنا، جیسا کہ عام مؤرخین کے یہاں مشہور ہے، مستند نہیں ہے، کیوں کہ وہ احادیث جن میں یاجوج وماجوج کے احوال و صفات بیان کیے گئے ہیں، ان اقوام پر کلیۃً منطبق نہیں ہیں۔ بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ یاجوج وماجوج "کاس میکاس" یا "چین ماچین" یا پھر "منگولیا و منچوریا" کا ہرگز معرب نہیں ہے، بلکہ یہ شمال و مشرق کے اقوام میں سے دو قومیں ہیں۔

۲- احادیث یا قرآن میں ان کے جس ہلاکت انگیز خروج کی اطلاع ہے، وہ آخری خروج ہوگا اور یہی علامات قیامت میں سے ہے۔

۳- یاجوج وماجوج مسلسل دنیا کو پریشان کرتے رہیں گے، آبادیوں کو تہہ و بالا کرتے رہیں گے، اقوام عالم ان کی ہلاکتوں سے تباہ ہوتی رہیں گی، وہ ملکی سیاست میں کسی سلیقہ و قرینہ یا تہذیب و تمدن کے اصول و قوانین پر عمل نہیں کریں گے، بلکہ ان کی کارروائیاں جابرانہ و قاہرانہ نوعیت کی ہوں گی۔

۴- دیوار ہر جانب سے ان کو گھیرے ہوئے نہیں ہے اور نہ وہ سب کے سب محصور ہیں، بلکہ صرف ایک گروہ مقید کیا گیا ہے۔ اس لیے اگر دیوار ٹوٹ گئی اور وہ باہر نکل آئے، یا دیوار سے ہٹ کر کسی دوسری جانب میں، راہِ خروج ڈھونڈ نکالی، تو وہ قرآنی بیانات کے خلاف نہ ہوگا، چوں کہ قرآن میں یہ خروج مراد نہیں ہے، حضرت عیسیٰ کے عہد میں جس خروج کی اطلاع دی گئی ہے، وہ یاجوج وماجوج کے مخصوص گروہ کا ہوگا۔ (نقش دوام، ص: ۲۷۸، ص: ۲۷۹)

میں حضور ﷺ پر ''خاتم النبیین'' کا اطلاق ایسا ہی ہے، جیسا کہ ہمارے محاورے میں بطور مجاز کسی بڑے عالم، محقق ومحدث کو ''خاتم المحققین''، ''خاتم المحدثین''، ''خاتم الحفاظ'' کہہ دیتے ہیں۔ (پس جس طرح ان الفاظ کا اطلاق، ہمارے محاورے میں بہ طور مجاز ہے، ان الفاظ سے کوئی یہ نہیں سمجھتا کہ فلاں عالم آخری محقق ومحدث ہے، اس کے بعد کوئی محقق ومحدث پیدا نہیں ہوسکتا، اسی طرح حضور ﷺ پر ''خاتم النبیین'' کا اطلاق بھی بہ طور مجاز ہے۔ اس سے یہ مفہوم نہیں نکالا جاسکتا ہے کہ حضور ﷺ آخری نبی ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا)۔

یہ ان قادیانیوں کی بد قسمتی ومحرومی ہے کہ ان جیسے الفاظ کے محل استعمال اور آیت کریمہ کے محلِ استعمال کے فرق کو نہ سمجھ سکے۔ ان کی کتنی بڑی بد دینی وگمراہی ہے کہ آیاتِ محکمات کو چھوڑ کر متشابہات میں لگ گیے۔ اسی چیز نے دنیا کے ہر ملحد کو رسوا کیا۔ چناں چہ اگر آپ ان کی تحریرات کو دیکھیں تو اندازہ ہوگا، کہ کسی چیز سے بھی ان کا استدلال مقام ومحل کے مطابق نہیں ہوتا ہے۔

مندرجہ ذیل چند وجوہ سے ان کا یہ استدلال باطل اور ان کی جہالت ورسوائی ظاہر ہے۔

۱- لوگوں کا جملہ ایک عام محاورہ ہوتا ہے، جسے مقامِ خطابی، نیز مدح ومبالغہ اور تساہل ومسامحت کے موقعہ پر استعمال کرتے ہیں، اس کا مفہوم ناقص علم جزئی ہوا کرتا ہے، جس کی بنیاد وقتی احساس ہوتا ہے، نیز اس میں تمام جہات اور صورتوں کی رعایت نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کا مدار، تحقیق وعقیدہ پر ہوتا ہے۔ (بلکہ متکلم موصوف کی کسی صفت سے متاثر ہوکر، اپنے علم ناقص کی بنیاد پر، یہ خیال کر بیٹھتا ہے کہ ان صفات کا حامل اب کوئی نہیں ہے اور شاید ہو بھی نہ سکے، لہذا لفظ ''خاتم'' کا اطلاق اس پر کر دیتا ہے۔ جسے فقط مجاز پر محمول کیا جائے گا، حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں) اس کے بر خلاف باری تعالی کا کلام، تحقیق کے اعلی معیار پر ہوتا ہے، (چوں کہ اس کو اس بات کا یقینی وقطعی علم حاصل ہے کہ ان اوصاف کا حامل شخص اب کوئی پیدا ہوگا، یا نہیں، اس لیے اگر وہ کسی پر اس لفظ کا اطلاق کرتا ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کا یہ کلام حقیقت ہی پر محمول ہوگا) حقیقت واقعیہ سے ایک حرف بھی متجاوز نہ ہوگا بالخصوص بیان عقائد کے مقام میں۔ علاوہ ازیں قرآن کریم کے وجوہ اعجاز میں ایک یہ بھی ہے کہ اس کے کسی ایک کلمہ کی جگہ، دوسرا کلمہ رکھنا ممکن نہیں ہے، کیوں کہ حقِ لفظ، حقیقتِ امر اور حقِ مقام سے باری تعالی سے زیادہ کون واقف ہوسکتا ہے۔

۲- عوامی محاورہ کا قائل خود تحقیق کا طالب نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایک وقتی واقعہ بیان کرتا ہے (اس سے زیادہ اس کے بس میں ہے بھی نہیں) کیوں کہ اس کے علم میں غیب کا احاطہ نہیں اور نہ ہی وہ مستقبل کے پردے میں پوشیدہ حالات کا علم رکھتا ہے کہ دوام واستقبال کی رعایت کر کے کوئی لفظ استعمال کرے۔ بر عکس اس کے،

باری تعالیٰ کے کلام کا منشاء علم کلی ہے، جو تمام جہات کو حاوی ہے۔

۳۔ اس جیسا عمومی محاورہ ہر شخص سیاقِ کلام کے مطابق، اپنے ظن وتخمین کے اعتبار سے بولتا ہے۔ پس اگر اطلاق باری ''خاتم الانبیاء'' اسی عمومی محاورہ ''خاتم المحدثین والفقہاء'' کی طرح ہے، تو ''مقدام الانبیاء'' کہنا چاہیے تھا، نہ کہ ''خاتم الانبیاء''۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہ تو آیت کا باطنی مفہوم ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا اعتبار ظاہر سے فراغت کے بعد ہی جائز ہے۔ بطن، ظہر کے نیچے اور بعد میں ہی ہوتا ہے۔ پس آیت کا ظاہری مفہوم ختم زمانی ہے، جس کا ترک جائز نہیں، کیوں کہ عربیت کے اعتبار سے آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ''تمہارے مردوں میں، کسی کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا باپ ہونا منتفی ہو گیا اور اس کی جگہ نبوت وختم نبوت نے لے لی''۔ تو جس طرح ابوت بالکل منتفی ہو گئی، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دروازہ بھی بالکل بند ہو گیا۔ ختم نبوت کے یہ معنی کہ جو چیز عرضیات سے وابستہ ہے، وہ ذاتیات کے درجے تک پہنچ جائے، اس آیت کا ظاہری مفہوم نہیں ہو سکتا، کیوں کہ اس معنی سے اہل معقولات اور فلاسفر حضرات ہی آشنا ہیں، جب کہ قرآن کریم کا نزول لغتِ عرب کے عرف میں ہوا ہے، نہ کہ ذہنیات خارجیہ کے مطابق۔ الحاصل جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے مردوں میں، کسی کے لیے باپ ہونے کی ہمیشہ کے لیے مطلقاً نفی ہو گئی اور اس کی جگہ ختم نبوت نے لے لی، تو نبوت بھی اسی طرح ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ صحیح طور پر غور کرنے سے آیت کا یہی مفہوم نکلتا ہے۔ صاحب ''اکلیل'' فرماتے ہیں:

''استدل به على منع ان يقال له : ابو المؤ منين ،وهو احد ى الو جهين عندنا.''

''اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا گیا ہے کہ آپ کو ابوالمؤمنین کہنا صحیح نہیں ہے۔ میرے نزدیک دو توجیہوں میں سے ایک یہ ہے''۔

کنز العمال (۱۴/۶۳۳، رقم: ۳۹۷۵۴) میں بہ حوالہ ابوداؤد طیالسی واحمد، شفاعت کبریٰ کی بابت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک طویل حدیث مذکور ہے (جس کے آخر میں ہے کہ تمام لوگ جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے پاس جا کر کہیں گے، اے روح اللہ! آپ ہماری شفاعت فرمائیں کہ حساب ہو جائے، تو آپ علیہ السلام فرمائیں گے:

''انى لست هناكم انى اتخذت وامى الهين من دون الله) ولكن ارئيتم لو ان متاعا فى وعاء قدختم عليه أ كان يوصل الى ما فى الوعاء حتى يفض الخاتم(فيقولون لا ، فيقول فان

محمداً صلی اللہ علیه وسلم قد حضر الیوم وقد غفر له ما تقدم من ذنبه وما تاخر)" (۱)

''میں یہ کام نہیں کرسکتا، کیوں کہ دنیا میں میری اور میری والدہ کی پرستش کی گئی ہے۔ لیکن کیا تم جانتے ہو کہ اگر کسی برتن کو بند کر کے اسپر مہر لگادی جائے، تو کیا اس برتن کی چیز کو اس وقت تک لے سکتے ہو، جب تک کہ اس کی مہر نہ توڑی جائے؟۔ لوگ کہیں گے: ایسا نہیں ہوسکتا۔ پھر عیسی (علیہ السلام) فرمائیں گے کہ پس محمد صلی اللہ علیہ وسلم (جو انبیاء کے خاتمہ پر بہ منزلہ مہر ہیں) آج موجود ہیں اور انکی اگلی وپچھلی لغزشیں معاف کردی گئی ہیں۔ تم ان کے پاس جاؤ''۔

مہر نبوت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت پر ہے، جو اشارہ ہے اس بات کا کہ سلسلۂ نبوت آپ پر ختم ہے (اور آپ خاتم الانبیاء، بہ معنی نبوت ختم کرنے والے ہیں) ''ہدایۃ الحیاری'' میں ہے کہ مہر نبوت ان بڑی علامات نبوت میں سے ہے، جن کی انبیاء کرام نے خبر دی ہے اور جو نبوت کی فائل بند ہونے کی علامت ہے۔

۴- اگر خاتم النّبیین کے معنی وہی ہیں، جو خاتم المحدثین وغیرہ کے ہیں، تو امت مرحومہ کے تعلق سے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ''خاتم الانبیاء'' کے لقب کی کوئی زیادہ خصوصیت باقی نہیں رہ جاتی، حالاں کہ سیاق آیت اس بات پر دلالت کررہا ہے کہ بجائے ابوت کے، امت کے تعلق سے، آپ کے لیے ''خاتم الانبیاء'' کا لقب بہ طور اختصاص ذکر کیا گیا ہے۔ اختصاص سے مراد یہ ہے کہ اس امت کا نبی آخری نبی ہے، نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق اس امت سے، نبوت بلکہ ختم نبوت کا ہے، نہ کہ ابوتِ (جسمانیہ) کا۔ غالبا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولادِ نرینہ کے زندہ نہ رکھے جانے میں بھی، اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ آپ کے بعد سلسلۂ نبوت ختم ہے، جیسا کہ بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی رائے ہے۔

۵- اس بنیاد پر (کہ خاتم النّبیین کا اطلاق آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بہ طور مجاز ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تشریعی نبی بھی آسکتا ہے، (جیسا کہ قادیانی کینز دیک غیر تشریعی آسکتا ہے) جب کہ یہ مردود بھی بار بار کہہ چکا ہے کہ آپ کے بعد کوئی تشریعی نبی نہیں آسکتا، اگر چہ بعض دفعہ اس کی نقیض بھی بول گیا کہ شریعت خود مجھ پر آتی ہے (یعنی ایک جانب تو یہ دعوی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی تشریعی نبی نہیں آئے گا اور دوسری جانب خود تشریعی نبی ہونے کا دعوی کرتا ہے)۔

(۱) کنز العمال کے الفاظ یہی ہیں۔ جب کہ مسند احمد ج ۱ ص ۲۹۶، میں یہ الفاظ ہیں ''انی لست هناكم قد اتخذت الٰها من دون الله وانه لا يهمني اليوم الا نفسي ثم قال ارء يتم لو كان متاع في وعاء قد ختم عليه اكان يقدر على ما في الوعاء حتى يفض الخاتم، فيقولون لا، فيقول ان محمدا صلى الله عليه وسلم خاتم الانبياء قد حضر اليوم ... الخ اس میں ''خاتم الانبیاء'' کی تصریح ہے۔ (ابو طہ محمد صغیر)

۶- پوری امت کا خاتمیت زمانی اور خاتمیتِ حقیقی پر اجماع ہے۔قرآن قطعی الثبوت اور اجماع قطعی الدلالۃ ہے، ایسے اجماع کا مخالف کافر گردانا جاتا ہے۔ارشاد باری ہے:

"وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ "
(البقرہ: ۸۷)

''اور بیشک دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور پے در پے بھیجے اس کے پیچھے رسول اور دیے ہم نے عیسیٰ مریم کے بیٹے کو معجزے صریح''۔

اس آیت میں حضرت موسیٰ کے بعد حضرت عیسیٰ تک پے در پے پیغمبروں کے بھیجنے کا تذکرہ ہے۔اس کے بعد سورہ مائدہ میں فرمایا:

" يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ۞ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ " (المائدہ : ۱۹)

''اے کتاب والو آیا ہے تمہارے پاس رسول ہمارا، کھولتا ہے تم پر، رسولوں کے انقطاع کے بعد، کبھی تم کہنے لگو کہ ہمارے پاس نہ آیا کوئی خوشی یا ڈر سنانے والا، سو آ چکا تمہارے پاس خوشی اور ڈر سنانے والا''۔

اس میں حضرت عیسیٰ اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین زمانۂ فترت کے واقع ہونے کی تصریح ہے۔ پھر سورہ صف میں فرمایا:

"وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ " (الصف :۶)

''جب کہا عیسیٰ مریم کے بیٹے نے اے بنی اسرائیل میں بھیجا ہوا آیا ہوں اللہ کا تمہارے پاس تصدیق کرنے والا اس کی جو مجھ سے آگے ہے توریت اور خوش خبری سنانے والا ایک رسول کی جو آئے گا میرے بعد اس کا نام ہے احمد''۔

یہاں حضرت عیسیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے، اس نام مبارک کے ساتھ، آنے کی بشارت دی، جو اس سے پہلے کسی کا نہ تھا (یعنی احمد) لوگوں نے یہ نام، آپ کے نام سے حاصل کیا۔اس کے برخلاف ''محمد'' نام بہت سے لوگوں نے نبی ہونے کی طمع میں رکھا تھا۔

اس موقع پر ''مرقات'' (شرح مشکوٰۃ)، باب اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' کا مطالعہ مناسب ہوگا، جس میں انھوں نے ''الوفاء'' کے حوالے سے ابن جوزی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

''ابن قتیبہ نے فرمایا کہ ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی بڑی علامتوں میں سے ایک

یہ بھی ہے کہ آپ سے پہلے کسی کا نام ''احمد'' نہیں رکھا گیا، اللہ رب العزت نے آپ کے اس نام مبارک کی حفاظت فرمائی، جیسا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے نام کی حفاظت فرمائی تھی کہ اس نام سے، آپ علیہ السلام سے پہلے کسی کو موسوم نہیں کیا گیا''۔ (چناں چہ ارشاد ربانی ہے:

''یٰزَکَرِیَّآ اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلٰمِ نِ اسْمُهٗ یَحْیٰی لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِیًّا '' (مریم : ۷)

''اے ذکریا ہم تجھ کو خوش خبری سناتے ہیں ایک لڑکے کی، جس کا نام ہے یحییٰ نہیں کیا ہم نے پہلے اس نام کا کوئی)''۔

''اس کی وجہ یہ ہے کہ کتب سابقہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے نام کو ذکر کیا، نیز انبیاء کرام نے اسی نام مبارک کے ساتھ آپ کی آمد کی بشارت دی، پس اگر اس نام میں اشتراک ہوتا، تو کتنے لوگ نبوت کا دعویٰ کر بیٹھتے اور نبی برحق کی بابت شبہ پیدا ہو جاتا۔ مگر جب آپ کا زمانہ قریب ہوا اور اہل کتاب نے اس بات کی بشارت دیدی کہ آپ کی آمد قریب ہے تو لوگ اپنے بچوں کا یہ نام رکھنے لگے'' (انتہی)

امام احمد بن حنبل حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اعطیت اربعا لم یعطهن احد من انبیا ء الله تعالی قبل، اعطیت مفاتیح الارض ، وسمیت احمد ، وجعلت امتی خیر الامم ، وجعل لی التراب طهورا''(مسند احمد: ج:۱،ص:۹۸،رقم:۷۶۳۔ج:۱،ص:۱۵۸،رقم:۱۳۶۱)

''مجھے چار ایسی چیزیں عطا ہوئی ہیں، جو کسی اور نبی کو نہیں دی گئیں: مجھے زمین کی کنجیاں دی گئیں۔ میرا نام احمد رکھا گیا۔ میری امت سب سے بہتر امت قرار دی گئی۔ مٹی ہمارے لیے (سبب) طہارت کر دی گئی''۔

غالباً ''احمد'' سے مراد صاحب حمد ہے، اس اعتبار سے یہ آپ کے نام ''محمد'' کو شامل ہو جائے گا۔
خواجہ عبد المطلب نے کیا خوب کہا ہے:

انت الذی سمیت فی القرآن ۞ فی کتب ثابتة المثانی
احمد مکتوب علی البیا ن

''آپ ہی کا نام ان کتابوں میں جو پختہ ہیں اور پڑھی جانے والی ہیں۔ واضح طور پر احمد لکھا ہوا ہے''۔

سہیلیؒ نے اس شعر کو ذکر کرنے کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ حمد کسی عمل سے فارغ ہونے کے وقت ہوتی ہے، جیسا کہ (اہل جنت کی بابت) ارشاد باری ہے:

'' وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ '' (یونس : ۱۰)

''اور خاتمہ ان کی دعا کا اس پر کہ سب خوبی اللہ کو، جو پروردگار سارے جہاں کا''۔

(مطلب یہ ہے کہ اہل جنت سے، جنت میں پہنچ کر، جب دنیوی تفکرات وکدورات کا خاتمہ ہوجائے گا اور محض ''سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ'' کہنے پر ہر چیز، حسب خواہش ملتی رہے گی، تو ان کی ہر دعا کا خاتمہ ''اَلْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' پر ہوگا) اور اگر افتتاح میں حمد کی رعایت کی جائے (تب بھی کوئی اعتراض نہیں ، بلکہ اچھا ہی ہے، اس لیے کہ) اللہ تعالیٰ نے اسے فاتح (ابتداء کرنے والا) اور خاتم (ختم کرنے والا) دونوں قرار دیا ہے، کما مر من الحدیث: ؎

صلی الالہ ومن یخف بعرشہ ❁ والطیبون علی المبارک احمد

''اللہ تعالیٰ، اس کے عرش کو گھیرنے والے (فرشتے) اور تمام پاکیزہ لوگ، احمد کی ذات مبارک پر درود بھیجتے ہیں''۔

سورہ بقرہ اور مائدہ کے بعد پھر سورہ احزاب میں ارشاد ہوتا ہے:

''مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ'' جس نے علی الترتیب مفہوم کے تمام اجزاء کا احاطہ کرلیا۔ رہا ارشاد باری:

''وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوْلاً'' (النحل : ۳۶)

''اور ہم نے بھیجے ہیں ہر امت میں رسول''۔

تو اس کا تعلق گذرے ہوئے زمانے سے ہے اور ''اُمَّۃٍ'' سے مراد قرن ہے جو کہ جانب طول میں ہوا کرتا ہے، نہ کہ قوم جو عرض کی جانب ہوتا ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

''ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْ م بَعْدِھِمْ قُرُوْنًا آخَرِیْنَ o مَاتَسْبِقُ مِنْ اُمَّۃٍ اَجَلَھَا وَمَا یَسْتَاْخِرُوْنَ o ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ط کُلَّمَا جَآءَ اُمَّۃً رَّسُوْلُھَا کَذَّبُوْہُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَھُمْ بَعْضًا وَّ جَعَلْنٰھُمْ اَحَادِیْثَ ج فَبُعْدًالِّقَوْمٍ لَّایُؤْمِنُوْنَ o ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی وَاَخَاہُ ھٰرُوْنَ بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ o'' (المؤمنون: ۴۲۔۴۵)

''پھر پیدا کیں ہم نے ان سے پیچھے جماعتیں اور، نہ آگے جائے کوئی قوم اپنے وعدہ سے اور نہ پیچھے رہے۔ پھر بھیجتے رہے ہم اپنے رسول لگاتار، جہاں پہنچا کسی امت کے پاس ان کا رسول اس کو جھٹلا دیا، پھر چلاتے گئے ہم ایک کے پیچھے دوسرے اور کر ڈالا ان کو کہانیاں، سو دور ہو جائیں جو لوگ نہیں مانتے۔ پھر بھیجا ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی ہارون کو''۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ تواتر وتسلسل، سلسلہ طول میں ہے اور امت سے مراد قرن ہی ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"انکم تتمون سبعین امة انتم خیرھا واکرمھا علی اللہ" (ترمذی: ۲/ ۱۲۹، تفسیر آل عمران)

"تم لوگ سترویں ۷۰ ویں امت (قرن) کو پوری کر رہے ہو اور ان میں سب سے بہتر و مکرم اللہ کے نزدیک تم ہی ہو"۔

نیز ارشاد باری ہے:

" وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ " (یونس: ۴۷)

"اور ہر جماعت کے لیے ایک رسول ہے"۔

("اُمَّةٍ" سے یہی مراد ہے، جو میں نے بیان کیا) اس کے برعکس کیسے ہو سکتا ہے؟ جب کہ اس کے کچھ ہی بعد ارشاد باری ہے:

"لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ط اِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ " (یونس: ۴۹)

"ہر فرقہ کا ایک وعدہ ہے، جب آ پہنچے گا ان کا وعدہ، پھر نہ پیچھے سرک سکیں گے ایک گھڑی اور نہ آگے سرک سکیں گے"۔

حضرت ابراہیمؑ سے پہلے سنت اللہ یہ تھی کہ قوم یا تو (اپنے نبی کی) اطاعت کرے، ورنہ ہلاک و برباد کردی جاتی (کما مر) اور حضرت ابرہیمؑ کے بعد کے طریقے کو قرآن کریم کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے:

" وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ " (العنکبوت: ۲۷)

"اور رکھ دی اس کی اولاد میں پیغمبری اور کتاب (یعنی حضرت ابراہیم کے بعد بجز ان کی اولاد کے، کسی کو کتاب آسمانی اور پیغمبری نہ دی جائے گی)"۔

پس حضرت ابراہیم کے بعد نبوت و رسالت کو آپ علیہ السلام کی ذریت و اولاد میں منحصر کر دیا گیا، پھر خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر اس سلسلۂ نبوت و رسالت کو ختم کر دیا گیا۔ آیت احزاب کا مقصد متبنی کے باپ ہونے کی نفی کرنا ہے اور اس کو "برجالکم" سے مقید اس لیے کیا گیا، تاکہ لفظ کی صورت [جو اگرچہ مراد نہیں ہے] سے یہ وہم نہ کر لیا جائے کہ آپ کے اپنی اولاد کا باپ ہونے کی بھی نفی کی جا رہی ہے (نعوذ باللہ من ذلک) حالاں کہ یہ مراد نہیں ہے۔ یا پھر مطلق ابوت کی نفی مقصود ہے، چناں چہ "جامع البیان" میں ہے کہ: "اس آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں کہ آپ ﷺ اور اس شخص کے درمیان حرمت مصاہرت ثابت ہو، جیسا کہ والد اور ولد کے درمیان ہوتی ہے اور اولاد سے مراد آپ کی اولاد صلبی ہے، نہ کہ اولاد کی اولاد۔ رہے حضرت قاسم، ابراہیم اور طاہر رضی اللہ عنہم تو چوں کہ یہ حضرات رجال کی عمر تک نہ پہنچے تھے (بلکہ بچپن ہی میں ان سب

کا انتقال ہو گیا تھا) اس وجہ سے مردوں کی فہرست میں نہیں آئیں گے'' (انتہی)

مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کا تم میں سے کسی کا نسبی باپ ہونا، ایک ناقص چیز ہے، اس لیے تمہارے ساتھ (اے امت محمدیہ) آپ ﷺ کا یہ تعلق نہیں ہے، بلکہ تمہارے ساتھ آپ کا تعلق نبی اور پیغمبر کا ہے (جو نسبی ماں، باپ سے کہیں زیادہ شفیق ہوتا ہے) اس لیے معمولی اور کم تر درجہ تعلق (یعنی تعلق ابوت) کے بجائے، اعلی اور جامع تعلق (یعنی تعلق نبوت ورسالت) کو قائم کیا گیا۔ نیز لوگوں کے امور کے بجائے امرالٰہی کو ترجیح دی گئی۔ اس مقام پر کفار مکہ کے اس قول کا جواب دینا مطلوب نہیں کہ آپ مقطوع النسل ہیں، کیوں کہ ان آیات کے سیاق میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ اس مقام پر حضرت زید (متبنیٰ) کی منکوحہ سے جب کہ وہ اسے طلاق دیدیں، آپ ﷺ کے نکاح کا جواز ثابت کرنا ہے۔ جن حضرات نے اس مفہوم کو آیت کے ذیل میں ذکر کیا ہے، تو انھوں نے آیت سے اس مفہوم کو اخذ کر کے بیان کیا ہے، نہ کہ آیت کی منشاٗ ومراد ہونے کے اعتبار سے۔

تفسیر ''روح المعانی'' وغیرہ میں اس آیت سے متعلق مذکور بحث کا حاصل یہ ہے کہ جب متبنیٰ (لے پالک بیٹا) میں اختلاط نسب ومیراث، نیز حلال کو حرام کرنے کا مفسدہ تھا (بایں طور کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگ متبنیٰ کو تمام احکام واحوال میں حقیقی اور نسبی بیٹا سمجھتے، اسی کا بیٹا کہہ کر پکارتے، مرنے کے بعد شریک وراثت ہونے، رشتہ ناتے اور حلت وحرمت کے تمام احکام میں حقیقی بیٹا قرار دیتے، جس طرح نسبی بیٹے کے مرجانے یا طلاق دینے کے بعد، باپ کے لیے بیٹے کی بیوی سے نکاح حرام ہے، اسی طرح وہ متبنیٰ کی بیوی سے بھی اس کے مرنے اور طلاق دینے کے بعد نکاح کو حرام سمجھتے تھے۔ حالاں کہ اس سے نکاح جائز اور حلال ہے۔ یہ رسم انہی جیسے بہت سے مفاسد پر مشتمل تھی۔

اسلام جو کہ دنیا کو کفر وضلالت اور جاہلیت کی بیہودہ رسوم سے پاک کرنے کے لیے آیا، اس سلسلے میں اس نے دو طریقے اختیار کیے۔

۱۔ حکم دیا کہ متبنیٰ کو اس کے نسبی باپ کی طرف منسوب کر کے پکارو:

''اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ'' (الاحزاب: ۵)

''پکارو لے پالکوں کو ان کے باپ کے نام سے''۔

۲۔ ان کی بیواؤں سے، جن کو ابھی تک حرام سمجھتے تھے، نکاح کرو۔

مگر چوں کہ کسی رائج شدہ رسم کے خلاف عمل کرنے میں اعزا واقارب اور اپنی قوم وقبیلہ کے ہزاروں طعن وتشنیع کا نشانہ بننا پڑتا ہے، جس کا تحمل ہر شخص کو دشوار ہے) نیز کسی چیز کی اصلاح اسی وقت ہو پاتی ہے، جب

کہ مصلح خود اس پر عمل کرے، بالخصوص ان چیزوں میں جسے لوگ عار اور غیرت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ (اس لیے خداوند عالم نے چاہا کہ اس عقیدہ کو اپنے رسول ہی کے ہاتھوں عملاً توڑا جائے، چناں چہ جب حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی زینب رضی اللہ عنہا کو باہمی ناچاقی کی وجہ سے طلاق دیدی، تو خداوند عالم نے اپنے رسول کو حکم فرمایا کہ ان سے نکاح کرلو، تاکہ اس رسم وعقیدہ کا کلیۃً استیصال ہوجائے، ارشاد باری ہوا:

"فَلَمَّا قَضیٰ زَیْدٌمِّنْهَا وَطَراً زَوَّجْنٰكَهَا لِكَیْ لَا یَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْ اَزْوَاجِ اَدْعِیَاءِ هِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَراً" (الاحزاب ۳۷)

"پھر جب زید کا اس (زینب) سے جی بھر گیا، (یعنی طلاق دیدی اور عدت بھی گذر گئی تو) ہم نے آپ سے اس کا نکاح کردیا، تاکہ مسلمانوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں (سے نکاح) کے بارے میں کچھ تنگی نہ رہے، جب وہ (منہ بولے بیٹے) ان سے اپنا جی بھر چکیں (یعنی طلاق دیدیں)۔"

چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بامر خداوندی نکاح کیا، ادھر جیسا کہ پہلے ہی خیال تھا، تمام کفار عرب میں شور مچا کہ "لو اس نبی کو دیکھو کہ اپنے بیٹے کی بیوی سے نکاح کر بیٹھا" ان لوگوں کے طعنوں اور اعتراضات کے جواب میں) متبنی کے معاملے کو ختم کرتے ہوئے ارشاد باری ہوا: "مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِیِّیْنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْئٍ عَلِیْماً" (الاحزاب: ۴۰) یعنی یہی نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زید کے باپ نہیں، بلکہ آپ تو کسی بھی مرد کے باپ نہیں، پس ایک ایسی ذات پر جس کا کوئی بیٹا ہی موجود نہیں، یہ الزام لگانا کہ اس نے اپنے بیٹے کی بیوی سے نکاح کرلیا ہے (کس قدر ظلم اور کجروی ہے) اس جگہ "مَا كَانَ" غالباً اسی معنی میں ہے، جس معنی میں کہ:

"وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْبَغِیْ لَهٗ" (یس: ۶۹)

"اور ہم نے نہیں سکھایا اس کو شعر کہنا اور یہ اس کے لائق نہیں"۔

یعنی یہ شعر وشاعری آپ کے منصب جلیل کے شایان شان نہیں ہے۔ (اسی طرح "" مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِنْ رِّجَالِكُمْ" کا بھی یہی مطلب ہے کہ آپ کے منصب جلیل کے شایان شان یہ بات نہیں ہے کہ آپ مردوں میں سے کسی کے نسبی باپ ہوں، جو ایک ناقص رشتہ ہے، بلکہ آپ کا تعلق تو امت سے نبوت ورسالت کا ہے جو ایک اعلی اور دائمی رشتہ ہے) اور "وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ" کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے مردوں میں سے کسی کو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صوری ابوت حاصل نہیں، جو ایک نسبی باپ سے ہوتی ہے، ہاں امت کو، آپ کی معنوی ابوت حاصل ہے، جیسے استاذ وشیخ کی ابوت (شاگرد ومرید کے لیے) ابن السہا (ایک چھوٹا مدہم روشنی کا ستارہ) کا تعلق سورج سے۔ "وَخَاتَمَ النَّبِیِّیْنَ" کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی

معنوی ابوت ہمیشہ جاری رہے گی، جس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ﷺ آخری نبی ہیں، آپ ﷺ کی امت آخری امت ہے، آپ ﷺ پر نازل شدہ کتاب (قرآن کریم) آخری آسمانی کتاب ہے، آپ کا زمانہ عہد قدیم وعہد متوسط کے بعد آخری زمانہ ہے اور آپ کی مسجد (مسجد نبوی) انبیاء کرام کی (تعمیر کردہ) آخری مسجد ہے۔ دیکھیے: ''وفاء الوفاء'' ج ا، ص ۶۹۵، اور ''مسلم شریف'' ج: ا ص ۴۴۶۔ اس لیے اس نعمت خداوندی سے، جو فوت ہونے کے بعد دوبارہ نہیں مل سکتی، محرومی کا شکار نہ ہوئیے۔ یہ ساتویں وجہ ہوئی۔ کیوں کہ قرآن نے مطلقاً کہا ہے کہ آپ ہمیشہ کے لیے آخری نبی ہیں (تشریعی اور غیر تشریعی کے ساتھ مقید نہیں کیا) نیز آپ کے علاوہ کوئی اور اس وصف کا حامل بھی نہیں (اس لیے آپ قطعی اور یقینی طور پر آخری نبی ہیں، آپ کے بعد تشریعی و غیر تشریعی کوئی بھی نبی نہیں آسکتا ہے) جب کہ اس ملحدِ قادیان کی تحریف (اور تشریعی و غیر تشریعی کی تقسیم) کے نتیجے میں معاملہ اس کے برعکس ہو جاتا ہے، چناں چہ اس کی تشریح کے مطابق یہ بد بخت خود، یا اور کوئی خاتم الانبیاء بن سکتا ہے۔ نیز جو امور اس آخریت پر متفرع ہوتے ہیں، وہ بھی بدل جاتے ہیں، حالاں کہ یہ اولیات وآخریات آپ ﷺ کے مناقب میں سے ہیں۔ وَاللّٰہُ یَقُوْلُ الْحَقَّ وَھُوَ یَھْدِی السَّبِیْلَ.

''لسان العرب'' میں ہے کہ ''خاتِم القوم [بالکسر] اور ''خاتَم القوم'' [بالفتح] کے معنی ''آخر القوم'' ہیں، یہی معنی لحیانی سے نقل کیا جاتا ہے۔ ''محمد ﷺ خاتم الانبیاء'' یعنی آخر الانبیاء اور ''مجمع البحار'' میں ہے ''خاتم النبوۃ'' [بکسر تاء] یعنی تمام کرنے والا اور [بہ فتح تاء] بہ معنی مہر، یعنی وہ شئ جو اس پر دلالت کرے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ غالباً ''خاتم'' [بہ فتح تاء] بلیغ ترین ہے، کیوں کہ اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ تمام نبوتیں اس طرح جمع ہیں کہ ان میں ترتیب، ہم آہنگی اور تناسب ہے، جیسا کہ حدیث قصر النبوۃ میں ''آخر لبنۃ'' بتا رہا ہے، نہ کہ کیف ما تفق بہ حیثیت مجموع اعتباری، تمام نبوتیں جمع ہو گئی ہیں اور آپ ان تمام نبوتوں کے لیے مہر واقع ہوئے، یعنی آپ کی نبوت دوسرے انبیاء علیہم السلام کی نبوتوں کے لیے حسی مہر کا درجہ رکھتی ہے۔

اس لیے یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ ''خاتم النّبیین'' ''خاتم المحققین'' کی طرح ہے، جیسا کہ اس ملحدِ قادیان کا خیال ہے، ورنہ تو (بہ زعم قادیانی غیر تشریعی نبی کی طرح) آپ ﷺ کے بعد تشریعی نبی کی آمد بھی ممکن ہوگی (حالاں کہ یہ شقی خود اس کا قائل نہیں۔ کما مر) اس لیے اب یہ احتمال بھی باقی نہ رہے گا کہ آپ ان نبوتوں کے لیے خاتم [بہ کسر تاء] ہیں، جو آپ سے مستفاد نہیں۔ یعنی آپ سے پہلے کی نبوتیں، رہے نبوت کے وہ درجے جو آپ سے مستفاد ہیں — یعنی آپ کے بعد کی نبوتیں — جیسا کہ قادیانی کا خیال ہے)۔ تو وہ کھلے ہوئے ہیں، ان پر مہر نہیں لگی ہے۔ پھر نبوت تشریعی و غیر تشریعی کی کوئی دلیل نہیں ہے، سوائے شیطانی وساوس کے۔ ''حسبنا اللہ و نعم الوکیل''۔

چند مفید باتیں

تخلیق ارض وسماء

اللہ رب العزت نے مخلوقات کی تخلیق کا آغاز ہفتے کے پہلے دن سے کیا[امام طبری کے بیان کے مطابق ابن اسحاق کی یہی رائے ہے، نیز مسلم شریف میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ایک حدیث میں بھی یہی بات مذکور ہے] تخلیق کا یہ عمل بروز جمعرات پایہ تکمیل کو پہنچا۔ پھر خداوند تعالیٰ جمعہ کے دن عرش معلیٰ پر مستوی ہوئے جیسا کہ بہ روایت حضرت انسؓ، مسند شافعی میں منقول ہے۔ مورخ طبری نے ابن اسحاق سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ تخلیق کائنات کے معاً بعد ہی ابوالبشر حضرت آدم پیدا نہیں کیے گئے اور ارشاد باری:

" اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ "

(اعراف : ۵۴)

" بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے سب آسمانوں اور زمینوں کو چھ روز میں پیدا کیا پھر عرش پر قائم ہوا"۔

سے یہی مراد ہے۔ بلکہ کئی صدیوں بعد، جن کا علم صرف حق تعالیٰ ہی کو ہے، کسی جمعہ کو ابوالبشر حضرت آدمؑ کو پیدا کیا اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جمعہ کو مقدس اور مخلوق کے لیے یوم جشن قرار دیا، روز جمعہ ہی تورات میں "یوم السبت" کے نام سے مذکور تھا کیوں کہ "سبت" کے معنی کام چھوڑ کر آرام کرنا، لیکن یہود نے بعد میں اپنی جانب سے "یوم السبت" فی زمانہ مشہور روز شنبہ کو قرار دے کر اسے یوم العید بنا دیا۔ صاحب "جامع البیان، ارشاد باری:

" وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ (ق : ۳۸)

'اور ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان سب کو چھ دن میں پیدا کیا اور ہم کو تکان نے چھوا تک نہیں"۔

کے تحت لکھتے ہیں کہ اس میں یہود کے اس قول کی تردید ہے کہ اللہ رب العزت مخلوق کی تخلیق سے جمعہ کے دن فارغ ہوئے اور سنیچر کے دن آرام کیا اور یہ کہ اسی وجہ سے یہود اس دن (یعنی شنبہ) کو "یوم الراحہ" (آرام کا دن) کہتے ہیں۔

دنیا کی عمر

دنیا کی عمر حضرت آدمؑ کی پیدائش سے لے کر، حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تک تو رات کے نسخہ سبعیہ، باب ''عہد آدم الی تارح فی ذکر السنین'' کے مطابق چھ ہزار (۶۰۰۰) سال ہے۔ جب کہ نسخہ عبرانیہ کے اعتبار سے چھ ہزار سال سے بہت زیادہ ہے۔ دنیا کی کل عمر کی بابت یہی بات زیادہ صحیح ہے۔ اس جاہل قادیانی کا یہ کہنا کہ یہ مدت (یعنی از آدم تا محمد ﷺ) چار ہزار سات سو چالیس (۴۷۴۰) سال ہے، اس کی خود ساختہ اور ناقابل التفات ہے، اسی طرح ہندوؤں کی یہ بات بھی لائق التفات نہیں کہ دنیا کی کل مدت ہزاروں ہزار سال بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے، اس لئے کہ یہ سب انکل اور اندازے کی باتیں ہیں۔ کسی بھی قوم کے پاس کوئی ایسی دلیل اور ثبوت نہیں جس سے دنیا کی کل عمر سات ہزار سال سے زیادہ معلوم ہوتی ہو، چناں چہ: صابی، کلدانی، اشوری، عبرانی، رومانی، یونانی، مصری، فارسی، ترکی، حبشی، ہندی اور چینی سبھی تو میں یہی عمر بیان کرتی ہیں۔ جیسا کہ ''دائرۃ المعارف'' وغیرہ میں مذکور ہے۔ نیز یہ کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ساتویں ہزار کے شروع میں ہے۔

رہی حدیث نبوی:

'' الدنیا سبعة آلا ف سنة انا فی آخر ھا الفاً''

'' کہ دنیا کی عمر سات ہزار سال ہے اور میری بعثت آخری ہزار میں ہے''۔

اس کے بعد دنیا کے ختم ہونے کی تمہید ہے، خواہ کتنے سال بعد [ہوا سے امام طبرانی اور امام بیہقی نے ''دلائل النبوۃ'' میں نقل کیا ہے] تو یہ روایت اگرچہ اسناد کے لحاظ سے بالکل ساقط ہے، لیکن اس میں وہی بات مذکور ہے، جس کی شہادت تاریخ بھی دیتی ہے امام طبری نے اپنی تاریخ میں حضرت ابن عباسؓ کے اس قول:

'' الدنیا جمعة من جمع الآخر ة سبعة آلا ف سنة ،فقد مضی ستة آلا ف ستة ومئو سنة ولیا تین علیھا مئو سنین لیس لھا مو حد ''.

''دنیا آخرت کے ہفتوں میں سے ایک ہفتہ ہے، جو کہ سات ہزار برس کا ہے، اس میں سے چھ ہزار برس اور کئی صدیاں گذر چکیں مزید کئی صدیاں ایسی آئیں گی، جن میں کوئی موحد باقی نہ رہے گا''۔

سے استشہاد کرتے ہوئے اسے قوی قرار دیا ہے، نیز طبری کی بھی یہی رائے ہے۔ اور صاحب ''ناسخ'' نے باب '' نبأ الیا سؑ فی ظھور خاتم الا نبیاء صلی اللہ علیه وسلم '' میں جو یہ ذکر کیا ہے '' کہ دنیا کی

پوری عمر پچاسی یوبل سے زیادہ نہیں [ایک "یوبل" پچاس سال کا ہوتا ہے، دیکھئے "فتح البیان، ج:۹، ص: ۳۲۷"] یہ سات ہفتوں کے اعتبار سے ہے۔ نیز یہ بات کہ "چچازاد بھائی اس وقت آئے گا"، تو اس کو صحیح معنی پر محمول کرنا ممکن ہے، بایں طور کہ اس تاریخ کو آدم ثانی حضرت نوحؑ کے ہبوطِ (سفینہ) سے جوڑا جائے۔ مؤرخ طبری نے تاریخ طبری [ص:۷۷] میں، ہشام کے حوالے سے جو تفصیل ذکر کی ہے اس سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ نسخہ عبرانیہ اور سبعینیہ کے درمیان اختلاف کی وجہ بھی یہی ہے، کیوں کہ عبرانی طوفان نوح سے تاریخ متعین کرتے ہیں، تو ممکن ہے کہ طوفان نوح سے بعثتِ خاتم الانبیاء تک اس مدت کو لیا جاسکے، جب کہ نزول آدم سے بعثتِ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک کی مدت چھ ہزار سال سے کچھ زائد ہو، واضح رہے کہ جمع کی یہ صورت اس وقت ہے، جب کہ عمداً یہ اختلاف نہ بیان کیا گیا ہو۔

شہرستانی کہتے ہیں کہ: "رہا "سبت" تو اگر یہود کو یہ معلوم ہوتا کہ "یوم السبت" کے ساتھ تکلیف احکام کا لزوم کیسے وارد ہوا اور وہ شخصوں میں سے کسی شخص اور زمانہ وحالت میں سے کس کے مقابلے میں ہے، تو یہ پہچان لیتے کہ آخری شریعت برحق ہے اور یہ سبت کو ثابت کرنے کے لیے آئی ہے نہ کہ باطل کرنے کے لئے" (انتہی)

علاوہ ازیں فرماتے ہیں: "کہ یہود تمام کے تمام اس بات پر متفق ہیں کہ تورات میں حضرت موسیٰ کے بعد ایک نبی کے آنے کی بشارت ہے رہا ان کے درمیان اختلاف تو وہ اس ایک نبی کی تعیین میں ہے (کہ وہ کون ہے) یا اس بات میں ہے کہ ایک ہی آئیں گے یا ایک سے زائد۔ حضرت مشیحا اور ان کے ظہور کی علامتوں کا ذکر تورات کے ابواب میں نمایاں طور پر مذکور ہے۔ نیز اس بات پر بھی متفق ہیں کہ "آخری زمانے میں ایک ایسے نبی کا ظہور ہوگا جو اس چمکتے ستارہ کی مانند ہوگا، جو اپنے نور سے پوری دنیا کو روشن کردے گا"۔

یہود اس نبی کے خروج کے منتظر ہیں، نیز بزعم خود "یوم السبت" جو کہ مخلوق کی تخلیق کے بعد استواء علی العرش کا دن ہے، اس نبی کے خروج کا دن بتاتے ہیں، کیوں کہ تمام یہود اس پر متفق ہیں کہ اللہ رب العزت آسمان کی تخلیق سے فارغ ہو کر عرش پر مستوی ہوگئے ہیں۔

مزید فرماتے ہیں کہ: "یہود کا ایک فرقہ اس بات کا قائل ہے کہ یہ چھ دن [جن میں اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کی تخلیق فرمائی] ہمارے چھ ہزار سال کے برابر ہے، اس لیے کہ قمری سال کے اعتبار سے دنیا کا ایک ہزار سال اللہ کے نزدیک ایک دن کے برابر ہے اور یہ مدت حضرت آدم کی تخلیق سے پہلے جو زمانہ گزرا ہے، سے لے کر، آج تک کے اعتبار سے ہے، نیز اسی مدت میں تمام مخلوق ختم ہوجائے گی۔ (یعنی از ابتدائے دنیا تا قیامت کے اعتبار سے یہ مدت ہے")

شہرستانی اس سے پہلے یہود کے فرقہ عنانیہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''یہ فرقہ حضرت عیسیٰؑ کے وعظ ونصیحت کی تصدیق کرتا ہے، مگر انھیں نبی ورسول نہیں مانتا، بلکہ اس بات کا قائل ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اولیاءاللہ میں سے ہیں۔ یہ فرقہ یہ بھی کہتا ہے کہ تورات میں بہت سی جگہوں پر جس مشیحا کا ذکر وارد ہے، اس سے مراد حضرت عیسیٰ ہی ہیں اور فارقلیط سے مراد ''رجل عالم'' ہے، اسی طرح فارقلیط کا ذکر انجیل میں بھی ہے۔ پس اسے اس ذات پر محمول کرنا واجب ہے، جو وجود پذیر ہو چکی اور جس نے اس کے ہونے کا دعوی کیا۔ انتہی۔ یعنی حضرت عیسیٰؑ کی نبوت''۔

میں کہتا ہوں کہ انجیل کا لفظ فارقلیط سوائے ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی اور پر صادق نہیں آتا ''فتح الباری'' میں جو یہ مذکور ہے کہ حضرت معمر فرماتے ہیں:

'' بلغنی عن عکر مة فی قوله . تعالی : فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَةٍ
قال : الد نیا من او لها الی آخر ها یو م مقداره، خمسون الف سنة لا ید ری کم مضی ولا کم بقی الا الله تعالی ''

''کہ مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ عکرمہ ارشاد باری: ''فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَةٍ'' (معارج: ۴) (اور وہ عذاب -- ایسے دن میں ہوگا۔ جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے)۔ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ دنیا کی پوری مدت شروع سے آخر تک پچاس ہزار سال کے برابر ہے، کتنے ایام گذر گئے اور کتنے باقی ہیں، اس کا اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو علم نہیں''۔

تو میرے نزدیک اس میں حضرت آدم کی تخلیق سے پہلے دنیا کی جو مدت گذری ہے، اس کا بھی ذکر ہے، یعنی آسمان وزمین کی تخلیق سے لے کر حضرت آدم کی تخلیق تک کی مدت، پھر حضرت آدم سے قیامت تک کی۔ اور اس سے پچاس ہزار سال سے بھی پچاس ہزار سال یا اس سے زیادہ پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنا عرش پانی پر پیدا کیا۔ چناں چہ ارشاد باری ہے:

''وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّکَانَ عَرْشُهٗ عَلَی الْمَاءِ''(هو د : ۷)

''اور وہ اللہ ایسا ہے کہ سب آسمان اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا، اس وقت اس کا عرش پانی پر تھا''۔

نیز امام مسلم نے عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کتب الله مقادیر الخلائق قبل ان یخلق السموٰا ت و الا رض بخمسین الفا، قال: و کان عرشه علی الماء .(مسلم: ۳۳۵/۲)

''کہ اللہ رب العزت نے تمام مخلوقات کی تقدیر آسمان وزمین کی پیدائش سے بھی پچاس ہزار سال پہلے لکھ دی تھیں۔اور فرمایا کہ:اس کا عرش پانی پر تھا''۔

بخاری میں حضرت عمران بن حصینؓ سے مروی ہے:

''کا ن اللہ ولم یکن شیء قبلہ ، وکان عرشہ علی الماء ،ثم خلق السمٰوات و الارض وکتب فی الذکر کل شیئ'' (بخاری:۱۱۰۳/۲)

''کہ اللہ تعالیٰ تھے،اس سے پہلے کچھ نہ تھااس کا عرش پانی پر تھا، پھر آسمان وزمین کو پیدا کیااور لوح محفوظ میں تمام چیزیں لکھ دیں''۔

حافظ ابن حجر''فتح الباری''میں لکھتے ہیں کہ:یہی حدیث نافع بن زید حمیری کے واقعے میں ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے:

'' کا ن عرشہٗ علی الماء ، ثم خلق القلم ، فقال:اکتب ما ھو کائن ، ثم خلق السمٰوات والارض وما فیھن''

''کہ اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا، پھراس نے قلم پیدا کیااور اس سے کہا کہ جو کچھ ہونے والا ہے،سب لکھ،اس کے بعد آسمان وزمین اور آسمانیات وزمینیات کو پیدا کیا''۔

اس میں پانی اور عرش کے بعد تخلیقِ مخلوقات کی ترتیب کی تصریح ہے(انتہی)

نیز بیہقی نے''کتاب الاسماء والصفات''میں ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے:

'' کا ن اللہ عزو جل ولم یکن شی غیرہ ، وکان عرشہ ٗعلی الماء، ثم کتب جل ثناءہ فی الذکر کل شیئ، ثم خلق السمٰوات و الا رض ''

''اللہ عزوجل تھا،اس کے علاوہ کچھ نہ تھااس کا عرش پانی پر تھا، پھر اللہ جل جلالہ نے لوح محفوظ میں سب کچھ لکھ دیا،اس کے بعد آسمان وزمین کو پیدا کیا''۔

دیکھئے:''روح المعانی،۱۱۱/۸،اور''سورہ اعراف'' کے تحت:۱۷۹/۳۰''۔

جب یہ بات معلوم ہوگئی تو یہ بھی واضح ہو گیا کہ خاتم الانبیاء کی بعثت ہفتے کے آخری دن یعنی جمعہ کو [جو حقیقتاً چھٹی کا دن تھا] ہوئی، یہود نے یوم العید ویوم الراحۃ اس کے بعد والے دن (یعنی شنبہ) کو قرار دے کر غلطی کی۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی مدت ایک ہزار سال سے جتنی زیادہ اللہ تعالیٰ چاہے گا،اتنی بڑھ جائے گی،جیسا کہ حافظ سیوطی نے اپنے رسالہ''بسط الکف فی مجا وزۃ ھذہ الا مۃ الا لف''

میں ذکر کیا ہے۔ الحاصل محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، آپ کے بعد جو بھی نبوت کا دعوی کرے، وہ بہ اجماع امت محمدیہ کافر ہے۔

دنیا کی عمر کی بابت مؤرخین کا اندازہ و تخمینہ شہروں کے پھیلنے، بادشاہوں اور معاصروں کی عمروں اوز کتب قدیمہ وغیرہ کے اعتبار سے ہے انھوں نے اس کی تحقیق میں کافی کوشش بھی کی، مگر یہ لوگ بھی حضرت آدم سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک کی مدت کو چھ ہزار سال سے کم نہ کر سکے۔ ''اظہار الحق'' میں ہے کہ مشہور یہودی مورخ یوسیفس نے دنیا کی مدت کی بابت تورات کے نسخۂ عبرانیہ کے حساب کو چھوڑ دیا اور اسے تسلیم نہ کیا، حالانکہ پکا یہودی تھا۔ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ غالباً نسخۂ عبرانیہ میں تحریف اس مورخ کے بعد ہوئی۔ چوں کہ یہ حضرت یحی وعیسی علیہما السلام کا معاصر تھا (اور دنیا کی مدت کے حسابات وغیرہ تحریفات میں سے ہیں، اصل نسخہ میں نہ تھے،) نیز بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کے سولی دیئے جانے کے واقعات (جو اس کی تاریخ میں مذکور ہیں) یہ سب بھی الحاقی ہیں، اصل نسخہ میں یہ واقعات نہیں ہیں، چنان چہ اس واقعے کی بابت موجودہ نسخے میں جو کچھ مذکور ہے، وہ سب مؤرخین نصاری کے حوالے سے ہے، کمافی ''فتح المنان، من سورہ ال عمران''۔ ''الملل والنحل'' میں ابن حزم کی عبارت سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے، جس کا کچھ حصہ مذکور ہو چکا ہے۔ پس اس تفصیل سے اس بدبخت کا دعوی اور یہ بہتان کہ میں ساتویں ہزارے میں بھیجا گیا ہوں ہباءً منثورا ہو جاتا ہے۔ شیطان نے اس کو آرزوؤں اور دھوکوں میں مبتلا کر دیا اور شیطان تو بنی آدم کے مقاعد سے بھی کھیلا کرتا ہے۔

محمد ﷺ آخری نبی ہیں

پوری امت محمدیہ کا اس بات پر اجماع قطعی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نہ تو نبوت ہے اور نہ رسالت۔ اس بابت تقریباً دوسو احادیث متواترہ وارد ہیں، لہذا ان احادیث کی ایسی تاویل کرنا جس سے ختم زمانی منتفی ہو جائے، بلاشبہ کفر ہے۔

یہ بھی واضح ہو کہ جس طرح پوری امت کا اس بات پر اجماع قطعی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلۂ نبوت ختم ہے اور آپ آخری نبی ہیں، اسی طرح اس بات پر بھی اجماع ہے کہ حضرت عیسیٰؑ قرب قیامت میں آسمان سے نزول فرمائیں گے (بہ ظاہر دونوں باتوں میں تعارض نظر آتا ہے، کہ جب حضور پر سلسلۂ نبوت ختم ہے تو اللہ کے نبی حضرت عیسی قرب قیامت میں کیوں کر نزول فرمائیں گے، اس تعارض کو ختم کرنے کے لیے

شارحین حدیث نے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد عالی:

"ان الرسالة و النبوة قد انقطعت فلا رسول بعدی ولا نبی" (ترمذی: ۵۳/۲)

"نبوت ورسالت کا سلسلہ بند ہوگیا، پس میرے بعد نہ کوئی نبی آئے گا اور نہ رسول"۔

کی مختلف تاویلیں کیں، اکثر علماء کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ کے بعد اب کسی کو نبوت دی نہیں جائے گی، رہے حضرت عیسیٰ (جو قرب قیامت میں نزول فرمائیں گے) تو وہ ان انبیاء میں سے ہیں، جنھیں حضور ﷺ سے پہلے ہی نبوت دی جا چکی ہے۔ اس حدیث کی تشریح میں بے غبار بات یہی ہے اور حدیث کی مراد بھی یہی ہے۔ اسے اس طرح سمجھئے کہ مثلاً کسی آدمی کی سب سے چھوٹی اولاد پہلے مر جائے اور اس سے پہلے کی بڑی اولادیں زندہ ہوں، تو زندہ بڑی اولاد کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ فلاں آدمی کی آخری اولاد ہے، بلکہ آخری اولاد تو وہی ہے جو وفات پا چکی۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ وجود شی اور ہوتا ہے اور بقائے شیء اس سے بالکل الگ۔ حضرت عیسیٰ کا نزول شریعت محمدیہ پر عمل درآمد کے لیے ہوگا، نہ کہ نئے نبی کے طور پر۔ الغرض حضرت عیسیٰ شریعت محمدیہ کے تابع ہوں گے، نہ کہ اس وقت آپ کو از سر نو نبوت دی جائے گی۔

لیکن بعض مورخین نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت عیسیٰ کے نزول اور مذکورہ حدیث نیز اس جیسی دیگر احادیث متواترہ کے درمیان تطبیق دینا چاہا، تو ایک ایسی عبارت لے آئے اور حدیث کا ایک ایسا مفہوم بیان کیا جس سے ظاہری طور پر بھی تعارض باقی نہ رہا، چناں چہ انھوں نے فرمایا:

"ان نبوة التشريع قد انقطعت، واما عيسىؑ اذا نزل لا يكون له تشريع"

"کہ نبوت تشریعی کا سلسلہ ختم ہوگیا، رہے عیسیٰؑ تو جب آپ نزول فرمائیں گے اس وقت نبی تشریعی نہ ہوں گے (بلکہ نبوت محمدی کے تابع ہوں گے)"۔

واضح رہے کہ اس عبارت کے لکھنے والے اس بات کے حتمی طور پر قائل اور معتقد رہے ہیں کہ یہ مفہوم حضرت عیسیٰ کے علاوہ کسی اور پر صادق نہیں آتا، کیوں کہ دین اسلام میں حد تواتر کو یہ بات پہنچی ہوئی ہے اور پوری امت کا اجماع ہے کہ ہر وہ شخص جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس نبوت حقیقیہ کا دعوی کرے جو دین سماوی میں مراد ہوتی ہے، وہ کافر ہے۔ لیکن ملاحدہ ان کی اس عبارت کو لے اڑے اور اس کی مراد کو بدل ڈالے، چناں چہ ان بدبختوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت حقیقیہ غیر تشریعیہ کو جائز قرار دے دیا۔ لاحول ولا قوة الا باللہ العلی العظیم۔

ملا علی قاری پر الزام اور اس کا جواب

بعض ملحدوں نے ملا علی قاری کی کتاب ''الموضوعات'' کی عبارت میں بھی اس طرح کی تحریف کی ہے، حالانکہ ملا علی قاری اپنی عبارت کا مصداق حضرت عیسیٰؑ اور صحابی رسول ابن ابی اوفیٰ وغیرہ کے اس قول

''انه لو عاش لكان نبياً، لكن بما ختمت النبوة قدر موته'' [كما عند البخاري ۹۱۴/۲](۱)

''اگر ابراہیم ابن النبی صلی اللہ علیہ وسلم زندہ رہتے تو نبی ہوتے، لیکن چوں کہ نبوت کے سلسلے کو ختم کر دیا گیا ہے، اس لیے (بچپن ہی میں) آپ کی موت مقدر کر دی گئی''۔

کے سبب حضرت ابراہیم ابن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور کو نہیں قرار دیتے۔ اصل بات یہ ہے کہ ابن ابی اوفیٰؓ وغیرہ کے مذکورہ قول کو پیش نظر رکھتے ہوئے ملا علی قاری نے اس بحث کو چھیڑ دیا کہ اگر ابراہیمؓ زندہ ہوتے اور نبوت دی جاتی، تو کیسی دی جاتی، چناچہ انھوں نے مذکورہ مفہوم بیان کیا (کہ اگر نبی بنتے تو نبی غیر تشریعی ہوتے) ملا علی قاری ہرگز اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ ان کی عبارت کا مصداق ان دو حضرات (حضرت عیسیٰ اور حضرت ابراہیمؓ) کے علاوہ کوئی اور ہے۔ لیکن افسوس ملاحدہ ملا علی قاری کی مذکورہ عبارت لے اڑے اور اس کے مفہوم کو جان بوجھ کر، یا اپنی جہالت کی وجہ سے بدل دیا، اگر جزئیات معینہ سے اسی طرح غلط مفہوم نکالے جائیں تو بہت سی عبارتوں پر نقض وارد ہوگا، اس لیے کہ اس صورت میں مفہوم عام اور قائل کی مراد کے خلاف؛ ہو جائے گا۔ اور پھر مسلسل نقض وارد ہوتے چلے جائیں گے۔ پس مومن وہ ہے جو حق بات پر ٹھہر جائے اور اسے مان لے، جب کہ ملحد وہ ہے جو اس میں سے اپنی خواہش کے مطابق چوری کر لے۔

اس کی نظیر وہ عبارتیں ہیں، جو اصحاب فنون اشیاء کی تعریفات میں لاتے ہیں اور پھر ان پر طرداً وعکساً نقض وارد کیا جاتا ہے، حالانکہ ان کی مراد صرف معرَّف ہوتا ہے، نہ کہ کوئی اور، اسی طرح تمام بحثوں میں یہ نقض دائر ہو سکتا ہے، جب کہ جزئیات میں سے ان کی طبیعتوں کو نکال باہر کیا جائے، اور اس کے خصائص کے اندر جزئی اوصاف کو لے کر بحث کی جائے، مثلاً ہمارے احناف کا یہ کہنا کہ نمازی کے لیے، نماز سے نکلنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے عمل سے نکلے، انھوں نے یہ بات ارشاد نبوی ''و تحليلها التسليم،، سے مستنبط کی ہے اور ان کے نزدیک یہ معنی خود اسی لفظ میں متحقق ہیں، لیکن جب انھوں نے ایک عام مفہوم ذکر کیا، اس

---

(۱) بخاری کے الفاظ یہ ہیں: حدثنا ابن نمير قال حدثنا محمد بن بشر قال حدثنا اسمعيل قلت لابن ابی اوفی رايت ابراهيم بن النبی ﷺ قال: مات صغيراً لو قُضی ان يكون بعد محمد ﷺ نبی عاش ابنه ولكن لا نبی بعده (بخاری ۹۱۴/۲) ابو طہ صغیر

کے علاوہ اور کوئی صورت بھی نہ تھی تو دوسرے منافی صلاۃ افعال کے ذریعہ نقض وارد ہو گیا اور دیکھنے والا یہ سمجھ بیٹھا کہ احناف لفظ ''السلام'' کے ذریعہ خروج من الصلوٰۃ کو لازم نہیں سمجھے، جیسا کہ قفال مروزی کی ''کتاب الصلوٰۃ'' میں ہے، حالاں کہ یہ لوگ بھی لفظ ''السلام'' کے ذریعہ نماز سے نکلنے کو واجب قرار دیتے ہیں۔

اسی طرح آیت کریمہ:

'' وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ '' (طٰہٰ : ۱۴)

''اور میری ہی یاد کے لیے نماز پڑھا کرو''

سے استدلال کرتے ہوئے اگر کوئی یہ کہے کہ نماز کا مقصد ذکر اللہ ہے۔ تو دوسرا اٹھ کھڑا ہو، اور یہ کہے کہ جب بات یہ ہے تو ارکان مخصوصہ: قیام، رکوع اور سجود وغیرہ کے ساتھ نماز مقید نہ ہوگی (بلکہ جس طرح بھی ذکر کیا جائے نماز ادا ہو جائے گی)۔ علمائے اصول کو اس قسم کی باتوں سے دشواری پیش آجاتی ہے، کیوں کہ یہ لوگ جب کسی حکم کے اوصاف مناسبہ اور علتوں کو ذکر کرتے ہیں تو ان کی تعبیر باعتبار لفظ مقصود سے عام ہوتی ہے، عموم انکی مراد نہیں ہوتا، مثلاً روزہ کی علت وحکمت کی بابت کہتے ہیں: کہ یہ نفس کو مغلوب کرنے اور شہوت توڑنے کے لیے مشروع ہوا۔ زکاۃ کی بابت فرماتے ہیں: کہ شکر الٰہی کے لیے اور حج مشاہد کی زیارت کے لیے مشروع ہوا، وغیرہ ذلک۔ اس پر کوئی جاہل یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ تب تو ان عبادتوں کے خصوصی ارکان کی کیا ضرورت، بس اللہ تعالی کے ساتھ تعلق کافی ہے، خواہ وہ جس طرح بھی ہو۔

اس سے بھی زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ علماء جب لفظ ''اللہ'' کی تشریح کرنا چاہتے ہیں تو مجبوراً انھیں کلی مفہوم لانا پڑتا ہے اور اس مفہوم کلی سے ان کا مقصد اعرف المعارف کے سوا کچھ نہیں ہوتا، ہاں مفہوم کلی کو اس لیے ذکر کرتے ہیں تاکہ ''اللہ'' کی تعریف ہو سکے، کیوں کہ جزئی کاسب نہیں ہوتی (کہ اس کے ذریعہ کسی چیز کی تعریف کی جا سکے) نیز علماء کا یہ بھی کہنا ہے کہ کلیات کا مجموعہ ہر جزئی ہے، یہ کلیات بہ حیثیت مجموعی جزئی میں منحصر ہیں، جزئی سے خارج نہیں ہوتیں۔ کما تقرر فی محلہ۔

الحاصل ملا علی قاریؒ کا کلام اگر چہ فی نفسہ غیر مناسب ہے، لیکن پھر بھی اس سے ان کی مراد کوئی بھی ایسی چیز نہیں ہے، جو ضروریات دین اور متواترات دین کے خلاف ہو۔ بلکہ اس عبارت سے ضروریات دین کے خلاف اور غلط مفہوم ان لوگوں نے نکالا جو خواہشات نفسانی کے پیرو کار گمراہ اور ملحد ہیں۔ اس طرح کی صورت حال (کہ عبارت پیش کرنے والا تو اپنی عبارت سے درست مفہوم مراد لے اور دوسرا غلط) بہ کثرت اس وقت پیش آتی ہے، جب کسی عالم کا جہلاء سے واسطہ پڑ جائے۔ جیسا کہ کفار کی بابت ارشاد باری ہے:

"وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُکَ مِنْهُ یَصِدُّوْنَ (زخرف : ۵۷)

"اور جب ابن مریم کے متعلق ایک عجیب مضمون بیان کیا گیا تو یکا یک آپ کی قوم کے لوگ اس سے چلانے لگے"۔

اور

"وَمَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَالَهٗ مِنْ نُّوْرٍ" (نور : ۴۰)

"اور جس کو اللہ ہی نور (ہدایت) نہ دے اس کو (کہیں سے بھی) نور نہیں (میسر آسکتا)"

ملا علی قاری نے خود "شرح الشفاء" وغیرہ میں اس بات کی تصریح کی ہے کہ دینی اصطلاح کے مطابق جو بھی نبوت کا دعویٰ کرے وہ بہ اجماع قطعی کافر ہے اور "شرح فقہ اکبر" میں لکھتے ہیں:

"ودعوی النبوة بعد نبینا. صلی اللہ علیہ وسلم. کفر بالا جماع"

"ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنا بالا جماع کفر ہے"۔

نبی تشریعی ہی ہوتا ہے، غیر تشریعی کوئی نبی نہیں ہوا

یہ بات ذہن نشین رہے کہ کوئی بھی حقیقی نبوت بغیر تشریعی کے پائی ہی نہیں جاسکتی، انبیاء بنی اسرائیل میں جتنے بھی نبی گذرے ہیں سب تشریعی ہی تھے، کوئی بھی غیر تشریعی نہ تھا، جیسا کہ حافظ ابن تیمیہ نے "شرح الاصفہانیہ، ص: ۱۰۷"، میں اس کی تصریح کی ہے، کیوں کہ ان سب حضرات کو عام کی تخصیص، مطلق کی تقیید اور اس قسم کے نواسخ جزئی کا من جانب اللہ حق تھا۔ شیخ محی الدین ابن العربیؒ نے بھی اسی جیسی تصریح فرمائی ہے۔ اور کیوں کر نہ ہو؟ اس لیے کہ جو بھی نبی ہوگا اس پر ایمان لانا اجزائے ایمان میں سے ہوگا، بغیر ایمان لائے ایمان معتبر ہی نہ ہوگا، تو کیا تشریعی کے معنی اس سے بڑھ کر بھی کچھ ہو سکتے ہیں۔

الحمد للہ ہم جماعتِ امت محمدیہ، حضرت عیسیٰؑ پر پہلے ہی سے ایمان رکھتے چلے آئیں ہیں اور ہمارا ایمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے مکمل ہو چکا ہے، اب تو حضرت عیسیٰ کے نزول کے وقت ہمیں ان کے چہرۂ انور کو صرف پہچاننا ہی باقی رہ گیا ہے اور آپؑ کے نزول کے وقت ہماری طرف سے اس میں کوئی تردد بھی نہ ہوگا۔ بلکہ انکار تو بعض یہود کردیں گے جن کا آپ خاتمہ کریں گے۔ پس ایسی نبوت جو تشریعی نہ ہو وہ خبر تو ہو سکتی ہے، مگر نبوت نہیں ہو سکتی۔ عارف باللہ سید علی ہمدانی ثم الکشمیری "شرح الفصوص" میں اس کی تشریح فرمائی ہے۔ مسلمانوں کو اس بابت ہرگز کسی بھی قسم کا شک نہ کرنا چاہیے۔ رہا بد بخت قادیانی تو اسلامی حلقوں میں اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں، اسے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنانا چاہیے:

"يُرِيدُوْنَ لِيُطْفِؤُا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ" (صف : ۸)

"یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھا دیں حالانکہ اللہ رب العزت اپنے نور کو مکمل و کامل کر کے رہے گا خواہ ان کافروں کو برا ہی لگے"۔

قد تمت هذه الرسالة

وانا اضعف العباد واصغرهم الافقر الاحقر

محمد أنور عفاالله عنه .

خادم الطلبه بدار العلوم الديوبنديه

ابن مولانا معظم شاه ابن الشاه عبد الكبير ابن الشاه عبد الخالق ابن الشاه محمد اكبر ابن الشاه حيدر ابن الشاه على ابن الشيخ عبد الله ابن الشيخ مسعود النروري الكشميرى .

وعن على رضى الله عنه : "اِنّ اللّٰهَ وَمَلٰئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ " الاية. لبيك اللهم ربى و سعديك ، صلوٰت الله البر الرحيم و الملئكة المقربين و النبيين والصديقين والشهداء والصالين ، وما سبح لك من شيء يا رب العالمين على محمد بن عبدالله خاتم النبيين و سيد المرسلين ، وامام المتقين ورسول رب العالمين، الشاهد البشير الداعى اليك بإذنك السراج المنير وعليه السلام ، وما توفيقى الا بالله عليه توكلت و اليه انيب .

بعون اللہ و کرمہ آج بتاریخ ۲۶ر جمادی الثانی ۱۴۲۳ھ مطابق ۵ر ستمبر ۲۰۰۲ء بروز جمعرات اس ترجمے کی تسوید و تبییض سے فارغ ہوا۔ الحمد الله الذى بنعمته تتم الصالحات.

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم و تب علينا انك انت التواب الرحيم

العبد الصغير

أبو طه محمد صغير القاسمى ثم المظاهرى

ابن الشيخ محمد يار القاسمى كان الله له ولوالديه فى الدنيا والاخرة

خادم الطلبه بمعهد الانور . الديوبند



Zam Zam Publishers

Shahzaib Centre, Gawali Line # 3, Near
Muqaddas Masjid, Urdu Bazar
Karachi-Pakistan.
Ph: 0092-21-2760374, 0092-21-2761671
Fax: 0092-21-2725673
E-mail: zamzam01@cyber.net.pk
info@zamzampub.com
Visit us Our http://www.zamzampub.com